علیم الحق حقی کلیکشن

(سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کی شاہکار کہانیاں)

(2)


لہو کے دو رنگ
پگلی
جوان ہوا
رشتہ آدم
مس ہرکولیس
خندہ تقدیر
اماوس کا دیا
پہیلی
امید کا دیا
اچھوت

لہو کے دو رنگ

علیم الحق حقی

سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد بوسنیا میں جو کچھ ہوا اور اب کوسووو میں ہو رہا ہے، وہ متعصب اور تنگ نظر یورپ کی سیاہ تاریخ کا تاریک تر باب ہے۔ جو مظالم وہاں مسلمانوں پر ڈھائے گئے، وہ چنگیزی ہیں نہ نازی۔ ان کے اظہار کے لیے یہ اصطلاحیں ہیچ ہیں کہ یہ خود اپنی مثل ہیں۔ اس دوران سفاکی کی جو کہانیاں منظرِ عام پر آگئیں، اُن سے کہیں زیادہ ہمیشہ کے لیے زمین کے سینے میں محفوظ ہو گئیں۔ اس عرصے میں محبت و خلوص کے متوالے بھی اپنی داستانیں رقم کرتے رہے۔ انہی واقعات کے تانے بانے سے بُنی گئی یہ کہانی ایثار و بربریت کا خوب صورت امتزاج ہے۔ وسیع النظری اور روشن خیالی کے نام پر تنگ نظری اور جہالت میں مبتلا مغرب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو صحیح اور غلط کی تمیز رکھتے ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی چند افراد میں سے ایک تھا۔ فاتحِ عالم جذبۂ محبت کی کرشمہ سازی اس پر عیاں ہو چکی تھی اور احسان کے درست مفہوم سے بھی کسی نے اُسے آگاہ کر دیا تھا۔ محبت و ایثار کے ان گنت واقعات کا وہ شاہد بھی تھا اور امین بھی۔ عیسائی ہونے کے باوجود وہ اس سچائی پر ایمان لاچکا تھا کہ انسانیت اور رواداری میں کوئی مذہب دینِ اسلام پر سبقت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ رواداری کے نام پر جب رواداری کا ہی خون کر دیا گیا تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

بیس فوجیوں کے قاتل افسر کا احوال۔ اُسے اپنی بے گناہی پر اصرار تھا

وہ یوگوسلاویہ کی ایک فوجی عدالت تھی، جہاں ایک غیر معمولی مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔ کورٹ مارشل گورین نام کے ایک کیپٹن کا ہو رہا تھا۔ تین جج اس مقدمے کی سماعت کر رہے تھے۔ عدالت کا سربراہ ایک بریگیڈیئر تھا جبکہ دیگر دونوں ارکان کرنل تھے۔

مقدمے کے واحد عینی گواہ لیفٹیننٹ میسٹلوف نے اپنا بیان مکمل کیا اور نفرت آمیز نگاہوں سے کیپٹن گورین کو تکنے لگا۔

بریگیڈیئر نے اپنے ساتھی کرنلوں کو غور سے دیکھا۔ ان دونوں نے اپنے سروں کو تفہیمی جنبش دی۔ بریگیڈیئر ملزم کیپٹن گورین کی طرف متوجہ ہوا ”تم نے اپنے ماتحت کا بیان سنا“ اس نے کیپٹن کو مخاطب کیا ”اس نے کہیں جھوٹ تو نہیں بولا؟ اس کے بیان سے یا بیان کے کسی حصے سے تمہیں اختلاف تو نہیں ہے؟“

”نہیں جناب۔ بس نقطۂ نظر کا فرق ہے“ کیپٹن گورین نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

”تو تمہیں اعتراف ہے کہ تم نے اچانک اور بلاوجہ اندھادھند فائرنگ کر کے اپنے انیس ماتحتوں کو بھون ڈالا؟“ ایک کرنل نے پوچھا۔

”میرا فعل اچانک تو تھا جناب۔ مگر بے وجہ نہیں تھا۔“

”اوہ..... تو اپنے ماتحت فوجیوں کو بھون ڈالنے کی کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے؟“ دوسرے کرنل نے بھویں اچکاتے ہوئے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

”جی ہاں جناب، وجہ تھی۔“

”میرا خیال تھا کہ تم کوئی عذر پیش کرو گے“ بریگیڈیئر نے کہا۔ ”مثلاً یہ کہ تمہاری یادداشت غائب ہو گئی تھی یا دماغ چل گیا تھا تمہارا“ بریگیڈیئر کا لہجہ سرد تھا۔

”یا یہ کہ تم غصے میں اندھے ہو گئے تھے“ ایک کرنل نے ٹکڑا لگایا۔

کیپٹن گورین نے گہری سانس لی ”یہ درست ہے کہ میں غصے سے پاگل ہو گیا تھا“ اس نے کہا ”لیکن سچ یہ ہے کہ فائرنگ کرتے وقت میں پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔“

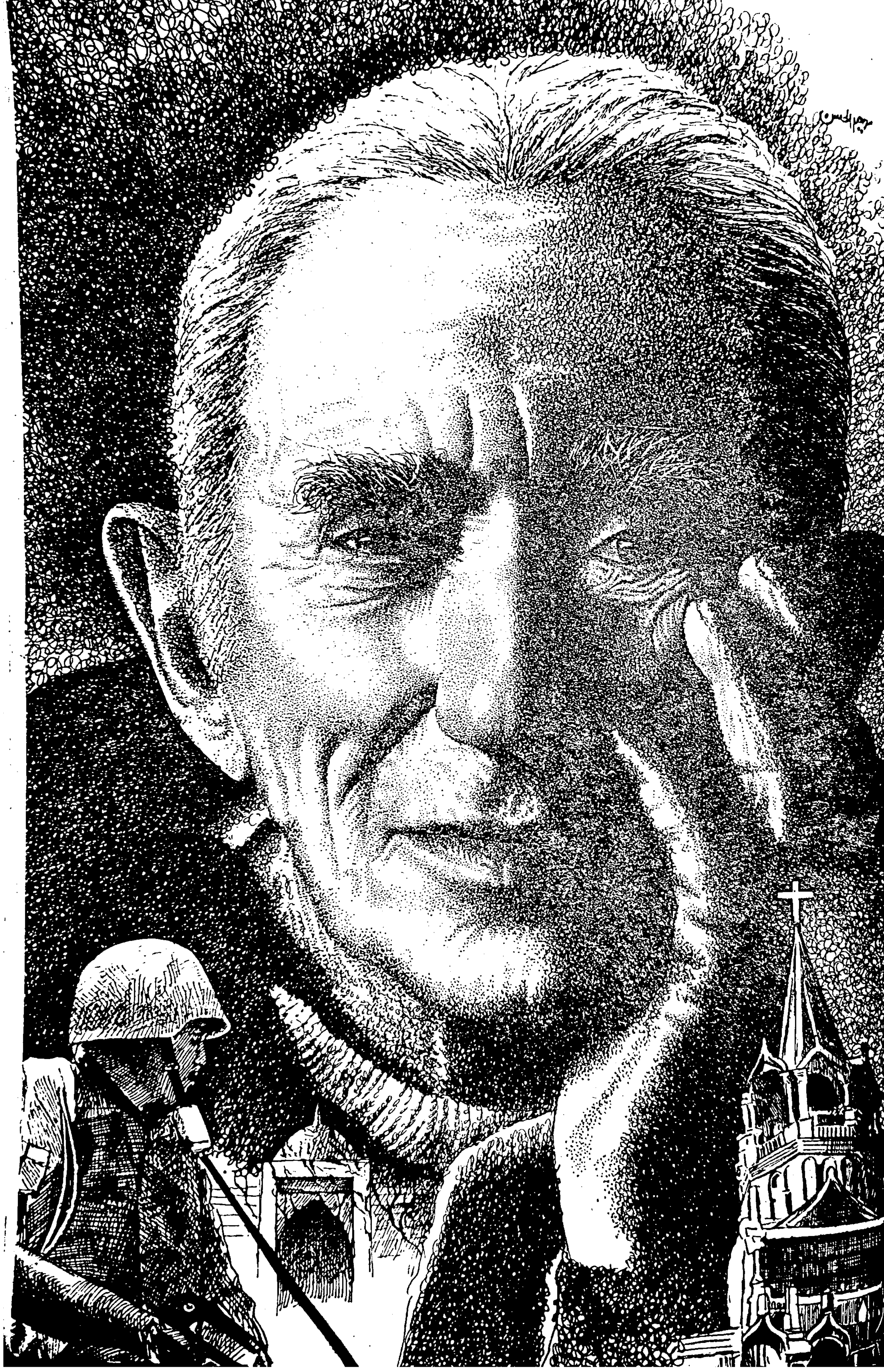
تینوں ججوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ”یعنی تم جانتے تھے کہ تم کیا کر رہے ہو؟“ بریگیڈیئر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”جی ہاں جناب۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔“

”تو پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”میں نے کہا نا جناب کہ اس کی وجہ تھی۔“

”اعترافِ جرم تو تم کر چکے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اب باقاعدہ بیان بھی دے ڈالو۔ ہم وہ وجہ بہرحال جاننا چاہیں گے جس کے تحت تم نے بغیر کسی وارننگ کے اپنے ماتحت کامریڈز پر بے دردی سے فائرنگ کی۔ مگر سنو..... ایک بات بتاؤ، تمہیں کوئی پچھتاوا ہے اپنے




NOVELS LOVERS
I BOOKS
0342:8678391
RJ

اس فعل پر؟"

"جی نہیں جناب۔ اس صورتِ حال میں دوسری بار بھی میں ایسا ہی کروں گا۔"

"دوسرے لفظوں میں تم خود اپنے لیے موت کی سزا تجویز کررہے ہو؟"

"جی نہیں جناب۔ مجھے یقین ہے کہ انصاف ہوا تو میں باعزت بری کردیا جاؤں گا" کیپٹن گورین نے بے حد اعتماد سے کہا۔

تینوں ججوں کے چہرے کا رنگ بدل گیا "یہ تو ہم دیکھیں گے" بریگیڈیئر نے کہا "تم تفصیل سے سب کچھ بتا ڈالو۔ ہمیں محرک جاننے میں دلچسپی ہے۔"

"بہتر جناب!" کیپٹن گورین نے کہا۔ چند لمحے وہ خلاؤں میں گھورتا رہا پھر بولا "وہ ۱۸ مارچ کی شام تھی..."

○☆○

وہ ۱۸ مارچ کی شام تھی!

کیپٹن گورین کو اپنا گھر اور گھر کے لوگ بہت شدت سے یاد آرہے تھے۔ ان کے دستے کو اس جنگل میں پڑاؤ ڈالے ایک ہفتہ ہوچکا تھا۔ اس کا آبائی گاؤں سوڈینہ اس جنگل سے صرف تیس میل کی مسافت پر تھا۔ گاؤں بلندی پر تھا۔ پہاڑی راستے دشوار گزار تھے پھر بھی جیپ پر وہ بمشکل ایک گھنٹے کا سفر تھا لیکن دشواری یہ تھی کہ اتنا قریب ہوکر بھی وہ وہاں جا نہیں سکتا تھا۔

اچانک دستے کے انچارج میجر ایلڈرچ نے اسے بلوالیا۔ وہ میجر کے خیمے میں چلا گیا۔

"تم سوڈینہ کے رہنے والے ہو نا؟" میجر نے پوچھا۔

"یس سر!" کیپٹن نے جواب دیا۔

"مجھے اپنے گاؤں کے بارے میں بتاؤ۔"

اس کے لیے کیپٹن کو سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی "سوڈینہ رقبے کے اعتبار سے بڑا گاؤں ہے۔ میرا مطلب ہے' لوگوں کے پاس وہاں زرعی زمین بہت ہے۔ گھر سو سے کچھ زیادہ ہوں گے۔"

"مجھے اپنے گاؤں کے مسلمانوں کے بارے میں بتاؤ۔"

کیپٹن گورین کی آنکھوں میں حارث انکل کا شفیق چہرہ پھر گیا۔ وہ اسے گھر کے لوگوں کی طرح یاد آتے تھے۔ "مسلمانوں کے وہاں مشکل سے بیس گھر ہوں گے" اس کی نگاہیں جیسے گاؤں پہنچ گئیں۔ وہ جو بتا رہا تھا' دیکھ بھی رہا تھا "گاؤں میں داخل ہوتے ہی ایک راستہ پیچھے کی ڈھلان کی طرف نکلتا ہے' اس پر دو میل چلیں تو مسلمانوں کی زمینیں اور گھر شروع ہوتے ہیں۔ تمام گھر ساتھ ساتھ ہیں اور گاؤں میں داخل ہوکر سیدھے چلے جائیں تو ہمارے گھر آتے چلے جاتے ہیں۔ آخر میں چرچ ہے ہمارا۔"

"بیس گھر" میجر نے پُرخیال لہجے میں دہرایا "تعداد کتنی ہوگی مسلمانوں کی؟"

"ساٹھ ستر سے زیادہ نہیں ہیں" کیپٹن گورین نے جواب دیا پھر پوچھا "لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اطلاع ملی ہے کہ سوڈینہ کے مسلمان آج رات خاموشی سے گاؤں چھوڑ کر بوسنیا روانہ ہورہے ہیں۔"

کیپٹن گورین حیران رہ گیا "لیکن کیوں؟ ہمارے گاؤں میں کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ مذہبی منافرت بھی نہیں رہی۔"

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا" میجر کا لہجہ تلخ ہوگیا "جب سے بوسنیا قائم ہوا ہے' ان لوگوں کے دماغ خراب ہوگئے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے وہاں جانے سے بوسنیا کی مملکت مضبوط ہوجائے گی۔ یورپ کے قلب میں اسلامی مملکت ان کے خیال میں بہت بڑی کامیابی ہے۔"

"جبکہ ہم بوسنیا کو ختم کردینا چاہتے ہیں" کیپٹن گورین نے سادگی سے کہا "سربیا اور کروشیا میں بانٹ دینا چاہتے ہیں۔"

میجر نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا لیکن کیپٹن کے چہرے پر کوئی معترضانہ تاثر نہ دیکھ کر مطمئن ہوگیا "ہاں... ہم وسیع النظر لوگ ہیں۔ مسلمانوں کو مذہبی آزادی دیتے ہیں پھر کسی آزاد اسلامی مملکت کی کیا ضرورت ہے" میجر کہتے کہتے رکا "بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"سوڈینہ کے مسلمان..."

"ہاں۔ ہمیں ان کو روکنا ہے" میجر کو یاد آگیا۔

"کیا ضرورت ہے اس کی۔ جارہے ہیں تو جانے دیں۔"

"نہیں بھئی۔ ہمیں دنیا پر یہی تو ثابت کرنا ہے کہ بوسنیا کا وجود غیر ضروری ہے۔ یورپ کے مسلمان کسی بھی ریاست میں آزادی کے ساتھ رہ سکتے ہیں اور رہ رہے ہیں۔ پھر ہم کیوں بنیاد پرستی کے فروغ کا خطرہ مول لیں۔ یورپ کو تاریکی سے بچانا ہے۔ خیر... میں کیپٹن پولارچ کو بیس جوانوں کے ساتھ سوڈینہ بھیج رہا ہوں۔ مسلمانوں کو ہر قیمت پر نقل مکانی سے روکنا ہے۔ اچھا... اب تم جاؤ۔"

کیپٹن عادتاً تعمیل کے لیے اٹھا مگر جاتے جاتے پلٹا۔ "سر... آپ مجھے بھیج دیں نا۔ وہ میرا گاؤں ہے۔ میں ان کو بچپن سے جانتا ہوں اور قائل کرسکتا ہوں۔"

میجر مسکرایا "ہوں... یوں کہو' گھر والوں سے ملنا چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے' تم بھی چلے جاؤ لیکن کمان کیپٹن پولارچ ہی کے پاس رہے گی۔"

"تھینک یو سر!" گورین نے کہا اور خیمے سے نکل آیا۔ وہ بہت خوش تھا۔

○☆○

گورین کو گھر گئے اور گھر والوں سے ملے ایک سال سے زیادہ ہوچکا تھا۔ اس سفر کے دوران میں وہ بہت خوش تھا۔ وہ گھر جائے گا۔ چند گھنٹے ہی سہی' پاپا اور بیوی بچوں کے ساتھ گزارے گا اور مشن ایسا ہے کہ اس کی حارث انکل سے بھی ضرور ملاقات ہوگی۔

...نہ ہونے سے کچھ ہونا بہرحال بہتر ہے۔"

وہ گاؤں کے قریب پہنچے تو جھٹ پٹے کا سماں تھا۔ پرندے ...ے ٹھکانوں کی طرف کوچ کررہے تھے۔ گورین کیپٹن پولارج کے ...ہ سب سے آگے والی جیپ میں بیٹھا تھا۔

"اس چڑھائی کے بعد گاؤں شروع ہوجائے گا" گورین نے ...ارج کو بتایا۔

"تم چاہو تو پہلے اپنے گھر چلے جاؤ" پولارج نے پیشکش کی۔

"نہیں۔ ڈیوٹی فرسٹ۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ چڑھائی سے ذرا پیچھے تھے کہ گورین کو ایک جانا پہچانا چہرہ نظر ...۔ وہ ہنرک تھا جو لپکتے قدموں سے ایک طرف جارہا تھا "سر... ...منٹ کے لیے گاڑی روک سکتے ہیں" گورین نے بڑی لجاجت ...پولارج سے کہا "گھر کا حال تو یہیں معلوم ہوجائے گا۔"

"کیوں نہیں، کارپورل گاڑی روکو۔"

جیپ رکی اور پیچھے آنے والا ٹرک بھی رک گیا۔ ہنرک اپنی ...ن میں چلا جارہا تھا۔ گاڑیاں رکیں تو اس نے چونک کر دیکھا۔ ...ے جیپ سے گورین اترتا دکھائی دیا۔ وہ جیپ کی طرف لپکا "ارے ...ورین..... تمہیں کیسے معلوم ہوگیا؟"

گورین کا دل زور سے دھڑکا "کیا معلوم ہوگیا؟"

ہنرک نے ایک نظر ٹرک میں سوار فوجیوں کو دیکھا اور سہلاتے ...وئے بولا "اوہ..... تم تو کسی کام پر آئے ہو شاید۔ تو تمہیں کچھ ...علوم نہیں؟"

"کیا معلوم نہیں؟ ہوا کیا ہے؟" گورین نے ہنرک کو جھنجوڑ ...الا۔

ہنرک چند لمحے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا پھر تاسف ...ے بولا "تمہارے پاپا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔"

گورین کے چہرے کا رنگ یوں اڑا جیسے جسم کا سارا خون اڑ گیا ہو "کیا ہوا؟ پاپا خیریت سے تو ہیں؟"

"ہاں۔ لیکن ان کی حالت اچھی نہیں۔"

کیپٹن پولارج یہ سب سن رہا تھا۔ وہ جیپ سے اترا اور گورین کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "گورین، تم فوراً گھر جاؤ۔ یہ جیپ لے جاؤ۔ تمہارے پاپا ٹھیک ہوں تو آجانا ورنہ کوئی بات نہیں" اس نے ڈرائیور کو اشارہ کیا، وہ جیپ سے اتر آیا۔

"تھینک یو سر!" گورین نے پولارج کو سیلوٹ کیا پھر وہ اسے راستہ سمجھاتا رہا "تمہیں وہاں پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔"

فوجی دستہ گاؤں کی مسلمان آبادی کی طرف چل دیا اور گورین نے جیپ گھر کی طرف دوڑادی۔ وہ لمحوں میں گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

○☆○

گورین کو گھر پہنچے ایک گھنٹا ہوچکا تھا۔ پاپا غنودگی کے عالم میں تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں غنودگی لانے والی کوئی دوا دے رکھی تھی۔

گورین بیوی اور بچوں سے ملا ضرور لیکن وہ باپ کی پٹی سے لگ کر بیٹھا رہا۔ وہ انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ پاپا بہت کمزور ہوگئے تھے۔ ویسے ہرگز نہیں رہے تھے جیسا وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ ان کا چہرہ پیلا ہورہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور ہونٹوں پر نیلاہٹ۔

"آپ اندر چلیں۔ پاپا اٹھ جائیں تو ان سے مل لیجئے گا" اس کی بیوی نے کہا۔

"نہیں، اتنی دیر میں، میں ڈاکٹر سے مل آتا ہوں" گورین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے گورین کو بتایا کہ یہ دل کا دوسرا دورہ تھا.... اور کافی شدید تھا۔ گورین کو اندازہ ہوگیا کہ ڈاکٹر اسے امید دلانے کی کوشش کررہا ہے لیکن خود پُرامید نہیں ہے۔ "ایسی کوئی خطرے کی بات نہیں" ڈاکٹر کہہ رہا تھا "بس ان کا خوش ہونا بہت ضروری ہے۔ انہیں پریشانیوں سے بچانا ضروری ہے۔ اب وہ کوئی صدمہ جھیل ہی نہیں سکتے۔"

"مگر کوئی پریشانی تو ہے بھی نہیں" گورین نے کہا۔

"تم پاس ہوتے تو اچھا ہوتا، وہ بہت تیزی سے سنبھل پاتے۔"

گورین خاموش رہا۔ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"ویسے بھی آدمی کی عمر ستّر سے تجاوز کرجائے تو بڑھاپے کی بیماری لاحق ہوجاتی ہے..... میری طرح" ڈاکٹر نے شگفتگی سے سنگینی کا علاج کرنے کی کوشش کی "تم اتنے پریشان مت لگو۔ یہ تمہارے پاپا کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ مسکراؤ..... پریشانی کی تو کوئی بات بھی نہیں۔"

گورین مسکرادیا۔ ڈاکٹر اس کام کا بہت ماہر تھا۔

"کچھ دن رکوگے؟"

"شاید نہیں۔ زیادہ سے زیادہ صبح تک۔"

گورین ڈاکٹر کے پاس سے اٹھ کر گھر واپس آیا تو پاپا جاگ چکے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ گورین نے دانستہ ان کی طبیعت کا تذکرہ نہیں چھیڑا۔ پاپا ہی گاؤں اور گاؤں والوں کے متعلق اس کی معلومات اپ ٹو ڈیٹ کرتے رہے۔ اب ان کے چہرے پر بحالی تھی۔

"حارث انکل کیسے ہیں؟" گورین نے پوچھا۔

"رشک آتا ہے اسے دیکھ کر" پاپا نے گہری سانس لی "مجھ سے تین سال بڑا ہے اور اب بھی اپنے فارم پر سب کچھ خود ہی کرتا ہے۔ ایک میں ہوں کہ بستر پر پڑا ہوں۔" آخری بات کہتے ہوئے پاپا کے لہجے میں اداسی آگئی۔

گورین کو ڈاکٹر کی بات یاد تھی' اس نے بہت تیزی سے موضوع بدلا۔ پاپا کو بھی پتا نہیں چلا۔ باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔

اطلاعی گھنٹی بجی۔ گورین کے بڑے بیٹے نے دروازہ کھولا اور پکار کر کہا "پاپا..... ہنرک انکل آئے ہیں۔"

گورین ہچکچا رہا تھا مگر پاپا نے کہا "بلالو اسے۔ اس نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔"

"بیٹے... انکل کو یہاں لے آؤ" گورین نے بیٹے کو پکارا۔

مگر ایک ثانیے کے بعد ہنرک اندر آیا تو اسے دیکھ کر گورین دھک سے رہ گیا۔ ہنرک کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں "کیا ہوا ہنرک؟ خیریت تو ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارے ساتھیوں نے مسلمانوں پر فائرنگ کردی ہے۔" ہنرک کی آواز لرز رہی تھی۔

گورین کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا "یہ کیسے ممکن ہے؟" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"انہوں نے گاؤں کے سب مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کرلیا تھا" ہنرک بولا "اور فائرنگ بہت زیادہ ہوئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں' کوئی بھی نہیں بچا ہوگا۔"

گورین پاپا کو بھول ہی گیا تھا۔ ان کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی تو اس نے سر گھما کر انہیں دیکھا..... اور وہاں جو نظر آیا' اسے دیکھ کر اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ پاپا کو سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ ان کا ہاتھ اپنی بائیں چھاتی پر تھا اور چہرے پر اذیت کے آثار نمایاں تھے۔ "پاپا..... تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"حا..... رث..... حا..... رث..." پاپا بمشکل بولے۔ ان کے لہجے میں سوال تھا۔

گورین گھبرا گیا "ڈاکٹر کو بلانا ہوگا۔ پاپا کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔"

مگر پاپا زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگے۔ پھر انہوں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ گورین نے ان کے ہونٹوں سے کان ملا دیے۔ پاپا ٹوٹتی آواز میں کہہ رہے تھے "میری فکر مت کرو۔ حارث کی طرف جاؤ۔ اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے' تم جانتے ہو نا..."

"لیکن پاپا' آپ کی طبیعت..."

"میں جو کہتا ہوں' وہ کرو" پاپا کا لہجہ سخت تھا۔ اچانک وہ چلائے "جاؤ گورین' حارث کو بچاؤ۔"

چند لمحے بڑی کشمکش کے تھے۔ پھر گورین نے پاپا کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "فکر نہ کریں پاپا۔ میں جاتا ہوں۔ حارث انکل کو کچھ نہیں ہوگا" پاپا پر اس کا اچھا ردِعمل دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ وہ ہنرک کی طرف مڑا "چلو ہنرک' میرے ساتھ۔ تم ڈاکٹر کو لے کر آجانا۔"

وہ دونوں نکل رہے تھے کہ پاپا کی نحیف آواز ابھری۔ "حا..... رث....." ان کے لہجے میں التجا تھی۔

"آپ فکر نہ کریں پاپا!" اس نے انہیں دلاسا دیا۔

وہ گھر سے نکلے ہی تھے کہ ڈاکٹر انہیں آتا دکھائی دیا۔ وہ رک گئے۔ ڈاکٹر تیز قدموں سے چلتا ان کے قریب آگیا "ہم آپ ہی کی طرف جا رہے تھے۔" گورین نے کہا "مسلمانوں پر فائرنگ کا سن کر پاپا کی طبیعت ایک دم بگڑ گئی ہے۔"

"میں جانتا تھا کہ یہ فادر کے لیے اچھا نہیں ہے۔ خبر سنتے ہی میں یہاں کے لیے چل دیا" ڈاکٹر نے وضاحت کی اور گھر میں چلا گیا۔

"تم پاپا کا خیال رکھنا۔ میں اس ... طرف جا رہا ہوں" گورین نے ہنرک سے کہا۔

"لیکن گورین' تمہاری موجودگی ضروری ہے۔"

"نہیں' مجھے یہاں دیکھ کر پاپا کی طبیعت اور بگڑ جائے گی۔ مجھے جانا ہے۔ پھر مجھے حارث انکل کی بھی فکر ہے۔"

"ٹھیک ہے گورین' جاؤ۔"

گورین نے جیپ میں بیٹھ کر سیٹ پر رکھی مشین گن کو تھپتھپایا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

اب اندھیرا ہو چکا تھا لیکن راستے جانے پہچانے تھے۔ گورین پوری رفتار سے گاڑی چلاتا رہا لیکن اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ گاؤں کی حدود کے آغاز سے اس نے گاڑی مسلمانوں کے سیکشن کی طرف جانے والی ڈھلان پر موڑ دی۔ مگر جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا' اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ پہلا گھر آچکا تھا مگر وہاں ہر طرف غیر فطری سناٹے کا راج تھا۔ کہیں کوئی آواز نہ تھی۔ حالانکہ ابھی اتنی رات بھی نہیں ہوئی تھی۔

اسے اندازہ ہوگیا کہ کوئی بہت خوفناک بات ہو چکی ہے۔

ابھی تک اسے کوئی فوجی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ گاؤں میں سب سے آخری گھر حارث انکل کا تھا..... اور اب وہ اس کے قریب پہنچ رہا تھا۔

مگر حارث انکل کا گھر بھی اندھیرے اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اسی لمحے گاڑی اوپر چڑھی تو اسے سامنے والی پہاڑی پر روشنی نظر آئی۔ لوگ چل پھر رہے تھے ..... اور وہ فوجی تھے۔

اس نے گاڑی کی رفتار اور بڑھا دی۔ پہاڑی پر پہنچ کر اس نے گاڑی روکی' مشین گن اٹھائی اور نیچے اترا۔ گاڑی کی آواز سن کر اس کے ساتھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ کیپٹن پولارج اس کی طرف بڑھا "تم آگئے کیپٹن' تمہارے پاپا ٹھیک تو ہیں؟" اس نے پوچھا۔

گورین نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کے قدم بھی نہیں رکے "یہاں کیا ہوا ہے؟" اسے خود بھی اپنی آواز عجیب سی لگی۔

"ہاں..... یہاں ایک ناخوش گوار واقعہ ہوا ہے" پولارج نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"یہ بتاؤ' کیا ہوا ہے؟" گورین کا لہجہ سخت تھا۔

کیپٹن پولارج کا منہ بن گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ انچارج وہ ہے

اور گورین اس سے اس طرح جواب طلب نہیں کر سکتا لیکن اس نے دیکھ لیا تھا کہ گورین اس وقت شاک میں ہے اور یہ سب سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہے "میں نے سب لوگوں کو اکٹھا کیا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اڑے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ نقل مکانی خلافِ قانون نہیں ہے اور ہم انہیں روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ اس پر بحث ہوئی۔ میرے جوان مشتعل ہو گئے اور....." کیپٹن نے بات ادھوری چھوڑ دی "ان کو ضرور سزا ملے گی۔ کورٹ مارشل ہو گا ان کا۔"

خون گورین کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ دماغ پر جیسے کسی نے سرخ چادر ڈال دی تھی۔ وہ اس طرف بڑھا' جہاں فوجی جوان گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ وہ وہاں پہنچا تو انہوں نے اسے راستہ دیا۔

وہ تازہ کھودا گیا بہت گہرا گڑھا تھا۔ کدال اور بیلچے بھی وہیں رکھے تھے۔ باہر نکلی ہوئی مٹی سے اندازہ ہوتا تھا کہ گڑھا جتنا گہرا لگتا ہے' اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ گڑھے میں دیکھتے ہی اسے چکر آ گئے۔ وہ خون آلود لاشوں سے اٹا پڑا تھا۔

چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔ پھر اس نے بمشکل پوچھا "کیا سب کو ختم کر دیا تم نے؟"

"نہیں سر۔ جوان عورتوں کو نسل خراب کرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے" ایک فوجی نے چہکتے ہوئے کہا۔

"آپ ذرا دیر سے آئے سر۔ ورنہ بوائی میں آپ بھی شریک ہو جاتے۔"

گورین کے وجود میں غصے کا جوالا مکھی دہکنے لگا۔ وہ پھٹ پڑنا چاہتا تھا۔ مگر حارث انکل کا خیال اسے روک رہا تھا "لاشیں ہٹا کر دکھاؤ۔ مجھے کسی کی تلاش ہے۔"

دو سپاہی لاشیں اِدھر اُدھر کرنے لگے۔ زیادہ دیر نہیں لگی۔ انکل حارث کا چہرہ دیکھتے ہی وہ دیوانگی جسے اس نے جسم و جاں کی پوری طاقت سے روک رکھا تھا' قابو سے باہر ہو گئی۔ اسے نظر کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس نے مشین گن تانی اور اندھا دھند چاروں طرف فائرنگ شروع کر دی۔

مشین گن خاموش ہو گئی۔ مگر اس کی انگلی ٹریگر دباتی رہی۔ وہ ہوش میں آیا تو ہنرک اسے جھنجوڑ رہا تھا "یہ سب کیا ہے گورین!"

اس نے چونک کر ہنرک کو دیکھا پھر گردوپیش کا جائزہ لیا اور پُرسکون لہجے میں بولا "دیکھ نہیں رہے' یہ قبرستان ہے۔"

ہنرک رونے لگا۔ اچانک گورین کو سب کچھ یاد آنے لگا... دھیرے دھیرے.... تھوڑا تھوڑا... "پاپا...؟" اس کا سوال بے حد بلیغ تھا۔

ہنرک نے نفی میں سرہلایا "تمہارے پاپا نہیں رہے گورین۔"
گورین رو بھی نہیں سکا۔ اس کے جسم میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی۔ وہ صرف بے ہوش ہو سکتا تھا۔

○☆○

کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ خاصی دیر خاموشی رہی پھر کورٹ مارشل کرنے والے بریگیڈیئر نے پوچھا "تم فرار کیوں نہیں ہو گئے؟"
"فرار تو مجرم ہوتے ہیں سر!" گورین نے کہا۔
"تو تمہارا خیال ہے کہ تم مجرم نہیں ہو" کرنل بولا۔
"خیال کی بات نہیں سر۔ میں مجرم ہوں ہی نہیں۔"
"لیکن جرم تو ثابت ہو گیا۔ اس کے لیے تمہارا بیان ہی کافی ہے" دوسرے کرنل نے کہا۔
"مجرم وہ سب تھے، جنہیں میں نے مارا۔"
"ان کا کورٹ مارشل ہونا چاہیے تھا۔ تمہیں ان کو سزا دینے کا حق نہیں تھا" بریگیڈیئر نے کہا۔
"میں کہتا ہوں سر کہ آپ میری جگہ ہوتے تو آپ بھی وہی کرتے جو میں نے کیا" گورین کے لہجے میں استحکام تھا۔
"ہرگز نہیں، یہ میں کبھی نہ کرتا" بریگیڈیئر نے سخت لہجے میں کہا۔
"یہ آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ میں نہیں ہیں۔ جو میں نے دیکھا ہے، میں جانتا ہوں، وہ آپ نہیں جانتے۔"
"اور جان بھی نہیں سکتا۔"
گورین نے ایک کتاب اس کی طرف بڑھائی "یہ پڑھنے کے بعد آپ انصاف کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے اس پر۔"
"یہ... یہ کیا ہے؟"
"یہ بلا جواز، بلا اشتعال قتل کیے جانے والے حارث انکل کی آپ بیتی ہے۔ اسے پڑھ کر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے اتنا غصہ کیوں آیا؟"
"ضروری تو نہیں کہ میں اسے پڑھوں۔"
"یہ ایک دستاویزی شہادت ہے۔ آپ کو اسے پڑھنا چاہیے" گورین نے اصرار کیا "اس سے پتا چلے گا کہ حارث انکل کتنے بڑے انسان تھے اور انہیں قتل کرنے والے کتنے مکروہ جانور۔"
بریگیڈیئر چند لمحے ہچکچایا۔ اس نے اپنے دونوں ساتھی کرنلوں سے مشورہ کیا اور پھر بولا "سماعت مکمل ہو چکی ہے۔ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر ہم اس کتاب کا مطالعہ کریں گے اگرچہ یہ ضروری نہیں تھا لیکن انصاف کے نام پر ہم ملزم کی یہ فرمائش پوری کر رہے ہیں۔ اگلے ہفتے آج ہی کے دن فیصلہ سنایا جائے گا۔"
اور عدالت برخاست ہو گئی۔

○☆○

اپنے گھر کی اسٹڈی میں بریگیڈیئر کارتیلوف نے پڑھنے کی غرض سے وہ کتاب اٹھائی جو اسے ملزم کیپٹن گورین نے دی تھی۔ عدالت برخاست ہوتے ہی بریگیڈیئر نے اپنے ایک ماتحت کو اس کتاب کی دو اور جلدیں فراہم کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ دو جلدیں آئیں تو اس نے مقدمے کی سماعت کرنے والے کرنلوں کو ایک ایک جلد تھما دی۔ طے یہ پایا کہ وہ یہ کتاب پڑھیں گے اور اس کے بعد مقدمے کا فیصلہ لکھیں گے۔ ان دونوں کاموں کے لیے ان کے پاس ایک ہفتہ تھا۔
بریگیڈیئر نے کتاب کا ٹائٹل دیکھا۔ خوب صورت گرد پوش ٹائٹل تھا۔ اوپری حصے پر ایک طرف ایک چرچ اور دوسری طرف ایک مسجد کی تصویر پینٹ کی گئی تھی۔ نیچے برف سے ڈھکا ہوا ایک لینڈ اسکیپ تھا۔ اس میں سانتا کلاز تحفوں کا بھرا ہوا تھیلا اٹھائے ایک طرف جا رہا تھا۔ چرچ اور مسجد کے درمیان کتاب کا نام لکھا تھا... محبت فاتح عالم!
ٹائٹل نے بریگیڈیئر کو بہت متاثر کیا۔ اسے لگا کہ وہ ایک اچھی کتاب کا مطالعہ کرنے والا ہے۔ ویسے اس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسے تو فرض سمجھ کر پڑھنا تھا اس کتاب کو۔ لیکن فرض اچھا بھی لگے تو بہت خوش دلی سے ادا کیا جاتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔
اس کی نظر سرورق کے نچلے حصے پر چھپے مصنف کے نام پر پڑی۔ حارث امروک۔ نام بہت چھوٹے حروف میں چھپا تھا اور پہلے اسے نظر ہی نہیں آیا تھا۔
اس نے کتاب کا ورق کھولا۔ پرنٹنگ ڈاٹا پر نظر ڈالی۔ کتاب بیس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ یہ اس کا دوسرا ایڈیشن تھا۔ وہ خود نوشت تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ کتاب کسی بھی قسم کے تعارف سے ..... حتیٰ کہ دیباچے سے بھی محروم تھی۔
کرنل نے پہلا صفحہ کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

○☆○

یہ سب میں اس وقت لکھ رہا ہوں، جب اپنی عمر کے ۵۴ ویں سال میں ہوں۔ یہ وہی کہانی ہے، جو شاید مجھے بہت پہلے سنا دینی چاہیے تھی لیکن ایک نامعلوم حس نے میرے قلم کو روکے رکھا۔ سو میں انتظار کرتا رہا۔ برسوں بیت گئے۔ اب اس موسم خزاں میں جبکہ کرسمس کی آمد آمد ہے، میں نے سوچا کہ اب میری عمر ایسی ہے کہ میں سب کچھ بڑی سچائی کے ساتھ لکھ سکتا ہوں اور اتنا بوڑھا بھی نہیں ہوا کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، اسے سمجھ بھی نہ سکوں۔ یعنی یہ سب کچھ لکھنے کا یہ مناسب وقت ہے۔
میں اس وقت تیرہ برس کا تھا، جب میرے والدین نے مجھے خود سے دور کر دیا بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ انہیں مجھ کو خود سے دور کرنا پڑا۔ انہوں نے مجھے سوڈینہ بھیج دیا جہاں میرے نانا رہتے تھے۔

وہاں ان کی آبائی زمینیں تھیں۔ یہ ۱۹۳۰ء کی دہائی کی بات ہے' جب امریکا اور پورا یورپ کساد بازاری کے بدترین وقت سے گزر رہا تھا۔ ہمارے گھر کے حالات بہت خراب تھے۔ ڈیڈی مہینوں پہلے ملازمت سے محروم ہوچکے تھے اور اب دوسری ملازمت سے بھی محروم ہوچکے تھے لہٰذا اب تیسری ملازمت کی تلاش میں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے۔ گھر میں زیادہ تر فاقے ہوتے تھے۔ ڈیڈی اور مما کو اپنی فکر نہیں ہوتی تھی لیکن مجھے کبھی بھوکا سونا پڑتا تو انہیں بہت رنج ہوتا تھا۔

میں بہت خوش قسمت تھا کہ ننھیالی فارم موجود تھا' جہاں میں جاسکتا تھا۔ سب لوگ یہی کہتے تھے کہ زمین دار لوگ دوسروں کے مقابلے میں خوش قسمت ہیں۔ حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوجائیں' وہ بھوک کی آزمائش سے بہرحال بچے رہتے ہیں۔

میرے نانا کا نام منصر تھا اور نانی کا نام ایلیا۔ جس فارم میں مجھے بھیجا گیا' وہ نانا کے دادا علی کا بسایا ہوا تھا' جو فوج میں میجر رہے تھے۔ فوج میں شجاعت کے مظاہرے پر انہیں جھاڑ جھنکاڑ سے ڈھکی ہوئی وہ غیر آباد زمین انعام میں دی گئی تھی۔ انہوں نے اس زمین پر بڑی محنت کی۔ اس کی صفائی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زمین بھی ان پر بے حد مہربان ہوگئی۔ ان کے بعد وہ زمین ان کے بیٹے ابراہیم کو ملی اور ان کے بعد منصر یعنی میرے نانا کو۔ یہ سب بے حد محنتی اور جفاکش لوگ تھے.... زمین سے محبت کرنے والے' بہت اچھے کسان!

ان کی زمین پچاس ایکڑ کے قریب تھی۔ بیس ایکڑ زمین کاشت کی جاتی تھی۔ ایک چھوٹا سا جنگل تھا' جہاں لومڑیوں اور گلہریوں کی بہتات تھی۔ ایک چھوٹی سی مگر نہایت سرسبز چراگاہ تھی' جہاں بھیڑیں چرتی تھیں۔ ایک چھوٹی سی مگر گہری جھیل تھی' جس کا پانی بے حد نیلا دکھائی دیتا تھا۔ ایک خاصا بڑا گودام تھا' جہاں غلہ اور بھوسا رکھا جاتا تھا۔ پھر ایک شیڈ بھیڑوں کے لیے اور ایک گایوں کے لیے تھا اور ایک بڑا اصطبل بھی تھا۔ یہ تھی میرے نانا کی چھوٹی سی دنیا۔

رہنے کے لیے لکڑی کا ایک کاٹیج تھا' جس پر برسوں پہلے سفید رنگ کیا گیا ہوگا۔ اس میں باتھ روم ایک ہی تھا مگر مجھے رہنے کے لیے الگ کمرا میسر آیا۔

میں اوورآل پہنتا اور سات میل پیدل چل کر اسکول جاتا' جو چرچ کے برابر واقع تھا۔ اس اسکول میں ساتویں جماعت میں دو ہی طالب علم تھے.... میں اور ایک اور لڑکا۔ اس کا نام ایلک گورین تھا اور وہ چرچ کے پادری کا بیٹا تھا۔ اسکول کے بعد میں نانا کا ہاتھ بٹاتا۔ تھوڑے ہی عرصے میں میں نے اچھے خاصے کام سیکھ لیے۔ میں گاڑی جوت لیتا اور کھول لیتا۔ کھیتوں' فصلوں کی بھی سمجھ آنے لگی۔ بس دودھ دوہنا مجھے نہیں آیا۔ کوشش میں نے اس کی بھی کی لیکن بھیڑیں میرے قابو میں نہیں آتی تھیں۔ تیرہ سال کی میری عمر تھی۔ میں دبلا پتلا شہری لڑکا تھا۔ گاؤں کے جانور بھی مجھے خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بہرحال میں..... نانی کے کاموں میں ان کا ہاتھ زیادہ بہتر طور پر بٹا سکتا تھا اور بٹاتا تھا۔ وہ برتن دھوتیں تو میں برتن خشک کرکے رکھتا۔ لکڑیاں کاٹ کر لاتا۔ نانی مجھ سے بہت خوش ہوتی تھیں۔

کچن کے عقب میں لکڑیوں کا شیڈ تھا۔ وہاں اسٹیل کا ایک بڑا سلنڈر رکھا تھا' جو نیچے آتے آتے دو بڑی نلکیوں میں دو سمتوں میں تقسیم ہوجاتا تھا۔ سلنڈر کے اوپر کے کھلے ہوئے حصے میں بالٹی بھر دودھ انڈیلا جاتا اور دونوں نلکیوں کے نیچے برتن رکھ دیے جاتے۔ اب جھکتے ہوئے' دونوں پاؤں مضبوطی سے جما کر ہینڈل کو پوری رفتار سے اور مسلسل گھمایا جاتا تو سلنڈر کے اندر کارروائی شروع ہوتی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ سپریٹر کس طرح کام کرتا ہے۔ میں بس یہ جانتا تھا کہ ہینڈل مسلسل گھمایا جائے تو اندر سے غراہٹوں کی آواز آتی ہے۔ مزید گھمائے جائیں تو وہ آواز ایک چیخ معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہینڈل کو پوری طاقت اور رفتار سے گھماتے رہیں تو اچانک ایک نلکی سے دودھ اور دوسری سے کریم نکلنے لگتی ہے۔ اس وقت مشین کی آواز اتنی بڑھ جاتی ہے کہ بہرے ہونے کا خوف طاری ہونے لگتا ہے۔

اس ہینڈل کو تیز رفتاری سے گھماتے ہوئے میں آنکھیں بند کرلیتا اور خوابوں میں کھو جاتا۔ کبھی میں خود کو ایک ملاح سمجھتا' جس کی کشتی سمندری طوفان میں گھر گئی ہو اور وہ اسے بچانے کے لیے چپو چلائے جارہا ہو اور کبھی میں ایک بہادر ہیرو بن جاتا جو چٹان کے کنارے کو پکڑ کر ہزاروں فٹ گہری کھائی میں لٹکی ہوئی ہیروئن کو اوپر زندگی کی طرف کھینچنے کی کوشش کررہا ہوتا۔

اور ہاں..... وہاں انڈے بھی تو تھے۔ نانی نے دو سو مرغیاں پالی ہوئی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ ان کی تمام مرغیاں بہت محنتی ہیں..... اچھی' انڈے دینے والی مرغیاں۔ میرے حساب سے نانی انکسار سے کام لیتی تھیں۔ کیونکہ لیگ ہارن نسل کی مرغیاں تو انڈے دینے کی مشین تھیں کیونکہ میں نے انہیں عام مرغیوں کی طرح ٹہلنے' ادھر ادھر چونچیں مارنے اور کڑکڑانے کی غرض سے دڑبے سے نکلتے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ وقت ضائع کرنے کی قائل ہی نہیں تھیں۔ وہ صرف اس وقت باہر نکلتی تھیں' جب انہیں انڈا دینا ہوتا تھا۔ شاید باقی وقت وہ بڑی تندہی سے انڈے تخلیق کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔

بہرحال..... یہ میرا ایک کام تھا' جو میں باقاعدگی سے کرتا تھا۔ میں انڈوں کے باغ میں ٹہلتا' کھوجتا پھرتا' مرغیوں کے پھل جمع کرتا' انہیں دھوتا' خشک اور صاف کرتا اور کریٹ میں محفوظ کرتا۔ مگر اس کام کے بعد ناشتے کی میز پر کسی انڈے کا سامنا کرنا میرے لیے آسان نہیں ہوتا تھا' خواہ پلیٹ پر رکھا ہوا انڈا ابلا ہوا ہو' ہاف فرائی ہو یا آملیٹ کی شکل میں ناقابل شناخت ہو۔ مجھے اس سے

گھن آتی تھی۔

نانی ہر ہفتے انڈوں کے دو کریٹ قریبی قصبے کے ایک کریانہ فروش کو بھجواتی تھیں۔ ان کے بدلے جو ملتا تھا' اس کے وہ دو حصے کرتی تھیں۔ ایک حصہ گھر کے خرچ کے لیے اور دوسرا وہ گاڑی خریدنے کے لیے پس انداز کرتی تھیں۔

نانی کو اس بات پر بہت شرمندگی ہوتی تھی کہ پورے گاؤں میں ایک وہی ہیں جن کے پاس آٹو موبائل نہیں ہے ورنہ سب کے پاس ٹرانسپورٹ کے نام پر کچھ نہ کچھ موجود تھا۔ نانی کے ساتھ برتن دھلواتے وقت مجھے بہت معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر انہوں نے مجھے بتایا کہ تین سال پہلے ان کے پاس اتنی رقم جمع ہوگئی تھی کہ گاڑی خریدی جاسکتی تھی۔ بدقسمتی سے ایک چکنی چپڑی باتیں بنانے والا سیلزمین آٹپکا اور اس نے نانا کو پھسلالیا۔ اس نے نانا کو نیا رسلے آئل پل جو کہ بہت مہنگا تھا' ٹکادیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نانا اپنے پرانے ٹریکٹر کے بدلے تیل سے چلنے والا وہ ہاتھی لے لیتے لیکن نانا کی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنی مشینری سے بہت محبت کرتے تھے' خواہ وہ متروک ہوچکی ہو لہٰذا نانا نے نقد رقم سے ادائیگی کرکے آنے والی کار کا پتا صاف کردیا اور بے کار ہو رہے۔

"تمہارے نانا کی مشینوں سے محبت ہی کی وجہ سے ہم گاؤں میں سب سے بیک ورڈ ہیں" نانی نے بتایا۔" ہمارے ہاں اب بھی وہ مشینیں اور آلات استعمال ہوتے ہیں' جنہیں دوسرے ترک کرچکے ہیں۔"

"مگر کیوں؟"

"تمہارے نانا اپنی کوئی مشین بیچنے کو تیار نہیں ہوتے اور نئی خریدنے کے لیے پیسے جمع نہیں ہوپاتے۔"

"اوہ!"

"مگر اب میں کار کے لیے رقم جمع کررہی ہوں۔"

مجھے دلچسپی ہوئی "کون سی کار خریدیں گی آپ؟"

"اسٹڈ بیکر۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ میں شہری تھا' کاروں کے بارے میں اچھا خاصا جانتا تھا "فورڈ کیوں نہیں؟"

"اسٹڈ بیکر کی تشہیر میں کہا جاتا ہے کہ وہ فری وھیلنگ آٹو موبائل ہے" نانی نے بتایا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"گاڑی کو ایک بار اسپیڈ دینے کے بعد انجن بند کردو' اس کے بعد وہ میلوں بغیر پیٹرول کے چلے گی' کتنی بچت ہے۔"

"مگر اسٹڈ بیکر اور فورڈ کی قیمتوں میں اتنا فرق ہے کہ آپ اس سے ہزاروں گیلن پیٹرول خرید سکتی ہیں" میں نے نانی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن نانی نہیں مانیں۔ وہ عورت تھیں اور بار بار خیالات بدلنے کو اچھا نہیں سمجھتی تھیں "چھوڑو اس بات کو" انہوں نے کہا اور بات ختم کردی۔



میں اکثر نانا اور نانی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ جب میں ان کے ہاں گیا تو میں ان دونوں کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں تھا۔ میں ڈیڈی اور مما کے ساتھ ان سے ملنے کے لیے دوبار آچکا تھا۔ مگر وہ بچپن کی بات تھی۔ یہ بات سمجھنے میں مجھے خاصا وقت لگا' یہاں تک کہ کرسمس آگیا۔ بہرحال اس وقت تک میں نے سمجھ لیا کہ وہ دونوں انسان ہیں اور ان سے میرا تعلق دشوار نہیں' آسان ہے۔ ایک لڑکا آسانی سے نانا نانی کو دوسرے لوگوں سے جدا کرکے' ان سے بہت گہری محبت کرسکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ نسلی محبت قدرتی طور پر اس کے اندر موجود ہوتی ہے اور اسے ابھارنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ وہ خود بخود ابھر آتی ہے۔ جب میں وہاں گیا تھا تو میرا خیال تھا کہ یہ نانا نانی دادا دادی.... یہ لوگ کچھ غیر حقیقی ہوتے ہیں' جیسے ڈراموں کے کردار۔ وہ کبھی جوان رہے ہوں گے۔ انہوں نے بھی محبت کی ہوگی' نفرت کی ہوگی' دکھی ہوئے ہوں گے۔ کبھی وہ کمزور' ضدی اور اڑیل بھی رہے ہوں گے۔ کبھی ان کے مزاج پل پل رنگ بھی بدلتے ہوں گے۔ وہ خوف سے' شدتوں سے' غصے سے اور حیرت سے بھی واقف رہے ہوں گے۔ مگر یہ سب کچھ وہ اب تک بھول چکے ہوں گے۔ اب ان جذبوں سے' ان کمزوریوں سے' ان قوتوں سے وہ بے خبر ہوں گے۔

میں تو شروع سے یہی سمجھتا تھا کہ والدین سفید سر' مہربان' لاغر اور کمزور ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں عنقریب مرجانا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں جانتا'



وہ پُراز واقعات موسم خزاں تھا۔ گاؤں میں حال ہی میں بجلی آئی تھی۔ شاید ناقص وائرنگ کے نتیجے میں آگ لگی۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ چرچ آگ لگنے کے نتیجے میں تباہ ہوگیا۔ اسے دوبارہ تعمیر کرنا ضروری تھا اور یہ گاؤں والوں کی ذمے داری تھی۔ سب لوگ اتوار کے دن جمع ہوتے..... کیا عیسائی اور کیا مسلمان اور یہ کام کرتے۔ کبھی بارش کا سماں ہوتا اور معمول کے کام رک جاتے تو اس دن بھی سب اکٹھے ہوکر چرچ کا کام کرتے۔ بالآخر کیم دسمبر تک نیا چرچ تعمیر ہوگیا۔ لوگوں کے لیے مالی مدد کرنا بہت مشکل تھا۔ ہر شخص جو کچھ دے سکتا تھا' دے چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ چرچ باہر سے بھی اور اندر بھی' رنگ وروغن سے محروم تھا۔ روشنی بھی نہیں تھی۔ بہرحال بینچیں موجود تھیں۔ فادر میکس کورین نے پہلی سروس کے دوران میں خوشی کا اظہار کیا کہ یہ بھی غنیمت ہے۔

دوسرا واقعہ اور طرح کا تھا۔ اس شام نانا گودام کی طرف سے آئے اور انہوں نے اطلاع دی کہ ان کی پرانی بھیڑوں میں سے ایک بچہ دینے والی ہے "میری بات پر یقین مت کرو" انہوں نے کہا۔

"کیونکہ مجھے خود بھی اپنے آپ پر یقین نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ کم از کم چار ماہ کی گیابھن ہے۔"

"تو اس میں یقین نہ کرنے کی کیا بات ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بھیڑیں موسم سرما میں کبھی بچہ نہیں دیتیں" نانا نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "میں جانتا ہوں یہ بات۔ چالیس سال سے بھیڑیں پال رہا ہوں میں۔ میمنے اپریل مئی.... اور زیادہ سے زیادہ جون میں پیدا ہوتے ہیں۔"

"اگر میں بھیڑ ہوتا...." میں نے خالص شہریوں کی سی بدتمیزی سے کہا "تو میرا جب جی چاہتا، جب مناسب سمجھتا، بچہ دیتا۔ بھیڑ کوئی پابند ہے کسی کی۔"

"ہر چیز.... ہر ذی روح قانونِ قدرت کی پابند ہے اور تمہاری آزاد طبیعت ہی کی وجہ سے اللہ نے تمہیں بھیڑ نہیں بنایا" نانا کے لہجے میں شفقت تھی اور وہ اپنی مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہے تھے "بلکہ اللہ نے تم پر بچہ دینے کی ذمے داری سرے سے نہیں ڈالی ورنہ تم میری نواسی بھی ہو سکتے تھے۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگے.... خوب ہنسے۔

"کیا بے ہودگی ہے یہ" نانی نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

"مگر میں تو کچھ سمجھا ہی نہیں" میں نے معصومیت سے کہا۔

"کہو تو سمجھاؤں" نانا نے پیش کش کی۔

نانی نے شاید بات بدلنے کی کوشش کی "چلو منصر، یہ تو اچھا ہی ہے۔ تمہیں کرسمس کے موقع پر میمنا ملنے والا ہے" وہ بولیں اور دلیے کی دیگچی چولھے پر رکھ دی "اور سنو، مجھے کیلنڈر کی تصویریں یاد آتی ہیں۔ بی بی مریم اور ننھے مسیح کی تصویروں میں اکثر ایک میمنا بھی دکھایا جاتا ہے۔ کون جانے، اس زمانے میں میمنے سردیوں میں ہی پیدا ہوتے رہے ہوں۔"

"وہ تصویریں مصوروں کی بنائی ہوئی ہیں" نانا نے خشک لہجے میں کہا "اور مصور بھیڑیں نہیں پالتے۔ وہ کیا جانیں بھیڑوں اور میمنوں کے بارے میں۔"

تیسرا واقعہ منفی تھا.... یعنی کہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہوا۔ میرا مطلب ہے کہ برف باری نہیں ہوئی۔ دن سرمئی ہوتے گئے۔ نومبر سرد سے سردتر ہوتا گیا۔ جھیل کی سطح پر کہرا جمتا رہا۔ نانا نے سیب کے جوس کا پیل عقبی صحن میں رکھ دیا لیکن برف نہیں پڑی۔ ہر طرف یہی باتیں ہونے لگیں۔ لوگ جہاں ملتے، یہی موضوع رہتا۔ سب کو فکر تھی کہ اس سے سرما کی فصل خراب بھی ہو سکتی ہے۔

مگر یہ طے تھا کہ یہ موسم سرما ہے اور کرسمس قریب آرہا تھا۔ اسکول جاتے ہوئے اور اسکول سے گھر آتے ہوئے مجھے اکثر رونا آجاتا تھا۔ پہلے میں ہر ہفتے ڈیڈی اور مما کو خط لکھتا تھا۔ اب ایک دن چھوڑ کر لکھنے لگا۔ عقبی صحن میں رکھا سیب کے جوس کا پیل جمنے لگا۔ نانا ہر روز اس کی برف صاف کرتے اور اسے دوبارہ جمنے کے لیے وہیں چھوڑ دیتے۔ جب پیل کی تہ میں شفاف مائع صرف چند انچ اونچا رہ گیا تو وہ اسے بڑی محبت سے سینے سے لگا کر لائے اور جا کر نیچے تہ خانے میں رکھ آئے۔

اس عرصے میں نانا اپنی گیابھن بھیڑ کا کثرت سے جائزہ لیتے رہے تھے۔ ان کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے کوئی موجد اپنی کسی ایجاد کو عملی طور پر آزمانے سے پہلے جانچتا، دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ وہ ہر ہر زاویے سے اس کا معائنہ کرتے۔ اس کے اونی بالوں کو تھپتھپا کر دیکھتے۔ پھر کبھی سہلاتے، کبھی جھٹکتے۔ مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ بھیڑ گیابھن تھی.... اور یہ ایک حقیقت تھی۔

نانا نے اس روز تمام نمازیں گھر پر پڑھیں۔ وہ مسجد بھی نہ جا سکے۔

نانا کے گھر آنے کے بعد مجھے پہلی بار صحیح معنوں میں معلوم ہوا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اس سے پہلے مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ نماز بھی پڑھی جاتی ہے۔ میرے ڈیڈی اور مما شاید بس نام کے مسلمان تھے۔ ہمارے طور طریقے، ہمارا رہن سہن عیسائیوں کا سا تھا۔ مگر مجھے یہ معلوم تھا کہ ہم عیسائی نہیں، مسلمان ہیں۔ میں ڈیڈی یا مما سے فرق معلوم کرنے کی کوشش کرتا تو پتا چلتا کہ انہیں خود بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں ہے۔ سچ پوچھیں تو ہمیں بس کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت آتا تھا اور بس.... اور یہ معلوم تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔

نانا کے ساتھ میں نماز پڑھنے کے لیے جاتا تھا۔ نانا اور نانی روز قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتے تھے۔ مگر نانا کو اعتراف تھا کہ مذہب کے بارے میں انہیں بھی زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان مبلغوں اور عالموں کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں ملتی تھی۔ حکومت ڈرتی تھی کہ اپنے دین کے بارے میں جان گئے تو مسلمان سخت، متعصب اور متشدد ہو جائیں گے۔ بس اتنا کافی ہے کہ انہیں اپنے مذہب کے متعلق آزادی حاصل ہے۔

"تو ہم مسلمان کیوں ہیں نانا؟" میں نے نانا سے پوچھا۔

نانا چند لمحے سوچتے رہے پھر بولے "شاید اس لیے کہ ہم مسلمان پیدا ہوئے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے۔"

"تو ہم کرسچن کیوں نہیں ہو جاتے؟" میں نے اعتراض کیا۔ "جب ہم اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو مسلمان ہونے کا فائدہ؟"

"اس لیے کہ ہم کتنے ہی بے خبر ہوں، مگر اپنے اندر یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ دینِ برحق ہے" نانا نے کہا "میں جانتا ہوں کہ اسلام صرف اچھی باتیں سکھاتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے۔"

"اچھا نانا.... یورپ تو پورا عیسائیوں کا ہے پھر یہاں مسلمان

کیسے آگئے؟" میں نے سوال کیا۔

"لوگ دوسرے ملکوں میں تو جاتے رہتے ہیں نا۔ صدیوں پہلے یہ ہوتا رہا کہ کوئی کسی اسلامی ملک میں گیا اور وہاں کچھ عرصے رہا۔ اس دوران میں اس نے مسلمانوں کو دیکھا اور اسلام کے بارے میں جانا..... اور اتنا متاثر ہوا کہ مسلمان ہوگیا۔ پھر وہ گھر واپس آیا تو اس نے وہ روشنی اپنے گھر والوں کو دی۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ ان سے متاثر ہوکر ان کے پڑوسی مسلمان ہوگئے۔ یوں خاموشی سے اسلام پھیلتا رہا۔ جب حکومت کو اندازہ ہوا تو انہوں نے مبلغین کی آمد پر پابندی لگادی مگر اسلامی تعلیمات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ جو ایک بار ایمان لایا، پھر ایمان سے ہٹا بھی نہیں۔"

"تو آپ اتنے بے خبر کیوں ہیں؟"

نانا افسردہ نظر آنے لگے "اس لیے کہ میرے پاپا مجھے کچھ بتا نہیں سکے۔ اس لیے کہ انہوں نے کبھی مجھے دیکھا نہ میں نے انہیں۔"

اس لمحے بوڑھے نانا مجھے چھوٹے سے بچے کی طرح لگے "تو نانا مسلمان کرسمس کیوں مناتے ہیں؟" میں نے ایک اور اعتراض کیا۔

"ایک بات تو یہ کہ یہ نسلوں سے ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ یہ ہماری ثقافت کا حصہ بن گیا ہے۔ دوسرے اسلام تمام پیغمبروں پر، تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی ہدایت کرتا ہے تو ہم حضرت عیسیٰؑ کے پیغمبر ہونے پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن نعوذ باللہ انہیں اللہ کا بیٹا نہیں مانتے اور نہ ہی ان کے مصلوب ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے کبھی مسلمانوں کو ایسٹر کے تہوار میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا ہوگا۔"

نانا نے ٹھیک کہا۔ مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی تھی اس بات پر۔

"مسلمان اہلِ کتاب کا احترام کرتے ہیں اور جب تک ان کی دشمنی کھل کر سامنے نہ آجائے، انہیں برا نہیں کہتے، برا نہیں سمجھتے۔ ہمارا مذہب رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ ہم اہلِ کتاب کی خوشیوں میں، ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ ہم کسی سے نفرت نہیں کرتے، بس اتنی سی بات ہے۔"

"لیکن نانا، ہمیں اپنے مذہب کے بارے میں معلوم تو ہونا چاہیے۔"

"اللہ بہتر کرے گا۔ وقت آئے گا تو وہ بھی ہوجائے گا، کون جانے..."

یہ باتیں میرے اور نانا کے درمیان ہوتی ہی رہتی تھیں، کبھی کبھی نانی بھی ان میں شریک ہوجاتیں۔

خیر۔ اس سال کرسمس اتوار کے دن آیا تھا۔ نانی نے بتایا کہ کرسمس کے دن وہ بھی چرچ جاتی ہیں..... بیشتر مسلمان جاتے ہیں۔ اس رات نانی نے میٹھے میں کیک بنایا اور سیاہ رس بھریوں سے اس کی ڈیکوریشن کی۔ یہ رس بھریاں انہوں نے اگست میں توڑ کر ٹن میں محفوظ کرلی تھیں۔ کیک مجھے بہت اچھا لگا۔

کھانے کے بعد نانا گیابھن بھیڑ کی دیکھ بھال کے لیے باڑے کی طرف چلے گئے۔ میں معمول کے مطابق نانی کا ہاتھ بٹانے لگا، جو برتن دھورہی تھیں۔ میں برتن خشک کرکے رکھتا رہا۔ پھر نانی اگلے روز کے کھانے کے لیے مرغی روسٹ کرنے کی تیاریوں میں لگ گئیں۔ میں اس میں بھی ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

اچانک نانی نے کھڑکی سے باہر آسمان کو دیکھا اور بڑبڑائیں۔

"اتنی عمر ہوگئی میری۔ اتنے برسوں کا ساتھ ہے۔ مگر میں تمہارے نانا کو نہیں سمجھ سکی۔ شاید کبھی سمجھ بھی نہیں سکوں گی۔"

مجھے یقین تھا کہ نانی درست کہہ رہی ہیں۔ مجھے علم تھا کہ نانا اور نانی کا ۴۶ سال کا ساتھ ہے۔ اگر وہ اتنے عرصے میں انہیں نہیں سمجھ سکیں تو اب کیا سمجھیں گی۔ چنانچہ میں نے بے حد سادگی سے کہا "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں نانی، اب تو مشکل ہی ہے۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ مشینری سے انہیں عشق ہے۔"

میری پوری توجہ ان کی طرف نہیں تھی۔ میں نے کیتلی بھر پانی چولھے پر رکھا تھا۔ اب وہ ابل رہا تھا "جی نانی..... آپ نے کہا تو تھا" میں نے بے توجہی سے کہا۔

"ان سے ایک مرغی بھی ذبح نہیں کی جاتی" نانی نے انکشاف کیا۔

"مگر مرغی مشینری تو نہیں ہے نانی۔"

"ہے تو فارم کی ہی چیز۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔"

"ارے..... ساری زندگی میں ہی مرغیاں ذبح کرتی رہی ہوں" نانی بولیں "اور تو اور، وہ پڑوسیوں کے لیے بھی بہت نرم ہیں۔"

"پڑوسی نہ تو مشینری ہیں، نہ فارم کی چیز" میں نے پھر اعتراض کیا۔

"پڑوسی کیا، وہ گاؤں کے کسی آدمی کو دکھ نہیں دینا چاہتے۔"

"میں سمجھا نہیں" میں نے کیتلی چولھے سے اتاری اور کھولتا ہوا پانی سنک میں ڈالا تاکہ پائپ میں موجود چکنائی کی رکاوٹ دور ہوجائے۔

"ارے..... سبھی منہ اٹھا کر آجاتے ہیں تھریشر مانگنے۔ پچھلی گرمیوں میں بھی یہی ہوا تھا" نانی نے کہا "اسی بنیاد پر تو انہوں نے نیا ٹریکٹر خریدا تھا۔ کہتے تھے، پورے گاؤں والوں کی فصلیں نمٹاؤں گا۔ یوں ٹریکٹر کی رقم نکل آئے گی۔ تب تم کار خرید لینا۔ میں ان کی باتوں میں آگئی اور پتا ہے کیا ہوا، دو سال ہوگئے۔ یہ ہر کسی کی گندم الگ کرتے ہیں۔ مگر کبھی کسی نے ایک پائی بھی نہیں دی۔ نہ دینے کا ارادہ ہے کسی کا۔"

"کیوں؟"

"گندم کی قیمت گرگئی نا۔ تو سب نے ذخیرہ کرلیا..... اس امید

رکھ وقت آنے پر اچھی قیمت پر بیچیں گے اور انہوں نے کسی سے کچھ مانگا بھی نہیں۔ مانگتے تو مل بھی جاتے۔ میں جانتی ہوں' بیشتر لوگ ادائیگی کرسکتے ہیں۔ لیکن اپنا حق مانگتے ہوئے بھی تمہارے نانا کا دل دکھتا ہے۔ کہتے ہیں..... کڑا وقت ہے اہلی سب کے لیے اور پھر سبھی دوست ہیں میرے" نانی نے نانا کے لہجے اور آواز کی نقل اتاری "یہ تھا میرا مطلب کہ انہیں پڑوسیوں سے بھی عشق ہے۔"

"اوہ..... یہ بات ہے۔"

"اور کبھی بری طرح اڑجاتے ہیں..... اڑیل ٹٹو کی طرح۔ اب یہ ان کی بھیڑ ذرا بچہ دے دے' پھر دیکھنا۔ وہ ضد کریں گے کہ یہ بھیڑ کا بچہ ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ سال کے اس حصے میں بھیڑ کبھی بچہ دیتی ہی نہیں۔" نانی نے مرغی کے اندر کی صفائی کرتے ہوئے دل اور کلیجی ایک طرف رکھی "میں ایک اور مثال دوں۔ پتا ہے' تمہارے نانا چھ سال کے تھے تو آرگن بہت اچھا بجاتے تھے۔"

"یقین نہیں آتا" میں نے کہا۔

"انہیں اپنے والد کی وفات کا پتا چلا بس پھر اس کے بعد انہوں نے کبھی آرگن کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

میں نے چونک کر نانی کو دیکھا "وہ کیوں؟"

"بس ضد اور اڑیل پن" نانی نے گہری سانس لی "ان کی ماں مجھے بتاتی تھیں کہ انہوں نے ان کی بڑی خوشامد کی۔ التجائیں کیں۔ مگر یہ نہ مانے' ہے نا عجیب بات۔ نرم ہیں تو بہت نرم۔ اور سخت ہوئے تو کوئی ہاتھ بھی جوڑلے' یہ کس سے مس نہیں ہونے والے۔"

میں نے پانی کی کیتلی کو پونچھ کر' خشک کرکے ایک طرف رکھ دیا۔ اپنے خاندان کے متعلق کچھ نہ کچھ مجھے ممی بھی بتاتی رہتی تھیں۔ مجھے بہت کچھ معلوم تھا اور یاد بھی تھا۔ نانا کے والد ابراہیم اسی فارم سے جنگ پر روانہ ہوئے تھے۔ یہ ۱۸۷۱ء کی بات ہے۔ ۱۸۷۲ء میں ان کی جوان بیوی یعنی میری پرنانی سارہ کو ایک خط ملا' جس میں لکھا تھا کہ وہ چھ مہینے سے لاپتا ہیں۔ پرنانی اپنے بیٹے یعنی میرے نانا منصر کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کرتی رہیں۔ نانا نے اپنے پاپا کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پانچ سال بعد محکمۂ جنگ سے پرنانی کے نام ایک اور خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ نانا بڑی بہادری سے جنگ لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ان کی باقیات بھی بھجوائی گئیں' جن کی باقاعدہ تدفین ہوئی۔

"اسی لیے نانا نے اس کے بعد کبھی آرگن نہیں بجایا۔ یہی بات ہے" میں نے کہا "میرا مطلب ہے' اپنے پاپا کی وفات کا سن کر ان کا دل ٹوٹ گیا ہوگا۔"

"بکواس' نری بکواس۔ یہ تو ٹھرولا پن ہے" نانی نے غصے سے کہا۔

چند منٹ بعد باہر برف پر قدموں کی چاپ ابھری۔ اس وقت تک میں برتن خشک کرنے سے اور نانی مرغی کی صفائی سے نمٹ چکی تھیں۔ نانا کچن میں آئے اور چولھے کے پاس کھڑے ہوکر ہاتھ تاپتے رہے "ایسا طوفان میں نے کبھی نہیں دیکھا" وہ بولے۔

نانی نے کراہنے کی آواز نکالی جو کراہ سے زیادہ غراہٹ سے مشابہ تھی۔

"بھیڑ بھی بس بچہ دینے ہی والی ہے" نانا نے اطلاع دی۔

"اور حارث کا فون بھی بس آنے ہی والا ہوگا" نانی بولیں۔

وہ فون کال ڈیڈی اور ممی کی طرف سے میرے لیے کرسمس کا تحفہ تھا۔ ہمارے گھر کا فون تو کٹ چکا تھا مگر انہوں نے طے کیا تھا کہ اپنے ایک دوست کے گھر جاکر ٹھیک آٹھ بجے رات مجھے فون کریں گے۔ وہ تین منٹ کی متوقع گفتگو میرے لیے بہت قیمتی تھی۔ اسی خیال سے نانا اور نانی ڈرائنگ روم میں چلے گئے کہ کہیں میں مروت کے مارے ان تین منٹ میں انہیں بھی شریک نہ کرلوں..... اور خود تشنہ رہ جاؤں۔

وہ کرسمس ٹری سجانے میں مصروف ہوگئے۔ شہر میں کرسمس ٹری بہت اچھی طرح سجایا جاتا ہے۔ یہاں گاؤں میں وہ بات نہیں۔ پھر بھی موم بتیاں جلائی گئیں تو جگمگاتا ہوا کرسمس ٹری بہت خوب صورت لگنے لگا۔ درخت پر صرف دو تحفے تھے..... اور دونوں میرے لیے تھے۔ نانا نے اخروٹ کی لکڑی کے دستے والا جیبی چاقو دیا تھا جبکہ نانی نے میرے لیے اپنے ہاتھوں سے بہت لمبا' بہت بڑا اونی اسکارف بُنا تھا۔

"آپ دونوں کا بہت شکریہ۔ دونوں تحفے بہت اچھے ہیں" میں نے کہا "مگر میں آپ دونوں کو کچھ نہیں دے سکا۔ مجھے کچھ بھی بنانا نہیں آتا اور میرے پاس پیسے بھی نہیں تھے کہ بازار سے کچھ خرید کرلے آتا۔"

"ارے حارث..... پگلے..... تم..... تم تو خود ہی ہمارا تحفہ ہو" نانی نے میرے رخسار چومتے ہوئے کہا۔

نانا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیے "اور تم ابھی بچے ہو۔ بڑے ہوجاؤ تو تحفہ بھی دے دینا۔" ان کے لہجے میں محبت تھی۔

ہم نے ایک دوسرے کو کرسمس کی مبارک باد دی پھر میں کچن میں چلا گیا کیونکہ آٹھ بجنے والے تھے۔

نانا نانی میز پر بیٹھ گئے۔ میں دیوار پر نصب ٹیلی فون کے پاس کھڑا ہوگیا۔ پانچ منٹ گزرے' مجھے بے تابی ہونے لگی' میں نے سوچا' لائن پر کوئی ہوگا۔ چنانچہ میں نے ریسیور اٹھالیا۔ سوچا کسی کی گفتگو ہی سن لوں۔ مگر وہاں ڈائل ٹون کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے ریسیور رلٹکا دیا۔

چولھے میں جلتی ہوئی لکڑیاں چیخ رہی تھیں۔ دیواری کلاک ٹک ٹک کررہا تھا۔ ہوا گھر کی دیواروں کو ہلائے دے رہی تھی۔

"ذرا سوچو تو" نانی نے خاموشی توڑی "کون سوچ سکتا تھا کہ دو افراد جو اتنی دور ہوں' ایک دوسرے سے بات کرسکتے ہیں۔ پتا نہیں' آگے یہ انسان کیا ایجاد کرے گا۔"

نانا خاموش رہے' چند لمحے بعد بولے "اتنا خراب موسم ہے۔ ٹیلی فون کا رابطہ تو منقطع نہیں ہوگیا کہیں۔"

اس پر نانی نے گھور کر انہیں دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولیں۔

"سنو حارث' فون آئے تو ہم سے بات مت کروانا" نانا بولے "ہم تو خط بھی لکھ سکتے ہیں۔ یہ مختصر کال تمہارا تحفہ ہے۔ اس کا ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں ہونا چاہیے۔"

"شکریہ نانا!" میں نے کہا۔ میری ہتھیلیاں پسیج رہی تھیں۔ مجھے اپنے حلق میں ایک گولا سا پھنسا محسوس ہو رہا تھا۔

بالآخر فون کی گھنٹی بجی۔ ہم سب نے سانسیں روک لیں۔ تین گھنٹیوں کے بعد میں نے ریسیور اٹھایا تو مجھ سے ہیلو بھی نہیں کہا گیا۔ گلے میں پھنسا ہوا گولا دو زردی والے انڈے جتنا بڑا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر مما کی آواز اُبھری اور وہ گولا ٹوٹ گیا۔ "بیٹے.... میری نظر کلاک پر ہے" مما نے کہا "ہم تین منٹ سے زیادہ بات نہیں کر سکیں گے۔ تم وقت ضائع مت کرنا۔"

"مما.... آپ کیسی ہیں؟ اور ڈیڈی کیسے ہیں؟ سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں' ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ تمہارے دوست تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔"

"انہیں کہئے گا' میں بھی انہیں بہت مس کرتا ہوں۔"

"تم سناؤ بیٹے' تم ٹھیک ہو۔ دل تو لگ گیا ہے نا؟"

"جی مما' بہت خوش ہوں میں' یہاں جانور بھی ہیں۔ بڑی دلچسپیاں ہیں۔ آپ اور ڈیڈی بھی یہاں ہوتے تو...." میری آواز بھرا گئی۔ آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"ممی اور پاپا کیسے ہیں؟" ممی نے تیزی سے موضوع بدلا۔

"جی' ٹھیک ہیں۔"

"اچھا.... اپنے ڈیڈی سے بات کرو۔"

میں نے ڈیڈی سے ان کی خیریت پوچھی پھر پوچھا کہ ملازمت ملی یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ابھی تک نہیں ملی ہے پھر انہوں نے بھی جلدی سے موضوع بدلا "یہاں تو موسم بہت اچھا ہے۔ تمہاری طرف کیا حال ہے؟"

"یہاں تو برفانی طوفان آیا ہے ڈیڈی" میں نے کہا۔

"اور وہاں کی سناؤ۔"

"نانا کی ایک بھیڑ بچہ دینے والی ہے۔ نانا نے تحفے میں مجھے چاقو اور نانی نے اونی اسکارف دیا ہے.... خود بُن کر...."

میری نظریں بھی کلاک کی سوئیوں پر تھیں۔ وقت ختم ہو رہا تھا۔ میری آواز پھر پھنسنے لگی۔ ممی اور ڈیڈی نے مجھے کرسمس کی مبارک باد دی اور نانی کو مبارک باد دینے کی ہدایت کی۔ پھر وہ مجھے خدا حافظ کہہ ہی رہے تھے کہ رابطہ منقطع ہوگیا۔

میں نے ریسیور ہُک پر لٹکا دیا لیکن پلٹا نہیں کیونکہ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"ایک آئیڈیا آیا ہے میرے ذہن میں" نانی نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "کیوں نہ ہم پارلر میں چلیں۔ وہاں میں میلوڈین بجاؤں گی اور ہم سب گائیں گے۔"

میں اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پلٹ کر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں نے فون پر نظریں جمائے جمائے بمشکل کہا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو بجانا آتا ہے۔"

"اب میں اچھا تو نہیں بجا سکتی.... پہلے کی طرح" نانی کے لہجے میں اُداسی تھی "گٹھیا نے انگلیوں کو کمزور کر دیا ہے اس لیے کم ہی بجاتی ہوں لیکن پہلے بہت بجاتی تھی۔ ان کی ممی نے مجھے سکھایا تھا' بہر حال چاہو تو چلو۔"

نانی نے نانا کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں کچن سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے آنسو پونچھے اور ان کے پیچھے ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔ نانا نے سلائیڈنگ ڈور کو دھکیل کر کھولا اور ہم پارلر میں چلے گئے۔ نانی نے روشنی کر دی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ میں اس میلوڈین کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں کبھی پارلر میں بھی نہیں گیا تھا۔

وہ بہت بڑا اور بہت خوب صورت باجا تھا۔ ۴۳ انچ اونچا' چالیس انچ چوڑا اور ۲۱ انچ گہرا۔ اوپر کے ٹاپ میں قبضے لگے تھے' جس کی وجہ سے اسے فولڈ کیا جا سکتا تھا اور فولڈ کر دیا جاتا تو وہ میوزک ریک بن جاتا۔ کی بورڈ بھی بہت خوب صورت تھا۔ اوپر خوب صورت حروف میں بنانے والے کا نام لکھا تھا۔ میسن اینڈ ہیملن نیچے دس انچ چوڑے دو پیڈل تھے اس کے ساتھ ایک بینچ تھی۔

نانی بینچ پر بیٹھی اور میلوڈین بجانے لگیں۔ ہم نے کئی گیت گائے۔ نانی نے جو گیت گائے' وہ میں نے کبھی نہیں سنے تھے۔ نانا بھی آواز ملا رہے تھے۔ ہم نے.... رات خاموش ہے.... اور ہم تین دل کے بادشاہ.... گائے۔ پھر نانی نے سفید چابیوں کے بجائے سیاہ چابیوں پر ہاتھ مارا۔ جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ ایسی غلطی نہیں کر سکتیں مگر اسی لمحے میری نظر ان کی انگلیوں پر پڑی۔ ان کی انگلیاں سوج گئی تھیں۔ گٹھیا کا درد انہیں ستا رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ بجاتی اور گاتی رہیں اور اس میلوڈین کی آواز.... میں کیا بتاؤں کہ وہ کتنی خوب صورت تھی اور نانا نانی کی بوڑھی آوازوں میں باہم کتنی ہم آہنگی تھی۔ وہ بہت خوب صورت سماں تھا۔ مگر مجھے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بہت واضح اور یقینی احساس تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ پارلر میں کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔ اگرچہ میں انہیں دیکھ نہیں سکتا۔ مگر مجھے گیتوں میں ملی جلی ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔ نہ دیکھنے کے باوجود مجھے یقین تھا کہ وہاں کچھ اور لوگ موجود ہیں۔

اور وہ کرسمس کی رات تھی!

نانی اچانک گاتے گاتے رکیں۔ "منصر..... مجھے بہت زبردست خیال سوجھا ہے" انہوں نے نانا سے کہا "جیسے یہ خیال غیب سے آیا ہو۔"

میں اور نانا منہ کھولے انہیں دیکھتے رہے۔ ہم منتظر تھے۔

"یہ میلوڈین..... کیوں نہ ہم اسے چرچ کو دے دیں۔" وہ چیخ سے اٹھیں۔ چشمے کے پیچھے ان کی آنکھیں معمول سے زیادہ پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ "چرچ میں تو پیانو بھی نہیں ہے۔ یہ میلوڈین گانے میں ان کی مدد کرے گا اور ہمارے ہاں تو یہ بے کار ہی پڑا ہے۔ میں بھی نہیں بجاتی کبھی اور تم تو ہاتھ بھی نہیں لگاتے اسے۔ چرچ میں کام تو آئے گا نا۔"

نانا اپنی مونچھوں کے کناروں کو مروڑتے رہے۔ "میرے خیال میں اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

"کل اتوار بھی ہے اور کرسمس بھی۔ ہم انہیں سرپرائز دیں گے۔ سب لوگ چرچ میں داخل ہوں گے..... تب انہیں یہ میلوڈین نظر آئے گا۔"

"کل؟" نانا نے پُرزور انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ "ایلی..... بھول جاؤ۔ یہ برف کا طوفان دیکھ رہی ہو۔ میں ایسے میں یہ میلوڈین چرچ تک نہیں لے جا سکتا۔"

"بیل جوتو..... اور گاڑی پر لے جاؤ۔"

"پتا ہے، برف کے ذرات ہی تین فٹ تک ہوں گے۔ گاڑی دھنس جائے گی۔ یہ ممکن ہے....."

"بکواس۔" نانی نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"میری ایلی۔ تمہیں مایوس کرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگتا۔ مگر میں تمہیں بتا دوں کہ کل چرچ میں عبادت ہی نہیں ہوگی۔ راستے برف سے ڈھک چکے ہیں۔ کوئی کیسے جائے گا۔"

نانی نے منہ پھیرا اور میلوڈین پر اس کا ٹاپ ڈھک دیا "کاش..... ہمارے پاس گاڑی ہوتی..... آٹو موبائل" انہوں نے آہ بھر کے کہا۔

اس پر نانا کو غصہ آگیا "ایسے میں کوئی گاڑی بھی نہیں چل سکتی۔ تمہاری اسٹڈ بیکر بھی نہیں۔"

"تمہیں کیا پتا منصر سلطان۔ تمہارے پاس کبھی گاڑی رہی ہی نہیں" نانی نے بے حد وقار سے کہا۔

میری زبان بند ہو گئی تھی۔ مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔ عجیب سا لگ رہا تھا۔ یقین بھی نہیں آرہا تھا۔ مجھے فارم پر آئے چار ماہ ہو چکے تھے اور میں نے کبھی انہیں ایک دوسرے سے تلخ و ترش بات کرتے نہیں سنا تھا۔ میرے حساب سے تو والدین کے والدین کو ایک دوسرے سے لڑنے کا حق ہی نہیں تھا۔ مگر وہ لڑ رہے تھے..... اور وہ بھی کرسمس کی شب!

نانا نے پہلے تو نانی کو خونخوار نظروں سے دیکھا، جو ان کی طرف پیٹھ کرکے کھڑی تھیں۔ پھر وہ میری طرف مڑے اور سرہلا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا "میں گودام جا رہا ہوں۔" انہوں نے کہا "تم نے کبھی کوئی پیدائش دیکھی ہے؟"

"جی نہیں، کبھی نہیں" میں نے گھبرا کر کہا۔

"دیکھنا چاہتے ہو؟"

"ج..... جی..... کک..... کہہ نہیں سکتا۔"

"تو فیصلہ کرلو۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ بھیڑ کیا دے گی..... مچھلی، کوئی پرندہ یا کوئی عجوبہ۔ بہرحال وہ میمنہ..... بھیڑ کا بچہ تو نہیں دے سکتی۔ سال کے اس حصے میں تو یہ ممکن نہیں۔ ہاں..... تو کیا خیال ہے؟"

"جی..... میں..... میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بس تو چل پڑو میرے ساتھ۔"

میں نے اپنا اسکارف اچھی طرح لپیٹا، دو جیکٹیں چڑھائیں، سر پر ٹوپی رکھی اور نانا کے ساتھ نکل آیا۔ نانا نے دو لالٹینیں جلالی تھیں۔ ایک انہوں نے مجھے تھمادی۔ ان کی چمنیاں بہت صاف تھیں اور جگمگا رہی تھیں۔

"اُف یہ مادائیں" نانا بڑبڑائے۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ ان کا اشارہ بھیڑوں کی طرف ہے یا بیویوں کی طرف۔ ایسے میں چپ رہنا ہی بہتر تھا۔

ہم باہر طوفان میں نکل گئے۔



میں نے اسکارف اتنی اچھی طرح لپیٹا تھا کہ نتھنوں اور آنکھوں کے سوا میرے چہرے کا کوئی حصہ کھلا ہوا نہیں تھا۔ اس کے باوجود برف اڑاتی ہوا نے میری پلکوں کو برف سے لاد دیا۔ جی چاہتا تھا کہ اسکارف سے ناک کو بھی ڈھانپ لوں۔ مگر اس کے بعد سانس کی آمدورفت خطرے میں پڑجاتی۔ طوفان ایسا تھا کہ اگر لالٹین نہ ہوتی تو نہ میں نانا کو دیکھ پاتا، نہ ان کے پیچھے چل پاتا۔ کچھ سجھائی، کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ نانا کو گودام بھی نظر نہیں آرہا ہوگا۔ مجھے بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

مگر نانا وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے دروازہ بس اتنا کھولا کہ ہم بھی تنگی سے اندر داخل ہوئے۔ پھر انہوں نے فوراً ہی دروازہ بند کردیا۔ چند لمحے ہمیں ایک دوسرے پر جمی برف جھاڑنے میں لگے۔ نانا نے میری برف جھاڑی اور میں نے ان کی۔

گودام کے دور افتادہ گوشے میں بھیڑوں کا شیڈ تھا۔ وہاں سو سے زائد بھیڑیں تھیں جو بھوسے کے بستر پر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے بڑی بے تعلقی اور خاموشی سے ہمیں گھورا۔

"کون سی ہے نانا؟" میں نے اپنا اسکارف کھولتے ہوئے پوچھا۔

"وہ!" نانا نے ایک الگ تھلگ نیم دراز بھیڑ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھیڑ ایک لمحے کے لیے اٹھی مگر فوراً ہی بیٹھ گئی۔ وہ بہت بے چین لگ رہی تھی۔

"ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ کب بچہ دینے والی ہے؟" میں نے بے حد اہم سوال اٹھایا۔

"بس پتا چل جائے گا۔"

"مگر کیسے نانا؟"

"تم تو گھامڑ ہو یار۔ یہ تجربے کی بات ہے۔ تمہیں تجربہ نہیں ہے۔ مجھے ہے' مجھے پتا چل جائے گا" لفظوں کے برعکس نانا کے لہجے میں جھنجلاہٹ نہیں تھی۔

"اچھا.... پھر ہم کیا کریں گے۔"

"سوچیں گے۔"

ہم نے اپنی ٹوپیوں کے کانوں کے غلاف اوپر اٹھادیے۔ باہر کے مقابلے میں شیڈ خاصا گرم تھا لیکن ہماری سانسوں کا دھواں اب بھی ہمارے سامنے دھند بنا رہا تھا۔

میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ بالآخر مجھے نر کے سینگ نظر آئے۔ وہ بے حد خمیدہ اور خوب صورت سینگ تھے۔ بھیڑیے کو بھی شاید اس کا احساس تھا۔ اس کے انداز سے تفاخر جھلک رہا تھا۔ نانا کو وہ بہت پسند تھا۔ انہوں نے اس کا نام کالون رکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بہت اچھی نسل کا ہے "یہ اور صدرِ مملکت.....دونوں بہت کم گو ہیں" وہ اکثر کہتے تھے "اور جب یہ بولیں تو ان کی بات دھیان سے سننا چاہیے۔"

"نانا.... بھیڑ کیا سوچتی ہوگی؟" میں نے کہا۔

"اف یہ مادائیں" نانا نے آہ بھر کے کہا "اور ان کے تضادات۔ ہوش مند آدمی تو پاگل ہوجائے۔ اب یہی دیکھ لو کہ بھیڑ مادہ ہے اور کوئی مادہ ہی اتنے بے وقت' خلافِ فطرت موسم سرما کی ایک رات آدھی رات کے وقت بچہ دے کر ایک شریف آدمی کو پریشان کرسکتی ہے۔ جبکہ اس وقت اسے گرم بستر میں ہونا چاہیے۔ اور یہ بھی ایک عورت ہی توقع کرسکتی ہے کہ اس کا شوہر شدید برفانی طوفان میں چھ پہاڑی میل کا فاصلہ طے کرکے ایک بھاری اور بہت بڑا میلوڈین لاد کر چرچ پہنچا کر آئے گا۔ دنیا کی کوئی جدید ترین گاڑی بھی برف میں چلنے اور منزل پر پہنچنے کی سکت نہیں رکھتی۔ مگر کون کسے سمجھائے' اُف یہ مادائیں!"

میں ہاتھوں میں ٹھوڑی رکھے وہیں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد نانا نے کہا "میں نے ۱۹۳۱ میں گاڑی لینے کا ارادہ کیا تھا مگر اس کے بدلے آئل پل لے لیا۔ پھر اگلے سال میں نے سوچا تھا کہ تھریشنگ سے جو رقم ملے گی' اس سے گاڑی خرید لوں گا۔ مگر تمہیں کیا پتا کہ اس سال کیا ہوا۔ خیر پتا تو ہے۔ کساد بازاری نے ہی تمہیں یہاں پہنچایا ہے۔"

بھیڑ بے چین ہوکر ایک دم کھڑی ہوئی مگر فوراً ہی لیٹ گئی۔

"ایلیا نے تین سال سے یہ آرگن نہیں بجایا ہے" نانا نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

میری توجہ کالون نامی اس بھیڑیے پر تھیں۔ وہ بڑی بے پروائی سے سوکھی گھاس چبانے میں مصروف تھا۔ وہ اس ڈرامے سے قطعی بے خبر تھا' جو گودام کے اسٹیج پر کچھ دیر بعد کھیلا جانے والا تھا۔ حالانکہ اس ڈرامے کا سب سے بڑا سبب وہ ہی تھا۔ وہ اس ڈرامے کا مصنف تھا۔ مجھے اس کی بے نیازی پر رشک آرہا تھا۔ جتنی اس کی مادہ بے چین تھی' اتنا ہی وہ پُرسکون تھا۔ اسے تو اپنی تاریخ ساز اہمیت کی بھی پروا نہیں تھی کہ وہ دنیا کا پہلا اور ممکنہ طور پر آخری نر بھیڑ ہے جو دسمبر کے مہینے میں باپ بننے والا ہے۔

"اب سوچو' چقندر میں سے خون تو نہیں برآمد کیا جاسکتا" نانا نے مجھے چونکا دیا "دوستوں اور پڑوسیوں سے ایسے وقت میں پیسوں کا تقاضا کیسے کیا جاسکتا ہے' جب ان کے پاس کچھ ہو ہی نہیں۔ یہ سب اچھے لوگ ہیں۔ نادہند نہیں ہیں۔ جب ان کے پاس پیسے ہوں گے تو بغیر کہیں ہمیں دے دیں گے۔"

"نانا' مجھے افسوس ہے کہ نانی سے آپ کی تلخی ہوئی۔" میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اس میں قصوروار میں ہوں۔ میں یہاں نہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ اگر تھا بھی تو ممی اور ڈیڈی کو یاد کرکے روتا تو نہیں۔ مجھے بہلانے کے لیے ہی نانی نے میلوڈین بجایا۔ میں اگر نہ روتا تو انہیں اس کا خیال بھی نہ آتا۔ اور اگر وہ میلوڈین نہ بجاتیں تو انہیں یہ خیال بھی نہ آتا۔"

"یہ کوئی خاص بات نہیں" نانا نے بھیڑیئے کالون کی سی بے نیازی سے کہا "لڑائیاں تو ہوتی رہتی ہیں ہماری۔"

"کیا واقعی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں۔ کیا تمہارے ڈیڈی اور مما نہیں لڑتے۔"

"لڑتے ہیں مگر وہ تو جوان ہیں۔ میں نہیں سمجھتا تھا....."

"کہ بڈھے لوگ بھی لڑتے ہیں" نانا نے میری بات پوری کردی "سنو میرے بچے' بڈھے بھی لڑتے ہیں۔ یہ تو زندگی ہے۔ محبت میں بے کیفی اور کمی واقع ہونے لگے تو لڑائی ہوتی ہے اور اس کے بعد محبت پہلے سے بھی بڑھ جاتی ہے اور پھر شہد کے ساتھ سرکہ بھی ہوتا ہے۔ یہی تو ازدواجی زندگی ہے ...اور یہی اس کے مزے ہیں" وہ کہتے کہتے رکے' جیسے کوئی بات اچانک سمجھ میں آئی ہو۔ پھر انہوں نے مجھ پر آنکھیں نکالیں اور غصے سے بولے "اور دیکھنے' کیا میں تمہیں بوڑھا دکھائی دیتا ہوں؟"

"دکھائی تو نہیں دیتے مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ بوڑھے ہیں" میں نے سادگی سے کہا۔

نانا ہنسنے لگے۔ خوب ہنسے "تم ہو مزے کے آدمی یار" انہوں نے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

گیابھن بھیڑ کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی.... اور میں اسے دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا "میرا خیال ہے' میں گاڑی والے بیلوں کو اضافی چارا دے آؤں" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "آخر آج کرسمس کی رات ہے۔ انہیں انعام ملنا چاہیے۔"

درحقیقت جیسے جیسے بھیڑ کا وقت قریب آرہا تھا' میں اسے

دیکھنے سے تاب ہوتا جارہا تھا۔ یہ تو مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ مجھے دیکھنے کو کیا ملے گا لیکن یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی تھی کہ اس قسم کے حقائق کے لیے ابھی میں بہت چھوٹا ہوں۔ یہ بڑوں کے معاملات ہیں انہیں ہی بھگتنے چاہئیں۔

میں باڑے کی طرف چلا گیا۔ پہلے میں نے گاڑی میں جوتے جانے والے بیلوں کی تواضع کی۔ پھر اصطبل کی طرف نکل لیا۔ نانا کے پاس گھوڑوں کی ایک جوڑی بھی تھی۔ ٹام اور ڈولی کھڑے کھڑے سو رہے تھے۔ میں نے ان کے آگے اچھی طرح چارا ڈالا۔ دونوں جاگ گئے۔ انہوں نے ہنہنا کر شکر گزاری کا اظہار کیا اور مزے سے کھانے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے ان دونوں کو کرسمس کی مبارک باد دی اور بھیڑوں کے شیڈ میں واپس آگیا۔

وہاں صورتِ حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔

"مائی گاڈ" میں نے کراہتے ہوئے کہا "یہ ابھی تک نمٹی نہیں۔"

"جب اس کا موڈ ہوگا' نمٹے گی" نانا بولے "آخر یہ آزاد بھیڑ ہے۔"

میں پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا اور بھیڑ کو دیکھنے لگا۔ اس کی بے چینی بہت بڑھ چکی تھی۔ میں اس کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے کچھ اور سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ "اچھا نانا" یہ بتائیں۔ یہ میلوڈین آیا کہاں سے؟" میں نے نانا سے پوچھا۔

اس کے نتیجے میں خاندان کی تاریخ سے میری آگہی کچھ اور بڑھ گئی۔

اپریل ۱۸۶۹ء کے ایک دن میری پرنانی سارہ اسی گھر کے کچن کی کھڑکی میں کھڑی اپنے شوہر ابراہیم کو کھیتوں میں کام کرتے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اس وقت زمین میں ہل چلا رہے تھے۔ اچانک وہ رک گئے۔ انہوں نے بیلوں کی جوڑی کو وہیں چھوڑا اور گھر کی طرف چل پڑے۔ ایسا انہوں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ یہ ان کی فطرت تھی کہ جب کوئی کام شروع کرتے تو اسے ختم کر کے ہی دم لیتے۔

میری پرنانی اس وقت بہت کم عمر تھیں۔ ان کی شادی کو صرف دو سال ہوئے تھے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ ان کے شوہر انہیں کیا بتانے کے لیے آرہے ہیں۔ پھر بھی نہ وہ روئیں نہ بے ہوش ہوئیں۔ بس انہوں نے چولھے پر چڑھی ہوئی سالن کی دیگچی کو بہت مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ابراہیم سیدھے کچن میں آئے اور انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے سیدھی بات کی "ہوویل کے نواح میں ایک نئی توپ خانہ رجمنٹ کے لیے بھرتی کی جارہی ہے" انہوں نے نانی سارہ کو بتایا "میں بھی اس میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں۔"

نانی سارہ نے کچھ بھی نہیں کہا۔ بس ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی رہیں۔

"تمہیں چھوڑ کر جانا میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے" نانا ابراہیم نے کہا "لیکن میری واپسی جلد ہوگی۔ دشمن کو شکست دینے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ بات یہ ہے کہ شجاعت ہمارا آبائی ہتھیار ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے زنگ لگے۔"

"اور یہاں کا کیا ہوگا؟" بالآخر یہ نانی سارہ نے پوچھا۔

"میں یہاں کے کاموں کے لئے ایک ملازم رکھ لوں گا۔ وہ زمین کی دیکھ بھال کیا کرے گا۔ تم اس کی نگرانی کرو گی۔ سب کام چلتا رہے گا۔"

نانی سارہ جلدی سے دیگچی پر جھک گئیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ شوہر ان کے آنسو دیکھے۔

نانا ابراہیم نے ان کا چہرہ اٹھایا اور ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ارے.... تم رو رہی ہو!"

"جی نہیں۔ دیگچی پر جھکی تھی۔ بھاپ کی وجہ سے آنکھوں میں پانی آگیا۔" نانی سارہ نے اپنی آواز سنبھالتے ہوئے کہا۔

"تو پھر بتاؤ۔"

"کیا....؟" نانی سارہ نے معصومیت سے پوچھا۔

"اگر تم بہادری سے میری جدائی سہہ سکتی ہو تو میں بھی بہادری سے جنگ لڑ سکتا ہوں۔" نانا ابراہیم نے کہا۔ "یہ بات بہت دنوں سے میرے ضمیر پر بوجھ بنی ہوئی ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں مگر مجھے اپنے اسلاف کے ورثے سے بھی محبت ہے اور اپنے وطن سے بھی اور شورش کرنے والے کبھی یہاں تک بھی آسکتے ہیں۔ ہمیں اس کا سدباب کرنا ہوگا اور ایک محبت کی خاطر دو محبتوں کو نظرانداز کر دینا بے انصافی بھی ہے۔ جبکہ میں جوان بھی ہوں اور صحت مند بھی۔ تو ایسے میں مجھے ایک بار فوج کو خدمات ضرور سونپنی چاہئیں۔"

"آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ مجھے آپ پر فخر ہے۔" نانی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "آپ کو اپنا فرض بھی ادا کرنا چاہیے اور دوسری محبتوں کا خراج بھی ادا کرنا چاہیے۔ میری محبت کبھی آپ کے راستے کی دیوار نہیں بنے گی۔"

میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ مجھے اَن دیکھے پرنانا اور پرنانی پر پیار آرہا تھا۔

"مما نے یہ تو کہہ دیا' مگر انہوں نے جو بات پاپا کو نہیں بتائی' وہ انہیں بہت مہنگی پڑی۔" نانا بولے۔

"وہ کیا بات تھی؟" میں نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔

"یہ کہ میں ان کے رحم میں آچکا ہوں۔"

بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ "میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں پگلے۔ مطلب یہ کہ جس وقت کی یہ بات ہے' مجھے مما کے پیٹ میں آئے دو ماہ ہو چکے تھے۔"

"تو بڑی نانی نے بڑے نانا کو یہ بات بتائی کیوں نہیں؟"

"انہوں نے سوچا کہ اگر انہوں نے یہ بتا دیا تو پاپا انہیں اس حال میں چھوڑ کر کبھی نہیں جائیں گے اور یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ پاپا کو نہ جانے کا قلق رہے گا اور ان کا ضمیر انہیں ملامت کرتا رہے گا۔"

"پھر....؟"

"پھر یہ کہ انہوں نے پاپا کو بتایا نہیں۔ انہیں جنگ پر جانے دیا۔ وہ خاموشی انہیں بہت مہنگی پڑی مگر وہ بہت بہادر عورت تھیں.... بہادر لوگوں کی اولاد۔"

باہر اب برفانی طوفان کسی زخمی درندے کی طرح چنگھاڑ رہا تھا۔

"میں میلوڈین کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"ارے ہاں.... ہوا یہ کہ پاپا نے رجمنٹ جوائن کرلی۔ ایک ہفتے بعد ہوویل کا ایک دکاندار گاڑی پر یہ آرگن لاد کر ہمارے گھر لایا۔ اس نے بتایا کہ میرے پاپا نے ہوویل میں اس کا آرڈر دیا تھا اور پہنچانے کے لئے پتا بھی دیا تھا۔ یہ پاپا کی طرف سے تحفہ تھا ماما کے لئے.... شکر گزاری کا اظہار تھا کہ انہوں نے انہیں جنگ پر جانے سے روکا نہیں۔ پاپا کو میرے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے سوچا' یہ آرگن ماما کا دل بہلانے میں کام آئے گا۔ ایک رفیق ثابت ہوگا۔ ماما پیانو بجانا جانتی تھیں۔ پمپ آرگن بجانا سیکھنے میں انہیں زیادہ وقت نہیں لگا۔"

"اور بعد میں انہوں نے آپ کو بھی سکھادیا؟" میں نے تائید چاہی۔

"ہاں۔ میں چاہتا تھا کہ پاپا لوٹ کر گھر آئیں تو میں ان کے لئے آرگن بجاؤں۔ ان کا استقبال کروں اس لئے میں نے بہت شوق سے آرگن بجانا سیکھا۔"

"آگے مجھے معلوم ہے۔ بڑے نانا کبھی واپس نہیں آئے مگر یہ تو بتائیں کہ ان کی وفات کا علم ہونے کے بعد آپ نے کبھی آرگن نہیں بجایا.... کیوں؟"

انہوں نے مجھے ایسی.... اور گہری نظروں سے دیکھا کہ مجھے پچھتاوا ہونے لگا۔ کاش.... میں نے یہ زخم نہ کریدا ہوتا۔ "اس لئے کہ اب میرے پاپا کبھی نہیں سن سکتے تھے۔ نہ وہ مجھے دیکھ سکتے تھے' نہ میں انہیں دیکھ سکتا تھا پھر میں کیوں بجاتا.... کس کے لئے بجاتا۔ کیا یہ وجہ کافی نہیں؟" نانا کے لہجے میں بے پناہ شدت تھی۔ اس لمحے وہ مجھے چھوٹے سے بچے کی طرح لگے۔

"کافی ہے نانا۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنا پرانا دکھ ان کے سینے میں اب تک نہ صرف زندہ.... بلکہ تازہ ہوگا۔ میں نے تصور کرنے کی کوشش کی کہ اگر میں نانا کی جگہ ہوتا اور اپنے ڈیڈی کی دید سے بھی محروم ہوتا تو میرا کیا ردِعمل ہوتا لیکن مجھ سے تو یہ سوچا بھی نہیں گیا۔ لڑکے اتنی اداسی' اتنی سوگواری کے متحمل ہی نہیں ہوسکتے مگر میں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ والدین کے والدین' اتنے بوڑھے لوگ اتنے دکھی بھی ہوسکتے ہیں۔

اس معاملے سے گھبرا کر میں نے توجہ گیا بھن بھیڑ پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ بھیڑ اچانک ہی گھبرا کر چلائی۔ اس کی اس چیخ میں اذیت تھی۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "خدایا.... یہ کیا....؟ یہ تو بلبلا رہی ہے۔"

"یہ اب تیار ہے۔"

میں نے جلدی سے لالٹین اٹھائی۔ "میں ذرا مرغیوں کو دیکھ آؤں۔" میں بس وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

"کیوں؟ تمہارے خیال میں مرغیاں کسی غیر معمولی صورتِ حال سے دوچار ہیں؟" نانا نے مذاق اڑایا۔ "تمہارے خیال میں وہ انڈوں کی جگہ ہیرے موتی دینے والی ہیں۔"

"آپ یہ سمجھ لیں کہ میں مرغیوں کا انسپکٹر ہوں۔" میں نے بھنا کر کہا اور ٹہلتا ہوا مرغیوں کے دڑبوں کی طرف چل دیا' جو بھیڑوں کے شیڈ کے برابر ہی تھا۔

دڑبوں میں دو سو کے قریب مرغیاں تھیں اور تیس سے زائد مرغے تھے۔ وہ سب اس وقت محوِ استراحت تھے لیکن لالٹین کی روشنی اور میرے قدموں کی چاپ نے انہیں بے آرام کردیا۔ ان کی نگاہوں میں میرے لئے ناپسندیدگی تھی۔ سرد راتوں میں اتنی دیر سے آنے والا بن بلایا مہمان کسے اچھا لگتا ہے۔ وہ یقیناً بہت ڈسٹرب ہوئے تھے۔ ان میں جو شریف قسم کے مرغے تھے' جو کچے لفنگے مرغوں کی طرح دن دہاڑے کی چھاپا ماری کو ناپسند کرتے تھے' اس مداخلت پر بہت جز بز ہوئے اور بھنا کر بانگ دینے لگے۔

میں نے جلدی سے لالٹین نیچے رکھی اور واعظوں اور سیاسی رہنماؤں کے درمیان کا سا انداز اختیار کیا۔ "خواتین و حضرات! میرے لئے یہ امر باعثِ فخر و مسرت ہے کہ اس مبارک اور مسعود رات میں مجھے آپ سے بات کرنے کا شرف حاصل ہورہا ہے۔ مجھے یہ احساس ہے کہ خطاب کے لئے یہ کوئی مناسب اور شریفانہ وقت نہیں اس لئے میں اختصار سے کام لوں گا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں آپ کو ایک اہم اور کام کی نصیحت کرنے آیا ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اور وہ نصیحت یہ ہے کہ آپ انڈے دیں' انڈے بنائے جائیں' انڈے دیے جائیں۔ کام کریں.... صرف کام.... محنت سے.... لگن سے۔ انڈے آپ کی واحد معیشت ہیں۔ بیٹ سے کچھ بھلا نہیں ہوتا مگر آپ سوچیں تو کہ آپ بیٹ کتنی دیتے ہیں اور انڈے کتنے کم۔ آپ انڈے زیادہ دیں اور بیٹ کم کریں تو یقیناً تھوڑے ہی عرصے میں خوشحال ہوجائیں گے اور روئے زمین پر مرغیوں کا سب سے زیادہ متمول معاشرہ آپ ہی کا ہوگا۔ محنتی مرغیوں اور مرغوں کو سلام۔" آخر میں' میں نے گرج کر کہا۔

مگر میری اس طویل مختصر تقریر کے دوران میں تمام سامعین سو چکے تھے۔ وہاں نہ چوں کی آواز تھی نہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ۔ شریف النفس مرغوں نے بھی اپنے شغل سے دستبردار ہوتے ہوئے آنکھیں موندلی تھیں۔

"لیکن نہیں میرے ساتھیو! زیادہ جان کھپانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے خود اپنی بات کی نفی کرتے ہوئے کہا۔ "جلد بازی شیطان کا کام ہے۔ سکون سے اپنا کام کریں۔ یاد رکھیں، روم ایک دن میں نہیں بنا تھا۔ نانی کی پسندیدہ اسٹڈ بیکر ایک ہفتے میں نہیں خریدی جاسکتی۔ اس کے لئے اربوں انڈوں کی ضرورت ہے اور آپ صرف دو سو ہیں۔ سو اس کی فکر چھوڑ دیں۔ آپ دن میں ایک سے زیادہ انڈے دے ہی نہیں سکتیں پھر بیکار پریشان ہو کر خود کو گھلانے کا کیا فائدہ۔ بہتر ہے، پُرسکون رہیں۔ زندگی سے لطف اٹھائیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں سمیٹیں۔ فطرت کو، اس کے نظاروں کو سراہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ کو مشین بننے کے بجائے فنکار بننے پر زور دینا چاہیے۔ تعداد ناممکن ہے تو اسے کوالٹی کے ذریعے حاصل کریں۔ خوب سوچیں، خوب سجے سجائے، منفرد اور غیر معمولی انڈے دینے کی کوشش کریں۔ کوئی ایسا عجیب و غریب انڈا دینے کے بارے میں سوچیں کہ لوگ ایک انڈا ایک کروڑ انڈوں کی قیمت میں خریدنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ یہی صورت ہے نانی پر احسان کرنے کی اور احساسِ عدم تحفظ سے چھٹکارا پانے کی۔ ورنہ میں آپ کو بتا دوں کہ آپ کتنا ہی زور لگائیں، کتنی ہی محنت کریں اور عام انڈے کتنے ہی دیں، بالآخر آپ کی آخری منزل نانی کے ہاتھوں حلال ہونا ہی ہے۔ ایسا جلد ہو یا بدیر اور یاد رکھیں، نانی کے ہاتھوں کٹنا شہادت بھی نہیں ہے۔" اس آخری بات کا ردِّعمل دیکھنے کے لئے میں نے نظر دوڑائی۔ ایک مرغے نے زوردار بانگ دی۔ ایک مرغی خوف سے پیلی پڑ گئی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا انڈا اندر ہی گھل گیا ہوگا۔ ان دو کے علاوہ باقی سب خوابِ خرگوش کے مزے لیتے رہے۔ میں نے جان لیا کہ یہ سب عاقبت نااندیش اور احمق لوگ ہیں، جنہیں آنے والے کل سے نہ کوئی غرض ہے، نہ اس کی کوئی فکر ہے۔

"خواتین و حضرات، مجھے جو کہنا تھا، میں کہہ چکا۔" میں نے تقریر سمیٹی۔ "آپ سب کو کرسمس کی مبارک باد۔ اب میں چلتا ہوں۔" میں نے کمر تک جھک کر اپنے سامعین کے سامنے احتراماً سر خم کیا، اپنی لالٹین اٹھائی اور بھیڑوں کے شیڈ کی طرف واپس چل دیا۔

لیکن شیڈ تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے گیا بھن بھیڑ کی دردناک چیخ سنائی دی۔ آواز اتنی بلند تھی کہ طوفان کا شور بھی اسے نہیں دبا سکا تھا۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ بیچاری بڑی اذیت میں ہے۔

میں وہاں پہنچا تو نانا اس پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ سوکھے بھوسے پر پہلو کے بل پڑی تھی۔ اس کی پچھلی ٹانگیں مخالف سمتوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ گلا پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔ اس کا ردعمل یہ تھا کہ بیچارہ اس کا نر کالون بھی حیران و پریشان کھڑا تھا۔ یہی نہیں، اس کے تمام ہم جنس جاگ کر کھڑے تھے اور بے حد پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ کالون کی تھوتھنی پر تو باقاعدہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شاید وہ پچھتا رہا تھا۔

"کوئی گڑبڑ ہے؟" میں نے نانا سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ یہ بے چاری سر توڑ کوشش کر رہی ہے مگر بات نہیں بن رہی ہے۔" نانا نے کہا اور بھیڑ کے پہلو کو جگہ جگہ سے دبا کر معائنہ کرنے لگے۔ "یا تو بچے کی ٹانگ کہیں پھنس گئی ہے۔ یا پھر پوزیشن ہی ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"بچہ الٹا ہے یا آڑا ہے۔ ایسے میں پیدائش میں دشواری ہوتی ہے۔" نانا نے کہا۔ "اصولاً سر نیچے ہونا چاہیے۔" وہ اکڑوں بیٹھے اور انہوں نے مزید معائنہ کیا۔ "میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کاش..... مجھے معلوم ہوتا۔"

نانا دانتوں سے ناخن کاٹنے لگے۔ میں نے انہیں اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اتنی شدید سردی تھی مگر ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے پھر وہ اٹھے۔ انہوں نے اپنی جیکٹ اتاری اور قمیص کی آستینیں چڑھانے لگے۔

"اب آپ کیا کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔ ایسے تو بات نہیں بنے گی۔ یہ مر جائے گی۔"

مجھ پر لرزہ چڑھنے لگا۔ حیرت انگیز طور پر ان کی بات پوری طرح میری سمجھ میں آگئی تھی۔ "نہیں نانا۔" میں نے کمزور آواز میں کہا۔

"یہ ضروری ہے بیٹا۔ جانور انسان کی ذمّے داری ہوتے ہیں۔ انسانوں پر لازم ہے کہ ضرورت کے وقت ان کی مدد کریں۔ میں اس وقت اس کی مدد نہیں کروں گا تو یہ بھیڑ اور اس کا بچہ دونوں ختم ہو جائیں گے اور مجھے اللہ کو جواب دینا ہوگا۔"

"خدایا۔"

"فکر نہ کرو۔ میں یہ پہلے بھی کر چکا ہوں۔ بچے کی ٹانگ پھنسی ہے تو اسے نکالنا ہے اور اگر پوزیشن میں خرابی ہے تو بچے کو گھما کر اس کا رخ تبدیل کرنا ہے۔"

میں نے دانت پر دانت جما دیے۔ "میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟" میں نے بڑی ہمت کر کے پوچھا۔

"ہاں! تم اس کی دلجوئی کرو۔ اس کا حوصلہ بڑھاؤ۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھ لو اور تھپتھپاتے، چمکارتے رہو۔ یہ شدید تکلیف میں ہے۔"

"ٹھیک ہے نانا۔ یہ کام تو میں کر سکتا ہوں۔" میں نے سکون کا

سانس لیتے ہوئے کہا۔
میں کبھی کسی چیز سے اتنا نہیں ڈرا۔ کسی کام سے اتنا نہیں بچا۔ مجھے بھیڑ پر ترس آرہا تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اذیت کے اس عالم میں وہ کیا کر بیٹھے گی۔ وہ تو کچھ بھی کر سکتی تھی۔ مجھے کاٹ بھی سکتی تھی' لات بھی مار سکتی تھی.... اور کچھ بھی کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں خوفزدہ تھا۔ اس کے باوجود میں بے حد احتیاط سے نیچے بیٹھ گیا اور میں نے اس کے سر کو اپنی بانہہ کے حلقے میں لے لیا پھر میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

نانا اپنی کارروائی میں مصروف ہوگئے مگر میں نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

اس وقت اس شیڈ کا جو منظر تھا' اس نے مجھے ایک کیلنڈر پر چھپی تصویر یاد دلا دی۔ اس میں لالٹینوں کی روشنی کے گرد ہالہ تھا۔ بھوسے کے تنکے سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ بھیڑیں خاموش کھڑی تھیں اور ایک بوڑھا آدمی ایک بھیڑ پر یوں جھکا ہوا تھا' جیسے اللہ کے حضور دعا کر رہا ہو پھر مجھے اس ابتلا کا خیال آیا' جس میں نانا' وہ بھیڑ اور میں پھنسے ہوئے تھے اور مجھے لگا کہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔ میں دھماکے سے پھٹ جاؤں گا۔

اچانک بھیڑ نے ایسی چیخ ماری کہ پہلے نہیں ماری تھی۔ ساتھ ہی اس نے پوری قوت سے اپنے سر کو جھٹکا۔ اسے قابو میں رکھنے کے لئے مجھے زور لگانا پڑا۔ اپنے دونوں بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹنے پڑے۔ میں نے اس کی تھوتھنی اپنے چہرے سے لگالی۔ اسے قابو میں رکھنے کی ایک یہی صورت تھی۔

"پلیز.... میری ننھی بھیڑ.... ہلو مت۔ شاباش۔" میں نے اسے چمکارا۔ اس کی لتھڑی ہوئی سانسیں میری ناک میں گھسی جا رہی تھیں۔ "میری ننھی بھیڑ.... فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم کامیاب رہیں گے۔" اس کے باوجود میں اسے چمکارتا رہا' تھپتھپاتا رہا۔

مجھے نہیں پتا' وہ ایک منٹ تھا یا ایک گھنٹا۔ بہرحال وہ وقت گزر گیا اور اچانک بھیڑ نے ایک دم خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں گھبرا گیا۔ مجھے تو ایسا لگا' جیسے وہ مر گئی ہے۔

"میرے خدا۔" مجھے نانا کی چہکتی آواز سنائی دی۔

مجھ میں آنکھیں کھولنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ "کیا ہوا نانا؟" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں بمشکل پوچھا۔

"میمنا ہے.... اور کیا ہوتا؟"

"اور ٹھیک ٹھاک ہے؟"

"چاق و چوبند۔ تندرست و توانا۔"

میں نے آنکھوں کی جھریوں سے دیکھا۔ نومولود میمنا سوکھی گھاس کے تنکے چبا رہا تھا مگر اس کے پیٹ سے بندھی ہوئی ایک سرخ ڈوری بھی مجھے نظر آرہی تھی۔ میں نے پھر آنکھیں بھینچ لیں۔ چند لمحے بعد میں نے آنکھ کھولی تو نانا نال کاٹ چکے تھے۔ "یقین نہیں آتا۔" وہ بڑبڑائے۔ "یہ کرسمس کا میمنا ہے۔ کیسی ناممکن بات ہے۔"

"مجھے بھی یقین نہیں آتا۔" میں نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔

"اب تم اس بیچاری کو تو چھوڑ دو۔" نانا نے کہا۔ "یہ اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہے۔"

میں نے بھیڑ کے سر کو اپنی گرفت سے آزاد کیا اور اٹھ کھڑا ہوا پھر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ نانا نے میمنے کو سوکھی گھاس پر اس کی ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔ بھیڑ نے سر آگے کی طرف بڑھایا اور بڑی محبت سے اسے چاٹنے لگی۔ میں نے ایک نظر انہیں دیکھا پھر دور جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جسم کی جان نکل چکی ہے۔

میں نے بازو سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا۔ مجھے عمل پیدائش کی تھیوری پہلے ہی سے معلوم تھی لیکن درحقیقت میں جانتا کچھ بھی نہیں تھا اور جو کچھ اب میں نے جانا اور سمجھا تھا' وہ خوش کن ہرگز نہیں تھا۔ زندگی کے راز' زندگی کے حقائق کم ہی خوش کن ہوتے ہیں۔

بہرحال مجھے لگ رہا تھا کہ پچھلے چند گھنٹوں نے مجھے بڑا کر دیا تھا۔ میں لڑکے سے مرد بن گیا تھا۔ میں نے اس بھیڑ اور میمنے کے حوالے سے پیدائش کے عمل کو سمجھ لیا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ انسان کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ میرے پرنانا ابراہیم' بڑی نانی سارہ' نانا' نانی' میرے ڈیڈی اور ممی.... اور میں خود کیسے پیدا ہوا ہوں گا۔ مائیں کتنی اذیت اٹھاتی ہیں تو زندگی کی افزائش ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے اللہ نے ماں کے پاؤں کے نیچے جنت رکھی ہے۔

میں بہت کچھ سمجھ رہا تھا۔ انسان اذیتیں اٹھاتا اس دنیا میں آتا ہے' پھر یہاں جدوجہد کرتا اور تکلیفیں اٹھاتا ہے لیکن یہ اذیت اسے احساس فتح سے ہمکنار کرتی ہے۔ اس لمحے میں نے اپنے نانا کو دیکھا۔ ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

میں اٹھا تو میرے ہونٹوں پر بھی ایک کشادہ مسکراہٹ تھی۔ میں اس وقت خود کو زندگی سے بھرپور اور بہت بڑا محسوس کر رہا تھا۔

اچانک نانا نے پوری قوت سے اپنی ہتھیلی پر گھونسا مارا۔ "آئل پل" انہوں نے بلند آواز میں کہا پھر انہوں نے جلدی سے اپنی ٹوپی سر پر جمائی' جیکٹ اٹھائی اور مجھے بہت غور سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں جیسے کوئی آگ جل رہی تھی۔ "حارث.... میرے بچے۔ تمہارا کیا خیال ہے' ہم اسے اسٹارٹ کر سکتے ہیں؟"

"کسے اسٹارٹ کر سکتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں ٹریکٹر کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیوں؟ ٹریکٹر اسٹارٹ کر کے کیا کرنا ہے۔" میں اب بھی حیران تھا۔

"اس پر آرگن لاد کر چرچ پہنچا سکتے ہیں۔"

"اوہ.... اوہ...." میں نے گہری سانس لی۔ "کیوں نہیں.... وہ اسٹارٹ کیوں نہیں ہوگا؟"

"اس لئے کہ میں نے موسم سرما میں کبھی اسے اسٹارٹ ہوتے نہیں دیکھا ہے۔" نانا نے کہا۔ "لیکن بیٹے.... اگر ہم اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر برف کی بھی ایسی کی تیسی۔ اس پر تو کچھ بھی لاد کر کہیں بھی لے جا سکتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" میں بھی ایکسائیٹڈ ہو گیا۔ "ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں نانا۔"

"اے..... زیادہ جذباتی مت بنو۔ فاصلہ چھ میل کا ہے اور یہ بہت خوفناک طوفانی رات ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو' ہم کامیاب ہو جائیں گے؟" ان کے لہجے میں التجا در آئی۔ وہ مجھ سے مثبت جواب سننا چاہتے تھے۔

"کیوں نہیں نانا۔ ناکامی کا تو سوال ہی نہیں۔" میں نے بے حد خلوص اور جوش سے کہا۔

"دیکھ بیٹے' میں اب نہ جوان ہوں' نہ اتنی جان ہے مجھ میں۔"

"تو میں آپ کی مدد کروں گا۔"

"بیٹے' وہ آرگن بہت قیمتی ہے۔ بہت اعلیٰ لکڑی کا بنا ہوا ہے اور وہ یادگار بھی ہے۔"

"ہم بہت احتیاط برتیں گے۔ اس پر خراش بھی نہیں لگے گی۔"

"میرے پاس اس آئل پل کی کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ سردی کے موسم میں اسے کیسے اسٹارٹ کیا جا سکتا ہے لیکن پڑھنا بہت آسان ہوتا ہے اور لکھے ہوئے کے مطابق عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"چھوڑیں نانا۔ کوشش کریں گے تو نتیجہ ضرور نکلے گا۔ ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"کہنا آسان ہوتا ہے بیٹے اور کرنا مشکل۔ سوچو تو یہ کام ناممکن لگتا ہے۔"

"ناممکن تو اس موسم میں میمنے کی پیدائش بھی تھی لیکن دیکھ لیں' یہ سچ مچ کا..... جیتا جاگتا ہے کہ نہیں۔"

نانا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "خدا کی قسم' یہ تم نے بڑی سچی بات کہی ہے۔ معجزے تو اب بھی ہو جاتے ہیں۔ بس اللہ کی مرضی ہونی چاہیے۔" وہ کہتے کہتے رکے اور چند لمحے ہچکچائے۔ "مگر ایلی کا مسئلہ بھی تو ہے۔ یہ اس کے لئے سرپرائز ہونی چاہیے ورنہ مزہ نہیں آئے گا۔"

"تو ہم نانی کو بتائیں گے ہی نہیں۔"

"ایلی بہت ہلکی نیند سوتی ہے۔ کوئی دبے پاؤں قریب سے گزرے تو جاگ جاتی ہے۔" نانا جوانوں کے سے انداز میں ہنسے۔ "اور ہمارے اس ٹریکٹر کی آواز! اسے یہاں اسٹارٹ کریں تو بلغراد میں بھی بھگدڑ مچ جائے۔ تم نے اس کی آواز سنی ہی نہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا میرے پاس۔

"چلو..... کہیں چل بیٹھتے ہیں۔ مل جل کر سوچیں گے تو شاید کچھ سوجھ ہی جائے گا۔"

ہم ذرا دور جا کر بھوسے پر بیٹھ گئے۔ میں ایک تنکے سے دانت کرید تا رہا۔ نانا اپنی مونچھوں کا کنارہ مروڑتے رہے۔ معاملہ بہت گمبھیر تھا۔ وہ کرسمس کی سرد ترین رات تھی۔ درجۂ حرارت صفر سے کتنا نیچے ہے' یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ اس موسم میں ایک بوڑھا شخص اور اس کا تیرہ سالہ نواسہ ایک ناممکن کام کرنا چاہ رہے تھے۔ پہلے مرحلے میں انہیں نقطۂ انجماد سے نیچے کے موسم میں ایک بے حد پرانا ٹریکٹر اسٹارٹ کرنا تھا..... اور وہ بھی ایک ایسی خاتون کی لاعلمی میں' جو گہری نیند نہیں سوتی تھی اور ٹریکٹر ایسے اسٹارٹ ہوتا تھا' جیسے توپ سے گولا داغا گیا ہو۔ دوسرے مرحلے میں بھاری آرگن کو ٹریکٹر پر لادنا تھا۔ تیسرے مرحلے میں ایسے موسم میں' جب راستے برف سے ڈھکے ہوئے تھے' اسی ٹریکٹر کو چھ میل دور لے کر جانا تھا اور برف باری جاری تھی اور اس آرگن کو اگلی صبح اتوار اور کرسمس کی سروس میں استعمال ہونا تھا اور صبح صرف چند گھنٹے دور تھی۔

"وہ اسے بجاتی نہیں لیکن اس آرگن سے اسے بہت محبت ہے۔ اسے خود سے جدا کرنا ایلی کے لئے آسان نہیں۔" نانا پُرخیال انداز میں بڑبڑائے۔

میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی۔ میں دوسرے مسائل پر غور کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ نانا بڑے حوصلے اور ہمت والے ہیں لیکن ان میں اتنا اسٹیمنا بھی ہوگا؟ ان کی عمر ستر کے قریب تھی۔ میں نے سنا تھا کہ اتنی عمر میں آدمی کا ایک پاؤں قبر میں ہوتا ہے۔ اگر راستے میں کوئی خوفناک بات ہو گئی تو.....؟ تو کیا ہوگا؟ میرا کیا ہوگا؟ میں کچھ کر سکوں گا؟

"ایلی بہت بہادر عورت ہے۔" نانا نے کہا۔ "میری ماما سارہ کی طرح۔"

میں اپنی سوچ جا رہا تھا۔ نانا نے تو نانی سے کہہ دیا تھا کہ کل چرچ میں سروس ہونا ہی ناممکنات میں سے ہے۔ تو پھر اتنی مشقت کر کے آرگن وہاں پہنچانے کا فائدہ۔ یہ مشن ہی بے سود لگ رہا تھا۔

"یہ طوفان ساری رات چنگھاڑتا رہے گا۔" نانا بولے۔ "اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی بھی وقت اس کا زور ٹوٹ جائے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی دعوے سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اور اگر نانی ٹریکٹر کی آواز سن کر جاگ گئیں تو مزہ ہی کرکرا ہو جائے گا۔ نانا تو انہیں سرپرائز دینا چاہتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ راستے میں ٹریکٹر برف میں پھنس جائے اور میں اور نانا وہیں منجمد ہو کر وفات پا جائیں۔

"شادی کے بعد یہ پہلا کرسمس ہے کہ میں نے ایلی کو کوئی تحفہ نہیں دیا۔" نانا نے سوگوار لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ آرگن چرچ پہنچا

دیا جائے اور صبح سروس میں کام آئے تو یہ اب تک کا سب سے بڑا' سب سے قیمتی تحفہ ہوگا میری طرف سے.... ایلی کے لیے۔"

"مگر یہ ناممکن ہی لگتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ اچانک میرے اندر اس اُمنگ کی ایک لہر اٹھی' جو صرف نوجوانوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ میں نے سوچا' ایسے ناممکن کام کرکے ہی تو سچی خوشی ملتی ہے۔

اچانک نانا نے میرے بازو کو چھو کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بچوں کی سی خوشی چمک رہی تھی۔ "تم ذرا کل صبح اپنی نانی کے چہرے کا تو تصور کرو۔ وہ کل صبح چرچ میں داخل ہوں گی اور اچانک..... بالکل اچانک انہیں وہ آرگن نظر آئے گا۔ کیسا لگے گا!"

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔"

نانا مسکراتے رہے۔ پھر انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "تو پارٹنر' کیا خیال ہے۔ کوشش تو کریں نا؟"

"بالکل۔" میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت ہم ہر دشواری بھول گئے تھے۔ برفانی طوفان' بھاری آرگن اور چھ میل کا ناممکن فاصلہ۔ ہم سر جوڑ کر تفصیلات طے کرنے لگے۔ منصوبے کی نوک پلک درست کرنے لگے۔ بتدریج ایک خاکہ سا تیار ہوگیا۔ اس پر عمل کرنا کسی ہیرو ہی کا کام تھا۔ ہمارے سینے کچھ کرنے سے پہلے ہی فخر سے پھول گئے۔ اس میں خطرات بھی تھے اور بدمعاشی بھی۔ ہمارے جسموں میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ ہم دو سازش کرنے والوں کی طرح سر جوڑ کر بیٹھے درپیش چیلنج سے نمٹنے کی ترکیبیں سوچتے رہے۔ یہ طے تھا کہ ہم ایک بہت بڑی مہم پر جارہے تھے۔

"ٹھیک ہے۔" نانا نے ٹوپی کو کھول کر کانوں پر پھیلاتے ہوئے کہا پھر انہوں نے بھیڑ اور اس کے نوزائیدہ میمنے کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر یہ معزز خاتون کرسمس کے موقع پر جنم دے سکتی ہے تو اس کا مطلب ہے معجزوں کا دور ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ اور ہمیں ایک معجزے ہی کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔" میں نے ایسے کہا' جیسے ان کا کوئی ہم عمر دوست ہوں۔ نہیں..... بلکہ وہ مجھے اپنے ہم عمر دوست لگ رہے تھے۔

"بس تو اب کام شروع کردینا چاہیے۔" وہ نتھنے پھلاتے ہوئے بولے۔

ہم گھر کی طرف چل دیے۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی کہ ہم نے جو کام اپنے ذمّے لیا ہے' وہ ہماری طاقت سے باہر ہے۔ نانا نے ایک لالٹین لی اور تہ خانے میں چلے گئے۔ میں کچن میں داخل ہوگیا۔

"کیا ہوا؟ میمنا آگیا؟" نانی نے پوچھا۔

"نہیں' ابھی تو نہیں۔" میں نے جھوٹ بولا۔ "میرا خیال ہے' ہمیں اس بھیڑ پر پوری رات کھپانی ہوگی۔"

"یہ تو بڑی زیادتی ہوئی تم لوگوں کے ساتھ۔ اچھا' اچھا' منصر کہاں ہیں؟"

"تہ خانے میں۔ آتے ہی ہوں گے وہ بھی۔"

نانی رات کی تیاریوں میں مصروف رہیں۔ انہیں ہاٹ واٹر بوتلیں تیار کرنی تھیں۔ سردی سے بچنے کے لئے برقی کمبل کے ساتھ یہ بوتلیں بھی استعمال کی جاتی تھیں۔

نانا کچن میں آئے۔ ان کے ہاتھ میں ٹن کی دو پیالیاں تھیں۔

"میں نے سوچا' سیب کا جوس ہی ٹرائی کیا جائے۔"

"اب تک تو وہ نشہ آور ہوگیا ہوگا۔" نانی بولیں۔

"ارے نہیں۔" نانا نے کہا۔ "اس کے لئے تو کم از کم دو تین گرم دن چاہئیں۔"

نانی ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگیں۔ میری نانی الکحل کسی بھی شکل میں نہیں قبول کرتی تھیں۔ انہیں تو وائن کا ایک گلاس بھی گوارا نہیں تھا۔ اس موضوع سے بچنے کے لئے وہ بننے والی سوئیاں اور اون کا گولا لے کر بیٹھ گئیں۔ نانا یہی چاہتے تھے کہ ان کا دھیان بٹے اور انہیں اپنی کارروائی کا موقع مل جائے۔ انہوں نے کپ بورڈ سے تین چھوٹے گلاس نکالے اور ٹن کے ایک کپ میں موجود مشروب دو گلاسوں میں انڈیلا اور دوسرے کپ کا مشروب انہوں نے پورا تیسرے گلاس میں انڈیل دیا۔ مجھے آنکھ مارتے ہوئے وہ تیسرا گلاس انہوں نے نانی کی طرف بڑھایا۔ باقی دونوں گلاسوں میں سے ایک انہوں نے مجھے دے دیا۔

"لو بھئی..... کرسمس مبارک ہو۔" نانا بولے۔ "خدا کرے' یہ طوفان بھی جان چھوڑ دے۔"

"اور زمین پر امن قائم ہو اور انسانوں کو فلاح نصیب ہو۔" نانی نے جام تجویز کیا۔

میں نے اور نانا نے سیب کے میٹھے مزے دار جوس کا گھونٹ لیا۔

نانی نے بھی سپ لیا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے تھے منصر۔" وہ بولیں۔ "یہ خوش ذائقہ ہے۔ اور ابھی بھاری نہیں ہوا ہے۔" وہ مسکرائیں۔

اس پر نانا بھی مسکرائے۔ میں بھی مسکرا دیا۔

ہم بیٹھے رہے۔ نانی کی انگلیاں سلائیوں کو گھما رہی تھیں۔ شاید وہ کوئی سوئیٹر بن رہی تھیں۔ "غیر مصروف ہاتھ شیطان کا کام کرتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔ "اسی لئے میں اپنے ہاتھوں کو ہمیشہ مصروف رکھتی ہوں۔"

میں نے سوچا' گٹھیا کی تکلیف کے باوجود نانی کا یہ حال ہے۔

نانی کو مزید "سیب کا جوس" دیا گیا۔ ان کے اندر ایک ترنگ پیدا ہوئی اور وہ بہت خوش مزاج لگنے لگیں۔ انہوں نے مجھ سے

کہا۔ "میں تمہیں ایک چھوٹی سی کہانی سناتی ہوں۔ دیکھو' عزت نفس اور وقار کا کیسے خیال رکھا جاتا ہے۔" انہوں نے کن انکھیوں سے نانا کو دیکھا اور بات آگے بڑھائی۔ "اب میں سوچتی ہوں' شاید یہ بھی عزو وقار کی بات ہے کہ میں کرسمس کی صبح اپنے میلوڈین کو چرچ میں دیکھنے کی خواہش کر رہی تھی اور میں نے نہیں سوچا کہ یہ ممکن ہے یا نہیں۔ بہرحال جو کہانی میں سنا رہی ہوں' وہ تمہاری مما کے متعلق ہے۔ سنو اور سمجھو کہ عزت اور وقار کے لئے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔"

میں اور نانا' نانی کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"اس وقت تمہاری مما کی عمر سولہ سال ہوگی۔" نانی نے کہا۔ "ہمیں ہوڈیل کے ایک بینکار نے اپنے ہاں پارٹی میں مدعو کیا۔ عائشہ بھی گئی۔ ان دنوں نارنگیاں بہت قیمتی چیز ہوا کرتی تھیں اور مہمانوں کو نارنگیاں پیش کرنا تواضع کی حد ہوتی تھی۔ جسے سال میں ایک نارنگی میسر آجاتی تھی' وہ بے حد خوش نصیب کہلاتا تھا۔" نانی نے "سیب کے جوس" کا ایک اور طویل گھونٹ لیا۔ "واہ.... بہت مزے کا ہے۔" انہوں نے ایک پھندا لگانے کی کوشش کی لیکن سلائیوں پر ان کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ ان کی پیشانی پر فکر کی لکیریں نمودار ہوگئیں۔ "یہ گٹھیا بڑا تکلیف دہ مرض ہے۔ کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑتا۔" انہوں نے آہ بھر کے کہا۔ "ہاں' تو میں کہہ رہی تھی کہ تمہاری ماں عائشہ کو اس پارٹی میں مدعو کیا گیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ شام کو کس وقت نارنگیوں کی چھوٹی ٹوکری مہمانوں کے درمیان گردش میں لائی جائے گی۔ چنانچہ میں نے عائشہ کو نصیحت کی کہ عزت اور وقار بڑی چیز ہوتی ہے۔ آدمی کو سر اونچا کر کے فخر اور عزت سے رہنا چاہیے۔ میں نے کہا۔ جب ٹوکری تمہارے سامنے آئے تو تم نارنگی کے لئے ہاتھ مت بڑھانا۔ تم یہ تصور کرنا کہ گھر پر ہر روز تمہیں ایک نارنگی کھانے کو ملتی ہے۔ دوسرے لوگ جھپٹ جھپٹ کر نارنگیاں لیں گے پھر ٹوکری دوسری بار تمہارے سامنے لائی جائے تو ذرا ہچکچانا.... اور چند لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد ایک نارنگی لے لینا۔ دیکھو بیٹی' یہ ہوتے ہیں سیر چشموں کے طور طریقے۔ سمجھ گئیں نا؟"

نانی نے پھر ایک پھندا لگانے کی کوشش کی اور ناکام رہیں۔ اب ان کی انگلیاں مرتعش تھیں۔ نانا نے ان کی نظر بچا کر مجھے آنکھ ماری۔ نانی نے سیب کے جوس کا ایک اور طویل گھونٹ لیا۔ "کیا کہہ رہی تھی میں؟"

درحقیقت نانی جو کچھ پی رہی تھیں' وہ جوس نہیں' نشہ آور مشروب تھا۔ یہ بات نانا نے مجھے پہلے ہی بتادی تھی۔ "یہ بے ضرر ہے۔ ایسا ہے' جیسے آپ کے دماغ پر کوئی تتلی آکر بیٹھ گئی ہو۔" انہوں نے کہا تھا۔ "لیکن زیادہ مقدار میں لیا جائے تو یہ بچھو کے ڈنک سے بڑھ کر ثابت ہوتا ہے۔" دراصل نانا یہ چاہتے تھے کہ نانی ایسی بے خبر سوئیں کہ آئل پل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی انہیں نہ جگا سکے۔

"ہاں.... تو میں کہاں تھی؟" نانی نے پھر پوچھا۔

"آپ پارٹی کا واقعہ سنا رہی تھیں۔"

"کون سی پارٹی؟" نانی نے حیرت سے پوچھا۔

"نارنگیوں والی۔"

"ہاں.... پارٹی۔" اب نانی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ "خیر.... وقت آیا اور نارنگی کی ٹوکری گردش میں لائی گئی۔ تمہاری ماں نے نارنگیوں کو نظرانداز کردیا۔ یہ دیکھ کر سب لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ عائشہ کا جی تو مچلا لیکن اس نے دل کڑا کر کے کہا۔ "جی شکریہ۔" نانی کے ہاتھ سے سلائیاں گر گئیں۔ وہ نیچے دیکھنے لگیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے انہیں چونکایا۔

"کہاں کیا ہوا؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"ممی نے نارنگی نہیں لی پھر کیا ہوا؟"

"اوہ نارنگی۔ ہاں.... ہوا یہ کہ ٹوکری دوبارہ گردش میں آئی ہی نہیں۔ لوگوں نے پہلے ہی ہلے میں صاف کر ڈالی۔ میں کہتی ہوں...."

"کیا کہتی ہو؟" نانا نے پوچھا۔

نانی اٹھیں اور لڑکھڑا گئیں۔ انہوں نے ذرا جھک کر کرسی کا سہارا لیا۔ "مجھے چکر آرہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا منصر کہ بات کیا ہے۔ نیند سے بُرا حال ہے میرا۔"

نانا تیزی سے اٹھے۔ "تو سو جاؤ۔ چلو' میں تمہیں بیڈ تک پہنچا دوں۔"

نانا نے نانی کا ہاتھ تھاما اور انہیں بیڈ روم میں لے گئے۔ میں نے اون کا گولا اور سلائیاں دراز میں رکھ دیں پھر میں نے نانی کے گلاس کا بچا ہوا مشروب سنک میں انڈیلا اور گلاس کو اچھی طرح دھو ڈالا۔ مشروب جیسے ہی نیچے اترا' وہاں پٹاخہ سا چلا۔ میں گھبرا گیا۔ یہ نانا نے کیا پلا دیا نانی کو۔

کمرے سے نانی کے گانے کی زوردار آواز آرہی تھی پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔ مجھے حیرت ہونے لگی۔ یہ نانیاں' دادیاں ایسے جوان لڑکیوں کی طرح تو نہیں ہنستیں۔

ذرا دیر بعد نانا کچن میں واپس آئے اور میرے پاس بیٹھ گئے۔ ہم نے کلاک پر نظر ڈالی۔ دس بجنے والے تھے۔ ہم انتظار کرتے رہے مگر یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ بیڈ روم سے نانی کے خراٹوں کی خوش کن آواز سنائی دینے لگی۔ نانا نے سرگوشی میں مجھے اوپر جاکر تیار رہنے کی ہدایت کی۔

میں تیار ہو کر نیچے آیا۔ لکڑی کے شیڈ میں جاکر ہم نے لالٹینیں جلائیں پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ شاید ہم دونوں ہی کو یقین کی ضرورت تھی.... خود پر بھی اور ایک دوسرے پر بھی۔

پھر ہم نے دروازہ کھولا اور باہر چیختے چنگھاڑتے طوفان میں نکل گئے۔

○☆○

ہم سیدھے غلہ گودام میں گئے۔ یہ گودام ایک طرف سے کھلا ہوا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ جنوب کی جانب سے کھلا ہوا تھا کیونکہ سرد طوفانی ہوا شمال کی سمت سے چل رہی تھی۔ سب سے پہلے ہم نے لالٹینوں میں تیل بھرا۔ اس بات کی بڑی اہمیت تھی کہ لالٹینیں راستے میں دھوکا نہ دے جائیں پھر میں نے لالٹین سے نانا کو راستہ دکھایا کیونکہ وہاں مشینری اور آلات کا انبار تھا۔ ٹریکٹر کے پاس پہنچ کر نانا اس کے آگے پیچھے گھوم کر اس کا معائنہ کرتے رہے پھر انہوں نے ٹریکٹر کی ٹنکی بھی پوری طرح بھردی۔

میں اس ٹریکٹر کی پوری تفصیل بیان کرنا چاہتا ہوں اور یہ آسان کام نہیں۔ پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ آپ اپنے ذہن سے جدید ٹریکٹر کے تصور کو کھرچ دیں۔ نانا کا ٹریکٹر ہارس پاور سے لدا پھندا نہیں تھا۔ وہ سیلف اسٹارٹر کی عیاشی سے بھی محروم تھا۔ اس میں ہیڈ لائٹس اور سیٹ کشن بھی نہیں تھے۔ ریڈیو نصب ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ذہن میں رکھیں کہ وہ ۱۹۲۸ء کا ماڈل تھا۔ وہ رملے کا آئل پل ماڈل ۴۰۔۲۰ تھا اور وہ اتنا بڑا اور بھاری تھا کہ آج کے دور میں اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

ٹریکٹر میں سامنے کی طرف ایک چوکور چمنی تھی' جو انجن کے موڈ کے مطابق مختلف مقداروں میں دھواں اگلتی تھی۔ سائیڈ میں ماڈل کا نام اور کمپنی کا نام لکھا تھا۔ انجن ۸x۱۰ انچ سائز کا تھا۔ یہ دو سلنڈر والا افقی انجن تھا۔ یہ مٹی کے تیل سے چلتا تھا اور اس کی دو رفتاریں تھیں۔ کم رفتار دو میل فی گھنٹا تھی اور پوری رفتار ۳.۲ میل فی گھنٹا تھی۔ بیلٹ وھیل پر ۴۰ ہارس پاور کی قوت تھی اور وہ ایک منٹ میں ۴۵۰ بار گھومتا تھا۔ پہیے اسپوک کیے گئے کاسٹ آئرن کے تھے۔ عقبی پہیے تقریباً چھ فٹ اونچے تھے' اگلے پہیوں اور ٹرانسمیشن کے اوپر کیب تھی' جس کے اوپر ایک سائبان تھا۔ وہاں ڈرائیور کے لئے آہنی سیٹ تھی اور اسٹیرنگ وھیل تھا.... اور دیگر کنٹرول تھے۔ یہ ٹریکٹر سولہ فٹ لمبا اور دس فٹ اونچا تھا۔ اس کا وزن تقریباً ساڑھے چھ ٹن تھا۔ اس میں بس ایک کمی تھی۔ اس میں آرمر پلیٹیں لگادی جاتیں' دو ایک گنیں نصب کردی جاتیں اور کیب کو گھمانے کا بندوبست کردیا جاتا تو وہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں کسی بھی ٹینک سے برابری کی بنیاد پر مقابلہ کرسکتا تھا۔ کم از کم میں نے اس سے پہلے اس نوعیت کی کوئی چیز کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ہول آنے لگا۔

میری نانی کے نزدیک وہ بہت مہنگا تھا۔ وہ جس گاڑی کی آرزو رکھتی تھیں' یہ اس سے کئی گنا قیمت دے کر خریدا گیا تھا۔ میرے نانا کے نزدیک وہ ٹریکٹر طاقت ' عزت اور سربلندی کا نشان تھا لیکن بہرحال میرے نانا اس کے لئے متضاد جذبات رکھتے تھے۔ انہیں اس سے محبت تھی کیونکہ اس کی مدد سے پچھلے کئی سال سے پورے گاؤں میں ہونے والی گندم کی فصل کا دانہ دانہ الگ کیا جاتا رہا تھا لیکن شاید اس سے نفرت بھی تھی کیونکہ اب تک اس سے انہیں ایک دھیلے کی آمدنی بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ معاشی بدحالی کا زمانہ تھا۔ اس میں وہ کسی سے صلہ مانگتے تو وہ بے رحمی ہی کہلاتی۔ جبکہ ٹریکٹر کی خوراک کم نہیں تھی اور انہیں اس کا بندوبست اپنے پلے سے کرنا پڑتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ انہوں نے غربت میں ہاتھی پال لیا تھا اور میرے نزدیک وہ ایک ایسی عجیب الخلقت مشین تھی' جسے اس وقت' اس شدید موسم میں پٹانا تھا تاکہ اس کی مدد سے میلوڈین چرچ تک لے جایا جاسکے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ہم ایک چوہے کو حرکت دینے کے لئے ایک پہاڑ کو آگ لگا رہے تھے۔

بہرحال پہلا مسئلہ اسے اسٹارٹ کرنا تھا۔ درجۂ حرارت.... درجۂ حرارت تو نہیں کہا جانا چاہیے۔ بہرحال ٹمپریچر اس وقت نقطۂ انجماد سے کم از کم دس درجے نیچے رہا ہوگا۔ انجن ایسا سرد ہو رہا تھا کہ اگر وہ کوئی مخلوق ہوتا تو مرچکا ہوتا۔ اتنے بڑے اور جسیم ٹریکٹر سردیوں میں اسٹارٹ ہی نہیں ہوتے۔ اس موسم میں ان کا کام ہی نہیں ہوتا۔ وہ بس بیکار پڑے اینڈتے رہتے ہیں۔

نانا نے سب سے پہلے دونوں سلنڈروں کے کپ میں گیسولین انڈیلا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ یہ مٹی کے تیل سے چلتا ہے۔" میں نے کہا۔

"چلتا تو ہے لیکن گیسولین زیادہ گرمی فراہم کرتی ہے۔" نانا نے وضاحت کی۔ "چنانچہ ہم اسے گیس سے اسٹارٹ کریں گے اور گیس پر ہی چلائیں گے۔ یہاں تک کہ انجن پوری طرح گرم ہوجائے پھر ہم مٹی کے تیل پر اسے چلاسکیں گے۔"

نانا نے دستانے اتارے اور فلائی وھیل کی طرف گئے۔ وہ ہینڈل پر جھکے جو دھکیلے جانے پر خود ہی واپس آتا تھا۔ انہوں نے اسے ایک بار' دوبار.... تین بار گھمایا۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ نانا نے اپنے ہاتھوں پر تھوک ملا اور فلائی وھیل کو دس بارہ بار گھمایا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

"دھکا کرنا پڑے گا۔" نانا نے کہا۔ انہوں نے مجھے روشنی دکھانے کا اشارہ کیا اور آلات کے انبار کی طرف چل دیے۔ وہاں سے انہوں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک بلو ٹارچ برآمد کی۔ اس میں انہوں نے گیس بھری اور پھر ماچس کی مدد سے اسے جلایا۔ اس کی لو کم کرتے کرتے وہ اسے نیلی روشنی تک لے آئے پھر ہم ٹریکٹر کے پاس آئے۔ نانا نے بلو ٹارچ مجھے دی اور ٹریکٹر کے پلگ کی طرف اشارہ کیا۔ اس پلگ کا کام انجن کے باہر کی حرارت کو اندر منتقل کرنا تھا پھر یہ اس حرارت کو مرتکز کرتا۔ گیس کے بخارات سلنڈر میں جاتے تو سلنڈر جل اٹھتا۔

میں نے نیلے شعلے کا رخ پلگ کی طرف کیا۔ نانا نے ہینڈل تھاما

اور اسے کھینچنے لگے لیکن نتیجہ اب بھی کچھ نہیں نکلا۔

نانا کی سانس پھول گئی۔ وہ سانس درست کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ غور و فکر کر رہے ہیں۔ بالآخر انہوں نے کہا۔ ”میں کرسمس کی رات اپنی زبان گندی نہیں کرنا چاہتا ورنہ یہ ٹریکٹر صرف گالیوں کی زبان ہی سمجھتا ہے۔ خیر... ایک ترکیب اور ہے۔ اسے آزماتے ہیں۔ تم یہاں آؤ۔“

وہ مجھے ٹریکٹر کی دوسری سائیڈ لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے سلنڈر سے باہر آنے والا پائپ دکھایا۔ ”تم اسے گرمی دو۔“ انہوں نے کہا۔ ”سلنڈر میں ٹھنڈی ہوا بھری ہوئی ہے۔ یہاں سے گرمی براہِ راست سلنڈر میں جائے گی اور سرد ہوا ابخرات میں تبدیل ہوجائے گی پھر گیس اپنا کام دکھا سکے گی۔“

میں پائپ کو گرمی دینے لگا اور نانا پھر ہینڈل کے ساتھ الجھ گئے۔ انہوں نے فلائی وہیل کو اتنی قوت سے اور اتنی بار گھمایا کہ اگر وہ مکھن بلونے والی مشین ہوتا تو مکھن اگل دیتا۔

نانا کا ہاتھ رکا تو ان کی سانسوں کے شور کے سامنے شوریدہ سر طوفان شرمندہ ہوگیا ہوگا۔ وہ کوئی بھی محنت کا کام کرتے تو ہانپتے ضرور تھے مگر میں نے انہیں اس طرح ہانپتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔ انہیں پھیپڑوں کی بیماری تھی، جو بھوسے سے قربت رکھنے والوں کو اکثر ہوجاتی ہے۔ بھوسے کی گرد سانسوں کے ساتھ اندر جاتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تہ جمنے لگتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انفیکشن بھی ہوتا ہے اور سانس لینے میں دشواری بھی ہونے لگتی ہے۔ اس زمانے میں کسانوں کو یہ بیماری اکثر ہوتی تھی۔

”بُرے پھنس گئے ہم۔“ نانا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”تم پائپ کو گرمی دیتے ہو تو یہاں پلگ ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ پلگ کو گرمی دو گے تو پائپ ٹھنڈا ہوجائے گا۔“ وہ کھڑے ہوکر اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان کچھ سوچتے رہے۔

”لیکن نانا، ہمت تو نہیں ہارنی چاہیے۔“ میں نے انہیں چیلنج کیا۔ ”ہمیں یہ کام کرنا ہے۔“

”تمہارے پاس کوئی تجویز ہے؟“ انہوں نے منہ بنا کر پوچھا۔

”کہیں تو میں کوشش کروں؟“

”خوش آمدید۔“

میں لڑکپن کی خوش امیدی سے مالا مال تھا۔ میں نے دستانے اتارے اور وہیل کی طرف گیا۔ اپنے جسم کی تمام طاقت ہاتھوں میں لاتے ہوئے میں نے پوری قوت سے وہیل گھمایا۔ لیکن میں بڑی مشکل سے اسے ہاف ٹرن دے سکا۔

مجھے حیرت بھی ہوئی اور صدمہ بھی۔ بوڑھے نانا اتنے طاقتور تھے کہ وہیل آسانی سے گھما لیتے تھے اور میں جوان اور صحت مند اسے ٹھیک سے ہلا بھی نہیں پا رہا تھا۔

”شکریہ بیٹے۔“ نانا نے بے حد خلوص سے کہا۔

مجھے توہین کا احساس ہونے لگا۔ ”کس بات کا شکریہ؟“ میں نے تند لہجے میں پوچھا۔

”تم نے مجھے ایک اور راستہ سمجھا دیا۔ تمہارے بازو تو کام کے نہیں مگر ہم تمہاری ٹانگوں سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ سنو۔“

نانا نے دونوں لالٹینیں ٹریکٹر کے دونوں جانب رکھ دیں۔

”اب تم پلگ کو گرمی دو۔ وہ سرخ ہوجائے تو بھاگ کر دوسری طرف آؤ اور پائپ کو گرمی دو۔“ انہوں نے کہا۔ ”اور وہ گرم ہوجائے تو پھر بھاگ کر پلگ تک آؤ۔ یہی کرتے رہو پھرتی دکھاؤ گے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ پائپ اور پلگ دونوں گرم ہوجائیں گے۔ بات بن جائے گی۔“

بات عقل کی تھی۔ میں نے عمل شروع کردیا۔ نانا دھیرے دھیرے وہیل گھماتے رہے اور میں پلگ اور پائپ کے درمیان گردش کرتا رہا مگر اس مسلسل مشقت کا نتیجہ تھکن کے سوا کچھ بھی نہیں نکلا۔

ہم نے ہتھیار ڈال دیے۔ نانا سامنے والے وہیل کے پاس بیٹھ گئے اور میں چمنی کے پاس ڈھے گیا۔ ہم دونوں نڈھال تھے۔ نانا کا اپنی مشین پر اعتماد متزلزل ہوگیا تھا اور نانا پر میرے اعتماد میں ہلکی سی سہی، مگر ایک دراڑ پڑ گئی تھی۔ اس سے پہلے میں انہیں بہت بڑا انجینئر سمجھتا تھا۔

مگر اچانک اس آہنی عفریت کے اندر... کہیں گہرائی سے ایک واضح آواز سنائی دی۔ وہ کوئی آہ معذرت نہیں تھی بلکہ بے آرامی پر احتجاج تھا۔ ٹریکٹر اس سرد موسم میں بے وقت زحمت دیے جانے پر احتجاج کر رہا تھا۔

نانا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور دبے پاؤں فلائی وہیل کی طرف بڑھے۔ انہوں نے بڑی آہستگی، نزاکت سے اسے گھمایا۔

انجن دھیرے سے کھانسا... کھوکھو... کھوکھو... پھر وہ کھانسی بڑھتی گئی۔ ٹریکٹر ہلنے، لرزنے لگا اور چند لمحے بعد گاڑھا سیاہ دھواں اگلنے لگا۔

ہم جیت گئے تھے۔

کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑے میں اور نانا ایک دوسرے کو احمقوں کی طرح دیکھتے رہے۔ ہم دونوں کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ اس وقت تک ٹریکٹر کی آواز اتنی زیادہ بلند ہوچکی تھی کہ بات کرنے کے لئے نانا کو میرے کان سے منہ ملا کر چیخنا پڑا۔ ”اسے اور گرم ہونے کے لئے یہیں چھوڑ دو۔ ہمیں اور بھی بہت کچھ کرنا ہے۔“

نانا لائحۂ عمل کی جزئیات تک پہلے ہی طے کرچکے تھے، سب سے پہلے ہم نے ٹریکٹر کے راستے میں پڑی ہوئی چیزیں ایک طرف ہٹا کر راستہ بنایا۔ ہم نے بڑے تختے، دو بڑے کمبل، رسی کا ایک گچھا، لالٹینیں اور دوسری ضروری چیزیں لیں اور گھر کی طرف چل دیے۔

ہمارے پاس ایک ہتھ گاڑی بھی تھی مگر اسے کھینچنا بڑا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ فی الوقت اس پر بوجھ بھی نہیں تھا جبکہ واپسی میں اس پر بوجھ ہونا تھا۔ میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے ہم اسنومین بن چکے تھے..... برفانی بھوت۔

ہم نے گاڑی پورچ کی سیڑھیوں کے نیچے روکی۔ سیڑھیوں پر دو تختے بچھائے‘ جو ہتھ گاڑی سے ٹکے ہوئے تھے۔ رسی کی اہمیت اپنی جگہ تھی۔ پورا اہتمام کرنے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں گئے۔ سلائیڈنگ ڈور بہت آہستگی سے پوری طرح کھولنے کے بعد ہم پارلر میں گئے۔ ہمارا انداز نقب زنوں کا سا تھا۔ دونوں طرف سے میلوڈین کو دھکیلتے ہوئے ہم اسے ڈرائنگ روم میں..... اور پھر پورچ تک لے گئے۔ مقامِ شکر تھا کہ میلوڈین کے پہیے ٹھیک کام کر رہے تھے۔

ابھی تک سب کچھ اچھی طرح ہوا تھا مگر اب دشوار مرحلہ آگیا تھا۔

ہم نے میلوڈین کو کمبلوں سے اچھی طرح لپیٹا اور رسی کی مدد سے باندھ دیا۔ اب ہم نے دونوں سائیڈوں کو لکڑی کے دونوں تختوں پر رکھا۔ میلوڈین کو اتارنا بہت مشکل مرحلہ تھا۔ اوپر کی طرف میں تھا اور نیچے کی طرف نانا۔ ہم تھوڑا تھوڑا کر کے میلوڈین کو پھسلا رہے تھے۔ وہ ذرا قابو سے باہر ہوتا تو میرا دم نکل جاتا۔ ذرا سی غلطی سے نانا کا سرمہ بن سکتا تھا۔

بہ ہزار دقت ہم نے میلوڈین کو ہتھ گاڑی پر خیریت کے ساتھ چڑھا دیا پھر میں جا کر بینچ لے آیا۔

ہم میلوڈین کو لے کر گودام کی طرف چل دیے۔ قسمت ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو ہم ہرگز یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ ہتھ گاڑی ڈھائی سو پاؤنڈ وزنی میلوڈین کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی اور ہم گھٹنوں گھٹنوں برف میں چل رہے تھے۔ نانا کی سانس اکھڑی جا رہی تھی۔ میں بھی ہانپ رہا تھا۔ جس زنجیر کو پکڑ کر ہم ہتھ گاڑی کو کھینچ رہے تھے‘ وہ اب ہتھیلیوں میں اتری جا رہی تھی۔ تنگ آکر ہم نے اسے کلائی پر لپیٹ لیا۔

گودام تک سو گز کا فاصلہ تھا‘ جو پندرہ منٹ میں طے ہوا۔

منزل پر پہنچ کر ہم سانس درست کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ ٹریکٹر کا انجن بدستور غرائے جا رہا تھا۔ اب وہ مٹی کے تیل پر چل رہا تھا اور اگلے مرحلے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں اس آہنی عفریت کے ہر حصے کو بوسوں سے بھگو دیتا۔

سانس درست کر کے ہم اٹھے۔ نانا نے بینچ کو کیب میں رکھا پھر انہوں نے ٹریکٹر کو ریورس کیا اور ہتھ گاڑی تک لے گئے۔ اب ایک اور سخت مرحلہ میلوڈین کو ہتھ گاڑی سمیت ٹریکٹر پر چڑھانے کا تھا۔ جیسے تیسے وہ مرحلہ بھی بغیر کسی نقصان کے طے ہوگیا۔ ایک مرحلے پر مجھے لگتا تھا کہ میں میلوڈین کے نیچے دب کر مرجاؤں گا۔ میں نیچے سے اسے دھکیل رہا تھا۔ رسی نہ ہوتی تو شاید کوئی حادثہ ضرور ہوتا۔ ہتھ گاڑی کے بغیر میلوڈین کو ٹریکٹر پر نہیں چڑھایا جاسکتا تھا پھر ہتھ گاڑی میلوڈین کو چرچ کے اندر پہنچانے میں بھی مدد دیتی۔

نانا نے ہینڈ تھروٹل کو آگے کی طرف دھکیلا۔ دونوں سلنڈروں نے ٹیمپو تیز کیا۔ نانا نے اسے نچلے گیئر میں ڈالا..... اور ہم روانہ ہوگئے۔

مگر وہ اچھا اسٹارٹ نہیں تھا۔ دس فٹ آگے بڑھے ہوں گے کہ نانا نے ٹریکٹر کو روکا اور لالٹین ہاتھ میں لئے نیچے اتر آئے۔ ”اتنا اندھیرا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ ایسے میں راستہ کیسے نظر آئے گا۔ ذرا رکو۔“ یہ کہہ کر وہ گودام کی طرف چلے گئے۔ وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں آہنی تاروں کی مدد سے بنائے گئے حرف S کی شکل کے دو ہک تھے۔ انہوں نے دونوں لالٹینوں کو ان ہکس میں پھنسایا اور کیب کی چھت سے ان ہکس کو لالٹینوں سمیت لٹکا دیا۔ دونوں سائیڈوں پر یوں انہوں نے ہیڈ لائٹس کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی تھی۔

نانا نے پھر تھروٹل کھینچا‘ نچلا گیئر لگایا‘ ٹریکٹر کے دیو قامت پہیے گھومے اور ہمارا سفر شروع ہوگیا۔ ہم دو میل فی گھنٹا کی رفتار سے روانہ ہوگئے۔ بدترین مرحلے گزر چکے تھے۔ اب صرف چھ میل کا سفر باقی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ خدا کی تائید ہمارے ساتھ ہے۔



پُرشور سانسیں لیتا ہوا سیاہ دیو قامت ٹریکٹر مجھے بحری جہاز کی طرح لگ رہا تھا۔ مجھے وہ بہت بڑا‘ بہت اونچا دکھائی دے رہا تھا۔ جھولتی ہوئی لالٹینوں کی جھلک نظر آتی تو اس پر جہاز کے مستول کا گمان ہوتا۔ نانا آگے کی طرف جھکے ہوئے برف کے سمندر کو نظروں سے ٹٹول رہے تھے۔ وہ جہاز کے کیپٹن تھے۔

اگلے ہی لمحے روشنیاں اور کیپٹن سب میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ برف نے مجھے کچھ دیکھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ برف کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بہرحال میرے دیکھنے کی ایسی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں تھی۔ میرا فرض تو میلوڈین کو اس کی جگہ رکھنا تھا‘ اس کا خیال رکھنا تھا کہ اس کے گرد کمبل کو باندھنے والی رسی نہ کھلنے پائے اور میلوڈین پر سے کمبل نہ ہٹنے پائے۔

مگر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہتھ گاڑی کبھی ادھر لڑھکتی‘ کبھی ادھر۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ میلوڈین کے نیچے پہیے لگے تھے۔ انہوں نے اسے اس کے حجم اور وزن کے باوجود پھرتیلا بنا دیا تھا۔ چنانچہ میرے سامنے واحد راستہ یہ تھا کہ میں مضبوطی سے قدم جما کر میلوڈین کے پیچھے کھڑا رہوں اور دونوں ہاتھوں کے حلقے میں اسے سمیٹے رہوں۔ یہ پوزیشن بڑی عجیب تھی۔ میرے بازو سُن ہو رہے تھے۔ میرے دانت بج رہے تھے اور ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ ٹریکٹر دبیز تر برف میں جاتا تو ذرا نیچے ہوتا‘ اس کی رفتار بھی کم

ہوتی۔ اس سے نکلتا تو رفتار خود بخود بڑھتی۔ اس کے ردِّعمل کے طور پر ہتھ گاڑی لرزنے لگتی تھی۔ ادھر میلوڈین میری بانہوں میں تھرتھرانے لگتا۔ میں اسے ایسے لپٹائے ہوئے تھا' جیسے میں نے بھیڑ کے سر کو لپٹایا تھا۔ اس طوفانی اندھیری رات میں میلوڈین کی حفاظت کرتے ہوئے مجھ پر اس کی اہمیت اور قدروقیمت کھلی۔ وہ بہت قیمتی بھی تھا.... اور بہت محبوب بھی۔ حتیٰ کہ وہ مجھے بھی محبوب ہوگیا تھا۔ ہم اسے اس کے گھر سے ہٹارہے تھے۔ میلوڈین نے زندگی میں وہی ایک گھر دیکھا تھا۔ اس کی عمر ۸۰ سال تھی۔ وہ ایک نوجی کسان کا تحفہ تھا.... اپنی محبوب بیوی کے لیے اور اس بیوی نے اس میلوڈین کو بجانا سیکھا تھا.... اور اپنے ننھے بیٹے کو بھی سکھایا تھا۔ یوں یہ ایک بیٹے اور ایک باپ کے درمیان واحد قابلِ فہم رابطہ تھا۔ جبکہ باپ نے بیٹے کو اور بیٹے نے باپ کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔

بیٹا بڑا ہوگیا۔ اس کی شادی ہوگئی۔ اس کی بیوہ ماں نے اپنی بہو کو بھی میلوڈین بجانا سکھادیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری ممی نے بھی اپنے بچپن میں اس کے کی بورڈ پر اپنی ننھی ننھی انگلیاں تھرکائی ہوں گی۔ ان کے ننھے ننھے پیروں نے اس کے پیڈلوں کو دبا کر اوپر نیچے کیا ہوگا اور جب وہ بڑی ہوئی ہوں گی تو انہیں اس کی انسانی جذبات کے حوالے سے اہمیت اور اس کی تاریخی قدروقیمت کے بارے میں معلوم ہوا ہوگا۔ ابراہیم اور سارہ' منصور اور ایلیا' میری ماں..... اور اب میں۔ یہ میلوڈین چار نسلوں کو ایک دوسرے سے ملارہا تھا۔ ان کے درمیان تعلق جوڑنے والا رابطہ تھا اور اب نانی کی فرمائش پر نانا اس سے دستبردار ہورہے تھے.... اسے چرچ کو بطور عطیہ دے رہے تھے۔

اب میں ٹھیک سے یاد نہیں کرسکتا کہ اس وقت مجھے یقین تھا یا نہیں مگر کرسمس کی اس رات اس بات کی اہمیت تھی بھی نہیں۔ میں دعا کررہا تھا کہ ہم میلوڈین کو بحفاظت چرچ تک پہنچانے میں کامیاب ہوجائیں۔ مجھے یقین تھا کہ خدا اس پر ہم سے یقیناً خوش ہوگا۔

پھر ایک اور مشکل مرحلہ آگیا۔ اب ہمارے اور گاؤں کی سڑک کے درمیان ایک پہاڑی حائل تھی اور ہم اسے پار نہیں کرپارہے تھے۔ آئل بیل نے بہت کوشش کی لیکن چڑھائی بہت زیادہ اور بہت سیدھی تھی اور برف چار فٹ گہری تھی۔ انجن بند نہیں ہوا' پہیے گھومتے رہے۔

نانا نے ہینڈ بریک لگائے اور نیچے اتر گئے۔ "مجھے اسٹارٹ مل جائے تو ہم کامیاب ہوسکتے ہیں" انہوں نے کہا "بوجھ کم کرنا ہوگا۔"

ہم نے زنجیریں کھولیں' ہتھ گاڑی کو آزاد کرکے نیچے اتارا اور کچھ پیچھے لے گئے۔ نانا دوبارہ کیب میں سوار ہوئے۔ انہوں نے ٹریکٹر کو ریورس کیا۔ اسے کوئی تیس یا چالیس گز دور لے گئے پھر انہوں نے تھروٹل کھینچا' سیکنڈ گیئر لگایا اور ٹریکٹر پوری قوت سے آگے کی طرف چلا۔ وہ ریل کے پرانے انجن کی طرح چیختا چنگھاڑتا اوپر چڑھ رہا تھا۔ برف کے نیچے دبے ہوئے پتھر اچھل رہے تھے۔ چنگاریاں اڑرہی تھیں مگر بالآخر وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔

میں دیوانہ وار تالیاں بجانے لگا۔

نانا نے ہینڈ بریک لگایا اور پلٹ کر نیچے آئے۔ ہم دونوں نے پھر کلائی پر زنجیر لپیٹی اور ہانپتے کانپتے ہتھ گاڑی کو اوپر کی طرف کھینچتے رہے۔ اوپر پہنچتے پہنچتے پھر ہماری سانس اکھڑگئی مگر بالآخر ہم کامیاب ہوگئے۔

ہتھ گاڑی کو دوبارہ ٹریکٹر پر لاد دیا گیا۔

پہاڑی سے اترتے ہوئے سڑک کے دائیں جانب روشنی نظر آئی۔ وہ شاید ہینشا کا مکان تھا۔ میرا خیال ہے' انہیں ہمارے ٹریکٹر کی آواز سنائی دے رہی ہوگی۔ اس وقت کے سناٹے میں تو ٹریکٹر کی آواز شاید پورے گاؤں تک پہنچ رہی ہوگی۔ جو ہینشا اور اس کی بیوی ابھی یقیناً اٹھ گئے ہوں گے۔

جیسے ہی ہمارا ٹریکٹر ہینشا کے گھر کے سامنے رکا' نانا نیچے اتر گئے "ہمارے لیے تازہ دم ہونا ضروری ہے۔" نانا نے کہا "اب یہ لوگ تو جاگ ہی گئے ہوں گے' مائنڈ نہیں کریں گے۔"

میں نے اعتراض نہیں کیا۔ میرا بھی سردی سے بُرا حال تھا.... ان کی طرح۔ ہم منہ سے دھواں چھوڑتے ان کے گھر کی طرف چلے لیکن جیسے ہی ہم پورچ تک پہنچے' گھر کی بتیاں بجھادی گئیں۔ نانا نے دروازے پر دستک دی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ نانا میرا ہاتھ تھام کر پورچ سے پیچھے چلے گئے۔ وہاں سے ہم بہتر طور پر آواز لگاسکتے تھے۔

مجھے بہت غصہ آرہا تھا۔ "یہ کیا بات ہے؟ انہوں نے جلتی ہوئی لائٹ بھی بجھادی۔"

"وہ شرمندہ ہوں گے۔ مقروض ہیں نا" نانا نے کہا "انہوں نے مجھے تھریشنگ کی اجرت اب تک نہیں دی ہے۔"

"تو آپ نے ان سے مطالبہ ہی کب کیا؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہینشا اپنا قرض احسن طریقے سے اتارنے کا قائل ہے۔ نہ اتار پائے تو منہ چھپاتا ہے۔"

"تو وہ مارے شرمندگی کے ہم کو یہیں جم کر مرنے دیں گے۔"

"یہ بہت غریب لوگ ہیں۔ معاشی بدحالی نے سب سے زیادہ انہیں ستایا ہے۔"

یہ بات مجھے معلوم تھی۔ گاؤں میں سبھی کو ان سے ہمدردی تھی۔ وہ بے اولاد تھے۔ ان کے پاس نہ مرغیاں تھیں' نہ کوئی اثاثہ۔ ایک گائے تھی ان کے پاس اور اسّی ایکڑ تقریباً ناکارہ زمین۔ پتا نہیں' ان کا گزارہ کیسے ہورہا تھا۔ بہرحال حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اپنی ذاتی گاڑی میں چرچ جاتے تھے۔

"مجھے اس سے غرض نہیں" میں نے کہا "کرسمس کی رات

مہمانوں سے تو منہ نہیں موڑنا چاہیے۔"

"اس کی تکلیف بھی انہیں ہم سے زیادہ ہوگی اور ہم انہیں چھوڑ بھی نہیں سکتے ورنہ زندگی بھر یہ خود کو معاف نہیں کریں گے۔"

ہم انہیں آوازیں دیتے رہے۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ نانا میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دروازے پر لے گئے۔ انہوں نے پھر دستک دی۔ بالآخر چوتھی دستک پر روشنی ہوئی اور دروازہ کھلا۔ جو ہینٹسا نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا "معاف کرنا" ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ تم ہو" اس نے کہا "ہم سمجھے طوفان کا شور ہے۔"

وہ کھلا جھوٹ بول رہا تھا... آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، مجھے بہت بُرا لگا۔

اندر بھی اتنی ہی سردی تھی، جتنی باہر تھی۔ چولھے میں آگ کی لو نیچی تھی۔ نانا نے کہا بھی کہ ہم ذرا خود کو گرم کرنے کے لیے رکے ہیں۔ اس کے باوجود ان میاں بیوی نے آگ بڑھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ مزید لکڑیاں ڈالنا تو درکنار، انہوں نے آگ کو کرید کر تازہ بھی نہیں کیا۔

کچن میں صرف دو کرسیاں تھیں۔ ہم دونوں ان پر بیٹھے تھے۔ رفتہ رفتہ میرا غصہ سرد پڑنے لگا۔ ایک تو وہ میاں بیوی میرے نانا نانی سے بھی زیادہ بوڑھے تھے۔ دوسرے ان کے گھر میں کرسمس ٹری بھی نہیں تھا، جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ واقعی تباہ حال ہیں۔

نانا نے انہیں بتایا کہ ہم اتنی رات کو کس لیے نکلے ہیں تو انہوں نے نانا کو یوں دیکھا جیسے وہ پاگل ہوگئے ہوں۔

"اس سال میں نے ایلی کو کوئی تحفہ نہیں دیا" نانا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "ہم نے سوچا کہ صبح چرچ میں سرپرائز اس کے لیے تحفہ ہوگی" مگر یہ کہتے کہتے انہیں احساس ہوگیا کہ انہوں نے ان کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے کیونکہ ان دونوں نے بھی اس بار ایک دوسرے کو تحفے نہیں دیے تھے۔

وہ خاموش رہے۔ اسی خاموشی میں لمحے گزرتے رہے اور ہم سردی میں ٹھٹھرتے رہے۔ بات کرنے کے لیے بھی کوئی موضوع نہیں تھا پھر نانا نے کہا "جو..... میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں..... دیکھو..... ہم تیس سال سے اچھے پڑوسی ہیں..."

"مم.... میں.... میں شرمندہ ہوں" جو ہکلایا۔

"مجھے بات پوری کرنے دو جو" نانا نے کہا "مجھے تھریشنگ کی اُجرت کسی نے بھی نہیں دی اور مجھے اس کی امید بھی نہیں۔ کم از کم فی الوقت تو یہ ممکن نہیں۔"

"لیکن دنیا کا کام پیسے ہی سے چلتا ہے" جو بولا۔

"خیر.... میرا کام اس کے بغیر بھی چل رہا ہے۔ میں اسے بھولا ہوا ہوں..... اچھا وقت آنے تک۔"

"میں اپنا قرض وقت پر چکانے کا قائل ہوں۔"

"میں یہ بات جانتا ہوں۔ تمہاری بڑی قدر ہے میرے دل میں۔"

"میں جب چھوٹی تھی تو پاپ کارن بہت کھاتی تھی۔ اب تو ملتی ہی نہیں" ایبی نے کہا۔

"سب کا ہی بُرا حال ہے" میرے نانا بولے۔

"آپ اگر مشکل میں ہیں جناب تو حکومت سے مدد کیوں نہیں طلب کرتے" میں نے جو ہینٹسا سے کہا۔

"اس ذلت کے مقابلے میں مجھے مرجانا قبول ہے" جو نے کہا۔

"میں جب چھوٹی تھی تو میرے پاس جھالر والے ملبوسات تھے" ایبی بولی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"مگر یہ آپ کا حق ہے اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

نانا نے جلدی سے کہا "اب ہمیں چلنا چاہیے۔ ابھی ہمارا کام پورا نہیں ہوا ہے" پھر وہ ان دونوں کو دیکھ کر مسکرائے "آپ لوگوں کا شکریہ کہ آپ نے مسافروں کو ٹھکانا فراہم کیا۔ صبح چرچ میں ملاقات ہوگی۔ میری کرسمس۔"

"یہ میری شادی والے دن کا لباس ہے" ایبی نے کہا۔

ہم جلدی سے باہر نکل آئے۔ ہم ٹریکٹر کے پاس پہنچے تو میں نے نانا سے پوچھا "یہ ایبی کا کیا چکر ہے؟ کچھ کھسکی ہوئی ہیں کیا؟"

"کبھی وقت بھی آدمی کو کھسکا دیتا ہے۔"

"میں تو اب بھی ویسا ہی ٹھنڈے کا ٹھنڈا ہوں۔"

"لکڑی بہت مہنگی ہے بیٹے۔ میں نے جو کو کچھ لکڑی دینے کی کوشش کی تھی مگر اس نے نہیں لی۔"

مجھے نانی کی سنائی ہوئی ممی کی کہانی یاد آگئی "یہ تو وہی نارنگیوں والا معاملہ ہے۔"

"ہاں بیٹے۔ عزت اور وقار بڑی چیز ہوتی ہے اور کوئی ضرورت ایسی نہیں ہوتی، جو پوری نہ ہو تو آدمی مرجائے۔"

ہم ٹریکٹر پر سوار ہوگئے۔ نانا کیب میں اور میں میلوڈین کے پاس۔ سفر پھر شروع ہوگیا۔ برف باری اب بھی ویسے ہی ہو رہی تھی، کبھی بھی نہیں رکے گی۔

○☆○

اب سفر ہموار تھا۔ ہم گاؤں کی سڑک پر تھے۔ نانا ڈرائیو کر رہے تھے۔ لالٹینیں جھول رہی تھیں۔ ہتھ گاڑی اِدھر اُدھر کھسک رہی تھی۔ میلوڈین میری آغوش میں محفوظ تھا۔ ہم کوئی چوتھائی میل چلے ہوں گے کہ دائیں جانب پھر روشنی نظر آئی۔ وہ اسٹیکیل فیملی کا مکان تھا۔ یہ طے تھا کہ ہمارے وہاں سے گزرنے سے پہلے ہی ہینٹسا فیملی کی طرح کلائیڈ اور کیٹی بھی جاگ جائیں گے۔

ٹریکٹر رکا تو مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے آگے جھکتے ہوئے پوچھا "اب کیا ہوا نانا!"

نانا کیب سے اتر گئے "میں بہت تھک گیا ہوں اور سردی سے نڈھال بھی ہوں" نانا نے اپنے ہاتھ بغلوں میں چھپاتے ہوئے

کہا "بہتر ہے، کچھ دیر آرام کرلیں۔"
میں بے صبرا ہو رہا تھا۔ اگر ہم اسی طرح رکتے اور آرام کرتے رہتے تو سروس کے بعد ہی چرچ تک پہنچیں گے اور اسٹیکبل کے ہاں رکنے میں مجھے ویسے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تھکا ہوا نہیں تھا۔ لہٰذا نانا کی تھکن بھی میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

مگر مکان کی طرف بڑھتے ہوئے گھٹنوں گھٹنوں برف میں نانا لڑکھڑائے اور مجھے انہیں سہارا دینا پڑا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ نانا میں بالکل جان نہیں رہی ہے۔

اس بار ہمارا اچھی طرح خیر مقدم کیا گیا۔ کیٹی اسٹیکبل نے دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے گئی پھر اس نے سبز چائے کے لیے پانی چولھے پر رکھ دیا۔

"ہمیں اس طرح زحمت دینے پر شرمندگی ہے" نانا نے کہا۔ "ارے.... کلائیڈ کہاں ہے؟"

"انہیں سردی کے ساتھ بخار ہوا ہے۔ کھانسی بھی بہت ہے۔ میں ان کی پیشانی پر سرسوں کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ پٹی رکھتی ہوں تو بری طرح چیختے ہیں۔ مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ کرسمس کے موقع پر یوں بیمار ہوگئے" کیٹی نے کہا۔

"واقعی.... یہ تو محرومی ہے۔ خیر تم پٹیاں رکھتی رہو۔ خواہ وہ کتنا ہی چیخئے" نانا نے کہا اور لائن سے بیٹھی ہوئی کیٹی کی بیٹیوں کی طرف مڑے "گڈ ایوننگ ینگ لیڈیز۔ تم میرے نواسے حارث کو جانتی ہو؟"

وہ چاروں کھی کھی کرکے ہنسنے لگیں۔ میرے جسم میں گرمی بھرنے لگی۔ جن چار وجوہات کے تحت میں اس مکان میں ٹھہر کر آرام نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ وہی چاروں تھیں۔ کلائیڈ اور کیٹی نے جب بھی بیٹے کی آرزو کی، انہیں ایک عدد بیٹی ملی۔ چار آرزوؤں کے بعد انہوں نے ہار مان لی۔ ان چاروں کے نام بالترتیب اگنس، فرانسس، ڈولورز اور گرٹروڈ تھے۔ ان کی عمریں چودہ، گیارہ، نو اور چھ سال تھیں اور وہ سیڑھیوں پر ایسے بیٹھی تھیں جیسے پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی پوزیشن پانے والی کھلاڑی ہوں اور انعامات کے لیے بیٹھی ہوں۔ وہ میرے ہی اسکول میں پڑھتی تھیں لہٰذا ان سے مفر ممکن نہیں تھا۔

ان لڑکیوں کو ناپسند کرنے کے باوجود میں ان کی ماں کو پسند کرتا تھا۔ وہ سرخ چہرے والی پستہ قامت اور فربہ اندام خاتون تھی۔ اس کے انداز میں گرم جوشی تھی اور وہ مہمان نوازی کے آداب سے واقف تھی۔

کیٹی نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے میرے نانا سے پوچھا۔ "یہ تو بتائیں کہ ایسی طوفانی رات میں آپ ٹریکٹر لیے کیوں پھر رہے ہیں؟"

نانا نے انہیں وجہ بتائی۔

کیٹی کے رخسار خوشی سے دہک اٹھے "میں نے زندگی میں ایسا سچا اور اچھا جذبہ اور عمل پہلے نہیں دیکھا۔ چرچ کے لیے آرگن کا تحفہ اور وہ بھی کرسمس کے موقع پر۔ کل صبح ایلیا کا چہرہ خوشی سے کیسا تمتما رہا ہوگا۔ کیوں میری بچیو، ہے نا شاندار بات۔"

چاروں لڑکیاں چابی سے چلنے والی گڑیوں کی طرح سر ہلانے لگیں۔

"منصر، آپ نے کمال کردیا۔ میں آپ کو پیٹ بھر سبز چائے پلاؤں گی" یہ کہہ کر کیٹی کچن میں چلی گئی۔

میں لڑکیوں سے گفتگو سے بچنے کے لیے اپنے ہاتھوں کا جائزہ لینے لگا پھر میں نے کرسمس ٹری کا معائنہ کیا اور پھر قالین کے ڈیزائن پر غور کرنے لگا۔ آخر میں جائزہ لینے کے لیے چھت کے سوا کچھ نہیں بچا تو میں نے منہ اٹھایا اور چھت کو گھورنے لگا۔ مجھے احساس تھا کہ لڑکیاں مجھے گھور رہی ہیں۔

یہ بات نہیں کہ میں بے وقوف یا شرمیلا ہوں۔ شہر میں کئی لڑکیوں سے میری دوستی تھی۔ مگر وہ پرکشش، فیشن ایبل اور ذہین لڑکیاں تھیں.... بے شمار خوبیوں سے آراستہ.... جبکہ یہ گاؤں کی لڑکیاں بس شریر تھیں۔ چالاک بھی تھیں۔ میں کئی بار ان کی چالاکیوں اور شرارتوں کا نشانہ بن چکا تھا۔

"یہ چائے لیجئے منصر" کیٹی چائے لے آئی تھی "منصر؟"

ہم نے نانا کی طرف دیکھا مگر وہ دیوان پر دراز ہوکر سو چکے تھے۔ ان کا سر سرہانے پر ٹکا تھا۔ منہ کھلا ہوا تھا اور وہ پُرشور آواز میں سانسیں لے رہے تھے۔

کیٹی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا اور ہمیں اپنے ساتھ کچن میں چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم کچن میں پہنچے تو اس نے دروازہ بند کرلیا "لو حارث بیٹے، یہاں بیٹھ کر چائے پی لو" اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی۔ "میں نہیں چاہتی کہ تمہارے نانا کی نیند خراب ہو۔"

میں کچن ٹیبل کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سبز چائے مجھے ناپسند تھی مگر اگنس، فرانسس، ڈولورز اور گرٹروڈ کے مقابلے میں قابل قبول تھی۔ وہ چاروں بھی میز کے گرد بیٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے کہنیاں میز پر ٹکائی ہوئی تھیں اور ٹھوڑیاں ہاتھوں کے پیالے میں رکھے مجھے یوں گھور رہی تھیں جیسے میں عجوبہ ہوں۔

کیٹی نے برقی چولھا جلادیا تاکہ گرمی ہوجائے پھر وہ کاؤنٹر کے قریب کھڑی مجھے بہت غور سے دیکھتی رہی۔ میں چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔ بیڈ روم کی طرف مسٹر اسٹیکبل کے زور زور سے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ دوسری طرف سے ٹریکٹر کے انجن کی کھانسی کی آواز آرہی تھی۔

"تمہارے نانا بہت تھک چکے ہیں۔ نڈھال ہوگئے ہیں" کیٹی نے کہا "انہیں نیند کی ضرورت ہے۔"

"جی مادام!"

"ان کی عمر اور صحت کے لیے یہ موسم اور یہ رات بہت

خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ جو کام تم کر رہے ہو' بہت عظیم ہے لیکن تمہارے نانا کی صحت کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ تم میری خاطر ایک کام کر سکتے ہو حارث!"

"جی مادام!"

"انہیں سونے دو اور جب یہ جاگیں تو انہیں گھر جانے پر آمادہ کرو۔ آرگن صبح کے وقت چرچ پہنچایا جا سکتا ہے۔"

"نہیں..... نہیں..... یہ تو ممکن نہیں۔"

"کیوں؟"

"پھر سرپرائز نہیں رہے گی" میرے لہجے میں احتجاج تھا۔ "آپ کو اندازہ نہیں کہ کتنی دشواریوں اور خطرناک مرحلوں سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔"

"اوہ..... یہ بات ہے۔ کلائیڈ کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو وہ تمہارے ساتھ چلے جاتے اور میں کلائیڈ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔"

کیٹی نے کہا پھر چند لمحے سوچنے کے بعد اچانک بولی "یہ بتاؤ' تم ٹریکٹر چلا سکتے ہو؟"

"میں نے پہلے کبھی چلایا تو نہیں لیکن دیکھتا رہا ہوں۔"

"تو سنو۔ ڈننگز فیملی یہاں سے آدھا میل دور رہتی ہے۔ میں فون کر کے اولس کو کہتی ہوں' وہ تمہیں چرچ کے پاس مل جائے گا اور تمہاری مدد کر دے گا۔ اپنے نانا کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ ٹھیک ہے؟"

اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں نانا کی صحت کے معاملے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا لیکن مشن اس مرحلے میں نامکمل چھوڑنا بھی ممکن نہیں تھا جبکہ ہم کامیابی کے اتنا نزدیک پہنچ چکے تھے۔ یہ نانی کی فرمائش تھی' جسے پورا کرنے کی ضد نانا کے دل بچے نے کی تھی اور میں پوری طرح ان کے ساتھ تھا۔

سو میں ہچکچا رہا تھا۔ میلوڈین مجھ اکیلے کے بس کا نہیں تھا۔ اولس ہاتھ بٹا سکتا تھا لیکن پھر نانا رہ جاتے۔ بہرحال آخر میں اس بات کی اہمیت رہتی بھی نہیں ہے کہ کام کس نے نمٹایا "میرا خیال ہے' آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں" میں نے سہلاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرائی "شکریہ حارث۔ اچھا' میں اولس کو فون کرتی ہوں۔"

وہ فون کے لیے ڈائننگ روم میں گئی۔ میں نے چائے ایک طرف ہٹا دی۔ "تمہیں چائے اچھی نہیں لگی؟" فرانسس نے پوچھا۔

"نہیں تو' اچھی لگی۔ اچھی لگتی ہے۔"

"جھوٹا کھوٹا۔ بے پیندے کا لوٹا" ڈولورز نے تبصرہ کیا۔

"یہ عرب کا شیخ ہے" اگنس بولی۔

"کوئی کچھ کھا پی رہا ہو تو اسے اس طرح گھورنا نہیں چاہیے" میں نے نصیحت کی۔

"اور کرسمس کی رات دیر سے لوگوں کے گھر جانا اور سانتا کلاز کی آمد میں خلل ڈالنا بھی بری بات ہے" گرٹروڈ نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"تم سب سے چھوٹی ہو۔ نانی دادی مت بنو" میں نے کہا۔

"اور سانتا کلاز سچ مچ تھوڑا ہی ہوتا ہے" فرانسس بولی۔

"یوشٹ اپ" ڈولورز اس پر الٹ پڑی "گرٹروڈ کو یہ بات معلوم نہیں۔ وہ ابھی چھوٹی ہے۔"

اسی وقت کیٹی واپس آگئی "اوہ ڈیئر..... میرا خیال ہے' فون کی لائنیں خراب ہو گئی ہیں' اب..... اب کیا کریں؟"

میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ جملہ..... اب کیا کریں..... نہیں ..... اب کیا کروں میں..... ہونا چاہیے اور جواب اس کا یہ ہے کہ میں جا رہا ہوں مگر یہ بات بے حد اعتماد سے بااختیار انداز میں کہنی تھی چنانچہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کندھے پھیلائے اور سینہ ابھارا اور کہا "مسز اسٹیکیل....."

"میں اس کے ساتھ جا رہی ہوں" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اگنس نے اعلان کر دیا۔ ایک دھاکا ہوا اور میرا دماغ خالی ہو گیا۔

"نہیں..... تم نہیں جا سکتیں" کیٹی نے کہا۔

"یہ بہت دبلا ہے۔ بھاری آرگن اکیلے نہیں اٹھا سکتا۔"

"میں بھی جاؤں گی" فرانسس نے چیخ کر کہا۔

"اور میں بھی" ڈولورز چلائی۔

"ممی' میں بھی جاؤں گی" سب سے چھوٹی گرٹروڈ کے بھی پر نکلے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے" میں نے بلند آواز میں احتجاج کیا "میں یہ کام اکیلا کر سکتا ہوں۔ چڑیوں کا غول لے کر میں....."

"حارث!" کیٹی نے میری بات کاٹ دی۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ "حارث..... یہ برا آئیڈیا نہیں۔ میری بچیاں مضبوط ہیں اور تم اتنے بڑے بھی نہیں ہو کہ تنہا یہ سب کچھ کر سکو۔ چرچ اب دو میل دور ہے۔" اس نے گھڑی میں وقت دیکھا "بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ میں انہیں تیار کر دیتی ہوں۔ تمہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ واپسی میں بچیوں کو یہاں چھوڑنا اور اپنے نانا کو گھر لے جانا۔"

"ہم ضرور جائیں گے" اگنس مسکرائی۔ اسے اپنی فتح کا اندازہ ہو گیا تھا۔

"ہم جائیں گے' ہم جا رہے ہیں" دوسری تینوں بہنیں بھی خوش ہو گئیں۔

مجھے احساس ہوا کہ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ یہ احساس سیمسن سے لے کر ہر اس مرد کو ہوتا رہا ہے' جس پر صنفِ نازک مسلط ہو جاتی ہے "لیکن مسز اسٹیکیل....." میں نے کمزور آواز میں احتجاج کرنے کی کوشش کی۔

"ششش..... منصر کو نہ جگا دینا۔ شور مت کرو" کیٹی نے اپنی بیٹیوں کو اشارہ کیا پھر وہ میری طرف مڑی "دیکھو حارث' تم ایک

بہت بڑا کام کررہے ہو۔ یہ بات نہ ہوتی تو میں انہیں کبھی نہ بھیجتی لیکن تمہاری نانی سے مجھے بہت محبت ہے اور یہ ان کی خواہش ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہمیں بھی اس سعادت میں شریک کرلو۔"

"جی.... بہت بہتر" میں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ میں پریشان ہوگیا۔ نانا نڈھال تھے اور ناقابل برداشت لڑکیوں کا ایک گروہ اسے ایڈونچر سمجھ کر اس میں شریک ہورہا تھا۔ یہ بہت خراب صورتِ حال تھی مگر میں انہیں روک نہیں سکتا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

کیٹی نے بیٹیوں کو لباس تبدیل کرنے کے لیے اوپر بھیجا اور ایک جار میں سے گھر میں بنے ہوئے بسکٹ نکالے اور پلیٹ میں رکھ کر میری طرف بڑھائے "مجھے یقین ہے کہ تمہیں بہت بھوک لگ رہی ہوگی۔ میں نے اسی لیے بچیوں کو ہٹادیا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ میری طرح بھاری ہوں لیکن تمہاری ہڈیوں کو بہرحال اپنے اوپر گوشت کی ضرورت ہے" وہ میرے سامنے بیٹھ گئی "یہ لڑکیاں بہت شریر ہیں۔ ہاتھ بٹائیں گی تو شاید کچھ بردباری آئے گی ان میں۔ تم انہیں ذرا کھینچ کر ہی رکھنا۔ واضح کردینا کہ انہیں تمہارے حکم کی تعمیل کرنی ہے ہر حال میں۔"

بسکٹ بہت خوش ذائقہ تھے مگر میری زبان پر مزہ صرف مایوسی کا تھا۔

"تمہیں اپنے ممی ڈیڈی تو بہت یاد آئے ہوں گے آج؟"

میرا منہ بسکٹ سے بھرا ہوا تھا.... میں نے اثبات میں سرہلادیا۔

"یہ اچھا ہوا کہ تمہاری ان سے فون پر بات ہوگئی۔"

اب کے میں انہیں حیرت سے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔

وہ مسکرائی "گھبراؤ نہیں۔ ہم نے تمہاری گفتگو تھوڑا ہی سنی ہے.... باقی سب گاؤں والوں کو یہ بات معلوم تھی کہ بلغراد سے تمہارے لیے فون آئے گا۔"

اسی وقت سیڑھیوں پر ہونے والی دھمک نے اعلان کیا کہ لڑکیاں نازل ہونے والی ہیں۔ کیٹی نے سر اٹھا کر دیکھا اور مجھ سے آہستہ سے بولی "حارث، موقع ملے تو اپنے نانا کو بتانا کہ تھریشنگ کی ادائیگی نہ کرنے پر ہم ان سے شرمندہ ہیں۔ کلائیڈ ہر وقت اس بات پر کڑھتا رہتا ہے مگر فی الوقت ہم کچھ کرہی نہیں سکتے۔ کہہ دوگے نا بیٹے؟"

میں نے بسکٹ نمٹادیے تھے "جی مادام.... کہہ دوں گا۔"

"کچھ اس وجہ سے بھی میں لڑکیوں کو بھیج رہی ہوں۔ پیسے نہ سہی مگر ضرورت کے وقت مدد تو کی جاسکتی ہے۔"

"جی شکریہ!"

لڑکیاں نیچے آگئیں۔ کیٹی ان کا معائنہ کرنے لگی "ہاں ٹھیک ہے" وہ بولی "اب تم جاکر کرسمس ٹری سے اپنے تحفے یہاں لے آؤ۔ جلدی کرو۔"

"تحفے؟ سانتا کو تو موقع ہی نہیں ملا آنے کا؟" چھوٹی گرٹروڈ نے اعتراض کیا۔

"ارے.... وہ پہلے ہی آگیا ہوگا۔ جب ہم لوگ سو رہے تھے" کیٹی نے کہا۔

لیکن گرٹروڈ آسانی سے قائل ہونے والی نہیں تھی "مگر میں تو سوئی ہی نہیں اور میں نے اسے آتے بھی نہیں دیکھا۔ قدموں کی چاپ بھی نہیں سنی۔"

"اب اس کے لیے پریشان نہ ہو۔ تحفے لے آؤ۔ جلدی کرو۔"

وہ تینوں دبے قدموں ڈرائنگ روم میں گئیں اور واپس آگئیں۔ ان کے ہاتھوں میں تحفوں کے ایک جیسے پیکٹ تھے۔

"اب انہیں کھولو۔" ان کی ماں نے حکم دیا۔

انہوں نے پیکٹ کھولے۔ ہر پیکٹ میں ربر کے لمبے جوتے تھے جو سردیوں میں پہنے جاتے ہیں۔

"واہ بھئی.... سانتا کلاز کو پتا ہوتا ہے کہ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے" کیٹی نے کہا۔

"جوتے!" اگنس بولی۔

"جوتے!" فرانسس نے دہرایا۔

"واہ!" ڈولورز نے تبصرہ کیا۔

"مگر میں نے تو گڑیا مانگی تھی" گرٹروڈ نے احتجاج کیا۔

کیٹی کا منہ بن گیا "شکر کرو خدا کا۔ لاکھوں بچیاں ایسی ہوں گی جنہیں کرسمس ٹری کے نیچے کوئی تحفہ نہیں ملا ہوگا۔ میرا خیال ہے، جیسے ہم سب کے لیے یہ کڑا وقت ہے، ویسے ہی سانتا کلاز کے لیے بھی ہے۔ اچھا اب انہیں پہنو اور اپنے کوٹ پہنو پھر ٹوپیاں سر پر رکھو۔ جلدی کرو، حارث پریشان ہے۔ تمہیں چھوڑ ہی نہ جائے۔"

وہ چاروں یہ سنتے ہی تیزی سے چلی گئیں "تم بڑے پیارے ہو حارث۔ ہمیں بھی بیٹے کی بڑی آرزو تھی" کیٹی مجھ سے مخاطب ہوئی "مجھے اپنی بیٹیوں سے بہت محبت ہے مگر ایک بڑا بیٹا ہوتا تو وہ ان کی رہنمائی کرتا نا۔"

لڑکیاں تیار ہوکر آگئیں۔ ٹوپیاں انہوں نے آنکھوں کے اوپر تک کھینچ لی تھیں اور مفلر آنکھوں کے نیچے تک چڑھالیے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی سبز چائے کی دوسری پیالی ملنے پر ہوسکتی تھی۔

کیٹی نے اپنے دستے کا معائنہ کیا "دستانے لے لیے تم نے؟" چار سر اوپر نیچے ہلنے لگے۔

"اور سن لو۔ حارث انچارج ہے تم سب کا۔ کسی نے اس کا حکم نہ مانا تو چمڑی اتار دوں گی اس کی۔ سمجھ گئیں۔"

چاروں سر پھر ہلنے لگے۔

"اور سنو.... شاید آج کی رات تمہیں کرسمس کے بارے میں بہت کچھ سکھانا چاہتی ہے۔ کرسمس کا مطلب صرف لینا نہیں، دینا

بھی ہے۔ دینے میں اصل خوشی ہے۔ حارث کو اور اس کے نانا کو دیکھو، یہ مسلمان ہیں مگر کرسمس کے موقع پر اتنی تکلیف اٹھا کر چرچ کو تحفہ دے رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آج تم مثالی کام کرو۔ مدد کرو، بدتمیزی بالکل نہ ہو، ٹھیک ہے؟"

ان چاروں نے بڑی شدت سے سر ہلائے۔ ماں نے باری باری لپٹا کر انہیں پیار کیا پھر دانتوں سے ہونٹ کاٹنے لگی۔ کرسمس کی سرد اور طوفانی رات میں اتنی دیر کو اپنی بچیوں کو کہیں بھاری کام کے لیے بھیجنا کسی ماں کے لیے بھی آسان نہیں ہو سکتا "اب تم جاؤ۔ اور منصر کی نیند خراب نہ ہو۔ میں تمہارے پاپا کو اس وقت تک کچھ نہیں بتاؤں گی، جب تک تم خیریت سے واپس نہ آجاؤ۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ اچھا حارث، ان کا خیال رکھنا بیٹے!"

"جی ضرور" میں نے بے حد خلوص سے کہا۔

ہم دبے پاؤں ڈرائنگ روم سے گزرے۔ نانا خراٹے لے رہے تھے۔ میرا جی چاہا کہ انہیں جگا کر ان سے معذرت کروں۔ ایک اعتبار سے میں ان سے غداری کر رہا تھا مگر مجبوری تھی۔

کیٹی نے دروازہ کھولا اور پورچ تک آئی۔ باہر برف باری اور ہوا کی وہی کیفیت تھی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ محبت بھری مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں لیے اور میرے کان میں بولی "حارث۔ لارڈ تمہارا نگہبان ہو، جاؤ۔"

"شکریہ مادام!" میں نے کہا۔



رملے آئل پل ماڈل ۲۰-۳۰ ٹریکٹر کو میں آج تک دنیا کا سب سے شاندار ٹریکٹر سمجھتا ہوں۔ اس رات اس نے وہ کچھ کر دکھایا جو دنیا کی کوئی گاڑی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہر توقع پر پورا اترا۔ جو ہم نے چاہا، اس نے کر دکھایا..... اور وہ بھی تھوڑے سے مٹی کے تیل..... اور تھوڑی سی خوش اعتقادی کے عوض۔ میں نے اسے چلایا۔ جبکہ مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی۔

میں نے تھروٹل اوپر کیا۔ نچلا گیئر لگایا۔ پہیے گھومے..... اور دھواں اگلتا ٹریکٹر پھر تاریک رات کا سینہ چیرتا آگے بڑھنے لگا۔

عقبی حصے میں ہتھ گاڑی تھی۔ اس پر میلوڈین لدا تھا۔ فرانسس، ڈولورز اور گرٹروڈ میلوڈین کو لپٹائے بیٹھی تھیں۔ اگنس نے یہ میرا پہلا ہی حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کیب میں چڑھ گئی تھی اور آرگن کی بینچ پر میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ اگر وہ لڑکا ہوتی تو میں اس کی اتنی مرمت کرتا کہ وہ تابع داری پر مجبور ہو جاتی مگر وہ لڑکی تھی..... اور مجھ سے لمبی بھی اور بھاری بھی تھی اور وہ تھی بھی آٹھویں جماعت میں۔ چنانچہ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور خود کو یہ تسلی دیتا رہا کہ میں نے اس پر رحم کھا کر ایسا کیا ہے۔ وہ طبعاً تھی ہی ایسی بدتمیز کہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔

میں اس کے بارے میں بری بری باتیں نہایت ہمدردی سے سوچتا رہا۔ اس کے ہاتھوں پر خشکی کی یہ تھی تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا اور اگنس اسٹیکلیبن جیسا نام بھی اس نے خود نہیں رکھا تھا۔ اب تو اسے اسی نام کے ساتھ مرتے دم تک جینا تھا اور یہ طے تھا کہ اس بے چاری کی کبھی شادی نہیں ہوگی۔ ہر اعتبار سے وہ ہمدردی کی مستحق تھی۔ اور سب سے قابلِ رحم بات یہ تھی کہ وہ مجھ پر مرمٹی تھی۔ یہ ایک بے سود عشق تھا کیونکہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دنیا سے رخصت ہوں گا تو اپنے پیچھے بے شمار ٹوٹے پھوٹے دل چھوڑ کر جاؤں گا۔

اب سڑک چوڑی تھی۔ ہم داہنی جانب مڑے تو ہتھ گاڑی نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ اب راستے میں کوئی پہاڑی نہیں تھی اور فاصلہ بمشکل دو میل کا تھا۔

سلنڈر پوری طرح گرم تھے اور میں شاید اونگھ گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں ایک بہت جسیم اور خوب صورت مشکی گھوڑے پر سواری کر رہا ہوں اور میرا رخ اسٹرابری کے باغات کی طرف ہے۔ میں نے نیلا لباس پہنا ہوا تھا۔ میں زبردست اور خوب صورت جوان نائٹ تھا۔ مجھے اپنے پرچم کی لاج رکھنی تھی۔ ملک کا وقار بلند کرنا تھا۔ غلاموں کو آزاد کرانا تھا۔ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ خواب میں میری بیوی سارہ بھی تھی۔ اس کے لکھے ہوئے خط میری جیب میں موجود تھے۔ وہ کتنی حوصلے والی تھی۔ اس نے مجھے جنگ پر جانے کے لیے کیسی بہادری سے رخصت کیا تھا۔ اس نے مجھے بیٹے کے متعلق بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ میرے پاؤں کی زنجیر نہ بن جائے۔ بعد میں اس نے مجھے خط لکھ کر اس کے متعلق بتایا تھا۔ اس کا نام اس نے منصر رکھا تھا۔ میلوڈین وہ بجاتی تھی اور میرے بیٹے کو بھی سکھا رہی تھی۔ میں اسے اور اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لیے تڑپتا تھا۔ میں اپنے بیٹے کی دھنیں سننا چاہتا تھا۔ اسے میلوڈین بجاتے دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اسی روز دشمن کی گولی میرے سینے میں اتر جائے گی۔ میں اس سے بے خبر، اپنے گھوڑے پر سوار بڑھتا جا رہا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلا رہا ہے پھر ایک زہریلی آواز سنائی دی "او گدھے، ٹریکٹر کو سڑک سے نیچے کیوں اتار رہے ہو۔ ڈفر۔"

میں یوں اچھل کر جاگا کہ میرا سر کیب کی چھت سے ٹکرا گیا۔ اگنس کی باہنوں نے مجھے جکڑا ہوا تھا اور ٹریکٹر ایک خود مختار عفریت کی طرح دائیں جانب جھکتا جا رہا تھا۔

میں نے جلدی سے وھیل گھمایا اور ٹریکٹر کو بائیں جانب لایا۔ ٹریکٹر کو سڑک پر لا کر میں نے سکون کی سانس لی کہ مجھے اگنس کے پنجوں سے رہائی ملی مگر اسی لمحے ایک اور افتاد آ پڑی۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

دراصل برف باری اچانک ہی اور تیز ہو گئی تھی۔ لالٹینوں کی روشنی اس کی وجہ سے بالکل ناکافی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے تھروٹل کو پیچھے کھینچا اور ہینڈ بریک بھی استعمال کیا۔ ٹریکٹر رک گیا۔

"کیا مصیبت ہے" اگنس غرائی۔
میں نے دونوں لالٹینیں بکس سے اتاریں اور اس کی طرف بڑھائیں "نیچے اترو" میں نے چیخ کر کہا "تم اور فرانس انہیں لے کر آگے آگے چلو تاکہ مجھے سڑک کا پتا چلتا رہے۔"
"اور تم ہم پر سے ٹریکٹر گزار دو۔ یہ تو کسی قیمت پر نہیں ہوگا" اگنس نے ٹکا سا جواب دیا۔
"تمہیں اپنی ماں کی بات یاد نہیں؟"
"مما یہاں موجود نہیں ہیں۔"
"اور تمہیں کرسمس کا جو مطلب سمجھایا گیا تھا؟"
"سب فضول بات ہے۔ عمل کے وقت پتا چلتا ہے۔"
میں پریشان ہوگیا۔ میں نے اخلاق' قانون' مذہب اور جذبات..... سب کچھ آزما دیکھا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اب ایک فریب کا ہی حربہ رہ گیا تھا۔ بادل ناخواستہ میں نے وہ بھی آزما ڈالا "دیکھو اگنس' تم مجھے پسند کرتی ہو۔ تردید مت کرو۔ میں جانتا ہوں اور میں بھی تمہیں پسند کرتا ہوں۔ اگر تم اس وقت تعاون کرو تو اور زیادہ پسند کرنے لگوں گا۔"
"کتنا زیادہ؟" اس نے پرچون کی دکان کھول لی۔
اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ حضرت آدمؑ نے بھوک سے مجبور ہو کر ممنوعہ پھل نہیں کھایا تھا بلکہ وہ خود کو پاگل ہونے سے بچانا چاہتے تھے "بہت زیادہ۔ اتنا زیادہ کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ اتنا زیادہ کہ دنیا میں کسی نے کسی کو اتنا پسند نہیں کیا ہوگا۔ بس حد ہوجائے گی پسندیدگی کی۔" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔
اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ اگنس نے کیب سے چھلانگ لگادی اور پیچھے سے فرانس کو بھی اتار لیا۔ دونوں نے ایک ایک لالٹین لی اور اپنے درمیان ٹریکٹر کی چوڑائی جتنا فاصلہ رکھ کر آگے آگے چلنے لگیں۔ میں نے ہینڈ بریک کو آزاد کیا اور چیخ کر کہا۔ "لالٹینیں اوپر کرو۔"
آخری ایک میل کا فاصلہ ہم نے اس طرح طے کیا۔ چھوٹی دو لڑکیاں آرگن کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ بڑی دونوں میری رہنمائی کررہی تھیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا احسان مند تھا۔ بے انصافی تو نہیں کی جاسکتی۔ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کم از کم دس درجے نیچے تھا۔ ایسے میں ان بے چاریوں کا کیا حال ہوگا اور کہیں برف اتنی گہری تھی کہ اگنس اور فرانس لڑکھڑا جاتیں۔ ان کی رفتار کم ہوجاتی۔ وہ رک بھی جاتیں.... اور مجھے ٹریکٹر روکنا پڑتا پھر وہ اس دشوار حصے سے گزر کر مجھے اشارہ کرتیں اور میں ان کی لالٹینوں کی زرد روشنی کے اشارے پر آگے بڑھتا۔
کیٹی دیکھتی تو اپنی بیٹیوں پر بجا طور پر فخر کرتی۔ سردی' اندھیرے میں اور دشوار راستے پر دو میل فی گھنٹا کی رفتار سے برف پر بھاگتے ہوئے وہ کرسمس کی روح کو صحیح معنوں میں سمجھ رہی تھیں۔ یہ الگ بات کہ اگنس کو تحرک روحانیت نے نہیں' رومان نے فراہم کیا تھا۔
یہ وہ سڑک تھی' جس پر روز چل کر ہم اسکول جاتے تھے۔ چپ کارنر آگیا۔ چرچ کے عقب میں عیسائیوں کا قبرستان تھا اور اس کے پیچھے اسکول کی عمارت تھی۔ لالٹینوں کے پیچھے چلتے' و میل گھماتے میں نے ٹریکٹر کو سڑک پر سے اتارا اور نیم دائرے میں سفر کرتا دو بڑے درختوں کی طرف چلا کیونکہ وہ جگہ بلندی پر تھی اور چرچ کے قدمچے بھی وہاں سے قریب تھے۔
ٹریکٹر روکنے کے بعد ایک لمحے میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ہم کامیاب ہوگئے تھے۔ میں نے ہینڈ بریک سیٹ کیا' انجن کو رننگ کنڈیشن میں چھوڑا اور نیچے اتر آیا۔ میں نے بینچ اتاری اور اسے ستواں چھت کے نیچے رکھ دیا۔
اب میں ہتھ گاڑی کی طرف متوجہ ہوا۔ ڈولورز اور گرٹروڈ نے آرگن سے ہاتھ ہٹالیا تھا۔ اگنس اور فرانس پیچھے سے ہانپتی ہوئی آرہی تھیں..... میں نے انہیں دور رہنے کو کہا اور میلوڈین کو رسیوں کی بندش سے آزاد کردیا۔ میں نے چرچ کی سیڑھیوں پر تختے اس حساب سے بچھائے کہ میلوڈین کے پہیے ان پر آجائیں۔
پھر میں نے لڑکیوں کو پکارا "سنو بھئی' تم لوگوں نے زبردست کام کیا ہے۔ اب غور سے سنو۔ ایک مرحلہ اور ہے۔ میلوڈین کو چڑھانے کے لیے ایک طرف سے اٹھانا ضروری ہے پھر دوسری طرف سے اٹھا کر تختوں پر رکھنا اور اس کے بعد نیچے سے دھکیلنا ہے۔"
"مجھے تو نیند آرہی ہے" ڈولورز نے اعلان کیا۔
"میں سردی سے ٹھٹھر گئی ہوں" یہ فرانس تھی۔
"یہ ہمارے بس کی بات نہیں" اگنس نے کہا۔
"میں گھر جانا چاہتی ہوں" ننھی گرٹروڈ بولی۔
"ابھی چلی جاؤ گی" میں نے کہا اور میلوڈین کی طرف بڑھا۔ اس پر ڈھکے ہوئے کمبلوں پر بہت برف جمع تھی۔ میں نے اسے جھاڑ کر بوجھ ہلکا کیا "اب آجاؤ جلدی سے۔ شاباش' اسے یہاں سے پکڑو۔"
میں کنارہ پکڑے کھڑا تھا۔ وہ بڑی بے دلی سے وہاں جمع ہوئیں۔ "پکڑو..... اور اٹھاؤ" میں نے کہا۔
میں نے زور لگایا۔ ایک لمحے بعد ان کا زور بھی شامل ہوا۔ میلوڈین تختوں پر لٹکا دیا گیا۔
میں سیدھا کھڑا ہوا "اب ایک طرف سے دھکیلنا اور ایک طرف سے اٹھانا ہے" میں نے کہا "گرٹروڈ' تمہیں دیکھنا اور خیال رکھنا ہے کہ آرگن تختوں سے نیچے نہ کھسکے اور تم تینوں اسے اٹھا کر اوپر دھکیلو۔"
اس مرحلے پر میلوڈین بالکل سیٹ کردیا گیا۔ اب اوپر چڑھانے کا دشوار مرحلہ سامنے تھا۔

ہم زور لگاتے رہے لیکن سیڑھیوں کی اونچائی کی وجہ سے زاویہ بہت خطرناک تھا۔ ہم اس حد تک میلوڈین کو اٹھا نہیں پا رہے تھے۔ ڈھائی سو پاؤنڈ وزن کو بیک وقت اونچائی تک اٹھانا اور پھر اوپر دھکیلنا ناممکن ثابت ہو رہا تھا۔

میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا "اب اٹھاؤ۔"

لیکن ہم ناکام رہے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ہماری اجتماعی ناکامی کا بوجھ بھی مجھ پر آپڑا۔ میں اٹھ نہیں سکا۔ میں اور نانا...... اور بعد میں یہ چاروں لڑکیاں بے شمار دشواریوں سے گزر کر میلوڈین کو چھ میل دور چرچ تک تو لے آئے تھے لیکن سیڑھیوں سے چرچ کے دروازے تک چھ فٹ کا فاصلہ مسئلہ بن گیا تھا۔ کیا اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی میں نانی کو یہ منہ مانگی خوشی نہیں دے سکوں گا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔

تین چار بار اور کوشش کرنے کے بعد میں نے جان لیا کہ یہ کام میرے اور ان چار لڑکیوں کے بس کا نہیں۔

میں پسینے میں نہا گیا تھا۔ میری کمر دکھ رہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جلتے ہوئے آنسو میرے رخساروں پر بہتے رہے۔ مجھے اپنی اس کمزوری پر غصہ آنے لگا۔ میں دانتوں سے اپنے ناخن کاٹنے لگا۔ عجیب بے بسی تھی جو مجھے اندر سے کاٹے ڈال رہی تھی۔

میں پیچھے ہٹا اور اپنے جسم کے بوجھ سے میلوڈین پر زور لگایا۔ "لڑکیاں...... یہ لڑکیاں......" میں نے غصے سے کہا "کاش میرے ساتھ کوئی مرد ہوتا تو یہ کام پورا ہو جاتا۔ مگر میرے ساتھ کمزور اور ناکارہ لڑکیاں ہیں، جو کچھ بھی نہیں کرسکتیں۔"

یہ سن کر اگنس رونے لگی۔ اسے دیکھ کر فرانسس کو رونا آگیا اور پھر ان سب نے بالترتیب رونا شروع کر دیا۔

تو یہ تھے ہم سب اس وقت...... طوفانی رات کے 'بدحالی کے زمانے کے کرسمس کے بچے'! اور ہم سب رو رہے تھے ہم سوچ رہے تھے کہ یہ خواب ہے...... اور ابھی آنکھ کھل جائے گی۔

اچانک برف باری تھم گئی!

ہوا بھی رک گئی تھی۔ ہم لالٹینوں کی روشنی میں کھڑے تھے۔ ٹریکٹر کے انجن کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔

اچانک ہمارا رونا بھی موقوف ہو گیا۔ ابتدا میں وہ بہت دور سے آتی ہوئی موہوم سی آواز تھی، جسے برف نے اور دبا دیا تھا۔ وہ جنوب سے آرہی تھی اور اس میں کوئی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز تھی۔

ہم جنوب کی طرف دیکھنے لگے، آواز بتدریج بلند ہو رہی تھی اور قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔

○☆○

اندھیرے میں وہ بالکل اچانک ہی ہمارے سامنے آیا۔ وہ سیاہ گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کا جسم بہت بڑے کوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ سر پر ٹوپی بھی تھی۔ درخت کے قریب پہنچ کر گھڑسوار گھوڑے سے اترا۔ اس نے باگیں درخت کی شاخ سے باندھیں اور اپنا کوٹ اتار کر گھوڑے کی زین پر ڈال دیا پھر وہ ٹریکٹر کی طرف بڑھا اور نیچے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ٹریکٹر کا انجن خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد وہ باوقار انداز میں قدم بڑھاتا ہوا ہماری طرف آیا۔

لالٹین کی زرد روشنی کے حلقے میں وہ آیا تو ہم نے اسے اچھی طرح دیکھا۔ وہ ایک دراز قامت جوان تھا۔ اس کے چہرے پر بھورے بالوں کی داڑھی تھی، جس کی وجہ سے وہ بزرگ ہونے کا تاثر چھوڑتا تھا۔ اس کے جسم پر نیلی وردی تھی...... توپ خانے کی۔ اس کی بیلٹ سے بائیں طرف سنگین والی بندوق لٹک رہی تھی۔ دائیں جانب ایک ریوالور لٹکا ہوا تھا۔

ہم پانچوں کے سامنے وہ دیو لگ رہا تھا۔ لڑکیاں اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے اپنی ٹوپی کے کنارے کو چھوتے ہوئے کہا "گڈ ایوننگ لڑکیو!" پھر اس نے فوجیوں کے سے انداز میں میرا معائنہ کیا۔ میں بدن چرانے لگا "خوب...... بہت خوب!" اس نے آہستہ سے کہا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کیا تاثر چھوڑوں گا مگر مجھے بہرحال اپنے ماتحتوں کے لیے ایک اچھی مثال قائم کرنا تھی "آپ کو ٹریکٹر بند نہیں کرنا چاہیے تھا" میں نے گھڑسوار سے کہا "اب اسے دوبارہ اسٹارٹ کرنا مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔"

"بعد میں دیکھا جائے گا بیٹے!" اس نے اپنے ہاتھوں کو باہم رگڑتے ہوئے کہا "ہمیں لڑکیوں کو برا بھلا کہنے کے بجائے یہ میلوڈین اندر پہنچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ تم وہاں اوپر کھڑے ہو جاؤ اور دیکھتے رہو کہ پہیے تختوں سے نیچے نہ اترنے پائیں۔"

وہ صریحاً حکم تھا۔ میں نے فوراً اس کی تعمیل کی۔ گھڑسوار جھکا۔ اس نے میلوڈین کو اوپر اٹھایا...... اتنا اوپر کہ اپنے کندھے پر رکھ لیا پھر جو اس نے زور لگایا تو ایک ہی بار میں میلوڈین اوپر پہنچ گیا۔

"دروازہ کھولو" گھڑسوار نے مجھ سے کہا "اور لڑکیو، تم لالٹینیں اٹھاؤ۔" میں نے دروازہ کھولا مگر چاروں لڑکیاں بت بن کر رہ گئی تھیں۔ دونوں لالٹینیں مجھے ہی اٹھا کر لانی پڑیں۔ گھڑسوار نے میلوڈین اٹھا کر اس دروازے کی اونچی چوکھٹ سے گزارا اور پھر اسے بینچوں کے درمیان سے گزارتا قربان گاہ کی طرف لے جانے لگا۔ میں اسے روشنی دکھا رہا تھا۔

"کہاں رکھا جائے اسے؟" گھڑسوار نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے، وہاں ٹھیک رہے گا" میں نے اشارہ کیا۔

میں بینچ اٹھا کر لانے کے لیے باہر گیا اور لڑکیوں سے پھنکار کر کہا "اندر چل کر مدد کرو نا۔"

مگر وہ ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں۔ ان پر لرزہ چڑھا ہوا تھا۔ ان کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اگنس

نے بمشکل کہا "بھبھ..... بھوت..... بھوت....."
"دماغ خراب ہے" میں نے اس پر آنکھیں نکالیں "وہ بھوت نہیں۔"
"تو پھر کیا ہے؟"
"تم اس کی فکر مت کرو۔ اندر چلو' کچھ کام بھی کرو۔"
بڑی مشکل سے وہ چرچ میں گھسنے پر آمادہ ہوئیں۔ میں نے دروازہ بند کیا اور انہیں گھیر کر قربان گاہ کی طرف لے چلا لیکن وہ اجنبی گھڑسوار کے قریب بھی نہیں گئیں۔ ایک بینچ پر بیٹھ کر تھرتھراتی رہیں۔
گھڑسوار نے میلوڈین پر ڈھکے ہوئے کمبل ہٹادیے۔ میں نے میلوڈین کی بینچ لے جا کر اس کی جگہ پر رکھ دی۔
گھڑسوار میلوڈین کا معائنہ کررہا تھا "واہ..... شاندار۔ بالکل نئے جیسا..... اور زندگی جیسا بڑا۔ بہت خوب صورت ہے۔ ہے نا لڑکے۔"
"یس سر!" میں نے کہا۔
"ذرا دیکھیں تو۔ کیا میرا نوٹ اب بھی وہیں موجود ہے؟" اس نے کی بورڈ کے ٹاپ کو فولڈ کردیا پھر لالٹین اٹھائی اور جھک کر کیبنٹ میں جھانکنے لگا "حیرت ہے۔ وہ وہیں موجود ہے۔"
"کیسا نوٹ؟" میں نے پوچھا۔
"وہی جو میں نے لکھ کر اس میں ٹھونس دیا تھا۔ یہ دیکھو نا۔"
میں اس کے پاس گیا اور کیبنٹ میں جھانکا۔ ایک سائیڈ میں ایک زرد کاغذ تھا... کھلا ہوا..... جسے چپکا دیا گیا تھا۔ اس پر لکھے حروف براؤن پڑگئے تھے لیکن اب بھی صاف پڑھے جارہے تھے۔ لکھا تھا... عزیز از جان سارہ کے لیے' تنہائی سے بچانے کے لیے۔
"پتا نہیں' سارہ کو یہ کبھی ملا بھی یا نہیں؟" گھڑسوار نے کہا پھر میری طرف مڑا "تمہیں معلوم ہے؟"
"نہیں جناب!"
اس نے لالٹین نیچے رکھ دی اور بینچ پر بیٹھ گیا "مجھے وہ دن خوب یاد ہے' جیسے کل ہی کی بات ہو۔ میں نے ایک گائے اور دس بھیڑوں کے بدلے یہ میلوڈین لیا تھا۔ نقد رقم اس کے علاوہ تھی مگر اس کے لیے میں کوئی بھی قیمت ادا کرسکتا تھا۔ میں تو اسے چھو بھی نہیں سکا مگر یہ میرا نمائندہ تھا..... میرا ترجمان۔"
ہم سب خاموش تھے..... میں بھی اور لڑکیاں بھی۔ گھڑسوار میلوڈین کی بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس کی پشت ہماری طرف تھی۔ میں نے چرچ کا جائزہ لیا۔ اس کی ہر چیز علاقے کی غربت اور پسماندگی کی غمازی کرتی تھی مگر وہاں رکھا ہوا وہ میلوڈین نہایت پُرشکوہ لگ رہا تھا۔ لالٹینوں کی روشنی میں اس کی لکڑی جو کہ چیری کے درخت کی تھی' خوب چمک رہی تھی۔ اس کے میوزک ریک پر جو نقش کام تھا' وہ بلاشبہ فن کا نمونہ تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ جیسے میلوڈین بنایا ہی اسی چرچ کے لیے گیا تھا۔ نانی نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔
"آپ کی داڑھی اصلی ہے؟" گرٹروڈ کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔
بینچ پر بیٹھے شخص نے سر گھما کر دیکھا "بالکل اصلی ہے بیٹا۔ تم ایسا کرو' میری گود میں آکر بیٹھو اور داڑھی کو کھینچ کر دیکھو' خود پتا چل جائے گا۔"
گرٹروڈ ہچکچا گئی "آپ سانتا کلاز ہیں؟"
"ہو بھی سکتا ہوں" گھڑسوار مسکرایا۔
گرٹروڈ اسے شبے کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "لیکن سانتا ریڈ سوٹ پہنتا اور رینڈیرز کی گاڑی میں سفر کرتا ہے۔" اس نے معترضانہ انداز میں کہا۔
"کبھی کبھی۔"
"اور وہ موٹا اور خوش مزاج ہے جبکہ آپ ایسے نہیں ہیں۔"
"بے شک لیکن سانتا کے بے شمار حلیے اور بے شمار لباس ہوتے ہوں گے۔ میرا تو یہی خیال ہے۔"
"خیر۔" گرٹروڈ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اب وہ بے تکلف ہونے کے چکر میں تھی۔ "بات یہ ہے کہ میں نے گڑیا مانگی تھی.... اور آپ نے مجھے تھمادیے جوتے۔"
"اوہ.... سوری مس مگر وہ جوتے اتنے اچھے ہیں.... اور میں ایک ایسی رجمنٹ سے واقف ہوں جو بخوشی تمہارے جوتوں کے بدلے بہت کچھ دے سکتا ہے۔"
مگر گرٹروڈ پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ "ٹھیک ہے۔ اگلے کرسمس پر مجھے گڑیا چاہیے.... اور وہ بھی آنکھیں بند کرنے اور کھولنے والی۔"
"تمہیں اچھی لڑکی بن کر رہنا ہوگا۔"
"میں ہمیشہ سے اچھی بچی ہوں۔"
"بس تو میں سوچوں گا۔" گھڑسوار نے وعدہ کیا پھر پلٹتے ہوئے کی بورڈ کا ٹاپ اٹھایا اور بٹنوں پر انگلیاں لہرائیں۔ "کاش.... مجھے سارہ کو اسے بجاتے دیکھنے کا موقع ملا ہوتا۔ کاش میں نے ننھے منصر کو دیکھا اور سنا ہوتا۔" وہ چند لمحے بیٹھا سوچتا رہا پھر جوشیلے انداز میں اٹھا اور اپنی ہتھیلی پر گھونسا مارا۔ "ایک بات سمجھ میں آئی ہے حارث بیٹے۔" مجھے اس پر حیرت نہیں ہوئی کہ وہ میرا نام جانتا ہے۔ وہ سب کے نام جانتا تھا۔ میں توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔
"سنو بیٹے' کل تم میرے منصر کو مجبور کرنا کہ وہ میلوڈین کو بجائے.... وہ گانا جو وہ میرے گھر آنے پر میرے لیے گانا چاہتا تھا' تاکہ میں اسے سن لوں۔" گھڑسوار نے میری ٹھوڑی پکڑ لی۔ "پلیز....."
میرے حلق میں گولا سا پھنس گیا۔ دانت بھنچ گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا "وہ نہیں گائیں گے جناب؟"
اس نے میری ٹھوڑی چھوڑ دی "نہیں گائے گا؟ کیوں نہیں گائے گا؟"
"انہوں نے کبھی وہ گانا نہیں گایا۔ جس روز انہیں پتا چلا کہ آپ واپس نہیں آئیں گے' اس کے بعد انہوں نے کبھی میلوڈین

نہیں بجایا۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے مگر وجہ نہیں معلوم۔"

اب یہ سب کچھ کہنا بہت مشکل تھا۔ رات نانا سے جو بھیڑوں کے شیڈ میں گفتگو ہوئی تھی، میں اسے لفظ بہ لفظ یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ "میں نے ان سے وجہ پوچھی تھی۔ انہوں نے کہا.... کیونکہ میرے پاپا اب کبھی نہیں سن سکیں گے۔ وہ مجھے دیکھ سکیں گے، نہ میں انہیں دیکھ سکوں گا۔"

گھڑسوار کی آنکھوں سے اذیت جھانکنے لگی۔ اس وقت میں نے پہلی بار غور کیا کہ اس کی رنگت راکھ جیسی تھی۔ اس کے چہرے پر مردنی تھی اور وہ کتنا تھکا ہوا اور مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔

"اوہ۔" بالآخر اس نے کہا۔ "منصر نہیں جانتا مگر یہ سچ ہے کہ میں اسے سن سکتا تھا لیکن وہ تو چپ سادھ کر بیٹھ گیا۔ خیر، کل اگر وہ میلوڈین بجائے اور گیت گائے تو میں ضرور سنوں گا۔ حارث.... میرے بچے، تم اسے راضی کرلینا۔"

وہ مجھ سے ناممکن کو ممکن بنانے کو کہہ رہا تھا۔ 'کیسے کروں؟ وہ بہت ضدی ہیں۔' میں نے چند لمحے سوچا پھر پوچھا۔ "اچھا، میں انہیں آپ کے بارے میں بتا سکتا ہوں؟ اجازت ہے؟"

"ارے نہیں...." اس نے جلدی سے کہا پھر لڑکیوں کو اور ان کے بعد مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ وہ کام ہے جو تمہیں نہیں کرنا ہے۔ تم میں سے کسی کو بھی نہیں۔ سمجھ میں آیا کچھ؟ کسی کو نہ بتانا کہ میں یہاں آیا تھا۔ ویسے تو کوئی یقین کرے گا بھی نہیں۔ کیونکہ عمر جیسے جیسے بڑھتی ہے، آدمی اتنا ہی مادی اور بے عقیدہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کسی کو مت بتانا کچھ۔"

"میں چاہوں تو بتا سکتی ہوں۔" گرٹروڈ بولی۔

گھڑسوار نے اسے سختی کی نظر سے دیکھا، پھر اس کی بہنوں کو اور آخر میں مجھے پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو پہلے سے زیادہ اونچا لگ رہا تھا.... جیسے دیو ہو۔ "ایک آواز نکال کر دیکھو۔ مجھے جس دن موقع ملے گا، چپکے سے پکڑلوں گا اور سارے دانت توڑ کر اور کان کاٹ کر لے جاؤں گا۔"

ہم سب نے جان لیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ حد یہ کہ گرٹروڈ بھی سہم گئی تھی۔ جیسے ہی اس نے دیکھا کہ اس کی دھمکی کام کرگئی ہے، اس کے چہرے پر نرمی بکھر گئی۔ "حارث بیٹے! اس وقت تو تم سب کو بستر میں ہونا چاہیے۔" اس نے بے حد محبت سے کہا۔ "اور کل کی فکر کرو۔ آج رات میں نے ضرورت کے وقت تمہیں سہارا دیا ہے۔ کل تم اس کے بدلے مجھے میرا پسندیدہ گیت سنواؤ، جس کا میں کب سے منتظر ہوں۔ حساب برابر ہوجائے گا۔"

"میں پوری کوشش کروں گا جناب۔" میں نے کہا۔ "بہت اچھی کوشش۔"

"پیارے لڑکے ہو تم اور میرا خون ہو اس لئے میں تم پر اعتبار کروں گا۔ چلو بچو، اب گھر کی فکر کرو۔ لالٹینیں اٹھاؤ۔"

ایک لالٹین میں نے اٹھالی اور دوسری اگنس کو دے دی پھر ہم آگے آگے چلے، دروازے سے گزرے اور سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ گھڑسوار سب سے آخر میں نکلا اور اس نے دروازہ بند کردیا۔

باہر رات ویسی ہی پُرسکون تھی جیسا ہم اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ ہوا کے جھکڑوں اور برف باری کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ درخت سے بندھا ہوا گھوڑا اپنے مالک کو دیکھ کر ہنہنانے لگا۔

گھڑسوار گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ "تم سب یہاں آؤ.... میرے پاس۔" اس نے پکارا۔ ہم قریب گئے تو اس نے ہم پانچوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر ایک دائرہ سا بنا دیا۔ "میرے بچو! بہادر ہونے کے لئے فوجی ہونا ضروری نہیں۔ تم لوگوں نے آج رات جو کچھ کیا ہے، میں اسے کمال بہادری کہوں گا۔ میں نے زندگی میں بہادری کی ایسی کوئی مثال اس سے پہلے نہیں دیکھی اور سنو، میں تم میں سے ہر ایک کا شکرگزار ہوں۔"

"یو آر ویل کم۔" گرٹروڈ بولی۔

اب وہ جارہا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ پوچھنے کا یہ آخری موقع ہے۔ "وہ جنگ، کہتے ہیں بہت خوفناک تھی؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا۔ "اس میں کوئی شک نہیں۔"

"اور وقعت کے اعتبار سے...."

"اپنے وطن کے لئے جنگ لڑی جائے تو اس کی وقعت کا حساب نہیں۔ بس سوچتا ہوں، کاش ہر جنگ جہاد ہوتی۔ تمہیں موقع ملے تو جہاد ضرور کرنا۔ اس میں نفع ہی نفع ہوتا ہے۔ زندہ تو غازی، مرے تو شہید۔"

"جی ہاں جناب۔"

"خدا کی رحمت تم پر سایہ فگن رہے۔ تمہیں جہاد ضرور نصیب ہوگا۔ بس میری بات کبھی بھولنا نہیں۔ اچھا بچو، گڈنائٹ.... اور ہاں، کرسمس مبارک ہو۔"

ہماری جوابی مبارک باد سے پہلے وہ ٹریکٹر کی طرف بڑھا۔ اس کا ہینڈل تھامتے ہوئے فلائی وھیل کو اس نے پوری قوت سے چکر دیا۔ اگلے ہی لمحے انجن جاگ اٹھا، دھواں اور آواز اگلنے لگا۔

گھڑسوار نے اپنی ٹوپی کو انگلیوں سے چھوتے ہوئے سر تھوڑا سا خم کیا پھر اس نے کاٹھی پر رکھا ہوا اپنا کوٹ پہنا، گھوڑے کو کھولا اور اس پر بیٹھ کر ایڑ لگادی۔ اس کا رخ جنوب کی طرف تھا۔

ہم پانچوں ساکت وصامت وہیں کھڑے اس سمت دیکھتے رہے، جدھر وہ گیا تھا پھر ٹاپوں کی آواز بھی مدھم ہوگئی اور ٹریکٹر کے انجن کی آواز رہ گئی۔



ہم ٹریکٹر پر بیٹھ کر واپس جارہے تھے۔ اس بار کوئی دشواری راستہ نہیں روک رہی تھی۔ اچانک اگنس میرے کان میں چلائی۔ "کون تھا وہ؟"

میں نے نفی میں سرہلایا۔

"وہ تمہارے نام سے واقف تھا اور تم بھی اسے جانتے تھے۔"

میں نے ظاہر کیا کہ ٹریکٹر کے شور میں کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔

"میں اپنے پاپا کو بتا دوں گی۔"

اب مجبوری تھی۔ یہ بات میں کیسے نہ سنتا۔ "اگنس' ایسا نہ کرنا۔ اس کی دھمکی یاد نہیں۔" میں نے اسے ڈرایا۔

"وہ تو یونہی سی دھمکی تھی۔"

"اس نے کہا تھا' کسی سے کچھ نہ کہنا۔" میں نے دہاڑ کر کہا۔

"اگر تم نے کسی سے کچھ کہا تو میں تم سے نفرت کرنے لگوں گا۔"

میری دھمکی سن کر اس کے ہونٹ سل گئے۔ اب میں سکون سے ٹریکٹر چلا سکتا تھا۔ راستہ آسان تھا۔ موسم کی سختی بھی دور ہو چکی تھی۔ میں اس سفر کو انجوائے کر رہا تھا۔

ڈکنس کا گھر دور سے جگمگاتا نظر آرہا تھا۔ اس کی ماں نے کوئی روشنی بجھی نہیں رہنے دی تھی۔ میرے ٹریکٹر روکتے ہی لڑکیاں اچھل کر اتریں۔ میرے نانا کیٹی کے ساتھ سڑک پر ہی کھڑے ہماری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ کیٹی نے اپنی بیٹیوں کو یوں لپٹا لیا' جیسے اسے ان کی واپسی کی کوئی امید ہی نہیں رہی ہو۔ "خدا تمہیں خوش رکھے حارث۔ صبح ملاقات ہوگی۔ کرسمس مبارک۔" اس نے اپنی بچیوں کو گھیر کر گھر کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ لہرایا۔

نانا ٹریکٹر پر چڑھ آئے مگر میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ میں نے تھروٹل اٹھایا' لیور کو اوپر کیا اور ٹریکٹر کو ایسا زبردست اسٹارٹ دیا کہ نانا کو سنبھلنے کے لئے چھت کا سرا پکڑنا پڑا پھر وہ ایک فینڈر پر بیٹھ گئے اور گھر پہنچنے تک مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان نظروں میں تعجب بھی تھا' ستائش بھی اور تشویش بھی۔

سفر میں کوئی پریشانی تو نہیں تھی۔ میں نانی کے بارے میں سوچتا رہا۔ صبح وہ چرچ میں داخل ہوں گی تو کیا کہیں گی؟ کتنی خوش ہوں گی پھر مجھے گھڑ سوار نانا کا خیال آیا۔ ان کی فرمائش میں کیسے پوری کروں؟ اپنے نانا کو میلوڈین بجانے پر کیسے رضامند کروں۔ جبکہ انہیں اس کو چھوئے ساٹھ سال سے بھی زیادہ ہوگئے پھر مجھے اپنے ڈیڈی اور ممی کا خیال آیا۔ ان سے فون پر بات کرنے کے بعد میں ان کے بارے میں سوچ تک نہیں سکا تھا۔ انہیں پتا چلے گا کہ آج کی رات ان کے بیٹے نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے تو وہ کتنا فخر کریں گے پھر مجھے نانی کی سنائی ہوئی کہانی یاد آئی اور میں نے سوچا' وقار کی ایسی تیسی۔ میں تو طمانیت کی موٹی تازی' رس سے بھری نارنگی ضرور لوں گا۔ چاہے وہ وقار کے بدلے ملے۔

ہم گھر پہنچے۔ میں نے بڑی مہارت سے ٹریکٹر کو براہِ راست اس کی جگہ لے جا کر روک دیا۔ نانا نیچے اترے اور انہوں نے انجن بند کر دیا۔ ٹریکٹر نے اپنی آخری فاتحانہ سانسیں لیں اور پھر خاموش ہوگیا۔

ہم نے ہتھ گاڑی کو نیچے اتارا اور اسے اس کی جگہ پر پہنچا دیا۔ رسیاں اور کمبل اپنی جگہ پہنچا دیے گئے۔ اب نانی دیکھتیں تو کہہ نہ سکتیں کہ گودام کی کوئی چیز بھی اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہے۔

گودام کے باہر ہم دونوں چند منٹ کھڑے سن گن لیتے رہے۔

"طوفان جان چھوڑ گیا۔" بالآخر میرے نانا نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"مگر بہت سردی ہے۔ منفی دس تو اب بھی ہوگا۔"

"جی.... کم از کم۔" میں نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ ستارے ٹمٹما رہے تھے مگر وہ اتنے روشن نہیں لگ رہے تھے.... اور بہت زیادہ اوپر بھی دکھائی دے رہے تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں سو گیا۔" نانا نے معذرت کی۔ "نڈھال ہو گیا تھا میں۔"

"کوئی بات نہیں نانا۔" میں نے بزرگانہ انداز میں کہا۔

"تو تم نے میلوڈین چرچ میں پہنچا دیا۔"

"ہوا کی طرح.... پانی کی طرح۔" میں گنگنایا۔

"تم نے ان لڑکیوں کی مدد سے اسے چرچ کے اندر پہنچا دیا۔"

"جی پکی بات ہے۔"

"مگر کیسے؟"

اب مجھے احتیاط سے کام لینا تھا۔ "جیسے میں نے اور آپ نے اسے گھر سے نکالا تھا.... ہتھ گاڑی کی مدد سے!"

"لیکن بچیوں کے لئے تو وہ بہت بھاری.... بہت بڑا تھا۔" نانا کے لہجے میں حیرت در آئی۔

"ارے نانا' وہ بچیاں نہیں' بھینسیں ہیں بھینسیں۔"

"لڑکے' سچ بتاؤں۔ مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آتا۔"

"اچھا۔ صبح خود دیکھ لیجئے گا۔"

نانا اب مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں دور بہت دور' خلاؤں میں تاروں کو دیکھ رہا تھا' جو کبھی جلتے تھے' کبھی بجھتے تھے۔

"سنو! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو میں آخرت میں بھی تمہارا شکر گزار رہوں گا۔" نانا بولے۔

"مجھے خوشی ہوئی نانا۔" میں نے بڑوں کے سے انداز میں کہا۔

ہم گھر کی طرف چل دیے۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا۔ "نانا.... ایک نظر میمنے کو بھی دیکھ لیں نا۔"

"تم کہتے ہو تو چلتے ہیں۔"

ہم بھیڑوں کے شیڈ میں پہنچے۔ بیشتر بھیڑیں سو رہی تھیں۔ شاید وہ ہری بھری چراگاہوں کے' موسم بہار کے اور بال اتارے جانے کے خوشگوار خواب دیکھ رہی ہوں گی لیکن بچہ دینے والی بھیڑ اور اس کا نر دونوں جاگ رہے تھے۔ بھیڑ کھڑی تھی اور اس کا میمنا دودھ پی رہا تھا۔ اس کی دُم کی زندگی سے بھرپور حرکت اس کی خوشی کی غمازی کر رہی تھی۔

نانا نے اپنی مونچھ کے ایک کونے کو مروڑا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ان کے چہرے پر کتنی تھکن، کتنا بڑھاپا نظر آرہا ہے۔ اگر ان کی داڑھی چوڑی ہوتی تو وہ "کسی" سے کتنا زیادہ مشابہ نظر آتے۔

"مجھے اب بھی یقین نہیں آتا۔" نانا بڑبڑائے۔ "یہ الگ بات کہ کسی نے تمہاری مدد کی ہو۔"

ہم پھر برف پر سے گزرتے گھر کی طرف چل دیے۔ ہم دونوں ہی نیند سے بوجھل ہو رہے تھے۔ بستر ہمارے انتظار میں سرد ہو چکا ہو گا مگر کوئی بات نہیں۔

○☆○

میں صبح جلدی اٹھ گیا۔ عقبی صحن میں مرغیوں نے طوفانِ بدتمیزی برپا کیا ہوا تھا۔ ان کے شور نے مجھے جگا دیا۔ جاگتے ہی مجھے خیال آیا کہ یہ کرسمس کی صبح ہے اور ہمیں چرچ بھی جانا ہے اور مجھے نانا کو میلوڈین بجانے پر آمادہ کرنے کی کوئی ترکیب بھی سوچنی ہے۔

میں نے کپڑے بدلے اور نیچے چلا گیا۔ وہ ایک خوبصورت دن تھا...... سرد دن مگر دھوپ اور روشنی سے بھرا ہوا۔ میں کچن میں داخل ہوا۔ نانی اپنی عادت کے مطابق بیک وقت دو کاموں میں الجھی ہوئی تھیں۔ وہ ناشتا بھی بنا رہی تھیں اور ایک اور مرغی بھی صاف کر رہی تھیں۔ "کرسمس مبارک۔" میں نے چہک کر کہا۔

"تمہارے نانا نے کارنامہ انجام دے دیا۔" نانی نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"کارنامہ؟" میں بوکھلا گیا۔ "کیسا کارنامہ؟"

"ارے انہوں نے زندگی میں پہلی بار مرغی ذبح کر ڈالی۔ میں اس شخص کو ساری زندگی نہیں سمجھ سکوں گی۔"

"نانا ہیں کہاں؟"

"ضروری کام نمٹا رہے ہیں۔"

"اور آپ کو کیسی نیند آئی؟"

"نیند کیا، بے ہوشی تھی۔ پتا نہیں رات مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ارے ہاں بیٹے، کرسمس مبارک ہو تمہیں۔"

نانا کچن میں داخل ہوئے۔ "سنو بھئی، سروس تو آج ہو گی۔ شاید کاڈویلز نے راستوں اور سڑکوں سے برف ہٹائی ہے۔" انہوں نے چپکے سے مجھے آنکھ ماری۔ "یا شاید قصبے کی انتظامیہ نے صفائی کرادی ہے۔"

اگلے دو گھنٹے بڑی مصروفیت کے تھے اور نانا کے لئے آئیڈیل تھے کیونکہ نانی کو بھولے سے بھی پارلر میں جانے کا موقع نہیں ملا۔ موقع ملتا تو میلوڈین وہاں موجود نہ پا کر وہ کچھ کچھ سمجھ جاتیں۔ بہرحال ہم نے بیٹھ کر ناشتا کیا پھر میں نے برتن دھوئے۔ نانی مرغیوں میں مسالا بھرتی رہیں پھر انہوں نے وہ روسٹ ہونے کے لئے اوون میں رکھ دیں۔

مسٹر اینڈ مسز کاڈویل اپنی سیڈان میں ہمیں چرچ لے جانے کے لئے آئے تو ہم سب تیار تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں عقبی سیٹ پر خواتین کے ساتھ بیٹھا۔ نانا مرغی کی باسکٹ لے کر اگلی سیٹ پر بیٹھے۔

راستے میں کہیں برف رکاوٹ نہیں بنی!

نانا کی درخواست پر گاڑی ہینشا کے مکان پر روکی گئی۔ جواد اور ایبی چرچ جا چکے تھے۔ نانا نے مرغی کی باسکٹ ان کے پورچ میں دروازے پر چھوڑ دی۔

ہم اسٹیکیبل کے گھر کے سامنے سے گزرے اور کاؤنٹی روڈ پر پہنچ گئے۔ اب میرے پاس وقت کم تھا۔ بڑے نانا نے مجھے بہت بڑی مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ میں دن کی روشنی میں سوچ اور کہہ سکتا تھا کہ بڑے نانا ہماری مدد کے لئے نہیں آئے تھے۔ کسی طرح میں نے اور لڑکیوں نے زور لگا کر میلوڈین کو اندر پہنچایا تھا۔ کم عمری میں جھوٹ مختصر ترین راستہ ہوتا ہے لیکن سچ بلوغت کی طرف لے جاتا ہے اور سچ یہ تھا کہ اب چند منٹ بعد نانا کی فیملی کو جو عزت اور سرفرازی ملنے والی تھی، وہ صرف اور صرف اس مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر آنے والے کے دم سے تھی۔ وہی اس عزت کا مستحق تھا اور اس نے مجھ سے فرمائش کی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو ساز بجاتے دیکھنا چاہتا تھا، اس کا گانا سننا چاہتا تھا۔ وہ بیٹا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ گانا جو ایک ننھے لڑکے نے اپنے باپ کے استقبال کے لئے سوچا اور جوڑا تھا اور میں نے کہا تھا...... میں پوری کوشش کروں گا۔ سو اب مجھے کوشش کرنی تھی اور اس کے نتیجے میں ہمیں نانا کے غصے کا، گاؤں والوں کے مذاق اور تمسخر کا نشانہ بن سکتا تھا۔ مجھے عمر بھر کی شرمندگی بھی مل سکتی تھی۔

چرچ کے باہر گاڑیوں کی قطار دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ آج ہاؤس فل ہو گا اور یہ بھی پتا چل گیا کہ ہم لیٹ پہنچے ہیں۔

ہم گاڑی سے اتر آئے۔ نانا نے دانستہ نانی کو الجھا لیا تاکہ ہم آخر میں داخل ہوں۔ مسٹر اور مسز کاڈویل چرچ میں چلے گئے۔ میں نانا کی بات سمجھ رہا تھا۔ وہ نانی کا دھیان بھٹکانا چاہتے تھے تاکہ سرپرائز ان کے لئے فل سرپرائز ہو۔ "ٹوکری میں کیا رکھا تھا تم نے؟" انہوں نے نانی سے پوچھا۔

"کچھ کھانے پینے کی چیزیں تھیں اور کیا ہوتا۔" نانی جھنجلا گئیں۔

"میں سمجھا......"

"چھوڑو فضول باتیں۔" نانی نے کہا اور قدم بڑھایا...... نانی کے پیچھے ہم دونوں چرچ میں داخل ہوئے۔

میں اپنی نانی کے چہرے کا تاثر لفظوں میں پوری طرح بیان نہیں کر سکوں گا۔ یہ کام ناممکن ہے مگر بیان تو مجھے کرنا ہے۔ نانی کو پچھلی نشستیں پڑوسیوں اور جاننے والوں سے بھری نظر آئی ہوں گی...... اور وہ سب نظریں جمائے انہی کو دیکھ رہے ہوں گے۔

انہیں چرچ کو گرمی دیتا آہنی چولہا نظر آیا ہوگا۔ انہیں فادر گورین نظر آئے ہوں گے' جو انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے یہ سب دیکھا ہوگا مگر نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ تو آرگن دیکھ کر بت بن گئی تھیں۔ کبھی وہ آرگن کو' کبھی نانا کو اور کبھی مجھے دیکھتی تھیں۔ ان لمحوں میں ان کا بوڑھا چہرہ جوان لگنے لگا تھا۔ وہ جوان ہو گئی تھیں..... اور ان کا شوہر ان سے اظہارِ محبت کر رہا تھا۔

میں اور نانا آگے بڑھے اور نانی کو درمیان میں لے لیا۔ ہم انہیں ایک بینچ کی طرف لے گئے۔

فادر گورین کی آواز چرچ میں گونج اٹھی۔ "عبادت سے پہلے میں مسٹر اور مسز منصر امروک کا شکریہ ادا کروں گا' جنہوں نے بڑی محبت سے چرچ کو وہ میلوڈین تحفے میں عنایت کیا' جو ۱۸۶۹ء سے ان کی فیملی کے پاس ہے' جو ان کے لئے بزرگوں کی نشانی ہے۔ مجھے یقین ہے' سب لوگ اس تحفے کو سراہیں گے اور ان لوگوں کے اس احسان کو کبھی نہیں بھولیں گے اور انہیں ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ تحفے کی شکر گزاری کے علاوہ ہم سب منصر امروک اور ان کے نواسے حارث کے شکر گزار ہیں جنہوں نے طوفانی رات میں اس میلوڈین کو اپنے ٹریکٹر پر لاد کر یہاں تک پہنچایا۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ اسلام بڑا دین ہے اور مسلمان واقعی تمام اہلِ کتاب سے محبت کرتے ہیں۔ یہ جذبہ ہی تھا کہ میلوڈین اتنے خراب موسم میں چھ میل دور لایا جا سکا ورنہ یہ کام عملاً ناممکن تھا....."

"فادر....." میرے نانا نے مداخلت کی۔

"لیس مسٹر امروک؟"

"مجھے ضرورت سے زیادہ کریڈٹ نہ دیں۔" نانا بولے۔ "میں تو بس اسٹیکیل کے گھر تک ہی آسکا تھا۔ ہمیں ٹریکٹر کو اسٹارٹ کرنے میں بڑی پریشانی ہوئی تھی اور اس سے پہلے مجھے ایک بھیڑ کو بچہ دینے میں مدد دینی پڑی تھی۔ چنانچہ میں نڈھال....."

"بھیڑ؟ بچہ؟" چارلی گریو نے چونک کر پوچھا۔

"اس موسم میں؟" یہ ایمٹ روچ تھا۔

"جی جناب۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی بھیڑ نے اس موسم میں بچہ دیا۔ مگر یہ سچ ہے۔ بہر حال میں نڈھال تھا۔ اسٹیکیل کے گھر میں' میں سو گیا۔ کیٹی نے اپنی بچیوں کو میرے حارث کے ساتھ بھیجا۔ باقی سب کام ان بچیوں نے کیا۔"

اب سب لوگ ان چاروں بہنوں کو مسکراہٹوں سے نواز رہے تھے اور وہ شرمائے جا رہی تھیں۔

"ہم ان بچیوں کے بھی شکر گزار ہیں۔" فادر گورین نے کہا۔ "اب مسز امروک' اگر آپ ہمیں آرگن پر کوئی افتتاحی دھن سنا دیں تو یہ ہمارے لئے بڑا اعزاز ہوگا۔"

"آئی ایم سوری فادر۔" نانی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "گٹھیا کی تکلیف نے میری انگلیوں کو ناکارہ کر دیا ہے۔ اب میں یہ آرگن بجا ہی نہیں سکتی۔ مجھے معاف کر دیا جائے۔"

عبادت گزاروں کے مجمع سے ہمدردانہ آوازیں ابھریں اور ڈوب گئیں۔

"تب مسز امروک' مجھے افسوس ہے کہ....."

میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "فادر' میرے نانا کو آرگن بجانا آتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میرے بڑے نانا ابراہیم کی خواہش ہے کہ نانا وہ گیت گائیں' جو انہوں نے سوچا تھا کہ ابراہیم کی واپسی پر گائیں گے۔"

چرچ میں خاموشی چھا گئی۔ اب میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ خواہ کتنی ہی تکلیف اور شرمندگی اٹھانی پڑے۔ اس مسئلے کا کوئی اور حل تھا ہی نہیں۔ ایک بیٹے کی نظروں میں باپ کی حیثیت بحال کرنی تھی۔ بیٹے کو یقین دلانا تھا کہ باپ مرنے کے بعد بھی اس بیٹے کو نہیں بھولا ہے' جس کے وجود کا اسے اپنی زندگی میں علم بھی نہیں تھا۔ میں اپنے آپ میں بڑا ہو گیا تھا۔ میرے اسلاف میں سے دو بڑے میرے سامنے اور ایک دوسرے کے مدِ مقابل تھے اور وہ دونوں ہی بہت ضدی اور آسانی سے نہ ماننے والے تھے۔ "یہ ابراہیم کون ہیں؟"

"ابراہیم امروک' میرے بڑے نانا..... توپ خانے کے سپاہی۔ انہوں نے یہ میلوڈین سارہ کو اس وقت دیا تھا' جب وہ جنگ پر گئے تھے۔"

"سارہ؟"

"میری بڑی نانی۔ انہوں نے نانا کو میلوڈین بجانا سکھایا تھا' جب یہ بہت چھوٹے تھے لیکن جب ابراہیم کی موت کی خبر پہنچی تو میرے نانا نے میلوڈین بجانا چھوڑ دیا۔ کبھی بھی نہیں بجایا لیکن ان کے پاپا چاہتے ہیں کہ آج یہ میلوڈین بجائیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو حارث؟"

"انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا۔"

"کب؟"

"کل رات کو جناب۔ یہیں..... اسی جگہ۔"

"اسی جگہ؟"

میں نے فادر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ نانا اور نانی کی طرف دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی ورنہ میں ڈھیر ہی ہو جاتا۔

"جی ہاں جناب۔" میں نے کہا۔ "سچ یہ ہے کہ میں اور یہ لڑکیاں پوری کوشش کے باوجود میلوڈین کو اندر نہیں لا پا رہے تھے۔ یہ بہت بھاری ہے۔ ایسے میں بڑے نانا گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور ہماری مدد کی۔ بعد میں انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں نانا کو وہ گیت گانے پر مجبور کروں' جو نانا نے ان کی واپسی پر ان کے استقبال کے لئے تیار کیا تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں کوشش کروں گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم کسی کو ان کے متعلق نہ بتائیں کیونکہ کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا لیکن میں کیا کروں؟ نانا کو کسی اور طرح رضامند کر ہی نہیں سکتا۔"

آج بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ میں نے وہ سب کچھ کہہ دیا مگر

یہ سچ ہے۔ میں تنہا کھڑا تھا۔ صرف اس لئے کہ مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ چرچ میں موجود ہیں' ان کے علاوہ بھی کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔
"ممکن ہے' آپ مجھ پر یقین نہ کریں لیکن لڑکیوں سے پوچھ لیں۔"
پھر میں ان کی طرف مڑا۔ "کیوں اگنس' وہ آئے تھے نا۔"
اگنس یوں بیٹھی رہی' جیسے میں اسے نظر ہی نہیں آرہا ہوں۔
"فرانس... ڈولورز... تمہی بتاؤ نا۔" میں نے اپیل کی۔
وہ بھی بت بنی بیٹھی رہی۔
"گرٹروڈ... تم تو سچ بولو گی نا؟"
گرٹروڈ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "جی' میرا خیال ہے سانتا کلاز یہاں آیا تھا۔" وہ بولی۔ "اس کی داڑھی بھی تھی۔ اس نے نیلا سوٹ پہنا تھا' لال نہیں اور وہ کالے گھوڑے پر سوار ہو کر آیا تھا۔ اس کے پاس تحفوں کا تھیلا نہیں تھا' تلوار تھی اور وہ موٹا اور خوش مزاج بھی نہیں تھا۔ وہ اداس اور دبلا پتلا تھا اور میں نے اس سے جوتوں پر احتجاج کیا تو اس نے اگلے کرسمس پر مجھے گڑیا دینے کا وعدہ کیا۔" وہ اور بھی کچھ کہتی مگر کیٹی نے کھینچ کر زبردستی اسے بٹھا دیا۔
فائدہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ حاضرین کو میری بات پر یقین نہیں آیا ہے۔
"میں ثابت کر سکتا ہوں۔" میں نے چیخ کر کہا۔ میں فادر سے مخاطب تھا۔ "فادر..... آپ کی بورڈ کے ٹاپ کے اندر دیکھیں۔ وہاں آپ کو سارہ کے نام ابراہیم کا لکھا ہوا نوٹ ملے گا۔ یہ انہوں نے کل خود مجھے بتایا تھا۔ یہ نوٹ بورڈ پر چپکایا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ 'اپنی سارہ کے لئے' تنہائی کا ایک ساتھی۔' میں سچ کہہ رہا ہوں جناب۔"
فادر گورین مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے پھر وہ محتاط انداز میں میلوڈین کی طرف گئے۔ اس کے کی بورڈ کا ٹاپ اٹھایا' کیبنٹ کے اندر جھانکا' اپنی عینک درست کی اور دوبارہ اندر جھانکا پھر وہ سیدھے کھڑے ہو گئے۔ "نوٹ موجود ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اور اس کے الفاظ بھی یہی ہیں۔ مسٹر امروک' آپ کو اس نوٹ کی موجودگی کا علم تھا؟"
سب ہمہ تن سماعت بن گئے۔ "نہیں فادر۔" نانی کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔ "اس کا تو میری ساس سارہ کو بھی علم نہیں تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کے متعلق اس لمحے سے پہلے نہیں جانتا تھا۔" انہوں نے سر جھٹکا۔ "میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا ہے۔"
وہاں سب کا یہی حال تھا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ مرد سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔ عورتیں مشورہ طلب نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ میری بات کو آسانی سے رد کیا جا سکتا تھا۔ میں ایک لڑکا تھا' جس نے ایک کہانی گھڑلی تھی۔ گرٹروڈ تو تھی ہی بچی مگر وہ نوٹ ایک حقیقت تھا۔ ڈھائی سو پاؤنڈ وزنی میلوڈین ایک اور حقیقت تھا۔ وہاں موجود سب لوگ جانتے تھے کہ ایک لڑکا اور چار لڑکیاں مل کر وہ بھاری میلوڈین چرچ کے اندر کسی بھی طرح نہیں پہنچا سکتے تھے۔
اب میرے لئے کھڑا رہنا ناممکن تھا۔ میں بیٹھ گیا۔
فادر نے اپنی عینک اتار کر اس کے شیشے رومال سے صاف کیے اور پھر عینک دوبارہ لگالی۔ "دوستو' مجھے نہیں علم کہ اس سے ہمارے دلوں کو کتنا اور کیا فائدہ پہنچے گا۔ ہم سب نے بہت کچھ دیکھا اور سنا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم نے ایک معجزہ دیکھا ہو۔ بچوں کی آنکھیں وہ کچھ دیکھ سکتی ہیں' جو ہم بڑوں کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور ہم میں کون ایسا ہے' جو کہہ سکتا ہو کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ نہیں اس موسم میں ہم نے تباہ شدہ چرچ کے ملبے پر یہ نیا چرچ کھڑا کر لیا۔ یہ معجزہ نہیں کہ ہمیں ایک مسلمان فیملی کی طرف سے آرگن مل گیا اور یہ تم تک بچوں نے پہنچایا ہے۔ یاد رکھیں' گزشتہ رات کرسمس کی رات تھی' جو ہے ہی کرشموں کی رات۔ سو دوستو' آؤ دعا کریں۔"
سب نے سر جھکا لیے۔ "مالک' میلوڈین کے معجزے پر ہم تیرے شکرگزار ہیں۔ ہم ان بچوں کے حوصلے کے شکرگزار ہیں' جو یہاں سونا چاندی نہیں' موسیقی لے کر آئے۔ خداوند' اس عورت ایلیا امروک پر اپنی رحمت فرما اور اس شخص منصر امروک پر اپنی رحمت فرما' جو اپنے گاؤں والوں کے لئے رحم اور دریا دلی کا نشان ہے۔ اب ہم خداوند' تجھ سے ایک معجزے کی دعا کرتے ہیں اور منصر امروک سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اپنے باپ کی روح کے سکون کے لئے وہ گیت سنائے جو اس نے باپ کے خیرمقدم کے لئے تیار کیا تھا۔ اس باپ کے لئے جو تیری مرضی کے تحت لوٹ کر نہ آسکا۔ آمین۔"
فادر نے نظریں اٹھا کر ہم تینوں کو دیکھا اور پکارا۔ "منصر۔"
میری نانی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ان کی گرفت بہت سخت تھی۔
میرے نانا آہستہ سے اٹھے اور بینچوں کے درمیان سے گزرتے قربان گاہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ میلوڈین کے سامنے یوں جا کر کھڑے ہوئے' جیسے وہ کوئی عدالت ہو پھر آہستگی سے وہ بینچ پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے پاؤں پیڈل پر رکھے اور دباؤ ڈالا۔ آرگن کے پردے ہوا سے بھر گئے۔ نانا کا ہاتھ اٹھا۔ انگلیاں چابیوں پر گریں۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔
ہم سب سانسیں روکے بیٹھے تھے۔ وقت ایسا لگتا تھا کہ تیزی سے معکوس سفر کر رہا ہے۔ سب منتظر تھے اور میلوڈین کے سامنے بینچ پر بیٹھا ہوا شخص دیکھتے ہی دیکھتے بدل رہا تھا۔ اب وہ جوانوں کی طرح تن کر بیٹھا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ جیسے لڑکا بن گیا..... افسردہ' کھویا کھویا' باپ سے محروم لڑکا۔ کیا اس کی یادداشت اسے دھوکا دے جائے گی؟ کیا اس کی انگلیاں اس کے دماغ کے حکم کی تعمیل نہیں کر پائیں گی؟ کیا زندگی بھر کی محرومی اور اذیت نغمے میں ڈھلے

سکے گی؟

نانا کی انگلیوں نے کی بورڈ کو چھوا۔ صبح کی نرم دھوپ میں ان کے رخساروں پر بہتے آنسو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ چرچ خوبصورت اور پُراثر موسیقی سے بھر گیا تھا اور وہ گیت بڑے لوگوں کے لئے تھا جو ایک ایک کر کے کھڑے ہونے لگے۔ وہ سب نانا جیسے ہی تھے 'ان کے پاس وہ زخم تھے' جنہیں وقت کبھی نہیں بھر سکا تھا۔ وہ سب قربانی کے مفہوم سے واقف تھے۔ قربانیاں دے چکے تھے۔ وہ سب نانا کی آواز میں آواز ملانے لگے۔ ان کی آوازوں میں دلیری تھی مگر وہ لرز رہی تھیں۔

موت سے لڑ کر' موت سے جیت کر آنے والے
میں جیون' میں تیرے گلے کا ہار پاپا۔ پاپا پاپا میرے پاپا
نظریں جمائے راستہ تکتا رہتا ہوں
اب آجاؤ' ابھی جاؤ' ہر پل کہتا ہوں
تم ماما کا سنگار پاپا' پاپا پاپا میرے پاپا
کیا میں تم کو یاد کبھی نہیں آتا ہوں
بات یہ سوچ کے اکثر میں ڈر جاتا ہوں
مجھ کو ہے تم سے پیار پاپا۔ پاپا پاپا میرے پاپا
ملی نہیں آغوش وہ پیاری اس دن تک
دیکھی نہیں صورت ہی تمہاری اس دن تک
عمر گئی بے کار پاپا۔ پاپا پاپا میرے پاپا

گیت ختم ہوا تو صرف نانا اور نانی ہی کی نہیں' تمام حاضرین کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

○☆○

میں اگلے موسم گرما تک فارم پر رہا پھر ڈیڈی کو ملازمت مل گئی اور انہوں نے مجھے بلوا لیا مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے شہری زندگی اچھی نہیں لگتی۔ میں یہیں رہوں گا اور یہیں مروں گا۔

اب اس بات کو اکتالیس برس ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد میں نے کبھی بڑے نانا کی جھلک بھی نہیں دیکھی بلکہ برسوں تو مجھے بھی یہی شک رہا کہ وہ میرے اپنے ذہن کی اختراع تھی مگر پھر مجھے فادر کے الفاظ یاد آئے۔ انہوں نے کہا تھا' بچوں کی آنکھیں وہ کچھ دیکھ لیتی ہیں' جو بڑوں کو نظر نہیں آتا۔ اب بھی کبھی سرد راتوں میں مجھے ٹریکٹر کے انجن کی آواز سنائی دیتی ہے جیسے وہ میلوڈین کو اٹھائے چلا جا رہا ہے۔ اب بھی سرما کی کسی صبح مجھے میلوڈین کی آواز سنائی دیتی ہے......پاپا پاپا میرے پاپا۔

میں اس کرسمس کے تحفوں کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ اگر میرے نانا نے نانی کو اس میلوڈین کا تحفہ دیا تو ایک اعتبار سے ان دونوں

نے مل کر وہ خدا کو تحفے میں دے دیا۔ مجھے جو روحانی تحفے ملے' وہ بہت بیش بہا تھے۔ صحیح معنوں میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وطن کی محبت کیا ہوتی ہے۔ دوسری طرف مجھے اس یقین کا تحفہ ملا کہ بلاشبہ اسلام سب سے اچھا اور اللہ کا سب سے پسندیدہ دین ہے۔ وہ رواداری اور محبت سکھاتا ہے۔ نفرت' تعصب اور تنگ نظری سے دور کرتا ہے۔ اگر ہم اپنے مذہب سے ناواقفیت کے باوجود اتنے اچھے ہو سکتے ہیں کہ دوسرے ہمیں اس طرح سراہیں تو مذہب کو سمجھنے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے کے بعد ہم عظمت کی کن بلندیوں کو چھو سکتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب مطالعہ کروں گا اور دین کی آگہی حاصل کروں گا۔

اور میں نے کیا بھی یہی۔ آج میں اسلام سے پہلے کی طرح بے خبر نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اب بھی میں نے سمندر سے بس دو چار بالٹی پانی حاصل کیا ہے۔ اللہ نے زندگی دی تو یہ کام جاری رکھوں گا۔ جو کچھ سمجھ رہا ہوں' بساط بھر دوسروں تک بھی پہنچا رہا ہوں۔ آگہی بڑھتی رہنی چاہیے۔ اس خطے کے مسلمانوں کے ساتھ یہی کمی رہی ہے۔

میرے نانا کا اسی سال اپریل میں انتقال ہوا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ میں نے پچھلے ان کے پھیپڑوں کی بیماری کے بارے میں لکھا ہے۔ اگلی فصل کی بوائی کرتے ہوئے انہیں ٹھنڈ لگ گئی' جو چپکے چپکے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ انہیں نمونیا ہوگیا۔ ہوول سے کئی بار ڈاکٹر کو بلایا گیا کیونکہ نانا کو اسپتال لے جایا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ نقل و حرکت کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان کے لئے جو کچھ کیا جاسکتا تھا' کیا گیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ان کی حالت بہت تیزی سے گرتی چلی گئی۔

یہ سب کچھ صبح اور دوپہر کے درمیان ہوا۔ اس صبح مسٹر اور مسز ہینشا' مسٹر اور مسز اسٹیکبل اور مسز کاڈویل نانا کی عیادت کے لئے آئے۔ سبھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ لائے تھے۔ حالانکہ نانا ہر چیز سے بے نیاز تھے۔ وہ لوگ چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد کچن کے برابر والے بیڈ روم سے نانی نکلیں۔ انہوں نے بتایا کہ نانا کو ہوش آگیا ہے اور وہ مجھے بلا رہے ہیں۔

میں گیا اور نانا کی پٹی سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ میں خوفزدہ تھا۔ اس وقت تک موت سے میرا تعارف نہیں ہوا تھا۔ یہ تو اب پتا چلا کہ موت سے آدمی اتنا خوفزدہ نہیں ہوتا' جتنا آدھی رات کو مشکی گھوڑے پر سوار ہو کر آنے والے سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ موت جو مہربان ہے' نجات دلانے والی ہے۔ اللہ کی رحمت ہے اور اس پر فتح نہیں پائی جاسکتی کیونکہ وہ اللہ کا حکم ہے جو ٹلتا نہیں۔

مگر اس وقت میں یہ سب کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں صرف تیرہ سال کا تھا...... اور خوف زدہ تھا۔ میں اپنے نانا کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ نانا بہت سفید' بہت کمزور ہوگئے تھے۔ ان کی آنکھیں دھنس گئی تھیں۔ مونچھیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے ہونٹ حرکت کررہے تھے۔ میں آگے بڑھا اور میں نے ان کے منہ سے اپنا کان ملادیا۔

"جاؤ بیٹے۔ چہل قدمی کر آؤ۔" نانا سرگوشی میں کہہ رہے تھے۔

میں نے نفی میں سرہلایا۔

"جاؤ...... بھیڑوں کے گلّے کو دیکھو۔ اس میمنے کو ڈھونڈو۔"

"نہیں نانا' نہیں۔"

"میں کہتا ہوں' جاؤ۔"

"دل نہیں چاہ رہا ہے نانا۔"

"یہ میرا حکم ہے بیٹے۔"

لہجے کے اس تحکم نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے کرسمس کی رات چرچ کے باہر کسی کا تحکمانہ لہجہ یاد آگیا۔ جب کسی نے میلوڈین کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر نانا کی آنکھوں میں دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھی بڑے نانا کی آنکھوں کی یاد دلا رہی تھیں۔ وہ ایک فوجی کی شجیع آنکھیں تھیں۔

میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور ڈگمگاتا ہوا چلا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان سے کچھ دیکھنا میرے لئے ناممکن تھا۔ باہر نکل کر میں چراگاہ سے گزرتا ہوا روڈ پر آیا۔ میں زندگی میں کبھی اتنا اداس نہیں ہوا تھا اور میں بہت اکیلا بھی تھا پھر میں واپس آیا۔ بیری کی جھاڑیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے چراگاہ میں چلا گیا' جہاں بھیڑوں کا گلہ موجود تھا۔ میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ اب میں سمجھ گیا تھا کہ نانا نے مجھے کیوں بھیجا ہے۔ تاکہ ان کا وقت آئے تو میں ان سے دور رہوں اور کوئی کام کررہا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ جب میں گھر واپس جاؤں گا تو نانی میری منتظر ہوں گی۔ وہ کہیں گی۔ "تمہارے نانا چلے گئے حارث۔"

وہ ایک گرم صبح تھی۔ دھوپ میں بڑی تمازت تھی۔ گھاس لمبی' بے حد ہری اور زندگی سے بھرپور تھی۔ نیلے آسمان پر چھوٹی چھوٹی سفید بدلیاں تھرک رہی تھیں' جیسے ٹریکٹر کا چھوڑا ہوا دھواں۔ ہوا پرندوں کے چہچہوں کی مٹھاس سے اور کھاد کے ذائقے اور معصومیت سے معمور تھی۔

میں چرتی ہوئی بھیڑوں کے نزدیک چلا گیا۔ بھیڑوں کے بال اتار لئے گئے تھے اور وہ بالکل سفید نظر آرہی تھیں۔ کچھ کے پیٹ موٹے ہورہے تھے۔ کچھ دنوں میں وہ بچے دینے والی تھیں۔ نر بھیڑ کالون وقتاً فوقتاً کسی بھیڑ کی طرف للچائی ہوئی نگاہ اچھالتا اور پھر بے نیازی سے گھاس پر منہ مارتا۔ میں نے بہت کوشش کی مگر میں اس کرسمس والے میمنے کو تلاش نہ کرسکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جانوروں کو صاف طور پر دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

میں نے بھیڑوں کو مخاطب کیا۔ میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔ مجھ سے بولا نہیں جارہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ "رک جاؤ۔" میں چلّایا۔ "چرنا چھوڑ دو۔ تمہیں نہیں معلوم' کیا ہورہا ہے۔ تمہیں اپنے پیٹ کی پڑی ہے۔"

لیکن بھیڑوں پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنے شغل میں مصروف

رہیں۔

"لعنتی بھیڑو۔" میں پھر چلایا۔ "تمہیں نہیں پتا کہ وہ جو تمہیں کھلاتا پلاتا تھا' جو تمہیں نہلاتا تھا' جو بچے پیدا کرنے میں تمہاری مدد کرتا تھا' وہ تمہارا ہمدرد' وہ تمہارا نگہبان...... تمہیں کچھ پروا نہیں اس کی۔ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ نہیں پتا نا تمہیں۔ بدبختو' وہ مررہا ہے۔" میں بری طرح سسکنے لگا۔ "اس وقت منصر امروک مررہا ہے۔ موت کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔ وہ جانے والا ہے.... اور پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ سنا تم نے؟ تمہیں کوئی پروا ہے یا نہیں؟"

مجھے سچ مچ رنج ہوا۔ بھیڑوں کو کوئی پروا نہیں تھی۔ میں نے ان سے منہ پھیرا اور اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ میں پوری چراگاہ میں دوڑ گیا۔ میں نے اچھل کر باڑھ پار کی اور سڑک پر چلا گیا پھر میں اناج گودام اور کباڑ گودام کے درمیان چکراتا پھرا۔ تھک گیا تو میری رفتار کم ہوگئی۔ میں نے آستین سے آنسو پونچھے کیونکہ میری نانی مکان کے باہر آکھڑی ہوئی تھیں اور میرا انتظار کررہی تھیں۔ میں ان کی طرف بڑھنے لگا۔

میں قریب پہنچا تو نانی نے مجھے لپٹا لیا۔ میں بھی ان سے لپٹ گیا۔ "حارث.... میرے بچے' تمہارے نانا چلے گئے۔" انہوں نے رقت بھری آواز میں کہا۔ "بالآخر باپ بیٹے مل گئے..... ہمیشہ کے لئے!"

○☆○

نانی کو وہ گاڑی کبھی نہ مل سکی' جس کے لئے وہ رقم جمع کررہی تھیں۔ نانا کے تین سال بعد وہ بھی چلی گئیں۔ اس سے ایک سال پہلے ہی میں رہنے کے لئے ان کے پاس جاچکا تھا۔ میں نے ڈیڈی سے کہہ دیا تھا کہ اب میرا دل شہر میں کبھی نہیں لگے گا۔

میں نے نانی کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھیں۔ انہوں نے سب کچھ میرے نام کردیا تھا۔ نانی کی موت کے بعد میرے اصرار پر اور میری محبت سے مجبور ہوکر ممی اور ڈیڈی بھی وہاں آگئے۔ ہم سب وہاں رہنے لگے۔ یہاں تک کہ وقت آنے پر ڈیڈی اور مما بھی چلے گئے۔ میری شادی ان کی زندگی میں ہی ہوگئی تھی۔

یوں میری کرسمس کہانی ختم ہوتی ہے۔ میں خوش اور مطمئن ہوں۔ میں نے مسلمان کا مطلب سمجھ لیا ہے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ صحیح معنوں میں مسلم بنوں۔ مسلم یعنی اللہ کا فرمانبردار اور مطیع۔ میں نے ہر لمحے اپنے رب کی اطاعت کی کوشش کی ہے۔ کوتاہی بھی ضرور ہوئی ہوگی مگر وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔

سب کچھ ہے مگر مجھے بڑے نانا کی وہ دعا یاد آتی ہے جو انہوں نے مجھے دی تھی۔ وہ پوری نہیں ہوئی اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے پوری ہوگی۔ میں سیدھا سادہ کسان بن گیا۔ میرے پاس تلوار نہیں' قلم ہے۔ میں جہاد کیسے کروں گا؟ شہید کیسے ہوں گا؟ یہ سب سوچ کر ایک لمحے کو میں مایوس ہوتا ہوں مگر فوراً ہی وہ مایوسی مٹ جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بڑے نانا کی کرسمس کی رات والی دعا اسی لمحے مقبول ہوگئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیسے ہوگا مگر یہ ہوگا ضرور۔ میں جہاد بھی کروں گا اور شہادت بھی پاؤں گا..... انشاء اللہ۔

○☆○

کتاب ختم ہوچکی تھی مگر بریگیڈیئر کارتیلوف مبہوت بیٹھا تھا۔ اس نے کتاب کو بند نہیں کیا۔ آخری صفحہ اب بھی اس کے سامنے تھا۔

وہ عجیب کتاب تھی۔ کیا کہا جائے اسے؟ بریگیڈیئر سوچتا رہا۔ شاید یہ ایک معجزے کی..... نہیں' کئی معجزوں کی کہانی ہے۔ یا یہ ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کو فروغ دینے کی کوشش ہے۔ یا یہ اسلام کی تبلیغ کی غرض سے لکھی گئی ہے؟ بریگیڈیئر فیصلہ نہ کرسکا۔ بس وہ اتنا کہہ سکتا تھا کہ اتنی اثرانگیز کتاب اس نے اس سے پہلے نہیں پڑھی مگر سوال یہ تھا کہ کیا یہ کتاب مقدمے کے فیصلے کو تبدیل کراسکتی ہے؟ اور اس پر سوچنے کے لئے بریگیڈیئر کے پاس چھ دن کی فرصت تھی.....

○☆○

وہ فیصلے کا دن تھا۔

"ملزم کیپٹن گورین' تمہیں اعتراف ہے کہ تم اپنے ساتھیوں پر فائرنگ کرتے وقت ہوش و حواس میں تھے؟" بریگیڈیئر نے پوچھا۔

"یس سر۔" کیپٹن گورین نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اور اس کے باوجود تم خود کو مجرم نہیں سمجھتے؟" ایک کرنل

نے پوچھا۔
"یس سر۔"
"تم نے اپنے ساتھیوں کو مجرم سمجھ کر خود سزا دی۔ جبکہ تمہیں اس کا حق نہیں تھا۔" دوسرا کرنل بولا۔
"ہاں۔ ہم ان کا کورٹ مارشل کر سکتے تھے۔"
کیپٹن گورین چند لمحے بریگیڈیئر کو عجیب نظروں سے دیکھتا رہا۔
"اس طرح کے واقعات اب آئے دن ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ نسل خراب کرنے کے نام پر مسلمان عورتوں کی آبروریزی کی جاتی ہے۔ اب تک کسی ایک سپاہی کا بھی کورٹ مارشل نہیں ہوا۔ پوری دنیا چیخ اٹھی ہے مگر ہم نے دکھاوے کے لئے بھی کچھ نہیں کیا۔"
"تم مسلمان تو نہیں ہو؟"
"نو سر۔"
"اس کتاب کے حوالے سے اپنے بارے میں بتاؤ۔" کرنل نے فرمائش کی۔
"اس کتاب میں فادر گورین کا جو تذکرہ ہے' وہ میرے دادا تھے اور میرے والد ایلک گورین' حارث انکل کے ساتھ اسکول میں پڑھتے تھے۔"
"اس لئے تم اتنے جذباتی ہو گئے۔"
"یہ بات نہیں سر۔ ظالم کا ہاتھ کسی کو تو پکڑنا پڑتا ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"فرض کرلیں' میرے ساتھیوں نے یہی سب کچھ عیسائیوں کے ساتھ کیا ہوتا اور میری جگہ آپ ہوتے تو آپ کیا کرتے۔"
"وہی جو تم نے کیا۔" بریگیڈیئر نے بے ساختہ کہا پھر کسی احساس کے تحت اس نے بات بنائی۔ "مگر پھر بھی یہ جذباتی فیصلہ ہوتا۔"
"میں نے اپنا پوائنٹ ثابت کر دیا جناب۔" گورین نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "اسی لئے مجھے اپنی برات پر اصرار ہے۔ جناب عالی' مسلمان ہوں' عیسائی ہوں یا کوئی اور قوم ہو۔ انسان کے خون کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے..... سرخ مگر ہمارا رویہ ایسا ہے' جیسے مسلمانوں کے خون کا رنگ مختلف ہوگا مگر ایسا ہے نہیں جناب۔"
"ہم پندرہ منٹ کا وقفہ کر رہے ہیں۔" بریگیڈیئر نے اعلان کیا۔ "اس کے بعد فیصلہ سنایا جائے گا۔"
عدالت کے تینوں ارکان اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ایک دوسرے کا فیصلہ سنا۔ بالآخر وہ عدالت میں چلے آئے۔
گورین پُرامید نظروں سے ایک ایک چہرے کو تک رہا تھا۔
"ہم تمہیں متفقہ طور پر سزائے موت سناتے ہیں کیپٹن گورین۔ اب سے تھوڑی دیر بعد تمہیں فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا۔" بریگیڈیئر نے سرد لہجے میں کہا۔
"تھینک یو سر۔" گورین مسکرایا۔ "مجھے اس فیصلے کے بارے میں بالکل شبہ نہیں تھا جناب۔"
"کیسے؟"
"میں یا پوری دنیا لاکھ کہتی رہے کہ ہر انسان کے خون کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے مگر آپ جیسے تعصب کی رنگین شیشوں والی عینک آنکھوں پر چڑھا کر دیکھنے والوں کو لہو کے دو رنگ نظر آتے ہیں۔ یہ بات نہ ہوتی تو یہاں وہ سب کچھ نہ ہوتا' جو ہو رہا ہے۔"
"تقریر مت کرو۔" کرنل نے اسے ڈپٹا۔
"ہاں۔ تمہاری کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دو۔ پوری کر دی جائے گی۔" بریگیڈیئر نے کہا۔
"نہیں سر۔ آپ یہ بھی نہیں کر سکیں گے۔"
"جاں بخشی کے سوا تم کچھ بھی مانگ سکتے ہو۔ تمہیں وہ ملے گا۔" بریگیڈیئر نے یقین دلایا۔
"آپ یقین سے کہہ رہے ہیں۔"
"شیور۔"
"تو کسی مسلمان عالمِ دین کو بلا لیں۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔" گورین نے کہا۔
تینوں منصفوں کے چہرے دھواں دھواں ہو گئے۔ بریگیڈیئر نے مسلح پہرے داروں کو اشارہ کیا۔ "اسے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے لے جاؤ..... فوراً۔"
"میں نے کہا تھا نا' آپ میری آخری خواہش پوری نہیں کر سکتے۔" گورین نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ "مگر یہ خواہش پوری کرنے کے لئے مجھے آپ کی اجازت یا مدد کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ گواہ رہیں....." اس کی آواز بلند ہوگئی۔ "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ واحد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور حضرت محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔"
بریگیڈیئر کے اشارے پر پہرے دار سزائے موت کے مجرم کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔ تینوں فیصلہ سنانے والوں کے چہروں پر کھسیاہٹ تھی۔ وہ ایک دوسرے سے بھی نظر نہیں ملا رہے تھے۔ ان کے سر ایک طرف جھکے ہوئے تھے۔ جیسے وہ کچھ سننے کے منتظر ہوں۔
پھر باہر درجنوں گنیں گرجیں..... ایک آواز میں..... ایک بار..... دوسری بار..... اور تیسری بار..... ان تینوں نے سکون کی سانس لی مگر فوراً ہی مضطرب ہو گئے۔ انہیں واضح طور پر کلمۂ شہادت کی پکار سنائی دی تھی۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ واشھد ان.....
"کیا تم بھی وہی سن رہے ہو' جو میں سن رہا ہوں؟" بریگیڈیئر نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔
انہوں نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیے۔ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے سروں کو اوپر نیچے ہلا دیا۔
▲▲▲

پڑاؤ

علیم الحق حقی



وہ ایک پاگل بڑھیا تھی۔ کیوں کہ بدلتی ہوئی دُنیا اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور بدلتی ہوئی دُنیا جس کی سمجھ میں نہ آئے اُسے پاگل کے سوا اور کہا بھی کیا جاسکتا ہے مگر وہ بڑھیا پاگل کے سوا شاید کچھ اور تھی۔

ایک ایسی کہانی جس کے انجام میں واقعی ایک تماشا پوشیدہ ہے

پاگل بڑھیا کہلانے سے پہلے وہ صرف بڑھیا کہلاتی تھی۔

... اس سے پہلے وہ بوڑھی مسز نیلسن تھی اور اس سے پہلے (یہ بہت 'بہت' بہت پرانی بات ہے) وہ مسز نیلسن تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ مسٹر نیلسن بھی ہوتے تھے مگر اب تو بس ان کی چند نشانیاں رہ گئی تھیں۔ جنگ کی یادگاریں جو مینٹل پیس پر لائن سے رکھی ہوئی تھیں۔ اب تو مینٹل پیس سے گرد بھی نہیں جھاڑی جاتی تھی۔

... اُن میں ایک بحری جنگی جہاز کا ماڈل تھا۔ دشمن کا ایک ہیلمٹ تھا' دشمن ہی کا ایک بم تھا' ایک چاقو تھا' کچھ اور چیزیں تھیں چھوٹی چھوٹی۔ دشمنوں کے بیج اور بٹن وغیرہ۔

ان دنوں دشمن بہت دور کی چیز معلوم ہوتا تھا اور شاپنگ بہت آسان تھی۔

اب تو چند بلاک کا فاصلہ بھی میلوں پر محیط معلوم ہوتا ہے۔ پہلے چند بلاک چلنا کتنا اچھا لگتا تھا۔ پیڑوں کے سائے سائے...

پرانی طرز کے خوش نما مکانات کے ساتھ ساتھ چلنا کتنا بھلا لگتا تھا۔ پرانے فیملی اسٹورز تھے' جہاں سے اشیائے ضرورت خریدی جاتی تھیں۔

اب تو سب کچھ بدل گیا ہے۔

ایک تو یہ کہ درختوں کو بدلتے وقت کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے کا شعور نہیں تھا۔ ان کی شریر شاخیں بجلی کے تاروں سے چھیڑ چھاڑ کرتی تھیں۔ ان کی جڑیں گندے پانی کی لائنوں کے لئے رکاوٹ بنتی تھیں اور ان کے تنے فٹ پاتھوں کو تنگ کرتے تھے۔

چنانچہ بیشتر پرانے درخت کاٹ ڈالے گئے۔

یہ ایک بہت بڑا شاک تھا' جس کے لئے بوڑھی مسز نیلسن کو کسی نے ذہنی طور پر تیار کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایک دن کہیں کوئی بڈھا درخت فٹ پاتھ پر کمر جھکائے کھڑا نظر آتا۔ دوسرے دن وہاں مرے ہوئے تنے' بریدہ شاخوں اور زخمی ٹہنیوں' پتوں اور بُرادے کے سوا کچھ نہ ہوتا اور اگلے دن وہ کچھ بھی نہ رہتا۔

پرانے طرز کے مکانات بھی گرادیئے گئے تھے... اور جو نہیں گرائے گئے تھے' ان کے حلیئے تبدیل ہوگئے تھے۔ انہیں اور اونچا کردیا گیا تھا اور ان کے کئی کئی حصے کردیئے گئے تھے۔ اب وہ اپارٹمنٹ کہلاتے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ مکینوں کو ان اپارٹمنٹس سے وہ وابستگی محسوس نہیں ہوتی تھی' جو پرانے گھروں سے انہیں رہی تھی۔

جہاں تک پرانے فیملی اسٹورز کا تعلق ہے وہ بھی اس انقلاب کی زد میں آئے تھے۔ ایسے ہی ایک اسٹور کے مالک مسٹر برمن نے کہا تھا "میں تو اب کوئی چیز بھی نہیں بیچ سکتا۔ اس لئے کہ سپر مارکیٹ سے ہر چیز اس قیمت میں مل جاتی ہے' جس میں مَیں خریدتا ہوں۔ اور مسز نیلسن' بچے بھی اب پہلے کی طرح اپنے والدین سے پیسے لے کر چیز خریدنے نہیں آتے۔ اب تو وہ صرف چیزیں چرانے آتے ہیں۔ میں سوچتا تھا' میرے بعد میرا بیٹا اسٹور سنبھالے گا لیکن وہ ویت نام سے تابوت میں واپس آیا۔ اب کیا ہوسکتا ہے؟"

سپر مارکیٹ وہاں بنائی گئی تھی' جہاں کوئی مارکیٹ نہیں تھی۔ ... حالانکہ اسے وہاں بننا چاہئے تھا' جہاں پرانے اسٹور تھے۔ وہ پرانا سرکاری باغیچہ' جہاں رنگ برنگے پھول کھلتے تھے' سپر مارکیٹ کے لئے اجاڑ دیا گیا تھا۔ اب بچے باغیچوں کے بجائے سڑکوں پر کھیلتے تھے۔

اور پھر سپر مارکیٹ میں چیزیں سستی ملتی تھیں تو ادائیگی بھی نقد کرنا ہوتی تھی۔ مہینے بھر کا ادھار نہیں چلتا تھا اور سامان کوئی لڑکا گھر پر نہیں پہنچاتا تھا۔ پہلے تو ڈیلیوری بوائے گھر پر سودا پہنچانے آتا تھا اور اسے گھر پر پکی ہوئی کوئی چیز کھانے کو دی جاتی تو خوش ہو کر شکریہ ادا کرتا تھا۔

مسٹر نیلسن کی موت کے بعد اکثر ایسا ہوتا تھا کہ لڑکا سودا لے کر آتا تو ۲۵ سینٹ کے عوض لان ٹھیک کردیتا' گھاس کاٹ دیتا۔ خالی بوتلیں لے کر شکریہ ادا کرنے کا رواج بھی تھا۔ پہلے کے غریب لوگ بوتلیں فٹ پاتھ پر یا بجلی کے کھمبوں پر مار کر توڑنے کو زیاں سمجھتے تھے۔

اب تو سب کچھ بدل گیا تھا۔ لان کی صفائی اور گھاس کی کٹائی کے لئے ایک ڈالر کے عوض بھی کسی لڑکے کی خدمات میسر نہیں آتی تھیں۔ بوتلیں تفریحاً توڑ دی جاتی تھیں... اور غریب لڑکے توڑتے تھے۔

"یہ دنیا کس طرف جارہی ہے؟" بوڑھی مسز نیلسن ایک ایک سے پوچھتی۔ پھر وہ چیختی "میں سب جانتی ہوں' مجھے سب معلوم ہے' تم لوگ گھروں میں چھپے بیٹھے ہو۔"

یہ وہ وقت تھا' جب لوگوں نے اسے پاگل بڑھیا کا نام دیا۔ وہ کہتی تھی کہ بڑے لڑکے اس پر چٹانیں پھینکتے ہیں۔ بڑے لڑکے اس کی تردید کرتے اور پولیس کا کہنا تھا کہ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔

جب اس نے شاپنگ کے لئے نکلتے وقت اپنے سر پر فوجی ہیلمٹ رکھنا شروع کیا تو لوگ اس پر ہنسنے لگے۔ اور وہ شاپنگ کے لئے گھر سے نکلنے پر مجبور تھی۔ وہ زمانے تو لَد گئے تھے جب کسی اسٹور کو فون کرکے کہہ دیا جاتا تھا "کہو بھئی' ایستھر اور ننھے نومولود کا کیا حال ہے؟ اور ہاں' ایک پاؤ چینی' اور ایک پاؤ مکھن بھجوادینا۔"

کبھی کبھی پگلی کے ذہن سے یہ بات نکل جاتی' وہ پرانا نمبر ڈائل کرتی' جو اسے اب بھی یاد تھا لیکن اب وہاں کوئی اور فیملی رہتی تھی۔ وہ اس کی خریداری کی فرمائشوں کے جواب میں گندی زبان استعمال کرتے تھے۔ لوگوں میں اخلاق نام کی چیز ہی نہیں رہ گئی تھی۔

پرانے علاقوں میں اب بھی پرانے 'بڈھے جنٹلمین اور لیڈیز موجود تھیں لیکن شروع میں وہ انہیں بوڑھا ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ "میری دادی بوڑھی تھی" وہ کہتی "اور اسے پرانی خانہ جنگی یاد تھی۔ مرتے دم تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی ملنے والے کا جنم دن بھولی ہو لیکن میں نہیں سمجھتی کہ تمہیں میری دادی یاد ہوگی۔"

"لو' پاگل بڑھیا کو دیکھو' خود سے باتیں کررہی ہیں" نوجوان لڑکیاں بہ آوازِ بلند تبصرہ کرتیں۔ ان کے لہجے بہت خراب ہوتے۔

اور پگلی کے تصور میں لہراتی ہوئی مسز جارج' جو کبھی کی مرچکی تھی' اسے دلاسا دیتے ہوئے کہتی "تم ان کی باتوں پر کان مت دھرو مسز نیلسن۔ ہم یہ ظاہر کریں گے' جیسے ہم نے ان کا تبصرہ سنا ہی نہیں۔"

"مسز جارج... یہ تمہارا ہاتھ۔ کیا ہوا تمہارے ہاتھ کو؟"

"آؤ چہل قدمی کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ نہیں سن رہے ہوں گے تب میں تمہیں بتاؤں گی۔"

مسز جارج پیاری عورت تھی۔ اپنے زمانے میں تو وہ بہت ہی خوب صورت رہی ہوگی۔ پگی سوچتی رہی۔ آخر کسی نے اس کا ہاتھ کیوں توڑ دیا۔

"میری شاپنگ کی رقم میرے پرس میں رہتی ہے اور کہاں رکھوں؟ میں کہیں اور گھر بھی نہیں لے سکتی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

اس سے ثابت ہوگیا کہ باہر نکلتے وقت ہیلمٹ پہننا کتنا ضروری ہے۔ مسز جارج کا ہاتھ اسی چکر میں ٹوٹا۔ کسی نے اس کا پرس چھینا، اسے دھکا دے کر گرایا اور رفو چکر ہوگیا۔

ہیلمٹ نہ پہنا جائے تو وہ لوگ سر توڑ دیں۔

کون وہ لوگ؟

"تم انہیں پکڑتے کیوں نہیں؟" وہ پولیس والوں سے کہتی۔

پولیس والوں نے کہا کہ اس حلیے پر تو علاقے کے تمام لڑکے پورے اترتے ہیں۔ کس کس کو گرفتار کریں۔

مسز شلز کے قتل پر بھی پولیس والوں نے یہی کہا تھا لیکن اگر وہ ہیلمٹ پہنے ہوتی تو اس کا سر کیوں پھٹتا۔

اس سے ہیلمٹ کی اہمیت واضح ہوتی تھی۔

"پولیس ہوتی کس لئے ہے؟ تم لوگ انہیں گرفتار کیوں نہیں کرتے؟" وہ پوچھتی۔

"وہ کون؟"

پھر پگی بھی زد میں آگئی۔

کسی نے اسے دبوچا، اس کا ہیلمٹ اتارا اور اسے دھکیل کر گرا دیا۔ پھر وہ زیادہ تیز بھی نہیں بھاگا، بار بار پلٹ کر دیکھتا اور ہنستا۔

"تم بہت خوش قسمت تھیں۔" ایک پولیس مین نے پگی سے کہا۔ "ممکن ہو تو رات کے وقت گھر سے نکلا ہی نہ کرو۔"

"لیکن یہ دن کی بات ہے۔" بڑھیا نے چیخ کر کہا۔

ایک روز کسی نے اوپر فلیٹ کی کھڑکی سے اس پر چٹان پھینکی لیکن نہیں، وہ چٹان نہیں تھی۔ وہ پتھر بھی نہیں تھا وہ تو اس کے شوہر کا یادگار ہیلمٹ تھا لیکن اسے بری طرح پچکا دیا گیا تھا۔ اب وہ ہیلمٹ ہی نہیں لگتا تھا۔

پگی نے سوچا، اب اپنے تحفظ کے لئے کیا کروں میں؟ اب گوشت خریدنے نکلوں گی تو کیا ہوگا۔ پولیس کہاں ہے؟ پولیس کیا کر رہی ہے؟

"سوری لیڈی سوری۔" پولیس مین نے کہا "آپ اتنا بڑا چاقو اپنے پرس میں رکھ کر گھر سے نہیں نکل سکتیں۔ یہ خلاف قانون ہے۔"

"تو پھر میری حفاظت کون کرے گا؟ تم لوگ تو نہیں کر سکتے۔"

بڑھیا چلائی۔ "اب تو میرے پاس ہیلمٹ بھی نہیں رہا۔"

وہ چاقو بھی اس کے شوہر کی نشانیوں میں سے تھا لیکن پولیس مین نے اسے ضبط کر لیا۔

وہ چیخ کر مسز جارج کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ اپنے زمانے میں کتنی حسین خاتون رہی ہے۔ اس نے چیخ کر مسز جارج کو پکارا لیکن سڑک پر بہت شور و غل تھا۔ ہر گھر کی کھڑکی سے ریڈیو کی، ٹیپ کی، ریکارڈ پلیئر کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایسے میں اس کی آواز کون سنتا۔

وہ پھر چلائی "مدد... مدد..." لیکن اتنے شور میں کون اس کی سنتا۔

اور اس شخص کی رفتار حیرت انگیز تھی، جس نے پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے مسز جارج کا پرس جھپٹا تھا اور اسے نیچے گرایا تھا پھر ہنستا ہوا، پرس اچھالتا ہوا بھاگتا چلا گیا تھا۔

'ایسا تو میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔' پگی نے سوچا، اور اب تو میرے پاس ہیلمٹ بھی نہیں۔ چاقو پولیس مین نے ضبط کر لیا اور شاپنگ کے لئے نکلنا ضروری ہے۔ اب کیا کروں؟ اس نے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں لیکن اس میں جیبیں رہی ہی نہیں تھیں گویا پرس لے کر نکلنا ضروری تھا۔ اب کیا ہو؟

اس نے پرس کے تسمے کو ایک زنجیر کی مدد سے اپنے ہاتھ سے باندھ لیا۔ پرس میں محض چند ڈالر تھے۔

اسے اپنے عقب سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی تو اس نے چلانا شروع کر دیا لیکن اتنے شور میں اس کی آواز کون سنتا۔

وہ جانتی تھی کہ ایک دن ایسا ہوگا اور اب وہی کچھ ہو رہا تھا۔

اس نے بڑھیا کے پرس پر جھپٹا مارا، زوردار جھٹکا دیا۔ استخوانی ہاتھ سے بندھی ہوئی نازک زنجیر ٹوٹ گئی اور وہ پرس لے کر یہ جا وہ جا۔

بڑھیا نے سوچا۔ میں پاگل ہی تو ہوں، جو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میرے استخوانی ہاتھ سے بندھی ہوئی یہ زنجیر پرس کو بچا لے گی۔

بڑھیا چیختی رہی، اور وہ بھاگتا رہا۔ پرس میں لوہے کی کوئی چیز کھنکنا رہی تھی۔

اُچکا بمشکل آدھے بلاک دور گیا ہوگا کہ بم پھٹ گیا۔

سب جانتے تھے کہ وہ پاگل ہے۔ پاگل خانے میں سب اس کا خیال رکھتے ہیں۔ تنہائی بھی نہیں، اور وہ آزادانہ شاپنگ کر سکتی ہے۔ وہ پرس جھلاتی ہوئی پاگل خانے کی کینٹین جاتی ہے... اور کوئی اسے پریشان نہیں کرتا۔ کوئی اس سے پرس نہیں چھینتا۔

اب وہ محفوظ ہے!

CRAZY OLD LADY
AVARM DAVIDSON

کھیلنے کی شوقین جوان ہوا کی کہانی

کھیلنا کسے اچھا نہیں لگتا! اور ہوا تو کھیلنے کی بہت ہی شوقین ہوتی ہے۔ آوارہ بادل، درختوں کے پتے اور کاغذی پتنگیں ہوا کے محبوب کھلونے ہیں... لیکن کچھ کھلونے بعض کھیلنے والوں کے لیے نئے ہوتے ہیں۔ خود سے کھیلے جانے کی تمنا رکھنے والے یہ کھلونے کھلاڑیوں کو کھیلنے کا ہنر سکھاتے ہیں۔

جوان ہوا

علیم الحق حقی

"صبح میں نے ہوا کو دیکھا۔" لڑکے نے انگلیوں سے چاولوں کا نوالہ بناتے ہوئے کہا۔

"ہوا کو کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتی۔" اس کے باپ نے جواب دیا۔ "تو کھانا کھا جلدی سے اور کام پر جا۔"

"میں نے سچ مچ اُسے دیکھا تھا باپو۔" لڑکا مُصر تھا۔ "میں بکریاں چرانے وادی میں گیا تو وہ مجھے نظر آئی۔ وہ اکیلی تھی... بہت اوپر۔ اور ہنس رہی تھی۔ اُسے کھیلنا اچھا لگتا ہے۔"

"کسے اچھا نہیں لگتا۔" باپ نے بدمزگی سے کہا۔ "خاص طور پر کام کا وقت ہو تو کھیلنا ہی اچھا لگتا ہے۔ اِدھر آ۔" جھاڑو کہاں ہے تیری۔ دیکھ سات بجے کا بھونپو بج گیا۔ تجھے اس وقت بنگلے میں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے دیکھ... میں آفس کا فرش دھو بھی چکا۔ جلدی کر۔ جلدی۔ تُو نے پھر دیر کی تو صاحب خفا ہو گا۔ اس نے بارش سے پہلے ہمارے گھر میں ٹین کی چھت ڈلوانے کا وعدہ کیا ہے۔ تُو وقت پر جانا بھولے گا تو صاحب چھت ڈلوانا بھول جائے گا۔ جلدی کر۔ جلدی۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر لڑکے کا کان تھاما، اسے مروڑا اور کھینچ کر لڑکے کو کھڑا کر دیا پھر اس نے پھول جھاڑو اس کی بغل میں ٹھونسی اور اس کی پیٹھ پر دھول جمانے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن لڑکا مچھلی کی طرح سے پھسلا اور دروازے سے گزر کر ٹھنڈی چمکیلی صبح میں نکل گیا۔

"تو نے ہوا کو دیکھا تھا... ایں۔" باپ نے چیخ کر طنز کیا۔

"ہاں... میں نے سچ مچ دیکھا تھا۔" لڑکے نے بھی چیخ کر جواب دیا۔ وہ چائے کے باغ میں دھوپ چھاؤں سے سجی پگڈنڈی پر دوڑ رہا تھا۔ "میں نے اُسے دیکھا۔ وہ اکیلی تھی... بہت اوپر۔ اور ہنس رہی تھی۔"

اُسی وقت ہوا نے لڑکے کے بالوں کو چھوا۔ وہ بڑا سازشانہ، خوشدلانہ لمس تھا۔ جیسے وہ اسے راز فاش کرنے سے منع کر رہی ہو۔ اس نے اس کے لفظوں کو تھاما اور انہیں اپنے ساتھ لے اُڑی۔ اس نے ان لفظوں کو کبھی اچھالا، کبھی پکڑا اور پھر بادلوں کے سپرد کر دیا، جو پہاڑ کی چوٹی پر مجمع لگا رہے تھے پھر اس نے انہیں بادلوں سے چھینا اور سایہ دار درختوں کی شاخوں پر دے مارا۔ سوکھے پتے ناچتے، تھرکتے، سرگوشیاں کرتے نیچے اترنے لگے۔

"... وہ اکیلی تھی... بہت اوپر... اور ہنس رہی تھی۔" اس کے لفظوں کی بازگشت پہاڑ کی ایک چوٹی سے دوسری چوٹی تک... افق تا افق ناچتی رہی۔

لڑکے نے جھک کر راستے سے ایک پتھر اٹھایا اور کھلنڈرے پن سے ہوا کی طرف اچھال دیا۔ "مجھ سے چھیڑ کرتی ہو؟" لیکن پتھر ہوا تک پہنچنے سے پہلے ہی مڑا اور زمین کی طرف لوٹ آیا۔ لڑکے کو مایوسی ہوئی۔ عام سے... بے کار پتھر سے کھیلنے کو کس کا جی چاہتا ہے؟

کاش اُس کے پاس کوئی رنگین پتنگ ہوتی۔ ویسی جیسے اس نے



ایک مہمان صاحب کے بچے کو اُڑاتے دیکھا تھا... وہیں بنگلے میں۔ اس کے پاس بھی ویسی پتنگ ہوتی تو وہ اسے ہوا پر اچھال پھینکتا اور اسے آسمان کی طرف بڑھتے دیکھتا' پھر وہ اور ہوا پتنگ کھیلتے' خوب ہنستے' ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کرتے۔

اس نے بانسوں کے پُل کو نظر انداز کیا اور بنگلے کے پیچھے والے نالے کو اچھل کر پار کیا۔ وہ سوچ رہا تھا... یہ پُل تو بڈھے' رعشہ زدہ لوگوں اور معذوروں کے لیے ہوتے ہیں۔ لڑکوں کے لیے نہیں۔ نالا پار کر کے اسے لیچی کا درخت اور بوگن ویلیا کا جنگلا نظر آیا۔ سامنے ہی بنگلے کا... سفید چہرہ تھا... اور دیکھتی' تاکتی ہوئی کھڑکیوں کی بے شمار آنکھیں اور اندر پورے دن کی گرد اٹھائے' جھاڑو اور پونچھے کے منتظر فرش۔

اور وہ خود ہوا کی طرح تھا' جوان... اکیلا... اور اسے کھیلنا اچھا لگتا تھا!

اس نے سر اٹھا کر ہوا کو دیکھا اور جھاڑی اس طرح لہرائی' جیسے صاحب لوگ رخصت ہوتے وقت ایک دوسرے کو دیکھ کر ہاتھ لہراتے ہیں۔ لڑکے کا خیال تھا کہ اس طرح قسمت ان پر مہربان ہوتی ہے... اور دیوتا ان سے خوش ہوتے ہیں۔

"ہوا!" اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر' چیخ کر ہوا کو پکارا۔ "اے آسمان پر اڑنے والی ہوا۔"

ہوا نے اس کے ناکافی لفظوں کا مذاق اُڑایا۔ وہ اس کی طرف لپکی اور اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین کر اسے جنگلے کے اوپر اچھال دیا۔ جھاڑو سبزیوں کے باغیچے میں گری۔ وہ ہنستا ہوا اس کے پیچھے بھاگا۔

"میرا انتظار کرنا ہوا۔" وہ چلّایا۔ "دوپہر کا بھونپو بجنے تک میرا انتظار کر ہوا۔"

"وہاں سے نکل... ننھے شیطان۔ باہر آ۔ تُو نے یہ اپنی گھٹیا جھاڑو صاحب کی ترکاریوں میں پھینکنے کی جرأت کیسے کی۔ کیا اتنا کافی نہیں کہ تو پھر آدھا گھنٹا دیر سے آیا ہے۔ میں کب سے اس سرد برآمدے میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔"

اردلی' اسے گھور رہا تھا۔ وہ مختصر سا آدمی تھا... جھریوں سے بھرا۔ دیکھنے میں وہ جنگلی بندر جیسا لگتا تھا۔ ایسا جنگلی بندر' جس کے ہونٹوں میں ادھ جلی بیڑی دبی ہو' ایسا بندر جو سر پر پگڑی باندھتا ہو۔

"سب ہوا کی وجہ سے ہوا ہے۔" لڑکے نے کہا۔

"ٹھہر تو جا۔ ابھی میں تیری ہوا نکالتا ہوں۔" بڈھے اردلی نے کہا۔

دونوں ایک ساتھ بنگلے میں داخل ہو گئے۔

*****

وہ کام میں الجھا رہا۔ فرش تھا... قالین تھے' آتش دان تھے' ردی کی ٹوکریاں تھیں' کچن کے کوڑے دان تھے' کوڑے کی ٹوکریاں تھیں۔ بہت سارا کام اس کا منتظر تھا۔ پھر فرنیچر سے گرد جھاڑتا' اس پر پالش کرتا اور فرش پر پونچھا لگاتا۔ فرش بہت ٹھنڈا تھا اور باہر ہوا اس کے انتظار میں گھنے سایہ دار درختوں سے کھیل رہی تھی۔

ایک بار وہ چمنی کی طرف سے اُسے پکارتی... چھیڑتی آئی۔

"لڑ...کے... لڑ... کے۔" اور چمنی سے راکھ اڑی اور اس کے چہرے پر چھپنی۔ اس کا...... دم گھٹنے لگا پھر اسے چھینکیں آنے لگیں۔ دوسری طرف بڈھا اردلی اس پر چڑھ دوڑا۔ "حرام خور... ٹھہر تو جا۔ جان بوجھ کر قالین اور کرسیوں کے کور خراب کرتا ہے۔"

دروازے کی طرف سے چھوٹی میم صاحب نے پکارا۔

"لڑکے... جیسا اردلی بولتا ہے' ویسا کر۔ احتیاط سے..."

میم صاحب اس سے نرم لہجے میں بات کرتی تھی اور عام طور پر وہ اسے جواب نہیں دیتا تھا۔ اس کا باپ کہتا تھا کہ نظر اٹھانا یا جواب دینا بری بات ہے' ادب اور احترام کے خلاف ہے لیکن اس صبح سب کچھ بدل گیا تھا۔ اس لیے کہ اس نے جوان ہوا کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے راکھ سمیٹتے ہوئے ہاتھ رکے اور اس نے پلٹ کر اپنے کندھے کے اوپر سے میم صاحب کو دیکھا۔ میم صاحب کے ہاتھ میں قینچی تھی' جسے وہ ہوا میں یوں چلا رہی تھی' جیسے خیالی پودوں کی شاخیں برابر کر رہی ہو۔ دوسرے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری تھی۔

"یہ ہوا کی حرکت تھی میم صاحب۔" اس نے کہا۔

"آہا۔" وہ بولی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ اس نے باہر باغیچے میں قدم رکھا تو سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جیسے ہوا کو تلاش کر رہی ہو۔ صبح اب دوپہر کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔

میم صاحب نے گتے کا ایک ڈبّا اسے پھینکنے کے لیے دیا۔ اس میں اسے سرخ کاغذ نظر آگیا... پھولوں کے سے سرخ رنگ کا اور ایسا صاف ستھرا اور شفاف جیسے شیشہ ہو۔ اس نے کاغذ نکالا اور اسے برآمدے میں لے گیا۔

"اب کوئی اور شیطانی سوجھ رہی ہے تجھے؟" بڈھے اردلی نے پوچھا۔ وہ بیٹھا صاحب کے جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔

لڑکے نے دانت نکالتے ہوئے اسے کاغذ دکھایا۔ ہوا فوراً ہی کاغذ کی طرف لپکی۔ کاغذ پھڑپھڑانے لگا۔

"احتیاط سے ہوا..." لڑکے نے چیخ کر کہا۔ "شرارت نہ کر۔ ذرا ٹھہر جا۔ میں تیرے لیے پتنگ بناؤں گا۔"

"احتیاط سے ہوا..." بڈھے اردلی نے منہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری۔ "بھنگی کا لڑکا... نام رام داس... اور ہوا سے چھیڑ خانی کرے ہے۔ ہوا تجھ سے باتیں کرتی ہے! اور تجھ جیسا جنگلی پتنگ بنانا کیا جانے۔ ہاں... میں جب لڑکا تھا... تیری عمر کا۔ تو شہر میں رہتا تھا۔ جہاں میرے باپ کا مکان تھا...."

لیکن رام داس ہنس رہا تھا.... پتنگ کے تصور ہی سے خوش تھا۔ اس نے اردلی کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے پونچھے کے جو کپڑے

سکھانے کے لیے دھوپ میں پھیلائے تھے' ہوا اب اُن سے کھیل رہی تھی۔

"..... دو تیلیاں لچک دار بانس کی......" اردلی کہہ رہا تھا... "نہیں یوں موڑو... اے یوں..." اس نے اشارے سے بتایا۔

"یہ تو جوتے ہیں۔" رام داس نے کہا۔

"اب اُلو... میں کہہ رہا ہوں' دو تیلیوں کو یوں کراس کرتے ہیں..." بڈھا اردلی کہتا رہا۔ "میرے والد کا ایک دوست تھا۔ بھلا سا نام تھا اس کا۔ اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا۔ ہاں تو ہم اس کی دکان پر جاتے تھے' مانجھے اور پتنگ کی دکان تھی اس کی۔ تو ہم وہاں بیٹھ کر اسے پتنگیں بناتے دیکھتے تھے۔ بعد میں ہم اس سے پتنگیں لے کر جاتے' چھت کا رخ کرتے۔ وہاں سے ہم پتنگ اُڑاتے۔ دوسری..... اونچی اونچی اڑنے والی پتنگوں کے ساتھ' بڑی بڑی عمارتوں سے اونچی۔ وہاں ہزاروں لاکھوں پتنگیں اُڑ رہی ہوتیں۔ اور تو..... تُو جنگلی لڑکا... تُو مجھے پتنگوں کے بارے میں کیا بتائے گا۔ دو چھڑیاں ہوں اس سائز کی۔ ایک کو کمان کی طرح یوں موڑا جائے اور دوسری سیدھی سیدھی..." اردلی اٹھا اور عقبی سیڑھیوں کی طرف گیا۔ وہاں سے اس نے پکارا۔ "مالی... مالی!"

رام داس نے کاغذ ایک طرف رکھ دیا۔ "ہوا... دوپہر تک انتظار کر۔ دوپہر کا بھونپو بجے گا تو تجھے تیری پتنگ مل جائے گی۔" اس نے منہ اوپر اٹھا کے کہا۔

اس نے بلی کے رہنے والے بکسے میں تازہ مٹی بھری اور اسے دوبارہ اندر لے گیا پھر اس نے اپنا کپڑا اور پالش کا ٹن سنبھالا اور باتھ روم کے فرش پر پالش کرنے لگا۔ چاروں ہاتھ پیروں پر بیٹھ کر وہ فرش صاف کرتا رہا یہاں تک کہ فرش میں اسے اپنا عکس نظر آنے لگا اور اس تمام عرصے میں ہوا چلّاتی رہی... اپنی پتنگ کا مطالبہ کرتی رہی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ پتنگ کیسے بنائے' جس کا اس نے ہوا سے وعدہ کر لیا ہے۔ اس نے زندگی میں صرف ایک بار پتنگ دیکھی تھی۔ رنگین کاغذ کا ایک مرتّب ٹکڑا' جو دو چھوٹی کھپچیوں پر تان کر چپکایا جاتا ہے۔ ایک کھپچی سیدھی اور دوسری کمان کی شکل میں۔ جسے آسمان کی طرف اچھالا جائے تو وہ اوپر ناچنے لگتی ہے۔

"پتنگ" باتھ روم کی کھڑکی سے اندر آتی ہوا گڑگڑا رہی تھی۔ "میری پتنگ" وہ التجا کر رہی تھی... کھڑکی کے پردوں سے سر ٹکرا رہی تھی' پھر اس نے دیوار پر لٹکی ہوئی کاغذ کی جھالر کو اکھاڑا اور ہار کی طرح رام داس کے گلے میں ڈال دیا۔

"شریر ہوا۔" لڑکا خوشی سے چلّایا۔ اس نے جھالر کو دوبارہ لٹکا دیا۔

دو چھلی ہوئی' پتلی چپٹی تیلیاں۔ اردلی نے کہا تھا اور انہیں یوں ایک دوسرے سے کراس کرو۔ ایک کو موڑو کمان کی طرح۔ اردلی کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ عقبی برآمدے کے فرش پر لکڑی کی دو کھپچیاں رکھی تھیں۔ سیدھی' صاف ستھری اور ہموار۔ قریب ہی بڑے صاحب کی گوند کی شیشی رکھی تھی۔ ڈور کا ایک گولا بھی تھا۔

"اِدھر آ لڑکے... کاغذ کہاں ہے۔" اردلی نے اسے پکارا۔ "دیکھ یہ ہیں دو تیلیاں۔ میں نے اپنے والد کے دوست کی دکان میں پتنگ بنتے دیکھی تھی اور یہ ڈور بھی میں لے آیا ہوں۔ اب تُو کاغذ لے آ جلدی سے۔"

رام داس نے گلابی کاغذ کی وہ سرسراتی' بڑبڑاتی شیٹ اٹھائی اور اردلی کے پاس لے گیا۔ اردلی نے کاغذ کو سلیقے سے تہ کر کے رکھا پھر بانس کی چھلی ہوئی پتلی تیلیاں اس پر رکھ دیں۔ "قینچی۔" وہ رام داس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اب ہمیں قینچی چاہیے۔ تُو یہ کاغذ دبا کر بیٹھ۔ میں ابھی آیا۔"

"دیکھ ہوا!" لڑکا اوپر دیکھ کر چیخا۔ "دیکھ..... تیری پتنگ بن رہی ہے۔"

ہوا خوشی سے گنگناتی اور مسخرا پن کرتی رہی۔ وہ الگنی پر لٹکے ہوئے صاحب کے موزوں میں گھس گئی۔ موزے پھول گئے اور الگنی پر لٹکے لٹکے تھرکنے لگے۔ لڑکا سب کچھ بھول بھال کر خوشی سے تالیاں بجا کر ہوا کو داد دینے لگا۔ گلابی کاغذ نے موقع پا کر اُڑنے کی کوشش کی لیکن لڑکے نے فوراً ہی اسے ہاتھ سے دبا دیا۔

مکان کے عقبی حصے کی طرف سے ننگے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ اس کے پیچھے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ۔

چھوٹی میم صاحب قینچی خود لے کر آئی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ انہیں قینچی سے کیا کاٹنا ہے۔

"یہاں سے... اور یہاں سے کاٹنا۔" اردلی نے کہا۔

"یوں..." چھوٹی میم صاحب نے کاغذ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس کو یوں تہ کرو اور یوں..."

"کاغذ کافی ہے۔" اردلی نے گوند کی شیشی اپنے قریب کھینچی۔

"اور دُم....؟" چھوٹی میم صاحب نے کاغذ پر قینچی چلاتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں... اس کونے پر۔" اردلی نے انگلی رکھ کر بتایا۔

"اسی کاغذ سے کاٹوں؟" قینچی چلانے والا ہاتھ ہچکچایا۔

"ایسے..." جھریوں بھری انگلیاں تیلی کو خم دے رہی تھیں۔

"ہم اور طرح کی پتنگیں بناتے تھے۔"

"ہندوستان میں ایسے ہی بنتی ہیں۔" اردلی نے کہا۔ "میں جب چھوٹا سا تھا اور شہر میں رہتا تھا تو ہم اکثر ابّا کے دوست کی دکان پر جاتے..."

ہوا نے بیزار ہو کر موزوں سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ "میری... پتنگ..." وہ لڑکے کے کان میں منمنا رہی تھی۔ لاؤ میری پتنگ۔"

رام داس نے گھاس پر لیٹے دوپہر کے گہرے مگر چھوٹے سایوں کو غور سے دیکھا۔ اب کسی بھی لمحے دوپہر کا بھونپو بج سکتا ہے۔ اس

نے دل میں سوچا اور میں نے ہوا سے وعدہ کیا تھا کہ.....

اس نے تشویش سے گلابی کاغذ کو دیکھا' جو گلابی ہاتھوں اور جھریوں بھرے ہاتھوں کی گرفت میں پھڑپھڑا رہا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ پتنگ کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

"جلدی کرو۔ جلدی..." رام داس بے صبری پن سے چلّایا۔ "ہوا پتنگ مانگ رہی ہے۔"

"ہش" اردلی پھنکارا اور اسے گھورنے لگا لیکن گلابی ہاتھ اپنے کام میں لگے رہے۔

"پتنگوں کا ہوا سے ہمیشہ یارانہ رہا ہے۔" چھوٹی میم صاحب نے کہا۔ "لو... پتنگ تیار ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں پتنگ تھام کر انہیں سامنے کی طرف پھیلایا تاکہ پتنگ کو غور سے دیکھ سکے۔ اس کا سر ایک جانب جھکا ہوا تھا۔

کام ہو چکا تھا۔ گلابی کاغذ پتنگ کا روپ دھار چکا تھا۔ رام داس نے ہاتھ بڑھایا۔

"ابھی نہیں۔ اتنی جلدی کاہے کی ہے۔" اردلی نے اسے جھڑکا۔ "پہلے ایک بڑا والا سلام چھوٹی بی بی کو۔"

رام داس نے دونوں ہاتھ جوڑے... ہتھیلی سے ہتھیلی ملاتے ہوئے... اور انہیں اپنی پیشانی تک لے گیا۔ اس کی نظریں چھوٹی میم صاحب کے پیروں کے سرخ ناخنوں پر جمی تھیں لیکن وہ ہوا کے ساتھ پتنگ پتنگ کھیلنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے پھر پتنگ کی طرف ہاتھ بڑایا۔

مگر اس وقت تک اردلی پتنگ پر قبضہ کر چکا تھا۔ وہ تنقیدی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے انگلیوں سے اسے ٹٹول رہا تھا۔ "یاد رکھ' ہر پتنگ اُڑتی بھی نہیں ہے۔" اس نے رام داس سے کہا۔ "آؤ..... کوشش کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ عقبی باغیچے میں چلا گیا۔

"یہ میری پتنگ ہے۔ میری ہے یہ پتنگ۔" ہوا منمنائی۔ وہ بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

"اور میرا کیا ہو گا؟" لڑکا بھی پاؤں پٹختے ہوئے اردلی کے پیچھے چل رہا تھا۔

"اب تماشا دیکھ۔ اردلی نے پتنگ کے کنّے باندھتے ہوئے کہا۔ پھر ڈور جوڑ کر اس نے پتنگ کو اوپر اُچھالا۔ اسی وقت فضا میں دوپہر کے بھونپو کی آواز گونجی۔ ہوا نے غوطہ لگا کر اپنی پتنگ کو دبوچا... اور اٹھا لیا۔ اردلی آہستہ آہستہ دوڑنے لگا۔ چھوٹی میم صاحب بھی اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ہوا اس کے سنہرے بالوں کو اڑا رہی تھی پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈور تھام لی۔ ذرا دیر بعد اس نے ڈور رام داس کے ہاتھ میں دے دی۔

ہلکی پھلکی ڈور بھاری ہو رہی تھی... اور تنی ہوئی تھی... "ہوا... اے ہوا... سنتی ہے۔" رام داس نے پکارا۔ "دیکھا... میں نے اپنا وعدہ پورا کیا نا۔" اب وہ اور ہوا' دونوں ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔

اردلی ہدایات جاری کر رہا تھا۔ "ایسے نہیں اُلو..... یوں..... اِدھر دیکھ۔"

اور رام داس سوچ رہا تھا... بے وقوف بڈھا۔ مجھے ہوا سے کھیلنا سکھا رہا ہے۔

"ہم تو چھت پر چڑھ کر پتنگ اُڑاتے تھے۔" اردلی کہہ رہا تھا۔ "پتنگ بازی کا مزہ تو شہروں میں ہے۔"

لیکن لڑکا کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ تو بس ہوا کے ساتھ پتنگ پتنگ کھیلتے ہوئے بھاگ رہا تھا۔ پتنگ کبھی دائیں جھکتی' کبھی بائیں' کبھی کبھی تو یوں لگتا' وہ سامنے والی نیلگوں پہاڑی کو چوم لے گی پھر وہ اچھل کر اوپر... آسمان کے درمیان میں اٹھتی آتی۔

"ہوا... پھر اٹھا اسے۔ ایک بار اور۔" رام داس چلّایا۔ "وہ ہنس رہا تھا۔

"اور ڈور چھوڑو۔ اور بڑھاؤ۔" چھوٹی میم صاحب کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ "یہ درختوں کی وجہ سے مشکل ہو رہی ہے۔"

ہانپتا ہوا اردلی پیچھے رہ گیا تھا۔ چھوٹی میم صاحب نے پلٹ کر اسے حکم دیا۔ "اردلی..... تم واپس جاؤ۔ تم بڈھے ہو۔ ہمارے ساتھ نہیں بھاگ سکتے۔ جاؤ واپس۔"

اور اردلی خاموشی سے واپس ہو گیا۔

اب ہوا' وہ اور میم صاحب آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ چھوٹی میم صاحب اس کے برابر آئی اور ڈور تھام لی۔ لیکن نہیں..... اس نے ڈور تھامی نہیں تھی... توڑ دی تھی۔ پتنگ جھومتی ہوئی... آزاد چلی جا رہی تھی۔ "چھوٹی میم صاحب' یہ تم نے کیا کیا؟" رام داس تقریباً رو دیا۔

چھوٹی میم صاحب نے اس کے رخساروں کو غور سے دیکھا' جہاں مُسیں بھیگ رہی تھیں۔ "دیکھ' ہوا کو تیری پروا نہیں۔ وہ اکیلی اکیلی پتنگ سے کھیل رہی ہے۔" وہ بولی۔ "تو میرے ساتھ کھیل۔ آ... اس جھنڈ میں چل کر کھیلیں۔ میں پاپا سے کہہ کر تیرے گھر پر ٹین کی چھت ڈلوا دوں گی... آجا۔"

چھوٹی میم صاحب کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی نظر آ رہی تھی... پتنگ کے کاغذ جیسی! رام داس نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ اس بار وہ نظریں جھکانا بھول گیا۔ میم صاحب اچھی لگ رہی تھی... ہوا جیسی لیکن اس سے ڈر بھی لگ رہا تھا' جیسے آندھی سے لگتا ہے۔

"میں آپ سے کیسے کھیلوں گا۔" رام داس نے بے بسی سے کہا۔ "ایک تو میں بھنگی کا بیٹا... اور پھر ہوا سے تو پتنگ کا کھیل کھیلتا۔ آپ سے کیا کھیلوں..."

"آ... میں تجھے بتاؤں گی۔" چھوٹی میم صاحب نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور درختوں کی طرف چل دی۔ اوپر جوان ہوا پتنگ کو اُڑا رہی تھی... اس سے کھیل رہی تھی۔



محبت کائنات کا خوب صورت ترین جذبہ ہے۔ انسانوں کی دُنیا میں پائے جانے والے ہر تفاوت کو بے حیثیت کر دینے کی صلاحیت اس میں موجود ہے اور سچ تو یہ ہے کہ دُنیا کی بقا اور خوب صورتی اسی فاتحِ عالم جذبے کی رہینِ منت ہے۔ اَن دیکھے تعلق کی ڈور سے بندھے دو افراد کی داستان۔ اُن کے درمیان کوئی خونی رشتہ تھا نہ سفید ہی ناتا! اس کے باوجود ایک دوسرے سے اُن کا لگاؤ دیکھنے والوں کے لیے تعجب کا باعث تھا۔

دلوں کو گداز آشنا کرنے والی خوب صورت کہانی

علیم الحق حقی

رشتۂ آدم

اوائل مئی کی اُس صبح ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش بیت اللحم پہنچنے میں دو گھنٹے لگے۔ کوئی بس خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ٹریفک جام ہو کر رہ گیا تھا۔

"کیا مصیبت ہے۔" مائکر نے جھنجلا کر کہا۔ وہ کار سے اترا اور بہت زور سے دروازہ بند کیا۔ آگے کاروں اور لاریوں کی ایک بہت طویل قطار تھی۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لیے ہاتھوں سے آنکھوں پر چھجا بناتے ہوئے اس قطار کو گھورتا رہا۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ اس کی قمیص پسینے کی وجہ سے پیچھے سے مٹیالی ہو گئی تھی۔

میں کار میں بیٹھی رہی۔ اس سفر میں یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ ٹریفک جام ہوا ہو۔ میں جانتی تھی کہ یہ مسئلہ خود بخود اور اپنے وقت پر ہی حل ہو گا یا شاید نہ ہو۔ لیکن دونوں صورتوں میں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مائکر بھی یہ بات جانتا تھا لیکن عادت سے مجبور تھا۔ جھنجلانا، کڑھنا، بڑبڑانا اُس کی عادت تھی۔

ہماری شادی کو دس سال ہو چکے تھے مگر اب بھی مجھے اسے دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ کی مکمل تاریخ مائکر کے لیے ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ لیکن وہ اس تاریخ کے نتائج کو قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ وہاں کا نکاسیٔ آب کا نظام، وہاں کا کھانا اور ٹریفک کے ضابطے.... وہ انہیں اپنے خلاف سوچی سمجھی سازش تصور کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس کی توہین کرنے کے لیے ہیں۔

ایک بات بتاؤں۔ ان تمام باتوں پر میں برہم ہوں تو برحق ہے۔ لیکن مائکر نے تو یہاں سیاست دانوں، افسروں اور دہقانوں سے طویل طویل انٹرویو کرنے میں ہفتوں گزارے تھے اور بعد میں ترتیب و تدوین میں مہینوں صرف کر کے اس مواد کو خوب صورت اور متاثر کن مضامین میں ڈھالا تھا۔ اسے یہ برہمی زیب نہیں دیتی۔

میرا کام مائکر کے کام کی نسبت سادہ اور آسان ہے۔ مجھے صرف تصویریں کھینچنا ہوتی ہیں اور یہ ایک ایسا کام ہے جسے میں انجوائے کرتی ہوں۔ بس کوئی خوب صورت، عجیب یا مضحکہ خیز چیز نظر آئی، انگلی دبی اور کلک! منظر محفوظ ہو گیا۔ کوئی چیز بری لگی یا راہ میں کوئی رکاوٹ آئی... کلک! ناخوش گوار یت ہمیشہ کے لیے ثبوت کے ساتھ ریکارڈ ہو گئی۔ میں اُسے شریفانہ اور تسلی بخش انتقام سمجھتی ہوں۔

ہم پچھلے تین ماہ سے سڑکیں ناپ رہے تھے۔ ترکی، شام اور لبنان کے متعلق مضامین تیار ہو چکے تھے۔ جس اخبار نے ہمیں بھیجا تھا، اس کے مالکان ہماری کارکردگی سے بہت خوش تھے اور اب ہمیں اس سیریز کے کلائمکس کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت بیت اللحم پر آرٹیکل کرنا تھا۔

مائکر واپس آیا اور کار کی سائڈ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا "کم از کم ایک میل تک ٹریفک بلاک ہے۔" اس نے بتایا۔

"تو ایسا کرو کہ گاڑی موڑ لو۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "پیچھے جا کر ہم کوئی اور روڈ تلاش کر لیں گے۔ چاہے راستہ لمبا ہو جائے، کم از کم چلتے تو رہیں گے ہم۔"

مائکر نے بڑی بے زار نظروں سے مجھے دیکھا "تم کبھی نقشے نہیں دیکھتیں۔" اس نے کہا "بیت اللحم کو صرف ایک سڑک جاتی ہے۔ سرحد شہر کے بالکل پیچھے ہے۔ سڑک گھوم کر جاتی ہے۔"

سرحد! مجھے اچانک خیال آیا کہ میں اسرائیل کی سرحد کو بھول ہی گئی تھی "سرحد کتنی قریب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چند کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔"

لہٰذا بات ختم ہوئی۔ ہم انتظار کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے سامنے سڑک ڈھلوان کی طرف جا رہی تھی۔ آگے وہ موڑ تھا جہاں بس خراب ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف یا تو کھیت تھے یا پھل دار درختوں کے باغ۔ مگر کنارے پر پتھر کی دیواریں تھیں۔ پتھر کی وہ اونچی نیچی دیواریں سڑک کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں اور کھیتوں کو تقسیم بھی کر رہی تھیں۔ دور بے آب و گیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ وہ اردن کے عقب میں موآب کے پہاڑ تھے۔ بس کے گرد مجمع لگا تھا۔ گرد آلود سیاہ سوٹ پہنے، سر پر سفید کپڑا لپیٹے، جھلسی رنگت والے لوگ! ان میں محض چند ایک ہی ایسے تھے جو رکی ہوئی کاروں میں سے اترے تھے ورنہ بیشتر لوگ زمین سے اٹھ کر بس کے گرد جمع ہوئے تھے۔ مشرقِ وسطیٰ میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ آپ کسی وادی کے وسط میں گاڑی روک دیں، جہاں



ہر سمت میں میلوں تک دیکھ سکتے ہیں۔ پانچ منٹ کے اندر اندر یقینی طور پر دو تین افراد نمودار ہوں گے اور بڑی تیزداری اور انکسار سے مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے بیٹھ جائیں گے اور آپ کو کھانا کھاتے دیکھتے رہیں گے۔

اچانک کہیں سے دو بھکاری نمودار ہوئے۔ ایک بُڈھا آدمی تھا' جو لاٹھی ٹیک کر چل رہا تھا۔ دوسرا ایک دبلا پتلا لڑکا تھا۔ بس کے گرد لگے مجمع سے انہیں کچھ بھی نہیں ملا لیکن کاروں کی قطار سے انہیں کچھ نہ کچھ مل گیا تھا۔

"کیا ان کی گزر اوقات بھیک پر ہے؟" میں نے پُر تجسس لہجے میں مائلز سے پوچھا۔

"ممکن ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مہاجر ہوں۔ سیاسی تبدیلیوں کے نتائج ہمیشہ غریبوں کو بھگتنے پڑتے ہیں۔" موجودہ صورت حال کے متعلق مائلز کے رویّے میں ایسی بے تعلقی تھی' جو مجھے ذرا اچھی نہیں لگی۔

لڑکے نے کار کی کھڑکی سے ہاتھ پھیلایا تو میں نے کہا "انہیں کچھ دے دو۔" مائلز انہیں دھتکارنے والا تھا۔

"دیکھو بی بی۔ ہم ساری دنیا کا دکھ درد دُور نہیں کرسکتے۔" مائلز نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ تاہم اس نے بڈھے کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر کچھ رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ بُڈھا بار بار شکریہ ادا کیے جا رہا تھا۔

بُڈھا اور اُس کا ساتھی لڑکا چلے گئے تو میں نے حیرت سے مائلز سے پوچھا "تو تم دوسروں کی مدد کرنے اور خیرات میں یقین نہیں رکھتے؟"

"کوئی بھی نہیں رکھ سکتا۔ ہمیں ضرورت مندی کے اسباب کو دور کرنا چاہیے۔ ایسا ہوجائے گا تو کسی کو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"لیکن مائلز....." میں نے اسٹارٹ لینا چاہا۔ مجھے بحث کرنا بہت اچھا لگتا ہے لیکن اسی لمحے آگے کی سمت سے ایک خوشی کی چیخ سنائی دی۔ بس ٹھیک ہوگئی تھی اور رکا ہوا ٹریفک چل پڑا تھا۔

مائلز نے کار آگے بڑھادی۔ ہم بیت اللحم پہنچے تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہم بیت اللحم سے زیادہ دور نہیں تھے۔

○☆○

اتنا چھوٹا شہر! میں نے مایوسی سے سوچا۔

شہر ایک پہاڑی پر بڑے خوب صورت زاویے سے بسا تھا۔ چاروں طرف سرسبز ڈھلانیں تھیں اور نہایت خوب صورت مناظر تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ پوری دنیا کے لیے ایک خداداد لالٹین ہے۔ لیکن مکانات جدید طرز کے اور غیر نمایاں تھے۔ سڑکیں تنگ اور گندی تھیں۔

"یہ ہے بیت اللحم۔" مائلز نے بل کھاتی سڑک پر ڈرائیو کرتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ پھر اس نے سیاحوں سے بھری

ایک بس کے برابر کار روک دی "وہ رہا چرچ۔" اس نے ایک اونچی پتھر کی دیوار کی طرف اشارہ کیا "یہ اصطبل کے اوپر بنایا گیا ہے۔"

اُس دیوار میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بس اس کی جڑ میں چار مربع فٹ کا ایک سوراخ تھا۔ میں نے سوراخ اس لیے کہا ہے کہ یہ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ چرچ کا مرکزی دروازہ ہوگا۔

"لیکن کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ مائلز اندر داخل ہونے کے لیے جھک کر دُہرا ہوگیا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھی۔ اپنے کیمرے کی وجہ سے مجھے بہت دشواری ہورہی تھی۔ آگے ایک چوڑی' خالی پٹی تھی۔ وہاں خاصی تاریکی تھی۔ دیواروں میں کافی اوپر تنگ کھڑکیاں تھیں۔ وہ نہ ہوتیں تو مکمل اندھیرا ہوتا۔ آگے ہمیں ستونوں کی چار قطاریں دکھائی دیں۔

"مجھے ہمیشہ بتایا گیا ہے کہ یہ دشمنوں کو تعاقب کرنے سے باز رکھنے کے لیے تھے۔ خاص طور پر گھڑ سوار دشمنوں کو روکنے کے لیے۔" مائلز نے بتایا۔

"دشمن؟"

"ازمنۂ وسطیٰ میں۔ چرچ اس سے بہت پرانا ہے۔ چوتھی صدی کا۔ لیکن عیسائیوں نے بیت اللحم پر قبضہ گیارھویں صدی میں کیا۔ سو سال بعد یہ دوبارہ مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا۔ یعنی یہاں ہمیشہ جنگ ہوتی رہی۔ میرا خیال ہے' لوگ چرچ میں پناہ لیتے ہوں گے۔" اس کی آواز مدّھم ہوگئی۔ وہ چرچ کو آگے تک دیکھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے' میں ذرا اصطبل دیکھ لوں۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ مجھے اندھیرے سے ڈر لگ رہا تھا۔

"قربان گاہ کے نیچے۔" مائلز نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔"

نجانے میں کیا دیکھنے کی توقع کررہی تھی۔ شاید وہ کچھ جو پینٹنگز میں نظر آتا ہے۔ لکڑی کا ایک گرم شیڈ... صاف ستھرا بھوسے کا ڈھیر اور پیارے پیارے جانور۔ لیکن وہ تو بس چٹان میں ایک سوراخ تھا۔ اسے غار بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ریل کے ڈبّے جیسی چھوٹی سی جگہ تھی۔ خالی اور سرد' چھت اتنی نیچی تھی کہ میں پورے قد سے کھڑی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں کھڑی چند لمحے اس جگہ کو گھورتی رہی۔ مجھے کسی کتاب کے الفاظ یاد آئے۔ یہاں مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ میں پلٹی اور چرچ میں واپس آگئی۔

"اور معصوموں کی قربان گاہ ہے' جہاں وہ قتل کیے جاتے تھے۔ اس دروازے سے گزرو۔" مائلز نے کہا۔

"نہیں" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ پھر زیادہ اعتماد سے بولی۔ "نہیں' مجھے نہیں دیکھنا' چلو یہاں سے۔"

"ٹھیک ہے" مائلز کے لہجے میں حیرت تھی۔ لیکن اس نے بحث نہیں کی۔ ہم واپس چل دیے۔

گرمی بہت زیادہ لگ رہی تھی۔ مائلز نے کہا "پہلے لنچ کرلیں۔"

ہمیں ایک ریسٹورنٹ نظر آیا۔ میں نے اپنا سازوسامان شیڈ میں رکھ دیا۔ ہم ٹیرس پر تھے۔ جہاں سے ایک تنگ سڑک نظر آرہی تھی۔ یہاں نسبتاً خنکی تھی۔ ایک طرف انگوروں کی ایک بیل تھی۔

میں خیالوں میں یوں کھوئی ہوئی تھی کہ مجھے خاموشی کی طوالت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ بہرحال کافی پینے کے دوران میری خاموشی ٹوٹی "تم آخر یہاں کے متعلق کیا کروگے۔ مجھے تو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے جیسے یہ چھت پر بیٹھی ہوئی فاختہ۔" میں نے چھت کی طرف اشارہ کیا "میں اس کی تصویر کھینچ لوں گی لیکن تم کیا لکھوگے۔ تم نے مجھے بس اتنا بتایا ہے کہ یہاں تشدد اور خوں ریزی کا طویل سلسلہ چلتا رہا ہے' نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔" میں کہتے کہتے رک گئی۔ مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ میں کچھ زیادہ ہی ڈرامائی ہوگئی تھی۔

مائلز نے متجسس نظروں سے مجھے دیکھا "حیرت ہے کہ تم نے یہ بات کہی۔ میں خود یہی سوچ رہا تھا۔"

اُسی لمحے نیچے سڑک کی طرف سے شوروغل بلند ہوا۔ کارنر کے موڑ پر لڑکوں کا ایک گروہ کسی کا پیچھا کرتا... پتھر اٹھا کر مارتا نظر آیا۔ وہ سب چیخ اور ہنس رہے تھے۔ وہ عین ہماری ٹیرس کے نیچے آکر جمع ہوگئے۔ شوروغل بڑھ گیا۔

"یہ کیا کررہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ مجھے ٹیرس کی دیوار سے پتھر ٹکرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔" مائلز نے کہا۔ وہ جھک کر نیچے دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

پھر اچانک ایک نئی آواز سنائی دی۔ کرب میں ڈوبی ایک چیخ۔ موڑ کے قریب ایک دراز قد ہیولا نظر آیا' جس کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ وہ لڑکوں کے پیچھے تھا۔ اس کے چلنے کے انداز میں بے یقینی تھی۔ دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں لاٹھی تھی۔

اُس کی داڑھی اور انداز مجھے جانا پہچانا لگا۔ اچانک میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہ بھکاری تھا' جو سڑک پر بھیک مانگتا ہوا ہمارے پاس آیا تھا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وہ اندھا ہے۔ وہ رکا اور سر ایک طرف جھکائے چند لمحے کچھ سنتا رہا۔ پھر وہ دوبارہ آگے بڑھا۔ اُس کا رخ اس طرف تھا' جہاں سے لڑکوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اچھل کر کھڑی ہوئی اور ٹیرس کی دیوار کی طرف لپکی۔ میں نے جھک کر نیچے دیکھا۔

لڑکے دیوار کی جڑ کے قریب نیم دائرہ سا بنائے کھڑے تھے۔ کسی کو گھیرے ہوئے۔ وہ اب بھی اِکّادُکّا پتھر مارتے۔ لیکن ان کے درمیان پڑی ہوئی وہ کوئی شے ساکت تھی۔ اس کی وجہ سے ان کا جوش و خروش ختم ہوگیا تھا۔ اب چیخ و پکار بھی کم ہوگئی تھی۔

اچانک دیوار کی جڑ کے قریب پڑے بنڈل میں سے ایک براؤن ٹانگ باہر نکلی۔ مائلز کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ تیزی سے زینوں کی طرف لپکا۔ نیچے لڑکوں کے درمیان پہنچ کر اُس نے

اندھا دھند انہیں گھونسے اور لاتیں مارنا شروع کر دیں۔ اس پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔

آپ نے اب تک اندازہ لگالیا ہو گا کہ مائلز بے صبرا آدمی ہے لیکن وہ عملی ہر گز نہیں۔ میں نے زندگی میں جسمانی تشدد نہیں دیکھا۔ لہٰذا جب میں دیکھتی ہوں تو اس پر یقین نہیں کرتی۔ میں مائلز کو یوں دیکھتی رہی، جیسے وہ کوئی اجنبی ہو۔ اور یقین کریں، وہ لگ بھی اجنبی ہی رہا تھا۔

لڑکوں کا غول پہلے تو اس اُفتاد کے نتیجے میں یوں منتشر ہوا، جیسے مچھلیوں سے بھرے تالاب میں کنکر اچھال دیا جائے۔ مگر پھر لڑکے سنبھل کر مائلز کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ ان کی انگلیاں مائلز کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ اس سے خاصا دور رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مائلز نے نیچے پڑے ہوئے بنڈل کو بڑی آہستگی سے اٹھایا۔ لڑکے کے سینے پر لپٹے ہوئے دونوں ہاتھ پھیل گئے۔ وہ ننھے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ لیکن بظاہر وہ زخمی نہیں تھا۔ میں جب تک زندہ ہوں، محبت کا وہ انداز کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ اس کی آواز سنتے ہی نابینا بڈھے کے دونوں ہاتھ بے تابی سے آگے کی طرف بڑھے اور اس نے لڑکے کو کھینچ کر سینے سے لگالیا۔ لڑکے کا گرد آلود سر اب بڈھے کے سینے پر رکھا تھا۔

مائلز نے آہستگی سے بڈھے فقیر سے کچھ کہا اور اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ایک لمحے کے بعد میں نے بڈھے کے سر کو اثباتی جنبش کرتے دیکھا۔ پھر وہ تینوں مڑے اور ٹیرس کی طرف آنے والے زینوں پر چڑھنے لگے۔ مائلز بڈھے کو سہارا دیے ہوئے تھا۔

وہ اوپر آئے۔ مائلز کا چہرہ غیر معمولی طور پر سرخ ہو رہا تھا۔ لڑکا بڈھے سے چمٹا ہوا تھا۔

میری ٹانگیں لرزنے لگیں۔ گرمی اچانک ہی ناقابل برداشت محسوس ہونے لگی۔ میں بیٹھنے ہی والی تھی کہ میں نے ریسٹورنٹ کے مالک کو اوپر آتے دیکھا۔ اس کے چہرے اور انداز سے ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس لمحے میں تماشائی نہ رہی۔ اس منظر میں شامل ہو گئی "یہ ہمارے دوست ہیں۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

ریسٹورنٹ کا مالک حیرت زدہ سا پیچھے ہٹ گیا۔ مائلز اُن دونوں کو اپنی ٹیبل کی طرف لے آیا۔ بوڑھے آدمی نے لاٹھی ایک طرف رکھی اور بڑے باوقار انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ لڑکا نیچے اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

پہلی بار مجھے ان دونوں کو بہت قریب سے، بغور دیکھنے کا موقع ملا۔ بوڑھے کا سر بہت بڑا، بہت خوب صورت تھا۔ اس کی جلد سفید تھی۔ لیکن آنکھوں کی بے نوری بہت خوف ناک لگ رہی تھی۔ لڑکے کی جلد براؤن تھی۔ اس کے لمبے گھونگھریالے بال براؤن تھے۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں۔ لباس دونوں کا جگہ جگہ سے پھٹا ہوا اور گرد سے اٹا ہوا تھا۔ لڑکے کے کپڑوں پر جما ہوا خون بھی لگا تھا۔ میں نے لڑکے کو دیکھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں ہے۔

تمام دن کی مایوسی اور بدمزگی پھر لوٹ آئی۔ وہ دونوں بے حد تباہ حال تھے اور ہمدردی کے بہت زیادہ مستحق۔ اور دونوں کے ساتھ بہت زیادہ بدسلوکی کی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بیت اللحم کے پاس ان کے لیے بے رحمی اور تشدد کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مائلز عربی میں بڈھے کی دل جوئی کر رہا تھا۔ اس نے انگریزی میں مجھ سے کہا "میرا خیال ہے، جلدی سے کھانا منگواؤ۔"

بڈھے نے اپنا سفید ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے شستہ انگریزی میں کہا "میں آپ کا شکر گزار ہوں لیکن ہم کھانا کھا چکے ہیں۔" اس کی آواز چرچرائی ہوئی تھی، جیسے کوئی بہت پرانا لوہے کا گیٹ۔ لہجے میں بھاری پن تھا۔

اُس کے انگریزی بولنے پر ہمیں تعجب ہوا۔

"تو پھر چائے پئیں گے یا کافی؟" مائلز نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"جو چاہے پلوا دیں۔"

مائلز نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

"میں نے ایک زمانے میں انگریزوں کے پاس کام کیا ہے۔" بڈھے نے دھیمی آواز میں کہا "لیکن اب تو انگریزی بولے برسوں ہو گئے۔" وہ مسکرایا۔

"تمہاری انگریزی میری عربی کے مقابلے میں بہت ... بہت زیادہ بہتر ہے۔" مائلز نے خوش دلی سے کہا۔ پھر اچانک ہی خاموش ہو گیا۔

میں مائلز کی کیفیت محسوس کر سکتی تھی۔ ایسے پُرتشدد مناظر دیکھنے کے بعد یہ خوش دلانہ گفتگو اُسے لغو لگ رہی تھی۔ محسوسات اور گفتگو دو مختلف سطحوں پر تھے۔ صرف بڈھا آدمی پُرسکون تھا۔ جیسے پیش آنے والے واقعات نے اس پر کوئی تاثر نہیں چھوڑا ہو۔

بڈھے نے مائلز کی طرف سر گھماتے ہوئے کہا "میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں جناب۔"

"نہیں۔ ایسا نہ کہیں۔ خدا کے لیے۔" مائلز گڑگڑایا۔

"ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔" بڈھا اسی لہجے میں کہتا رہا "ہم اجنبی ہیں۔ ایلی جیسے لڑکے چالاک اور بدمعاش نہیں ہوتے۔ ایلی ان دوسرے لڑکوں سے مختلف ہے۔ ایلی کو خدا نے ایسا ہی بنایا ہے۔" اس نے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ لڑکا بلی کی طرح اس کے پائینچے سے رخسار رگڑنے لگا۔

"بیت اللحم ڈراؤنی جگہ ہے۔" میں پھٹ پڑی۔ میں چاہتی تھی کہ میری ہمدردی کی شدت اُس تک پہنچ جائے۔

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف مڑا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی۔

"مجھے اچھا نہیں لگا۔ یہاں بیت اللحم میں ظلم ہوا اور خون بہایا

جائے۔" میں نے عجیب سے لہجے میں کہا "یہاں ہمیشہ یہی کچھ ہوتا رہا ہے اور اب بھی....." میں کہتے کہتے رک گئی۔

بڈھے نے نرم لہجے میں پوچھا "آپ یہ توقع کیوں کرتی ہیں کہ بیت اللحم ساری دنیا سے مختلف ہوگا۔"

میں گنگ رہ گئی۔

اُس نے میری خاموشی کا کچھ اور مطلب لیا "اوہ ... آپ کرسچن ہیں۔ میرے بچے کی طرح۔" اس نے پھر مسکراتے ہوئے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ کافی لیجیے۔" مائلز نے موضوعِ گفتگو بدل دیا۔ بڈھا کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا پھر اُس نے پیالی طشتری پر رکھ دی اور کہا "شکریہ!"

میں اُسے بغور دیکھ رہی تھی۔ میں تصور کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ اُس نے زندگی کیسی گزاری ہوگی لیکن میں تو یہ تصور بھی نہیں کرسکی کہ اب اُس کی زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ ایک اتنا باوقار اور خوب صورت آدمی' جو انگریزوں کے ساتھ کام کرچکا ہے اور اب بھیک مانگتا ہے' دماغی طور پر کمزور ایک لڑکے کے ساتھ!

"تو یہ ایلی آپ کا پوتا ہے؟" مائلز نے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ اس سے میرا خون کا کوئی رشتہ نہیں۔ یہ اجنبی ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔ اس کی ماں کا انتقال میرے گاؤں میں ہوا تھا۔"

"تو آپ کا گاؤں کرسچنوں کا گاؤں ہے۔" مائلز نے دلچسپی سے پوچھا۔

"نہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔"

"تو پھر.....؟" مائلز کہتے کہتے رک گیا۔ وہی سوال میرے ذہن میں بھی ابھرا تھا۔ اگر رشتے داری بھی نہیں تھی اور مذہب بھی جدا تھے تو بڈھے نے ایلی کی ذمّے داری کیوں قبول کی تھی۔ یہ درست ہے کہ ایلی بڈھے کے لیے آنکھوں کا کام کرتا تھا لیکن خود ایلی کو اس سے زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔

"اب مجھے اجازت دیں۔" بڈھے نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اب ہم جائیں گے۔" اُس نے لاٹھی اٹھائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہمارے پاس کار ہے۔" مائلز بھی اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔

"نہیں شکریہ۔ آپ یروشلم جائیں گے جبکہ مجھے کہیں اور جانا ہے۔"

بڈھے کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ہم نے اُن کے لیے بہت تھوڑا کچھ کیا تھا۔ لیکن ہمیں مزید مدد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مائلز نے میرا بیگ اور کیمرے جمع کیے۔ میں نے بڈھے کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم نیچے سڑک پر آگئے۔

"گڈ بائی مادام۔ اللہ آپ کو اجر دے۔ میں آپ کے لیے دُعا کروں گا۔"

"سنیں۔ آپ جہاں کہیں' ہم آپ کو وہاں پہنچادیں گے۔" میں نے کہا۔

"نہیں' آپ بے فکر ہوکر جائیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ ایلی میرے ساتھ ہے۔"

میں جانتی تھی کہ اس وقت یہ سوال کرنا عجیب لگے گا لیکن سڑک پر کھڑے ہوکر اُسے خدا حافظ کہتے ہوئے میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا "کیوں؟" میں نے پوچھا۔ مجھے خود بھی یہ بے تکا پن لگ رہا تھا "مجھے اس سوال پر معاف کردیجیے گا لیکن مجھے بتائیں کہ آپ نے ایلی کو کیوں اپنایا؟"

"کیوں؟" میرا سوال اُس کے لیے حیران کن تھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں "بھئی اس کی ماں مرچکی تھی۔"

"لیکن آپ ہی کیوں؟"

اُس نے کندھے جھٹک دیے "یہ بھی وہیں تھا اور میں بھی وہیں تھا۔" وہ یوں مسکرایا' جیسے مذاق کررہا ہو "اس کو مدد کی ضرورت تھی۔ اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا۔ ایلی نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ وہ دونوں تنگ سڑک کی طرف بڑھ گئے۔

○☆○

ہم نے یروشلم کا سفر خاموشی میں کیا۔ رات جب ہم اپنے ہوٹل کے کمرے میں تھے' تب نابینا بڈھے اور ایلی کا موضوع چھڑا۔

مائلز نے میرے پولورائیڈ کیمرے کو ٹٹولا اور ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھائی۔ تصویر میں نابینا بڈھا بیت اللحم کی تنگ سڑک پر کھڑا تھا۔ اُس کا ہاتھ ایلی کے کندھے پر تھا۔ وہ اُس وقت کی تصویر تھی' جب ہم انہیں الوداع کہہ رہے تھے۔

میں دیر تک تصویر کو دیکھتی رہی۔ پھر میں نے کہا "میرا خیال ہے' مجھے اپنا کام تمہیں سونپ دینا چاہیے۔" میں مسکرائی۔ اس کے لیے میری ستائش حقیقی تھی "یہ درحقیقت ایک غیر معمولی تصویر ہے۔"

مائلز نے شرمندگی سے مجھے دیکھا "بس مجھ سے رہا نہیں گیا۔" اُس نے کہا "میں نے سوچا' شاید اسے کلک کی آواز نہ سنائی دے۔ وہ دونوں اس قدر متاثر کن لگ رہے تھے۔ محبت کی علامت۔"

اُس نے ایک سرد آہ بھری "اور اگر تم چاہو تو میں اپنا کام تمہیں سونپ دوں۔ مجھے تو اپنے مضمون کے سلسلے میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔"

میں اُسے گھورنے لگی "تمہیں اب بھی نہیں معلوم کہ کیا لکھنا ہے؟"

"مجھے اندازہ تک نہیں۔" اُس نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"گڈ گاڈ۔ عجیب آدمی ہو تم۔" میں نے کہا اور اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ میں تیزی سے مائلز کے ٹائپ رائٹر کی طرف لپکی۔ میں نے کاغذ چڑھایا اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ٹائپ شروع کردیا "اوائل مئی کی اُس صبح ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش بیت اللحم پہنچنے میں دو گھنٹے لگے......"

✱

مرد کو صنفِ کرخت اور عورت کو صنفِ نازک کہا جاتا ہے لیکن کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کوئی ایسی عورت بھی پیدا ہو جاتی ہے، جسے صنفِ نازک کہنا کسی طور بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ ان کے سامنے اچھے خاصے مرد صنفِ نازک معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ایک ایسی ہی عورت کی کہانی جسے صنفِ نازک میں شمار نہیں کیا جاتا تھا

مس ھرکولیس

علیم الحق حقی

امریکی بحریہ کا سابق لیفٹیننٹ جوزف الشٹن لاس ویگاس کے نوتعمیر شدہ کورال ہوٹل کے کلاک روم سے برآمد ہوا۔ وہ یہاں ایک بے حد ضروری اور ہنگامی نوعیت کے کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ اُس نے ہوٹل کے سوئس منیجر فرانز کی طرف دیکھا اور سر کو اثباتی جنبش دی۔

"او کے!" اس نے کہا۔ "اب بے فکر ہو جاؤ۔ میں نے رکاوٹ دور کر دی ہے۔"

پھر اُس نے اپنے لازمی استعمال ہونے والے آلات کا بیگ اپنے اسسٹنٹ کو دے کر اُسے گھر جانے کی ہدایت کی اور خود حلق تر کرنے کی غرض سے ہوٹل کے آؤٹ ڈور بار کی طرف چل دیا۔ اُسے پتا بھی نہیں تھا کہ وہ دل ہارنے والا ہے۔

اس وقت فلور شو شروع ہو چکا تھا۔ وہ شو نیوادا کے مشہور زمانہ قمار باز بارلو کا ترتیب دیا ہوا تھا۔ چھ فٹ لمبی، سنہرے بالوں والی ایک لڑکی اسپاٹ لائٹ کی دودھیا چاندنی میں نہائی کھڑی تھی۔ وہ بہت لمبی تھی لیکن ساتھ ہی بے حد حسین بھی، وہ خوشگوار مترنم آواز میں گا بلکہ گنگنا رہی تھی۔

"میں طاقت میں دس کے برابر ہوں۔
لیکن اس سے فائدہ کیا ہے۔
میں اکیس برس کی لڑکی ہوں۔
میں نے جس کا ہاتھ بھی تھاما اُس کی کلائی ٹوٹ گئی۔



سوچ رہی ہوں میری شادی کب ہوگی شاید کبھی نہیں۔
ہرکولیس کی بیٹی ہوں میں مجھ سے شادی کون کرے گا؟"

نے کی شوخی کے باوجود اس کی آواز میں محرومی کا بخشا ہوا سوز تھا درد کی دبی دبی آنچ تھی۔ آرکسٹرا کے قریب تین ٹانگوں والے اسٹینڈ پر ایک بڑے کارڈ لگا تھا جس پر تحریر تھا۔ میریلین میریلو۔ دنیا کی سب سے طاقتور لڑکی۔

جوزف ایلشٹن نے اس لڑکی کو دیکھ کر جو پہلی بات سوچی وہ یہ تھی کہ اس نے زندگی میں کبھی اتنی خوبصورت لڑکی نہیں دیکھی۔ اس کے سینے میں کبھی اتنی شدید طلب نہیں جاگی۔

"اور اب" مس میریلین نے اعلان کیا "میں حاضرین میں سے چار افراد کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ جیوری کی حیثیت سے تشریف لے آئیں۔"

لیکن کوئی ایک شخص بھی آگے نہیں بڑھا۔

"میں آپ کو تکلیف نہیں پہنچاؤں گی آیئے۔" میریلین کے لہجے میں ترنم تھا۔ "دیکھیں پہل کون کرتا ہے۔"

جوزف ایلشٹن جس کا قد صرف پانچ فٹ نو انچ تھا لیکن کسرتی جسم کسی مڈل ویٹ چیمپئن باکسر کا سا تھا آگے بڑھا۔ اس نے اپنا جام خالی کر کے رکھ دیا تھا لیکن اس کا انداز کسی تنویم زدہ شخص کا سا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی مکھی کسی مکڑی کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔

"واہ ایک شریف آدمی تو بڑھا" لڑکی نے چہک کر کہا اور جوزف کے سامنے کورنش بجالائی "شکریہ جناب اس کرسی پر بیٹھ جایئے۔" وہ پھر حاضرین کی طرف متوجہ ہوگئی "تین حضرات اور تشریف لے آئیں پلیز، گھبرانے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

بالآخر کورم پورا ہوگیا۔ گھبرانے اور ڈرنے جیسے توہین آمیز الفاظ نے لوگوں کی مردانگی کو ابھار دیا تھا۔

میریلین نے جیوری کے چاروں اراکین کو لوہے کی ایک میخ تھمادی۔ پھر وہ بولی "سب جانتے ہیں کہ عورت مرد سے زیادہ خطرناک سہی لیکن اس سے کمزور ہوتی ہے۔ ذرا زور لگا کر دیکھیں آپ اس میخ کے دو ٹکڑے کرسکتے ہیں یا نہیں؟"

چاروں مرد اسکول کے بچوں کی طرح اپنی اپنی کرسی پر پہلو بدل کر زور لگانے لگے۔ جوزف کے علاوہ ان میں ایک پیشے کے اعتبار سے اڑیل بیلوں کو سدھانے والا تھا ایک ہالی ووڈ کا ڈائریکٹر تھا اور ایک پولو کا کھلاڑی۔ وہ چاروں اپنی اپنی جگہ بے حد جاندار تھے۔

جوزف نے خالص پیشہ ورانہ انداز میں میخ کا جائزہ لیا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ میخ بہت مضبوط ہے۔ نیوی میں بھی بارہا اس کا واسطہ دھاتی چیزوں سے پڑا تھا اور اب وہ لاس ویگاس میں چار سال سے ایک ماہر پلمبر کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ وہ دھات کو خوب سمجھتا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ اس میخ کو خم کھانے پر مجبور کرنا بھی ناممکن ہے۔ گویا یہ کہ اسے دو نیم کرنے کی کوشش کی جائے۔ کم از کم اس کی انگلیوں میں تو اتنی جان نہیں تھی۔

میریلین نے میز سے ویسی ہی ایک اور میخ اٹھائی۔ اسے کپڑے میں لپیٹا تین چار بار زور لگایا اور پھر حاضرین کے ملاحظے کے لیے اپنے ہاتھ بلند کیے۔ میخ دو ٹکڑے ہوچکی تھی۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر اور قہقہے لگا کر اسے داد سے اور چاروں مردوں کو بیداد سے نوازا۔

جوزف حیران رہ گیا۔ لڑکی کے عضلات میں ذرا سی اینٹھن بھی تو نظر نہیں آئی تھی لیکن اس نے جو کچھ کیا تھا سب کی نگاہوں کے سامنے کیا تھا۔

پھر میریلین نے آدھا انچ نصف قطر کی ایک سلاخ باری باری چاروں مردوں کی طرف بڑھائی۔ مقصد صرف معائنہ تھا۔ معائنے کے بعد اس نے سلاخ کو دانتوں میں دبایا اور زور لگا کر اسے ایک ہیئر پن کی شکل میں لے آئی۔

آخر میں اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری کی ایک ایک جلد چاروں مردوں کو تھمادی۔ وہ بے چارے زور لگاتے رہے۔ اس دوران میریلین نے بڑے مزے سے ڈائریکٹری کو پھاڑ کر آدھا کردیا اور تاؤ دلانے والے لہجے میں بولی "کمال ہے آپ لوگوں سے تو کاغذ بھی نہیں پھاڑا جاتا۔"

جوزف ڈائریکٹری سے الجھنے کے بجائے اسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کے ہاتھ بڑے بڑے تھے لیکن ان کی حرکات میں بدصورتی نہیں تھی۔ وہ جھکی اور اس نے ڈائریکٹری کو موڑا۔ اس کے سنہرے بالوں کی دو لٹیں اس کی پیشانی پر جھومنے لگیں۔ جوزف کا دل اس کی محبت اور ہمدردی سے معمور ہوگیا۔ پھر کلائمکس کا لمحہ آپہنچا۔ لڑکی سیدھی ہوئی اور اس نے کسی یونانی جنگ کی دیوی کی طرح ہاتھ اٹھائے اور اگلے ہی لمحے ڈائریکٹری کے دو ٹکڑے کردیے۔

بینڈ نے چیخ کر لڑکی کو اس کی کارکردگی پر خراج تحسین پیش کیا۔ تالیوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی بڑی ادا سے حاضرین کے سامنے سرخم کر کے داد وصول کرتی رہی۔ جیوری کے اراکین اپنی اپنی جگہ واپس آگئے۔ فلور پر موجود ہر شخص کھڑے ہوکر تالیاں بجا رہا تھا۔

جوزف دس منٹ تک اپنا حوصلہ مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر اس نے ایک ویٹر سے مس میریلین کے ڈریسنگ روم کے متعلق دریافت کیا۔ وہ ڈریسنگ روم کے دروازے پر پہنچا تو پتا چلا کہ جیوری کے باقی اراکین پہلے ہی وہاں پہنچے ہوئے ہیں۔ لڑکی چینی طرز کے ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ وقت اس کے لیے خاصا کڑا ہے۔ لیکن وہ ایسے مراحل سے بخوبی گزرنے کی عادی بھی معلوم ہوتی تھی۔

لڑکی کے سامنے تین آفرز پہلے ہی موجود تھیں لیکن اسے ان

میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ڈائریکٹر اُسے اپنے پہاڑی فارم ہاؤس میں لے جانا چاہتا تھا۔ پولو کا کھلاڑی اُسے رات بھر جُوا کھلانے کے موڈ میں تھا اور بیل سدھانے والا اُس کے ساتھ دور جنگلوں میں گھڑ سواری کرنا چاہتا تھا۔

جوزف کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی خاموشی چھا گئی۔ تینوں مرد اُسے گھورنے لگے۔ اُن کے نزدیک شخصیت اور اہمیت کے اعتبار سے وہ ایک بہت بڑا نزرو تھا۔

جوزف نے لڑکی سے کہا۔ "میں آپ کو یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ میں آپ کی پرفارمنس سے بے حد محظوظ ہوا ہوں۔ آپ کا فن قابلِ قدر ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے کچھ توقف کیا اور پھر بولا۔ "میں... مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ آپ مصروف ہیں۔"

لڑکی نے سرد نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ "ستائش کا شکریہ لیکن فرض کر لیں کہ میں مصروف نہیں ہوں پھر؟" وہ چوتھی آفر کے بارے میں متجسس معلوم ہو رہی تھی۔

جوزف سوچ میں پڑ گیا۔ اس قدر تھکا دینے والی پرفارمنس کے بعد یہ بات یقینی تھی کہ لڑکی بھوکی ہو گی۔ یہ بات وہ اس لیے سمجھ سکتا تھا کہ وہ بھی ایک گھنٹے تک ایک نامعقول پائپ سے اُلجھنے کے بعد اِدھر آگیا تھا اور خود اُسے بھی بھوک لگ رہی تھی۔ اُس وقت رات کا ایک بجا تھا۔

بالآخر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ "میں چاہتا ہوں مس کہ آپ میرے ساتھ سام اسنیکس چلیں۔ ہم وہاں نیوادا سینڈوچ کھائیں گے۔" اُس نے تجویز پیش کی۔

"اوہ۔" میریلین اُلجھ سی گئی۔ "یہ نیوادا سینڈوچ کیسا ہوتا ہے؟"

"یہ اسپیشل سینڈوچ ہوتا ہے۔ اس میں مرغی، پیاز، ٹماٹر، مکھن، چٹنی اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔ محنت کے کام کے بعد ایسی ہی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔"

"مجھے تو سن کر ہی بھوک لگنے لگی۔" میریلین نے کہا۔ "آپ باہر میرا انتظار کریں۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔" پھر اُس نے دوسرے امیدواروں سے کہا۔ "حضرات! اب میں آپ سے معذرت چاہوں گی۔ نیوادا سینڈوچ فاتح قرار پایا ہے۔"

جوزف کی خوبصورت کار دیکھ کر لڑکی چونکی۔ اُس کے چہرے کا تاثر یہ کہتا محسوس ہوا۔ "کہیں تم بھی کوئی پلے بوائے تو نہیں ہو؟"

لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ جوزف کس قدر منفعت بخش پیشے سے وابستہ ہے۔ پھر وہ برطانوی ہونے کی حیثیت سے یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس وقت وہ جس سرزمین پر ہے، وہاں امارت کی پہچان کاروں اور اُن کے ماڈلوں سے نہیں ہوتی۔ فراوانی کی وجہ سے وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس کے پاس کتنی کاریں ہیں۔ ایک اچھی کار تو غریب کو بھی میسر آ جاتی ہے۔

تاہم نیوادا سینڈوچ لاجواب ہی ثابت ہوا جیسا کہ اُسے بتایا گیا تھا۔ دونوں نے ڈٹ کر سینڈوچ کھائے اور ساتھ میں بیئر کے گھونٹ بھی لیتے رہے۔

"آپ انگریز ہیں، ہے نا؟" جوزف نے پوچھا۔

"ہاں، آپ کو کیسے پتا چلا؟" لڑکی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ یہ بات اُس کے لیے تکلیف دہ تھی کہ اُس کی قومیت اتنی جلدی کھل گئی۔

جوزف کو اُس کے لہجے سے توہین کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ اُس کی خوشی کے لیے تو یہی بہت تھا کہ وہ اُس کے ساتھ اُس کے بہت قریب ہے۔ "جنگ کے دوران میں نے چند ماہ لندن میں گزارے ہیں۔" اُس نے بتایا۔ "مجھے انگریز اچھے لگتے ہیں۔"

یہ اُن کے درمیان ایک قدرِ مشترک نکل آئی۔ بے مہری کی برف پگھلنے لگی۔ میریلین نے بتایا کہ وہ کلیپشم کی رہنے والی ہے۔ اس کے سوا اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ کس طرح وہ قد نکالتی گئی، یہاں تک کہ اُس کا منگیتر اُسے چھوڑ بھاگا کیونکہ اُسے خدشہ تھا کہ لوگ اتنی لمبی بیوی پالنے پر عمر بھر اُس کا مذاق اڑائیں گے۔ اس حادثے کے بعد میریلین نے اپنا مذاق خود اُڑانے کی ٹھان لی۔ اُس نے اپنے پس انداز کیے ہوئے پچاس پاؤنڈز کی مدد سے سرکس کے ایک ریٹائرڈ 'طاقت ور آدمی' سے اُس کا ایکٹ خرید لیا۔ پھر اُس نے اُس میں اپنی شخصی کشش کے علاوہ کچھ اضافے کیے اور اسی پیشے میں آ گئی۔ یہاں وہ بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ مالی اعتبار سے بھی وہ بہت زیادہ کامیاب تھی۔

کھانے کے بعد جوزف نے کہا۔ "مس میریلو! میں سوچ رہا ہوں کہ یہ چاندنی رات ہے۔ کیوں نہ میں آپ کو پتھروں والا بند دکھا دوں۔ وہ دنیا کا حسین ترین منظر پیش کرتا ہے۔"

"یہ اپروچ بھی نئی ہے۔" میریلین نے کہا۔

"یہ خوبصورت تجربہ آپ کبھی نہیں بھلا سکیں گی۔"

"مجھے اس میں شک نہیں۔" میریلین نے کہا۔ پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔ "ٹھیک ہے، زندگی میں کم از کم ایک بار ہر چیز کو آزمانا چاہیے۔ کم از کم لڑکیوں کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔"

تیئس میل کا وہ سفر اکتیس منٹ میں کٹا۔ اُن کے درمیان گفتگو نہیں ہوئی۔ کیونکہ جوزف کی پوری توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ سڑک بہت تنگ اور پُرپیچ تھی۔ جا بجا خطرناک موڑ تھے۔ دس منٹ تک چڑھائی کا سفر تھا۔ پھر جوزف نے ایک دیوار نما چھجے کے پاس کار روک دی۔

نیچے پانی کے آئینے میں تین چوتھائی چاند جھلک دکھا رہا تھا۔ پتھروں اور مٹی سے بنا ہوا وہ بند بہت بڑا تھا۔ ایک ہزار فٹ نیچے

دریا کے کولاریڈو چاندی کے تار کی طرح نظر آرہا تھا۔
لڑکی سنگی دیوار پر بیٹھی گہری خاموشی سے وہ منظر دیکھتی رہی۔ چاندنی میں اُس کے سنہرے بال بھی چاندی جیسے لگ رہے تھے۔ اُس کی نیلی آنکھوں کی رنگت گہری ہو گئی تھی۔

"یہ منظر پسند آیا آپ کو؟" جوزف نے پوچھا۔

لڑکی نے بے پروائی سے کندھے جھٹک دیے۔ "ہاں' برا نہیں ہے۔"

جوزف کو اُس کی کم ذوقی پر مایوسی ہوئی لیکن اُس نے اس مایوسی کو اُس خوشی کے نیچے دبا دیا' جو اُسے لڑکی کے قرب سے حاصل ہو رہی تھی۔ "آپ جانتی ہیں' ایک اعتبار سے آپ بھی اسی کی طرح ہیں۔" اُس نے کہا۔

"کیا یہ ستائش کا انداز ہے؟"

"میرا مطلب ہے... مکمل... کامل..." جوزف نے وضاحت کی۔ پھر بولا۔ "ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

لڑکی نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ایک آہ بھر کر بولی۔ "میں جانتی ہوں' آپ کیا پوچھیں گے۔ یہی کہ کیا میریلین مینرو میرا اصل نام ہے۔ نہیں' یہ میرا اصل نام نہیں ہے۔ میرا اصل نام ڈیزی ولز ہے۔"

"آ... آپ کو کیسے پتا چلا؟" جوزف گڑبڑا گیا۔

"سب یہی پوچھتے ہیں' نام کے بعد وہ پوچھتے ہیں کہ میں سلاخ کیسے موڑ دیتی ہوں اور ڈائریکٹری کیسے پھاڑ دیتی ہوں۔"

"اس کے بعد میں بھی یہی پوچھنے والا تھا۔" جوزف نے اعتراف کیا۔ "سچ تو یہ ہے کہ میں نے ایسا مظاہرہ کبھی نہیں دیکھا۔"

ڈیزی نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولی۔ "یہ سب ارتکاز کا کمال ہے۔ میں اس لمحے اپنی تمام توانائیوں کو ہاتھوں میں مرتکز کر لیتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کے بعد نڈھال ہو جاتی ہوں۔"

"اُف..." جوزف نے ہمدردانہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

اس کی آواز اور لہجے میں اتنی محبت اور ہمدردی تھی کہ ایک لمحے کو ڈیزی کا جی چاہا' معمول کے مطابق ٹالنے والا جواب دینے کے بجائے اُسے حقیقت بتا دے۔ شو بزنس کا راز اُس پر آشکار کر دے۔ لیکن وہ راز بے حد اہم' بے حد قیمتی تھا۔ طاقت اور آدمی' کا کھیل ایک فن کا بے مثال مظاہرہ تھا۔ دنیا میں اب بھی بہت سے لوگ اُس فن کے ذریعے روزی کما رہے تھے۔ اس فن کے راز کا افشا اُن کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا۔

مگر وہ کمزور لمحہ بہت تیزی سے گزر گیا۔

جوزف نے کہا۔ "مس ولز! آپ کو آرام کی ضرورت ہوگی۔ یہ میری زیادتی ہے کہ میں نے آپ کو آرام سے محروم کیا۔ آپ فکر نہ کریں' میں آپ کو جلد از جلد واپس پہنچا دوں گا۔"

اور واقعی اُس نے ایسا ہی کیا۔ واپسی کے سفر میں کار کی رفتار سو میل فی گھنٹا سے متجاوز تھی۔ آدھے گھنٹے بعد ڈیزی ولز المعروف بہ میریلین مینرو اپنے کمرے میں دانت برش کرتے ہوئے اور بال سنوارتے ہوئے دُبلے پتلے' معمولی سی شخصیت کے حامل جوزف ایلسٹن کو یاد کر رہی تھی' جس نے بتایا تھا کہ وہ بلبر ہے' لیکن اُس کے پاس اتنی خوبصورت اور مہنگی کار تھی کہ پورے امریکا میں کسی کے پاس نہیں ہوگی اور وہ بے حد شائستہ اور خوش اطوار تھا۔ عام لوگوں کی طرح بدتمیزی کرنا تو درکنار' اس نے تو اُس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔



ایک ہفتے بعد جوزف ایلسٹن نے ڈیزی ولز کو شادی کی پیشکش کی لیکن اُسے مسترد کر دیا گیا۔

اُس پہلی رات کے بعد شو ختم ہوتے ہی سام اینکس جا کر نیوادا اسینڈ وچ کھانا اور بیئر پینا اُن دونوں کا معمول بن گیا تھا۔ اتوار کی رات ڈیزی نے خود فرمائش کی کہ وہ اُسے پتھر بند لے چلے۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ہر شے چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ بند کا منظر بے حد سحر انگیز تھا۔ شاید اُس خوبصورتی ہی کا کرشمہ تھا کہ ڈیزی نے سرگوشی میں کہا۔ "بہت خوبصورت منظر ہے۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔"

اُس کے اس جملے نے جوزف کے شرمیلے پن کی ہر رکاوٹ کو دور کر دیا۔ اس نے بڑی نرمی سے ڈیزی کا ہاتھ تھاما اور بولا۔ "پتا ہے ڈیزی! میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ جانتی ہو نا؟"

ڈیزی نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ "لو' اُلو بنانے کے لیے سب مرد یہی کہتے ہیں۔"

منگنی ٹوٹنے کے بعد یہ تبدیلی آئی تھی کہ ڈیزی کو محبت کی گفتگو سن کر کچھ ہونے لگتا تھا۔ اُسے غصہ آجاتا تھا.........

ٹوٹا ہوا دل کبھی اچھوتے دل کی طرح نہیں ہو سکتا۔ جس دل پر کبھی زخم لگا ہو' اندمالِ زخم کے باوجود اس دل میں لفظ محبت کی گونج ٹیسیں جگا دیتی ہے۔

ڈیزی کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے ہر روز جوزف کے ساتھ وقت گزارنے کا معمول کیوں بنایا۔ وہ شریف تھا' طبعاً مہربان تھا' دوسرے مردوں کے ساتھ نمٹنے کے کئی طریقے تھے۔ ہاتھ چھڑانا' ہنسی اڑانا' جھڑکنا' دھکیلنا اور حد سے گزر جانے کی صورت' جوجتسو کے ہاتھ دکھانا' جس کی اُس نے باقاعدہ تربیت لی تھی۔ لیکن جوزف بالکل مختلف آدمی تھا۔ وہ اُس کے تجربات میں اضافے کی حیثیت رکھتا تھا۔

"میں تمھیں اُلو نہیں بنا رہا ہوں ڈیزی!" جوزف نے بے حد تحمل سے کہا۔ "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنھیں وہ لڑکی حقیقی زندگی میں مل جائے' جس کے وہ خواب دیکھتے رہے ہیں' جس کی وہ طلب کرتے رہے ہیں' ضرورت محسوس کرتے رہے ہیں۔"

"مجھے تمھاری بات پر کوئی شک نہیں۔" ڈیزی نے کہا۔ دو طرح کے لوگ اُس سے شادی کے خواہش مند رہتے تھے۔ ایک تو وہ جن کے خیال میں وہ ایک آسان روزی کی حیثیت رکھتی تھی۔ دوسرے وہ جو کمزور تھے اور اُس میں ماں کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ جوزف دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ "لیکن میں بہت کامیاب جا رہی ہوں۔ میں شادی کیوں کروں؟" ڈیزی نے اعتراض کیا۔

"محبت کے لیے، بچوں کے لیے اور ایک گھر کے لیے تمھارا بھی جی چاہتا ہوگا کہ کوئی تمھارا خیال رکھے، تمھاری پروا کرے۔"

"میں محبت پر یقین نہیں رکھتی۔ میں اس بات پر بھی یقین نہیں رکھتی کہ دنیا میں کوئی مرد ایسا بھی ہو سکتا ہے، جس سے میں محبت پر مجبور ہو جاؤں۔"

"تمھارے خیالات مَردوں کے متعلق کچھ اچھے نہیں ہیں ہے نا ڈیزی!" جوزف نے افسردگی سے کہا۔ ڈیزی کی شخصیت کی سختی نے اُسے اُداس کر دیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اُسے وجدان کا وہ الہامی لمحہ بھی میسر آ گیا تھا جو محبت کرنے والوں کی زندگی میں اکثر آتا ہے۔ اُس نے ظاہری سختی کی تہ میں چھپا باطنی درد اور اذیت دیکھ لی تھی۔ وہ سخت مزاج لڑکی اندر سے بہت چھوٹی، سہمی ہوئی اور لاچار تھی۔

"ہو بھی نہیں سکتے" میرے نزدیک مرد یا تو چور ہوتے ہیں یا کمزور۔" ڈیزی کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"اور اگر میں کسی طرح ثابت کر دوں کہ میں مختلف ہوں تو...؟"

"تم نہیں کر سکتے۔" ڈیزی نے کہا۔ پھر بڑی نرمی سے بولی۔ "ایسی کوشش نہ کرنا جوزف! میں آسانی سے قائل ہونے والی نہیں ہوں۔ میں محبت کے لیے نہیں بنائی گئی ہوں۔ مجھے بھول جاؤ۔ میں اس منظر کے حوالے سے ہمیشہ تمھاری شکر گزار رہوں گی۔" اُس نے نیچے ہاتھ پھیلا کر بند کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے بھی مَردوں ہی نے تخلیق کیا ہے۔" جوزف نے تلخ لہجے میں کہا۔

"مشینوں کی مدد سے۔" ڈیزی نے کہا۔

یہ دو رات بعد کی بات ہے۔ نائٹ کلب کے فلور پر اسپاٹ لائٹ کی دودھیا روشنی میں وہ طویل القامت لڑکی سیاہ لباس پہنے کھڑی تھی۔ قریب ہی ایک میز اور چار کرسیاں پڑی تھیں۔ کرسیوں پر اُس رات کی جیوری کے اراکین بیٹھے تھے۔ اُن میں ٹیکساس کا ایک کروڑ پتی تھا، ایک بل فائٹر تھا، ایک پولو کا کھلاڑی تھا جس کا تعلق برازیل سے تھا۔ چوتھا جوزف ایشٹن تھا۔ اُس کی ڈنر جیکٹ کے بٹن ہول میں سُرخ پھول لگا ہوا تھا۔

ڈیزی نے ہمیشہ کی طرح حاضرین میں سے چار افراد کو جیوری کی حیثیت سے کام کرنے کی دعوت دی۔ سب سے پہلے دعوت قبول کرنے والا جوزف تھا۔ ڈیزی کو اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی لیکن اگر وہ اُس کے چہرے پر سنجیدگی اور گمبھیرتا دیکھ لیتی اور اُس کے بھینچے ہوئے جبڑوں پر اُس کی نظر پڑ جاتی تو وہ یقیناً پریشان ہوتی۔ اُسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ کچھ کرنے کا ارادہ لے کر آیا ہے۔

چاروں مَرد میخوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ڈیزی کی پُشت اُن کی طرف تھی۔ وہ حسبِ معمول مائک ہاتھ میں لیے حاضرین کو بہلانے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔ جوزف ایشٹن نے ایک طویل سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب اُس کی تمام قوت صرف اُس کے ہاتھوں میں مرتکز ہو گئی تھی۔

دنیا کی طاقت ور ترین لڑکی اپنی جیوری کی طرف پلٹی تاکہ ان سے میخیں وصول کرے۔ جوزف ایشٹن جو تیسرے نمبر پر تھا، ڈیزی کا تعلق سرکس سے نہ رہا ہوتا تو وہ اس شاک کو نہ جھیل پاتی۔ جوزف نے میخ کے دو ٹکڑے اُس کی ہتھیلی پر گراتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ڈیزی نے میخ کے دونوں ٹکڑے بائیں ہتھیلی میں چھپائے اور تینوں ثابت میخوں کو داہنے ہاتھ سے یوں بلند کیا کہ حاضرین میں سے کسی کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر اُس نے ٹوٹی ہوئی میخ کو میز پر رکھا اور معمول کے مطابق رومال اور پانچواں میخیں اُٹھا کر اپنے مظاہرے میں مصروف ہو گئی۔

"مضبوط، طاقت ور اور جاندار مرد۔" اُس نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ صرف جوزف ایشٹن ہی اُس کی آواز کی لرزش کو محسوس کر سکتا تھا۔

لوہے کی سلاخیں تقسیم کرتے وقت وہ کچھ پریشان تھی۔ وہ خود کو سمجھا رہی تھی کہ میخ والا واقعہ اتفاقی ہے۔ شاید میخ کمزور یا پہلے سے ٹوٹی ہوئی ہوگی، لیکن خطرہ مول لینا غیر ضروری تھا۔ چنانچہ وہ اس انداز میں کھڑی ہوئی کہ تماشائیوں اور جوزف ایشٹن کے درمیان حائل ہو گئی۔ اب تماشائی جوزف کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ کھڑی معمول کے مطابق تماشائیوں سے باتیں کرتی رہی۔

پھر وہ لوہے کی سلاخیں واپس لینے کے لیے مڑی۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ جوزف ایشٹن سلاخ کو یو بائپ کی شکل میں دُہرا کر چکا تھا۔ اس بار جوزف نے اُس سے آنکھیں نہیں ملائیں۔ تماشائی چیخ رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے اور جوزف کی طرف اشارے کر رہے تھے۔ اُنھیں احساس ہو گیا تھا کہ صورتِ حال غیر معمولی ہے۔ وہ بھی سنسنی کے احساس اور اعصابی کشیدگی سے دوچار ہو گئے تھے۔

سلاخ کو چھپانا ممکن نہیں تھا۔ ڈیزی نے جوزف کے ہاتھ سے مُڑی ہوئی سلاخ لی اور پھنکار کر کہا۔ "چور!" اُسے غصہ بھی آ رہا تھا اور وہ توہین کی اذیت سے بھی دوچار تھی۔ اُس نے زندگی میں جس پہلے مرد کی پروا کی تھی، وہ کمزور اور بودا نکلا تھا۔ جبکہ دوسرا اُس کا ایکٹ

بچا رہا تھا اُسے بے وقوف بنا رہا تھا اور وہ بھی ساری دنیا کے سامنے۔ اس نے تینوں ثابت سلاخیں لے کر تماشائیوں کو دکھائیں۔ پھر اپنی سلاخ موڑ کر اُسے ہیروئن کی شکل دی لیکن اس بار رنگ نہ جم سکا۔ بہرحال ایکٹ تو مکمل کرنا ہی تھا۔ چنانچہ آخری مرحلے میں اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹریاں تقسیم کیں۔ جوزف سب سے آخر میں بیٹھا تھا۔ اُس نے جوزف کو نظرانداز کر دیا۔ اُسے ڈائریکٹری نہیں دی۔ پھر وہ پلٹی اور مائک کے ذریعے تماشائیوں سے مخاطب ہوئی۔ "ٹیلی فون کمپنی والوں نے مجھے اپنی بدذاتی ڈائریکٹریاں پھاڑنے کا ٹھیکا دیا ہے۔"

قہقہوں کی صورت اُبھرنے والا ردِعمل معمول سے بہت زیادہ تھا۔ ڈیزی کا دل ڈوبنے لگا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ جوزف ایشٹن ضخیم ڈائریکٹری پر زور آزمائی کر رہا تھا۔ درحقیقت وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اُس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص سے ڈائریکٹری لی تھی کیونکہ اُسے تو ڈیزی نے ڈائریکٹری دی ہی نہیں تھی۔

جوزف کی پیشانی کی رگیں اُبھر آئی تھیں۔ آنکھیں حلقوں سے اُبلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اُس کی بھوؤں سے رخساروں سے پسینہ دھاروں کی طرح بہہ رہا تھا۔ چہرے کی گلابی رنگت گہری سُرخ ہو گئی تھی۔ مرد تماشائی چیخ چیخ کر اُس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ "شاباش جوان! شاباش۔ تم اسے پھاڑ سکتے ہو! اس لڑکی کو دکھا دو کہ مَردوں کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں! ثابت کر دو لڑکے کہ مرد چوہے نہیں ہوتے!"

اُدھر جاں کنی کی سی کیفیت میں مبتلا جوزف کے مُنہ سے بھی بے ربط جملے نکل رہے تھے۔ جن کا مفہوم کچھ یہ تھا۔ "مرد چوہے ہوتے ہیں یا کمزور رہے نا، مَردوں کی کوئی عزت نہیں ہے نا؟ وہ میخ بھی دو ٹکڑے نہیں کر سکتے، ایک حقیر کتاب بھی ان سے نہیں پھاڑی جا سکتی؟ میں نے محبت کی ہے تو اسے ثابت بھی کر سکتا ہوں، انتہا کو بھی پہنچا سکتا ہوں۔ میں اس لڑکی کو دکھا دوں گا...!"

ڈیزی کسی معمول کی طرح ساکت کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے جوزف کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت بے پناہ اذیت اور بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ جوزف بھی بڑی اذیت میں تھا۔ اُسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ کسی بہت بڑے بحران سے گزر رہا ہے۔ زور لگانے اور بے پناہ ارتکاز کے نتیجے میں اُس کی رنگت نیلی پڑ گئی تھی۔

پھر ایک زوردار آواز اُبھری۔ ڈائریکٹری کی ضخامت نے جوزف ایشٹن سے ہار مان لی تھی۔ وہ بیچ میں سے پھٹ رہی تھی۔ چند ہی لمحے بعد دو حصّوں میں منقسم ڈائریکٹری نیچے پڑی تھی اور جوزف بڑی بے یقینی سے اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ پورا نائٹ کلب تالیوں کی گونج سے لرز رہا تھا۔

لیکن ڈیزی ولز اپنے ایکٹ کی بربادی پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ پھر وہ بھاگتی ہوئی اسٹیج سے اتر گئی۔ وہ اُس وقت بھی رو رہی تھی۔ اچانک دو طویل القامت بھاری بھرکم آدمی جوزف ایشٹن کے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے۔ اُن کے بڑے بڑے ہاتھوں پر گھنے بال تھے۔ انھوں نے دونوں طرف سے جوزف کے ہاتھ تھام لیے۔ "اوکے طاقت ور آدمی!" اُن میں سے ایک نے کہا۔ "باس تم سے کچھ میٹھی میٹھی باتیں کرنا چاہتا ہے۔ انکار مت کرنا اور ہم سے اُلجھنے کی کوشش بھی نہ کرنا کیونکہ تم اتنے طاقت ور نہیں ہو!" وہ اُسے کھینچتے ہوئے فلور سے لے گئے۔

اپنے آفس میں بارلو چند لمحے جوزف کو گھورتا رہا۔ پھر اُس نے غرّا کر کہا۔ "تم نے نہ صرف میرا ایکٹ تباہ کیا بلکہ خاتون کو رُلایا بھی ہے۔ میں نے اُسے لندن سے ہزاروں ڈالر خرچ کر کے یہاں اس لیے نہیں بلوایا تھا کہ تم جیسا کوئی عقل مند آدمی مفت کی پبلسٹی کے لیے مجھے اور اُسے دونوں کو بے وقوف بنائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمھارا کیا دھندا ہے اور تم کس چکر میں ہو لیکن یقین رکھو، میرے آدمیوں سے فراغت پانے کے بعد تم اپنے دو ٹوٹے ہوئے ہاتھوں سے کوئی کام بھی نہیں کر سکو گے!"

جوزف ایک اور جنگ کے لیے تیار تھا۔ پھر بھی اس نے بڑے تحمل سے کہا۔ "میری بات سنو مسٹر بارلو! میں تو صرف...!"

اُسی وقت دروازہ کھلا اور ہوٹل کا منیجر فرانز آفس میں داخل ہوا۔ اُس نے جوزف کو دیکھتے ہی کہا۔ "ارے مسٹر ایشٹن! آپ یہاں۔ میرا خیال ہے، باس نے آپ کو بتا ہی دیا ہو گا کہ ان کے ذاتی کمرے کا شاور بھی گڑبڑ کر رہا ہے!"

بارلو ایک لمحے کو حیران نظر آیا۔ پھر اُس نے اپنے منیجر کو سر کے اشارے سے قریب بلایا۔ "تم اس بندر کو جانتے ہو؟ کون ہے یہ؟"

فرانز نے جھک کر اُس مخصوص سرگوشیانہ لہجے میں بارلو کو بتایا جس میں وہ لاس ویگاس کے مشہور و معروف اور اہم لوگوں کے بارے میں بتاتا تھا۔ الیکٹریشن، پلمبر، مکینک... یہ وہ لوگ تھے، جو اس ہوٹل کی رگوں میں رواں دواں زندگی کو جاری و ساری رکھتے تھے۔ یہی اُن کی اہمیت تھی۔

بارلو کا مُنہ حیرت سے کُھل گیا۔ پھر اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اوکے مسٹر ایشٹن! اوکے۔ میں اور میرے آدمی تو محض مذاق کر رہے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم کون ہو۔ اگر ہو سکے تو میرے کمرے کے شاور کا پائپ چیک کر لو۔ میں سردیانی کا نل کھولتا ہوں تو گرم پانی برآمد ہوتا ہے!"

دروازہ پھر کھلا۔ اس بار ڈیزی کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کا انداز جارحانہ بلکہ دیوانگی سے پُر تھا۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا لیکن آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ "کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اُس نے گرج کر کہا۔ "کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ مجھے الیکٹریشن نے بتایا ہے کہ تم جوزف کو سزا دینے والے ہو...!" وہ رُکی اور اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جوزف کے پیروں کے پاس فرش پر دو سُرخ دھبے تھے۔ وہ

چند لمحے ان دھبوں کو گھورتی رہی۔" اوہ... دھنیو...! تم نے اس پر تشدد کیا ہے؟" اس نے دہاڑ کر کہا اور حرکت میں آگئی۔

پہلے گارڈ نے عادتاً کندھے کے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھانے کی حماقت کی۔ اگلے ہی لمحے وہ دروازے سے باہر فضا میں پرواز کر رہا تھا۔ وہ ساکت ہوا تو اس کا پاؤں اس کے کان کے پیچھے تھا۔ دوسرے گارڈ نے بھاگنے کی کوشش کی۔ ڈیزی نے اسے اٹھا کر بند کھڑکی کی طرف اچھال دیا۔ اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے یقیناً خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ وہ کھڑکی توڑ کر دوسری طرف نہیں گرا بلکہ ٹکرا کر کمرے ہی میں پلٹ آیا۔

ڈیزی کے جلال میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ایک لمحے کے بعد بارلو نے کسی بیل کا پٹرک طرح اٹھنا شروع کیا۔ خدا جانے اس کا کیا حشر ہوتا لیکن اس سے پہلے ہی جوزف کو ہوش آگیا۔ ایکشن کی تیزی نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ اس نے چیخ کر کہا۔" ڈیزی! کیا کر رہی ہو؟ سنو۔ رک جاؤ!"

ڈیزی نے بارلو کو چھوڑ دیا۔ وہ نیچے گرا اور چند لمحے بعد اپنی کنپٹی سہلاتا ہوا اٹھا۔

ڈیزی نے حیرت سے کہا۔" لیکن جوزف! میں تو تمہارے تحفظ کے لیے لڑ رہی تھی!"

" سنو بے بی! میں اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہوں اور تمہاری بھی۔" جوزف کا لہجہ تند تھا۔

بارلو نے تلخ لہجے میں کہا۔" خاتون! اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ہم اس دنیا کے بہترین پلمبر کو اپنے ہاتھوں سے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے تو آپ غلطی پر..."

" لیکن یہ خون؛ جوزف! کیا ہوا ہے تمہیں؟ اپنے ہاتھ دکھاؤ مجھے۔"

جوزف نے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے چھپا لیے۔ پھر اس نے ڈیزی کے اصرار پر انھیں اس کے سامنے پھیلا دیا۔" کوئی خاص بات نہیں۔ بس یہ اس قسم کے کام کے عادی نہیں..."

ڈیزی دیکھتی رہی۔ اس کے دونوں ہاتھ بری طرح چھلے ہوئے تھے۔ ان سے خون بہہ رہا تھا۔

" کسی نے مجھے تکلیف نہیں پہنچائی ہے۔" جوزف نے وضاحت کی۔

ڈیزی نے بڑی نرمی سے اس کے ہاتھ تھام کر پھیلائے اور کسی ڈاکٹر کے سے انداز میں ان کا معائنہ کیا۔ پھر اس نے جوزف کے چہرے کو ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔" جوزف! یہ سب کیا ہے؟ کیا تم پروفیشنل نہیں ہو؟ تم نے میرا ایکٹ نہیں چرایا؟ تم نے میرا ایکٹ تباہ نہیں کیا؟"

جوزف چند لمحے اسے گھورتا رہا۔" کیا؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں ثابت کر دوں گا، تم پر ثابت کر دوں گا کہ میں کمزور نہیں ہوں۔"

" جو! تمہیں بتانا پڑے گا۔ تم نے یہ سب کیسے کیا؟"

وہ اس سوال پر پہلے حیران اور پھر برہم نظر آیا لیکن اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ کمرے میں اور لوگ بھی موجود ہیں۔ بارلو اور فرانز ان کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔" میں نے تو وہی کیا، جو تم نے مجھے بتایا تھا۔" بالآخر اس نے جواب دیا۔" میں نے اپنی تمام توانائی، تمام توجہ اس ایک لمحے پر مرتکز کر دی اور پھر سب کچھ خود بخود ہو گیا۔"

" لیکن... لیکن جو...!" ڈیزی نے لرزیدہ آواز میں کہا۔" یہ تو ناممکن ہے جو! میں نے جھوٹ بولا تھا۔ مجھ سے جو بھی اس سلسلے میں سوال کرتا ہے، میں اسے یہی جواب دیتی ہوں۔ میں انھیں اپنی ترکیب تو نہیں بتا سکتی۔ یہ تو ایک شعبدہ ہے۔ جب تک تم اس کی ہڑک سے واقف نہ ہو، یہ سب کچھ کیسے کر سکتے ہو؟"

جوزف بری طرح چونکا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو ایک نظر دیکھا اور بالآخر بات اس کی سمجھ میں آگئی۔" میرا خیال ہے آدمی محبت کے زور پر سب کچھ کر سکتا ہے۔ مجھے تمہاری نظروں میں سرخ روئی حاصل کرنا تھی۔ تمہیں اپنی عزت پر مجبور کرنا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ میں تم پر اپنی محبت بھی ثابت کروں گا اور یہ بھی ثابت کر دوں گا کہ میں کمزور نہیں ہوں۔ بولو! اب تم مجھ پر... میری بات پر یقین کرتی ہو؟"

ڈیزی کی آنکھیں برسنے لگیں۔" جو... اوہ جو!" وہ اس وقت کسی چھوٹی سی بچی کی طرح سہمی ہوئی تھی۔

جوزف چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔" تم اتنی مضبوط، اتنی سخت نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کرتی ہو لیکن میں ہوں اور اسی لیے اب فیصلہ میں کروں گا۔ تم اندر سے نرم ہو اور ننھے بچوں کی طرح غیر محفوظ ہو۔ اسی لیے تم نے سختی اور طاقت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اب تمہیں اس لبادے کی ضرورت نہیں۔ ایکٹ ختم ہو چکا ہے۔ میں نے تمہاری آخری ٹیلی فون ڈائریکٹری پھاڑ کر پھینک دی ہے۔ سمجھ گئیں؟ اب کوئی ایکٹ نہیں ہوگا!"

ڈیزی کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔" ٹھیک ہے جو!" اس نے مہین سی آواز میں کہا۔

" شاباش اچھی لڑکی!" اس نے کہا اور اسے ساتھ لے کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

" سنو!" عقب سے بارلو نے پکارا۔" میرے شاور کا کیا ہوگا؟"

جوزف نے پلٹ کر اسے دیکھا۔" اس وقت نہیں بارلو!" اس نے کہا۔" میں اپنے شاگردوں میں سے کسی کو بھیج دوں گا۔ گڈ نائٹ۔"

پھر وہ اپنی ٹرافی اٹھائے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

MISS.HERCULES
Gilbert Harris.





خندہ تقدیر

علیم الحق حقی

اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ مشیتِ ایزدی کے خلاف ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ انسان تدبیریں کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور وہی کرتا بھی ہے لیکن کوئی تدبیر اس وقت تک کارگر نہیں ہوتی جب تک قدرت کی مرضی اس میں شامل نہ ہو۔

ایک شخص کا ماجرا جس کی تدبیر اُلٹ گئی تھی۔

ہر شخص کی زندگی میں کم از کم ایک بار ایسا وقت ضرور آتا ہے جب وہ مایوسی کی انتہائی کیفیت سے گزرتا ہے۔ اس کے سامنے ایسی رکاوٹ ہوتی ہے جس کے بارے میں وہ درست تخمینہ بھی نہیں لگا سکتا۔ اس وقت حالات ایک ایسے کنوئیں کی مانند ہوتے ہیں جس کی گہرائی کا اندازہ لگانا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ ایسی حوالات کی طرح ہوتے ہیں جس سے فرار ہونا ممکن نہیں ہوتا۔

جوناس کی زندگی میں وہ وقت آدھی رات سے ذرا پہلے آیا۔

اسے اچانک علم ہوا کہ اس کا پارٹنر عباس گزشتہ تین ماہ سے بڑے منظم انداز میں اس کمپنی کو لوٹ رہا ہے جو انھوں نے اشتراک میں قائم کی تھی۔ اسے یہ اندازہ بھی ہوا کہ اب کمپنی کو تباہی کے راستے سے واپس لانا ممکن نہیں رہا ہے۔ اب وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ کچھ کرنے کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔

یہ المناک حقیقت اس پر بہت آہستہ آہستہ روشن ہوئی۔ اس کا ذہن یہ قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ اس کا پارٹنر اس کا

دوست اس کے ساتھ دغا بازی کر سکتا ہے وہ چور ہو سکتا ہے اور چور بھی اتنا بڑا لیکن یہ حقیقت تھی کہ عباس نے اپنے دوست کی زندگی کی ہر خوشی چرالی تھی۔ اب جوناس سوچتا تھا تو اسے حیرت ہوتی تھی کہ اُسے عباس کے رہن سہن اور طرزِ زندگی سے اس بات کا اندازہ اب سے بہت پہلے ہی کیوں نہ ہو گیا۔ عباس کا معیارِ زندگی دیکھتے ہی دیکھتے بلند ہوا تھا۔ نئی کاریں، شاندار مکان، پُرتکلف دعوتیں، یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں تفریحی تعطیلات۔ پھر بار بار خاصے طویل عرصے کے لیے غائب ہو جاتا لیکن جوناس نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اپنے پارٹنر پر کبھی شک نہیں کیا تھا۔

اور اب صرف چھ گھنٹے کے عرصے میں حقیقت پوری طرح بے نقاب ہو گئی تھی۔ جوناس خود ایک تربیت یافتہ اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس نے اکاؤنٹس کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ اس نے ہر اُس بل کو شمار کیا کیا تھا جو قابلِ ادائیگی تھا۔ اس وقت پوری کمپنی اُس کے سامنے یوں بکھری پڑی تھی جیسے صدیوں پُرانے کھنڈرات۔ اب کمپنی کے پاس کوئی اثاثہ نہیں تھا، کوئی نقدی نہیں تھی۔ صرف وہ بل تھے جو ادا کیے جانے تھے یا بنک کا اوور ڈرافٹ تھا۔

وہ اُٹھا اور بھاری قدموں سے سیف کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ چند روز بعد سالانہ آڈٹ ہونے والا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ محض چند گھنٹوں میں آڈیٹرز کے سامنے صحیح صورتِ حال آجائے گی۔

سیف میں اس کے ذاتی کاغذات رکھے تھے۔ اس نے کاغذات نکال لیے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اُس نے کتنی بڑی حماقت کی تھی۔ سب کچھ اس کے نام تھا اور سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ ارما اور بچوں کے لیے کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔ سفاک حقیقت یہ تھی کہ اُس نے انھیں بے گھر کر دیا تھا۔ ایک طرح سے انھیں فٹ پاتھ پر لا کر پھینک دیا تھا۔ مکان، کار، فرنیچر، غرض ہر چیز قرق ہو جانا تھی۔ بچوں کی زندگی تباہ ہو گئی تھی۔ اب پچپن سال کی عمر میں اُسے ملازمت بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اس عمر میں وہ کر بھی کیا سکتا تھا اور اسے پوچھنے والا تھا کون۔ ایک ناکام بزنس مین اور ایک نااہل اکاؤنٹنٹ کسی کے کیا کام آسکتا ہے۔ اب وہ محنت مزدوری کر سکتا تھا یا سڑکوں پر جھاڑو لگا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کوئی ملازمت نہیں مل سکتی تھی۔

اچانک اُس کی نگاہ ایک پھٹے ہوئے لفافے پر پڑ گئی۔ ایک لمحے کو اُس کی آنکھیں چمکیں لیکن وہ چمک فوراً ہی معدوم بھی ہو گئی۔ وہ اُس کی زندگی کی بیمہ پالیسی تھی۔ اُس کی موت کی صورت میں اس کی بیوی کو دس ہزار ڈالر ملتے۔ پالیسی سے دستبردار ہونے کی صورت میں بھی اُسے اچھی خاصی رقم ملتی لیکن اُسے جو ادائیگیاں کرنا تھیں اُن کے سامنے وہ رقم کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ عباس فرار ہو چکا تھا اور اب ساری ذمے داری اُسی کی تھی۔

دس ہزار ڈالر کی رقم اُس کے لیے اچانک ہی بے حد پُرکشش ہو گئی۔ اُس نے لفافہ گھسیٹ لیا۔ وہ پالیسی کی شرائط جاننا چاہتا تھا۔ اس طرح اسے پتا چل سکتا تھا کہ اس کی بیوی کے لیے رقم حاصل کرنے کے امکانات کس حد تک روشن ہیں۔ لفافہ کھینچتے ہوئے کسی دھاتی شے کے سیف میں گھسٹنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ اُس کا پرانا ریوالور تھا۔ زمانۂ جنگ کی یادگار۔ ریوالور کی خوفناک چمک نے اس کو تھرا دیا۔ پھر اُس نے اپنی مرضی کے خلاف ہاتھ بڑھایا اور ریوالور بھی کھینچ لیا۔

اپنی میز پر آکر اس نے پالیسی ایک طرف اور ریوالور دوسری طرف رکھ دیا۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا جو اس کی اعصابی شکستگی کا غماز تھا۔ پھر اس نے لفافے میں سے پالیسی نکالی اور اُس کی تہیں کھول ڈالیں۔ پالیسی پڑھتے ہوئے اُس نے کن انکھیوں سے چمکتے ہوئے ریوالور کو دیکھا۔ پھر اُس نے بڑی بیزاری سے ریوالور کو دور ہٹا دیا تاکہ وہ اُس کی نظروں کی حدود سے باہر رہے۔

کام بہت دشوار تھا لیکن اس نے شروع سے آخر تک پالیسی کو پڑھ ڈالا۔ وہ اکاؤنٹنٹ کی آنکھیں تھیں جنھوں نے پالیسی کو پوری طرح پڑھ کر اس کی تمام جزئیات کو دماغ کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر سمجھ سمجھ کر تاکہ ہر شق کی اہمیت اس پر پوری طرح کھل جائے۔ اس کے مایوس ذہن میں ایک بے رحم خیال کا بیج کلّے کی صورت سر اُبھار رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ پالیسی کو پڑھتا گیا، اس کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی گئیں۔ وہ ایک عجیب انداز میں پُرامید ہوتا گیا۔ اُس کا کاروبار، مکان، کار، فرنیچر سبھی کچھ اس کے نام تھا۔ وہ سب قرقی کی نذر ہو جائے گا۔ پالیسی کے دس ہزار ڈالر اس کے بیوی بچوں کو مل سکتے ہیں بشرطیکہ وہ خودکشی کر لے۔ یہ مسئلے کا ایک ممکنہ حل تھا۔ جہاں تک اُس کا تعلق ہے، اس کا نہ ہونا ہی اس کے ہونے سے بہتر ہے۔ آخر وہ ہے ہی کس قابل۔ اس پر بیوی اور بچوں کی ذمے داری تھی اور اس نے یہ ذمے داری کیا خوب نبھائی تھی۔ وہ کتنا اچھا بزنس مین تھا کہ اتنی آسانی سے اپنے پارٹنر کے ہاتھوں لُٹ گیا۔ وہ کتنا اچھا شوہر تھا، کتنا اچھا باپ تھا کہ اس نے بیوی بچوں کے لیے ایک خوف ناک مستقبل کے سوا کچھ بھی نہیں چھوڑا۔

اسے خود پر بہت شدت سے غصہ آیا۔ اُس نے اندھا دُھند ہاتھ بڑھا کر ریوالور اُٹھا لیا۔ اس نے ریوالور کی دیکھ بھال میں کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اسے تیل دیتا رہا تھا، اُس کی صفائی کرتا رہا تھا۔ ریوالور بھرا ہوا تھا۔ اس وقت اسے ریوالور پر بہت پیار آیا۔ وہ ریوالور یاد دلاتا تھا کہ کبھی اُس نے مردوں کی طرح بھرپور زندگی گزاری تھی۔ اُس نے ایامِ جوانی میں اپنے وطن کا دفاع کیا تھا۔

اس نے ریوالور کو بڑی مضبوطی سے تھاما ہوا تھا اور اُس کی انگلی ٹرائیگر کو بڑے پیار سے سہلا رہی تھی۔ وہ سوچتا رہا۔ ریوالور منہ میں رکھ کر فائر کرنا سب سے بہتر ہوتا ہے۔ یہ بات اس نے کئی ناولوں میں پڑھی

پڑھی تھی۔ اس میں تکلیف بھی نہیں ہوتی اور موت بھی فوری طور پر واقع ہو جاتی ہے۔ پیشانی پر نال رکھ کر فائر کرنا بہت بے رحمانہ اور مکروہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں صرف سوچ کر ہی بری طرح لرز گیا۔

جب وہ پالیسی کی اس اہم شق تک پہنچا تو ریوالور اس وقت بھی اس کے داہنے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس شق پر نگاہ پڑنے کا منتظر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پالیسی میں یہ شق موجود ہے لیکن وہ حسابی ذہن رکھتا تھا۔ اسی لیے اس نے بے تاب ہو کر اس شق کو تلاش کرنے کے بجائے پوری پالیسی کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس شق کا مطالعہ کر کے اس کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنا چاہتا تھا۔ اب وہ آتشیں حروف اس کی بصارت کو جھلسائے دے رہے تھے۔ وہ جیسے جیسے اس شق کو پڑھتا گیا فرار کا واحد دروازہ بھی بند ہوتے ہوتے بالکل مقفل ہو گیا۔ خودکشی کی صورت میں پالیسی خود بخود کالعدم ہو جائے گی۔

اس کے چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ وہ الفاظ اس کے لیے گویا جہنم کا دروازہ کھول گئے تھے۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ خودکشی کا ایسا کون سا طریقہ ہو سکتا ہے جسے تفتیش کرنے پر خودکشی ثابت نہ کیا جا سکے۔ ایسا طریقہ، جس سے موت حادثاتی معلوم ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ریوالور کی صفائی کے دوران گولی چل جائے؟ لیکن اس میں دو قباحتیں تھیں۔ پہلی تو یہ کہ اس کے بچ جانے کا امکان موجود تھا۔ دوسری بات اور زیادہ باعثِ تشویش تھی۔ اسے یہ علم کیسے ہوگا کہ اس کی کوشش کامیاب ہو گئی ہے۔ اور اس کی موت حادثاتی قرار دے دی گئی ہے۔ وہ دوسری اور ابدی زندگی پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کے لیے اس متحرک زندگی میں دنیا سے اس بے یقینی کے ساتھ رخصت ہونے کا تصور بے حد روح فرسا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے عزت سے جینے کا سامان بھی چھوڑے جا رہا ہے یا نہیں۔ پھر وہ یہ سوچ کر ہنس دیا کہ اُسے ان باتوں کا علم ہی کہاں ہوگا۔ اسے کیسے پتا چلے گا کہ اس کے بیوی بچوں کو عزت کے ساتھ زندہ رہنے کا سامان میسر آیا ہے یا نہیں۔ وہ تو موت کے ساتھ ہی ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو جائے گا۔

بہر حال وہ یہ بات بھی جانتا تھا کہ اس کے لیے یہ کام ناممکن ہے۔ یعنی اس انداز میں خودکشی کرنا کہ وہ سو فیصد حادثہ قرار پائے اور پالیسی کی رقم اس کی بیوی کو یقینی طور پر مل جائے۔

اسی لمحے سام نامی چوکیدار نے دفتر کے نیم وا دروازے سے اندر جھانکا۔ فرار کا وہ تصوراتی دروازہ، جو خودکشی کی صورت میں پالیسی کالعدم ہونے کی شق کے مطالعے کے بعد بند ہو گیا تھا اس کی آمد سے ایک دو انچ کے قریب کھل گیا۔

"آج دیر تک کام کر رہے ہو گورز!" سام نے کہا۔ اسی وقت کلاک نے بارہ بجائے۔ "مسٹر جوناس! خیریت تو ہے؟" پھر سام کی نظر جوناس کے ہاتھوں پر پڑی۔ ایک ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے میں

پالیسی۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔

جوناس بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اگر کوئی اُسے قتل کر دے تو ارما کو دس ہزار ڈالر مل جائیں گے۔ کیا وہ سام کو اس بات پر رضامند کر سکتا ہے کہ وہ اسے قتل کر دے۔ وہ ارما کو خط میں ہدایت کر سکتا ہے کہ سام کو دو ہزار ڈالر دے دے تاکہ سام ملک سے فرار ہو سکے لیکن پھر اُسے احساس ہو گیا کہ یہ دیوانگی ہے۔ سام ایسا کسی قیمت پر نہیں کرے گا۔ وہ تو اُسے پاگل قرار دے دے گا۔ فرار کا دروازہ پھر پوری طرح بند ہو گیا۔ بچاؤ کے مستقبل کے لیے روشنی کی کوئی کرن نہیں رہی تھی۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے سام!" جوناس نے اُسے بے حد کشادہ مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے کہا۔

سام نے بعد میں بتایا کہ اس نے باس کو کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت درحقیقت جوناس کے دل میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا لیکن سام کو وہ مسکراہٹ تازندگی یاد رہے گی۔ اُس قاتل کی مسکراہٹ یاد رہنے والی چیز تھی۔ ان مٹ۔ سام تمام عمر لوگوں کو یہ بتائے گا۔

بہرحال سام نے باہر جا کر آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

جوناس کو اُس کے جانے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ وہ بدستور دائیں ہاتھ میں ریوالور اور بائیں ہاتھ میں پالیسی لیے بیٹھا رہا۔ اُس کا دماغ ٹھٹھر گیا تھا۔ اُس سے سوچا بھی نہیں جا رہا تھا۔ تھوڑے سے وقت میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ وہ لیٹ کر سو جانا چاہتا تھا۔ بلکہ مر جانا چاہتا تھا۔ کاش اپنی قوتِ ارادی کے زور پر سو جانے کی طرح مر جانا بھی انسان کے اختیار میں ہوتا۔ اُس نے سُنا تھا کہ قدیم مشرق کے لوگ اس سلسلے میں بااختیار تھے۔ پھر کالے جادو کا معاملہ بھی تو ہے۔ موم کا ایک چھوٹا سا پتلا بنا لیتے۔ اُسے تو اپنا پتلا بنانا ہو گا۔ پھر اس پتلے کے دل میں سوئی اتار دیتے لیکن خودکشی کے معاملے میں یہ بھی بے سود تھا۔ اُس کا پتلا جو اس کے قریب موجود ہو گا راز فاش کر دے گا۔ خودکشی ثابت ہو جائے گی اور پالیسی کالعدم قرار پائے گی۔

دروازہ پھر کھلا تو اُس کے جسم میں بیزاری کی ایک تُند لہر دوڑ گئی۔ آخر سام مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتا۔ اگر میرے کام نہیں آ سکتا تو کم از کم اتنا تو کر ہی سکتا ہے۔ اُس نے جھلا کر سوچا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید سام اُسے تنہائی سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

دروازہ کھلا اس کے بعد چند لمحے خاموشی رہی۔ جوناس نے نظریں اُٹھائیں اور اچانک خون اس کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ دروازے میں اس کا پارٹنر عباس کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ وہ بیوقوفوں کی طرح منہ کھولے کھڑا تھا۔ اس کی بھینگی آنکھوں میں دہشت تھی۔ "عجیب بات ہے۔" جوناس نے سوچا۔ "اتنی طویل رفاقت کے باوجود میں نے کبھی اس کا بھینگا پن محسوس نہیں کیا۔"

جوناس کا دماغ کھول رہا تھا۔ وہ ذلیل شخص کوئی ایسی چیز لینے آیا تھا جو وہ وہاں بھول گیا تھا۔ اب وہ حیران اور دہشت زدہ تھا۔ اُسے تو اُمید بھی نہیں ہو گی کہ میں یہاں موجود ہوں گا۔ جوناس کا ریوالور والا ہاتھ بلند ہوا۔ عباس کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔ وہ دہشت بھری نگاہوں سے ریوالور کی نال کو دیکھے جا رہا تھا۔

"جوناس!" عباس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اُس کی آواز مینڈک کی ٹرٹراہٹ سے مشابہ تھی۔

جوناس نے بغیر ایک لفظ کہے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اُس کے بددیانت پارٹنر کے دل میں اُتر گئی۔ جوناس نے بے حد پُرسکون انداز میں ریوالور میز پر رکھ دیا۔ کوریڈور کی طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سُنائی دی اور پھر سام کا خوف زدہ چہرہ دروازے میں نظر آیا۔ اس نے پہلے عباس کی لاش کو دیکھا اور پھر نظریں اُٹھا کر جوناس کو جوناس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ سے اپنے ریوالور کی طرف اشارہ کیا۔

"میں نے اسے قتل کر دیا ہے سام!" جوناس نے کہا۔ "پولیس کو فون کرو۔ میں جلد از جلد اعترافِ جرم کرنا چاہتا ہوں۔"

لاک اَپ میں اسے بے پناہ خوشی کا احساس ہوا۔ وہ ایسی خوشی تھی جو نہ اس سے پہلے کبھی اُسے ملی تھی اور نہ آئندہ مل سکتی تھی۔ عمل کے اس لمحے میں جوناس کے دماغ نے بہت تیز رفتاری سے کام کیا تھا۔ عباس بہت اچھے موقع پر آیا تھا۔ وہ ایک نفسیاتی لمحہ تھا۔ عباس کی آمد ایسی تھی جیسے تقدیر کی انگلی کی خفیف سی حرکت نے بساطِ وقت پر کسی پیدل کو اُردب میں ڈال دیا ہو۔ وہ مناسب ترین لمحے میں مناسب ترین مقام پر مناسب ترین آدمی تھا۔ اُس ایک لمحے میں جوناس کی قوتِ استدلال اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی تھی۔ اُس نے حساب لگایا تھا کہ وہ قاتل کی حیثیت سے سزائے موت پائے گا تو وہ فطری موت ہو گی۔ پالیسی کی رقم اُس کی بیوی کو مل جائے گی۔ باقی سب کچھ جائے جہنم میں۔ خود اُس کے لیے تو اب زندگی میں کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

قانونی کارروائی کے دوران وہ بہت پُرسکون رہا۔ اس نے غیرمعمولی تعاون کا مظاہرہ کیا۔ اس نے تفصیلی اعترافِ جرم پر بلا جھجک اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ سام کی گواہی اس کے بیان کی پوری طرح تائید کرتی تھی۔ اُس نے اصرار کیا کہ اس کی بیوی کو مطلع نہ کیا جائے۔

مقدمے کے دوران اُس نے اس بات پر زور دیا کہ وہ مجرم ہے۔ اس نے اپنی صفائی کے لیے وکیل کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر سرکار کی طرف سے اُسے وکیل فراہم کیا گیا تو اس نے بالکل ہی چُپ سادھ لی۔ وہ کچھ کہتا تو صرف اتنا کہ اس نے اپنے پارٹنر عباس کو بالارادہ قتل کیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کے پاس نہ کوئی وضاحت تھی اور نہ کوئی جواز۔

سام کی شہادت جوناس کے اعترافِ جرم کے ایک ایک

الفاظ کی تائید کرتی تھی۔ جوناس دل ہی دل میں دعا کرتا تھا کہ اب سام کے متعلق اپنے دل میں جذبۂ انتقام نہ پالنے۔ سام کا اس میں کوئی قصور نہ تھا۔ اس نے تو صرف اور صرف سچ بولا تھا۔

جوناس نے اپنے بیوی بچوں سے ملنے سے صاف انکار کیا تھا۔ اس کی بیوی نے وکیل سے التجا کی کہ اسے خط لکھے لیکن جوناس اپنے اس فیصلے پر ڈٹا رہا کہ وہ کسی سے بھی ملاقات نہیں کرے گا۔ اس کے نزدیک سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ کتابِ زندگی کا آخری باب بھی مکمل ہو چکا تھا۔ اب صرف اختتامیہ باقی تھا۔ اپنی ناکامی کے باوجود جو کچھ اُس کے اختیار میں تھا وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے کر چکا تھا۔ وہ مطمئن، پُرسکون اور آسودہ تھا لیکن اسے یہ اندازہ بھی تھا کہ بیوی یا بچوں پر ایک نظر پڑتے ہی اس کا استقلال اور اعتماد رخصت ہو جائے گا۔ اسی لیے وہ بیوی بچوں سے ملنے سے انکار کرتا رہا۔ وہ اس گریز کی کوئی وجہ بھی نہیں بتاتا تھا۔

مقدمہ چلتا رہا۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا کہ مقدمہ اس قدر طول کیوں پکڑ رہا ہے۔ اس میں کمی کیا تھی سوہ اعترافِ جرم کر چکا تھا۔ بوڑھا سام جو فائر کے صرف چند لمحے بعد جائے واردات پر پہنچ گیا تھا تقریباً عینی شاہد کی حیثیت رکھتا تھا۔ پھر اس کا یہ بتانا کہ اس نے جوناس کو آدھی رات کو اپنے دفتر میں ریوالور لیے بیٹھے دیکھا تھا پھر جوناس کی اسکرابٹ کا بیان۔ استغاثہ کے کیس میں کوئی جھول نہیں تھا۔

مقدمے کی تاریخیں آگے بڑھتی رہیں، سماعت بار بار ملتوی ہوتی رہی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا جوناس کی تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں تاخیر کا سبب نہیں آ رہا تھا۔ کیا عدالتیں کسی ایسے شخص کو پھانسی کی سزا سناتے ہوئے ہچکچاتی ہیں جو پھانسی کا خواہش مند ہو۔ یہ تو سیدھا سا معاملہ تھا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، جان کے بدلے جان۔ بس ایک فرق تھا اس بار جلاد کو ایک ایسا شخص ملے گا جو اُس سے بھرپور تعاون کرے گا۔

یہ جوناس کی خوش قسمتی تھی کہ مسلسل کوششوں کے باوجود سزائے موت کی روایت اب بھی قائم تھی۔ منسوخ نہیں کی گئی تھی۔

"آج فیصلہ سنایا جائے گا۔" کسی نے اسے بتایا۔ وہ خوش ہو گیا۔ جیوری کا فورمین اور دیگر اراکین، جب فیصلے کے بعد کورٹ میں داخل ہوئے تو جوناس سے نظریں چرا رہے تھے۔ "جرم ثابت ہو چکا ہے۔" فورمین نے اعلان کیا۔

جوناس نے بمشکل فیصلے کے الفاظ سنے۔ وہ اسی لمحے کا منتظر تھا اور وہ فتح کے احساس سے سرشار تھا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے کا دن تھا۔

سزائے موت پر اکیس دن بعد عمل درآمد ہونا تھا۔ جوناس ان لمحات سے ایک ایک دن انتہائی لطف اٹھا رہا تھا۔ سزائے موت کی کوٹھڑی اس کے لیے ایک دلکش اور پُرلطف مقام ثابت ہو رہی تھی۔ وہ وارڈن سے شطرنج اور ڈرافٹ کھیلتا، پہرے داروں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا، پیٹ بھر کے کھانا کھاتا اور معصوم بچے کی طرح گہری نیند سوتا۔ جیل کی چار دیواری میں وہ دیومالائی کردار کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اس کی زندہ دلی اور ثابت قدمی مثالی تھی۔

اس کی موت سے تین روز پہلے ریاست کا گورنر اس کی کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ جوناس نے کھڑے ہو کر بے حد دلکش مسکراہٹ سے اس کا خیر مقدم کیا۔ "گورنر! آپ بالکل فکر نہ کریں۔" اس نے ہموار لہجے میں کہا۔ "میں تیار ہوں۔ میں تو اسی روز سے اس مرحلے کے لیے تیار ہوں جب میں نے ارتکابِ جرم کیا تھا۔ میں پوری طرح تعاون کروں گا۔ آپ کو میری طرف سے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ جب وہ مجھے پھانسی گھر کی طرف لے جائیں گے تو میں اپنے قدموں پر ہوں گا۔ انھیں مجھے گھسیٹنے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ میں چیخوں گا بھی نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے آپ کی مذہبی تشفی کی پیشکش قبول نہیں کی ہے۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ اگر اسی میں آپ کی خوشی ہے تو پادری کو بلا دیجیے۔ بلکہ آپ اسے اپنے ساتھ ہی لے آئے ہوتے۔"

"میری یہاں آمد کا مقصد مختلف ہے جوناس!" گورنر نے کہا۔ "تمھیں اپنی بیوی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس نے تمھاری بقا کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ اس نے اپیل دائر کی۔ دوسری طرف [illegible] نے ہمیں کا سراغ لگا لیا..."

جوناس ہنوز گورنر کو سکتہ زدہ کی طرح گھورے جا رہا تھا۔ پہلی بار اسے جیل کی گھٹن اور سنگ بستہ دیواروں کی ہیبت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ آنے والے برسوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ مایوسی کے، قید کے تاریک سال۔ گورنر کے الفاظ اس کے لیے تازیانہ ثابت ہوئے تھے۔ یاسیت کا تصور اس پر حاوی ہو چکا تھا۔

"ان حالات میں تمھارے کیس کا ازسرِنو جائزہ لیا گیا۔" گورنر نے مزید کہا۔ "مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ تمھاری سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔"

جوناس جھومتے جھومتے اچانک گر گیا۔ اس کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ تقدیر اس کی تدبیر کی ناکامی پر قہقہے لگا رہی تھی، مضحکہ اڑا رہی تھی۔ گورنر نے فوری طور پر جیل کے ڈاکٹر کو طلب کر لیا۔ ڈاکٹر نے جوناس کا معائنہ کیا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے افسوس ہے گورنر!" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے انھیں کوئی ناقابلِ برداشت صدمہ ہوا تھا۔"

جوناس کی تدبیر ہار گئی تھی لیکن قدرت کو اس پر رحم آ گیا تھا ورنہ وہ موت کی آرزو میں عمر بھر ترستا رہتا، آزادی کی نعمت سے محروم۔

SENTENCE OF THIS COURT
Alan Archer.

جس کی تحریروں کا آپ انتظار کرتے ہیں، اُسی کے قلم سے ایک لازوال تحریر

اماوس کا دیا

علیم الحق حقی

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس پر ہر زبان میں بہت زیادہ لکھا گیا ہے، ہمیشہ سے لکھا جا رہا ہے اور ہمیشہ لکھا جاتا رہے گا۔ موضوعات کثرت سے لکھے جانے پر پامال ہو جاتے ہیں لیکن محبت کی تازگی برقرار ہے اور رہے گی۔ یہ اس جذبے کی آفاقیت کا ثبوت ہے۔ گزشتہ سال آپ نے انہی صفحات پر ناقابلِ فراموش داستان "عشق کا عین" ملاحظہ فرمائی۔ مصنف کا اپنا خیال تھا کہ اس کے بعد شاید وہ محبت پر کچھ نہیں لکھ سکیں گے لیکن انہی کے قلم سے محبت کی ایک اور یادگار داستان پھر انہی صفحات پر جلوہ گر ہو رہی ہے۔ عشق کا عین میں وہ محبت تھی جو بندے کو خدا سے ملاتی ہے۔ اس کہانی میں یہ وہ آسمانی محبت ہے جس میں زمین کے تمام رنگ موجود ہیں۔ سفلی بھی اور نوری بھی۔ اس کے باوجود وہ اوّل و آخر محبت ہی ہے۔ ایک عظیم انسانی جذبہ۔ اس کہانی میں کردار نگاری کا فن اپنے عروج پر ہے۔ یہ کہانی دو بے حد مشہور اور حقیقی کرداروں کے باہمی تعلق سے انسپائر ہو کر لکھی گئی ہے لیکن کہانی کے واقعات اور کرداروں کا خاندانی اور ثقافتی پس منظر اور دیگر سب کچھ فرضی ہے مگر انہیں بہت زیادہ سوچا اور بے حد عرق ریزی سے تخلیق کیا گیا ہے۔ مصنف نے انہیں اس طرح پیش کیا ہے کہ آپ بھی خود کو ان کرداروں کے ساتھ انسانی نفس کی بھول بھلیاں میں بھٹکتا محسوس کریں گے۔ ان کے ساتھ آپ کا سینہ بھی دُکھ سے چھلنی ہوگا اور ان کے ساتھ آپ بھی محبت کی سرشاری میں بھیگیں گے... شرابور ہو جائیں گے۔

آپ بھی اس سے اتفاق کریں گے کہ عظیم کہانیوں کو صفحات کا پابند کرنا زیادتی ہے اور ایسی کہانیوں کو بالاقساط شائع کرنا ہمیں اور پڑھنا آپ کو گراں گزرتا ہے۔ بہت جی چاہتا ہے کہ ایسی کہانیاں ٹکڑے کیے بغیر آپ تک پہنچائی جائیں لیکن یہ ممکن نہیں۔ کاش ہمارے وسائل اور آپ کی قوتِ خرید میں استطاعت ہوتی۔ یہ کہانی سالگرہ نمبر کے توشۂ خاص کی حیثیت سے ان آخری صفحات کی زینت بن رہی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مکمل کہانی کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔

اُسے سمندر زندگی ملی تھی اور اس نے سمندر کو اپنے اندر اتار لیا تھا

"ایک بات پر یقین رکھو انور۔ میرے دل میں خودکشی کا خیال بھی نہیں آسکتا۔"

انور کے اندر کی اداسی ایک دم تحلیل ہوگئی جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور باپ کو دیکھا۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ باپ کے چہرے کو غور سے دیکھے۔ دیکھتا تو اسے لگتا کہ وہ آئینے کے روبرو کھڑا ہے۔ جادوئی آئینے کے روبرو، جس نے اس کے سر کے تمام بالوں کو برف جیسا سفید کر دیا ہے۔ گالوں کو جھول دے دی ہے اور چہرے پر چند لکیریں... آنکھوں کے نیچے، آنکھوں کے پہلوؤں میں...

وہ باپ کا ہم شکل تھا۔ اس کی جوانی کی تصویر!

باپ کے چہرے کی وہ لکیریں بھی اسے حقیقی نہیں لگتی تھیں۔ جیسے وہ کچھ اور نہیں، باپ کے اپنے برش کا کمال ہو۔ بے نیازی سے لگائے گئے چھوٹے چھوٹے ہلکے سے اسٹروک مگر یہ بھی تھا کہ وہی لکیریں تو باپ کی عمر کا احساس دلاتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر اسے یاد آتا تھا کہ باپ کی عمر ۸۸ برس ہے۔ اس کے سوا تو وہ کسی اعتبار سے بوڑھا نہیں لگتا تھا۔

"پاپا۔ یہ خیال تو میرے دل میں کبھی آ ہی نہیں سکتا کہ آپ خودکشی کے بارے میں سوچ بھی سکتے ہیں۔" اس نے آہستہ سے



کہا۔
آذر جمیل نے نظریں اٹھا کر بیٹے کو دیکھا اور مسکرا دیا۔ انور کا چہرہ بدل گیا تھا۔ اب وہاں اداسی کا کوئی رنگ نہیں تھا اور یہ کمال اس کے پہلے جملے نے دکھایا تھا۔ لفظوں سے قطع نظر اس کے لہجے کی بیگانگی نے بیٹے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہوگا۔ ایسے میں اداسی جیسی نازک اور لطیف چیز کیسے پنپ سکتی ہے۔ انور کو اس کے لہجے نے احساس دلایا ہوگا کہ باپ کو نہ اس کی پروا ہے' نہ ضرورت ہے۔ باپ کو تنہا چھوڑ کر امریکا جانے کے خیال سے جس اداسی نے اس کے دل کو جکڑا تھا' وہ یہ جملہ سنتے ہی یوں تحلیل ہو گئی ہوگی جیسے صبح کی نرم دھوپ میں شبنم کے قطرے تحلیل ہو جاتے ہیں۔

آذر جمیل پھر مسکرا دیا لیکن اس بار اس مسکراہٹ کی تہ میں دکھ چھپا ہوا تھا مگر وہ دکھ انور کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ یہ آذر جمیل کی محبت کا انداز تھا۔ وہ محبت کے اظہار کا قائل نہیں تھا۔ لفظوں میں تو ہرگز نہیں۔ قدرت نے اسے اظہار کا پیرایہ رنگوں اور لکیروں کی زبان میں عطا کیا تھا۔ اور اس نے ساری عمر اسی سے استفادہ کیا تھا۔ وہ جن سے محبت کرتا تھا' اس نے لفظوں اور لمس کی زبان میں بھی ان سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اظہارِ محبت لوگوں میں خود انحصاری کو پنپنے نہیں دیتا جبکہ ... محبت کا کام محبوب کو مضبوطی عطا کرنا' اسے خود انحصاری سکھانا ہونا چاہئے تاکہ زندگی کے کسی بحران میں' کڑے وقت میں وہ مدد کے لئے ادھر ادھر دیکھنے کے بجائے صرف خود پر تکیہ کرنا سیکھے۔

اس وقت اس نے اپنے محبوب بیٹے کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ اس نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ صرف خود پر انحصار کرتا ہے اور بیٹے کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔

اس نے بیٹے سے کہا "دیکھو انور' میں۔ تقریباً ایک صدی پرانا آدمی اب عمر کے اس حصے میں ہوں' جہاں انسان زندگی اور موت کے درمیان NO MAN'S LAND میں کھڑا ہوتا ہے اور یہ بفرزون دو ملکوں کی درمیانی سرحد کی طرح کوئی چوڑی پٹی نہیں ہوتی۔ وہ بہت تنگ پٹی ہوتی ہے۔ آدمی کتنی ہی احتیاط برتے' اس کا پاؤں موت کی لکیر کو چھو رہا ہوتا ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کس لمحے' کس مقام پر زندگی کی زمین ختم ہو جائے گی اور موت کا خلا رہ جائے گا۔" اس نے گہری سانس لی "اور جس کے چلتے قدم موت کی سرحد کو چھو رہے ہوں' وہ خود کشی کے بارے میں سوچنے کی حماقت کیوں کرے گا۔ موت تو ویسے ہی اس کی ہم رکاب ہوتی ہے۔"

انور سحرزدہ سا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ پاپا خالص مصور ہیں۔ ہر چیز کو' ہر جذبے کو' ہر سچویشن کو VISUALISE کرتے ہیں۔ واہ۔ کیا اچھوتا خیال ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان NO MAN'S LAND۔ یہ شکل پل صراط۔

"پاپا۔ آپ اس خیال کو پینٹ کیوں نہیں کرتے؟" اس نے بے ساختہ کہا۔

آذر ہنس دیا "میں زندگی کا مصور ہوں انور۔ موت کو میں دوسرے جہان میں جا کر پینٹ کروں تو کروں مگر وہاں موت ہوگی ہی نہیں" وہ بولا "میں تو رقص کا مصور ہوں اور رقص میرے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ کائنات کی ہر چیز رقص میں ہے۔ ہر انسانی جذبہ' ہر کیفیت' خوشی' غم' محبت۔ ہر شے رقص کا پیراہن اوڑھے ہے جب کہ موت سکوت ہے۔ اس میں کوئی تحرک' کوئی ردھم نہیں" وہ کہتے کہتے چونک کر رکا "تم موضوع سے کیوں ہٹاتے ہو مجھے۔ بات تمہارے امریکا جانے کی ہو رہی تھی۔"

"ممی پاپا اور آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ آپ اصرار کر رہے ہیں کہ میں چلا جاؤں۔ میں آپ کی تنہائی کے خیال سے ہچکچا رہا تھا۔"

"تنہائی تو میرا سب سے پسندیدہ کھلونا ہے۔ تنہائی میرے لئے راجا اِندر کی سبھا ہے۔" آذر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ خود تو عمر گزار چکا۔ اس نے زندگی میں وہ سب کچھ کر لیا' جو کوئی انسان کر سکتا ہے جب کہ انور ابھی جوان ہے۔ اس کے سامنے پوری زندگی ہے۔ اسے بہت کچھ کرنا ہے۔ بہت آگے جانا ہے تو اب وہ۔۔۔ آذر جمیل بڑھاپے میں اپنے جوان بیٹے کے راستے کی رکاوٹ نہیں بننا چاہتا۔

لیکن اس نے بیٹے سے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ یہ تو کمزوری کا اظہار ہوتا اور یہ اسے گوارا نہیں تھا پھر عمر زیادہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ بوڑھا تو ہے بھی نہیں۔ ابھی تو اسے بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ بڑھاپا اور جوانی تو آدمی کے اندر ہوتی ہے۔ وہ تو اب بھی اوسطاً بارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔

ایک لمحے میں اس نے یہ سب سوچا اور پھر اپنی بات مکمل کی۔ "میری تنہائی میں رقص و سرود کی محفلیں سجتی ہیں۔ جام بے تاب کے دور چلتے ہیں اور کائنات مستی و بے خودی میں ڈوب جاتی ہے۔ وہ وقت میرے لئے سب سے بڑے انجوائے منٹ کا ہوتا ہے۔"

انور کا دل تلخی اور شکایت سے بھر گیا۔ پاپا نے اپنی تنہائی ممی کی تنہائی کی قیمت پر خریدی تھی اور سیدھی سادی ممی کی تنہائی ان کے لئے راجا اِندر کی سبھا نہیں تھی۔ وہ ان کے لئے اداسی اور دکھ کا سبب خلا تھا۔ اسی خلا میں گرتے گرتے وہ موت کے پاتال میں اتر گئیں۔ وہ تو عمر بھر زندگی اور موت کے درمیان میں چلتی رہی تھیں اور انہوں نے کبھی کوئی شکایت بھی نہیں کی۔ ممی نے تین جوان بیٹوں کی موت کا صدمہ اکیلے سہا۔ کوئی غم بٹانے والا جو نہیں تھا۔

"پاپا' آپ کو کسی کی ضرورت نہیں۔ میری بھی نہیں" انور نے اداسی سے کہا۔ یہ لفظ اس نے ہی لئے کہ ممی کی بھی نہیں تھی۔

"کسی کی ضرورت محسوس کرنا کمزوری کی علامت ہے جب کہ میں مضبوط انسان ہوں اور تمہیں بھی مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔"

آذر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں مضبوط نہیں بننا چاہتا پاپا!" انور کے لہجے میں رکھائی آگئی۔ "میں جانتا ہوں کہ مضبوط آدمی اندر سے کتنے کمزور ہوتے ہیں اور مضبوطی کے نتیجے میں کتنے اکیلے ہو جاتے ہیں۔"

اصولاً یہ سچ سننے کے بعد آذر کو نظریں چرانی چاہئے تھیں لیکن اس نے بیٹے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "تم تنہائی سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟" اس نے آہستہ سے کہا۔ "آدمی آتا بھی اکیلا ہے اور جاتا بھی اکیلا ہے۔ درمیان میں وہ کتنی ہی انجمن آرائی کر لے، انجام سب سے خوف ناک تنہائی ہوتا ہے۔ نزع کی تنہائی سے لے کر قبر کی تنہائی تک۔"

"آپ تنہائی کے فلسفے پر بڑی خوبصورت گفتگو کرتے ہیں۔" انور اچانک پھٹ پڑا۔ اس کے لہجے میں بپھرے ہوئے طوفانوں کی سرکشی تھی "لیکن آپ تنہائی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ آپ نے کبھی ممی سے پوچھا تھا کہ تنہائی کیا ہوتی ہے؟ کبھی انہیں محسوس کرنے کی کوشش کی؟"

"تنہائی محرومی ہے۔ محرومیاں سب کے ساتھ ہوتی ہیں۔ عام لوگوں کی محرومیاں نظر آجاتی ہیں اس لئے کہ وہ ان کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ مضبوط لوگوں کی محرومی کا کسی کو پتا نہیں چلتا۔ جیسے میں ہوں۔ میری کوئی محرومی تمہیں نظر نہیں آئی۔" آذر نے بے حد تحمل سے کہا۔ اس کے لہجے میں شکایت کا شائبہ بھی نہیں تھا "لیکن اس وقت یہ گفتگو بے محل ہے۔ تم مجھے موضوع سے نہ بھٹکاؤ۔ اپنی ممی کے سلسلے میں اپنی معمول کی شکایات پھر کبھی فرصت میں کر لینا اور رہی محسوس کرنے کی بات تو کسی کے جذبوں، احساسات اور سوچ کو محسوس کرنا محض ایک گمان ہوتا ہے، جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ آئینہ ہے، جس میں اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔ ہر آدمی کے محسوسات کی ایک حد ہوتی ہے اور محسوس کرنے کا اپنا ایک رنگ ہوتا ہے۔ وہ اسی کے مطابق دوسرے کو محسوس کر سکتا ہے۔"

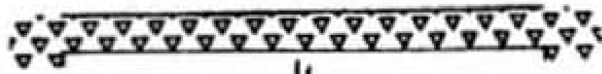
انور کا منہ لٹک گیا۔ پاپا ہمیشہ یونہی بات کرتے تھے۔ جیسے برف کی کوئی سل اپنی بے مہر ٹھنڈک دوسروں کو پہنچاتی ہے۔

"تم کاغذات مکمل کر لو۔ میں تین چار فون کروں گا۔ تمہارا کام ہو جائے گا اور کوئی فکر نہ کرنا۔ امریکا ہی میں نہیں یورپ کے ہر بڑے ملک میں میرے پرستاروں کا ایک حلقہ ہے۔ تمہیں وہاں رہ کر بھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" آذر نے اپنی بات مکمل کی۔

"شکریہ پاپا مگر میں آپ کے کسی پرستار سے ملوں گا بھی نہیں۔ مدد لینا تو دور کی بات ہے۔"

آذر نے حیرت سے بیٹے کو دیکھا۔

"میں اب بھی آپ کے نام کی بیساکھی استعمال نہیں کروں گا۔ مضبوط لوگ سہارے بھی تلاش نہیں کرتے نا؟ میں اپنے یہاں کے حوالے یہیں چھوڑ کر جاؤں گا۔" انور نے وضاحت کی



سوال

ٹیچر بچوں کو سمجھا رہی تھی کہ سردیوں میں مناسب کپڑے پہنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ مثال سے سمجھانے کے لئے اس نے چھوٹی سی ایک کہانی گھڑ کر بچوں کو سنائی "ارشد ایک اچھا بچہ تھا لیکن دسمبر کی کڑکڑاتی سردی میں وہ ایک روز صبح ہی صبح صرف بنیان اور نیکر پہن کر قریبی پارک میں کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ اس وقت وہ اسپتال میں ہے۔ اسے نمونیا ہو چکا ہے۔ آپ لوگ اس کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد ایک کونے سے چھوٹے سے ایک بچے نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"مس! ارشد کا بیٹ آج کل کس کے پاس ہے؟"

اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلتا ہوں پاپا۔"

آذر جمیل حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ بیٹے نے اس کی بات اسی کو لوٹا دی تھی۔

○☆○

تنہائی ہوئی تو اندر سبھا سج گئی!

اس کے ہاتھ میں جام تھا۔ آنکھوں میں سرور اور تصور میں محفلِ نشاط۔ نرتکیاں رقص میں مصروف تھیں۔ رقص۔ اعضا کی شاعری!

لیکن وہ لطف نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ طبیعت میں بدمزگی سی تھی۔ بیٹے نے نادانستگی میں اس کی دکھتی رگ پر انگلیاں رکھ دی تھیں۔ محرومی! محرومی!! اس کی محرومیاں ایسی تھیں، جن کا کسی کو پتا نہیں تھا۔ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے جام سے ایک گھونٹ لیا اور برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ شراب میں طولِ زندگی کی سی [illegible] آگئی تھی۔ اس نے جام پھینک دیا اور ہاتھ سے رقاصاؤں کو رقص موقوف کرنے کا اشارہ کیا۔ ایک لمحے میں گھنگروؤں کی آواز بجھ گئی۔ اندر سبھا پر سکوت طاری ہو گیا۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پھر اس سکوت میں گھنگروؤں کی چھن چھن ابھری۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی راج نرتکی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے؟ بہت بے کیف ہو؟" وہ مترنم آواز میں بولی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ "تم ہو۔ تم کب آئیں؟"

"میں یہاں سے کب گئی ہوں۔" راج نرتکی نے حیرت سے

کہا۔ "مجھے تو تم جانِ محفل کہتے ہو۔ میں تو اس محفل میں ہی رہتی ہوں۔ تم جب بھی آؤ' میں یہیں موجود ہوتی ہوں۔" راج زنگی کے لہجے میں اتراہٹ تھی۔

"ہوں۔ ہاں۔" وہ بے دھیانی سے بولا۔

"مگر ہوا کیا ہے؟ آج تم پہلے جیسے نہیں۔ اداس کیوں ہو؟"

"یونہی۔ اپنی محرومیوں کا خیال آگیا تھا۔" اس نے بے پروائی سے کہا پھر پُرخیال لہجے میں بولا۔ "تم کتنی جوان' ترو تازہ اور شاداب ہو اور میں۔۔"

"اس محفل میں کسی کی کوئی عمر نہیں۔" راج زنگی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہاں سب جوان ہیں۔ یہاں وقت کا گزر نہیں۔ ذرا آئینہ دیکھ لو۔"

آذر کو آئینہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی' صرف نظریں اٹھانا ہی کافی تھا۔ وہ تو آئینہ خانہ تھا مگر اپنا عکس دیکھتے ہی اسے جھٹکا سا لگا۔ آئینے میں تو اسے بڈھے آذر کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔۔ ۸۸ سالہ آذر کا۔ "تم جھوٹ بولتی ہو۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "میری عمر ۸۸ سال ہے۔ اور نظر بھی آرہی ہے۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے آج؟" زنگی بھی جھنجلا گئی۔ "تم پھر سے گیارہ سال کے بچے بن رہے ہو۔"

یہ گیارہ سال کے بچے کا حوالہ آذر کے لئے ایک اور تازیانہ تھا۔ کیا یہ دن ہی ایسا ہے کہ جو آئے گا' کچوکے دے گا۔ وہ اچانک ہی پھٹ پڑا۔ "چلی جاؤ یہاں سے۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ چلی جاؤ خدا کے لئے۔" اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

راج زنگی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کھڑے کھڑے غائب ہو گئی۔ محفل درہم برہم ہو گئی۔ آئینہ خانہ بھی اوجھل ہو گیا۔ اب وہ اپنے اسٹوڈیو میں تھا۔

آذر نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے ایزل پر ایک نامکمل تصویر لگی تھی۔ ادھر ادھر ایسے کینوس بکھرے ہوئے تھے' جن کی صرف فنشنگ باقی تھی۔ ایک طرف وہ کینوس رکھے تھے' جو مکمل ہو چکے تھے۔ وہ امریکا میں اپنی تصویروں کی نمائش کی تیاری کر رہا تھا۔

شیشے کے ٹاپ والی میز پر ایک جام رکھا تھا۔ اس نے جام اٹھا کر ایک گھونٹ لیا پھر اسٹوڈیو کا جائزہ لیا۔ اس کا منہ بن گیا۔ وہ محفل کہاں گئی۔ وہ آئینہ خانہ کیا ہوا۔ وہ اِندر سبھا۔ یہ کیا ہوا کہ تنہائی اپنی رنگینی اور جادو کھو بیٹھی بلکہ اذیت ناک ہو گئی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے تصور کو دعوت دی لیکن اس کے سامنے اِندر سبھا نہیں آئی۔ کوئی آئینہ خانہ نہیں آیا۔ کہیں کوئی زنگی نہیں تھی۔ اس کے سامنے ایک تاریک خلا تھا جس میں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟" وہ آنکھیں بند کیے کیے غرایا۔

اس لمحے تصور میں روشنی ہو گئی۔ اِندر سبھا تو نظر نہیں آئی لیکن پرانی یادوں کا ایک کمرا ابھر آیا۔

تھوڑی دیر تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ بات ہی اتنی پرانی تھی پھر اسے یاد آگیا کہ یہ اس کا پرانا کمرا ہے' جہاں اس کا لڑکپن گزرا تھا۔ یہ اس کے آبائی مکان کا کمرا تھا۔ اس مکان کو وہ بہت پہلے خیرباد کہہ آیا تھا۔ اب تک تو اس کی دیواروں۔ بلکہ بنیادوں کو بھی وقت نے چاٹ لیا ہو گا۔ مٹا ڈالا ہو گا۔

مگر اس وقت وہ اپنے کمرے میں تھا۔ وہ خود ہی تماشا تھا اور یہ خود ہی تماشائی۔ وہ اس کمرے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔ گیارہ سالہ آذر جمیل کو اور وہ بے حد روانی سے پنسل کی مدد سے ایک نسوانی جسم کو کاغذ پر اجاگر کر رہا تھا۔ اس جسم کے خطوط و قوسین کا تناسب قابل داد تھا۔ اس عمر میں کسی عام لڑکے سے ایسی فنکارانہ چابک دستی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

گیارہ سالہ آذر نے اپنی بنائی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس مسکراہٹ میں بڑی محبت تھی۔

وہ اسکیچ زہرہ کا تھا۔ زہرہ جو اس کی کزن تھی...... چھوٹی سی تھی کہ ماں باپ دونوں یکے بعد دیگرے اسے اکیلا چھوڑ گئے۔ اسے آذر کے والدین نے ہی پالا تھا۔ اور اتنی ہی محبت سے پالا تھا کہ ماں باپ کا حق ادا کر دیا تھا۔

اسی لمحے زہرہ کمرے میں چلی آئی۔ "ارے ننھے منے۔ تم یہاں اکیلے کیا کر رہے ہو؟"

آذر کو وہ دن تمام جزئیات سمیت یاد تھا۔ وہ کبھی اسے بھول نہیں سکا۔



آذر نے زہرہ کی آواز سنتے ہی اسکیچ کو پیٹھ کے پیچھے چھپا لیا۔ زہرہ کا تجسس سے برا حال ہو گیا۔ "ننھے منے۔ دکھاؤ نا۔ کیا چھپا رہے ہو؟"

آذر کو یہ "ننھے منے" ہمیشہ برا لگتا تھا۔ خاص طور پر زہرہ کے منہ سے لیکن اس نے کبھی تردید نہیں کی تھی۔ اتنی کم عمری میں بھی وہ عملی تردید کا قائل تھا۔

"دکھاؤ نا۔" زہرہ نے پھر کہا۔

آذر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ وہ یہ اسکیچ زہرہ کو دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ ابتدا میں تو آذر اس اسکیچ کو اس لئے بچانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ زہرہ کو دکھانا نہیں چاہتا تھا مگر چند لمحے بعد اس کا نظریہ تبدیل ہو گیا اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔ البتہ اس کے اندر سے کسی نے کہا کہ اسے اس اسکیچ کو زہرہ کے ہاتھوں میں جانے سے روکنے کی بھرپور کوشش کرنی ہے۔ وہ یہ کوشش کرے گا تو چھینا جھپٹی کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اس چھینا جھپٹی کی لذت سے وہ زیادہ سے زیادہ محظوظ ہو سکے گا۔

چھینا جھپٹی اتنا زور پکڑ گئی کہ زہرہ کو تن بدن کا ہوش ہی نہیں

"اچھا۔ یہ بتاؤ۔ میں یہ فرق دور کر کے اس تصویر جیسی بن سکتی ہوں؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ یہ کام مشکل تو ہے' ناممکن نہیں۔"

اس جواب نے زہرہ کی ہچکچاہٹ دور کر دی۔ حسین سے حسین ترین بننا ہر عورت کی سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے۔ وہ اس آرزو کی خاطر کیا نہیں کر سکتی۔ "اچھا چلو۔ مجھے وہ فرق بتاؤ۔"

آذر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ اپنے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "تو ٹھیک ہے۔ یہاں سیدھی کھڑی ہو جاؤ۔"

زہرہ اس کی ہدایت کے مطابق سنگار میز کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ آذر اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور اسے بغور دیکھنے لگا۔ وہ نظریں چرانے لگی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"ایسے دیکھنے ہی سے تو فرق نظر آتا ہے۔" آذر نے کہا۔ "تم آئینے میں دیکھتی رہو۔"

آذر نے اپنی انگلی سے اس کے چہرے کو بڑی نرمی سے سہلایا۔ وہ سمٹنے لگی۔ "کیا کرتے ہو...؟"

"کچھ نہیں۔ تمہارا چہرہ بالکل ٹھیک ہے۔ جو ہو تب بھی اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ ناک کو تھوڑا سا چھیلا نہیں جا سکتا۔ ہونٹوں کو تھوڑا سا خم نہیں دیا جا سکتا۔ رخساروں کی ہڈی کو تھوڑا سا اونچا نہیں کیا جا سکتا۔" وہ ہنسنے لگا۔

زہرہ جھنجلا گئی۔ "کیوں فضول بک رہے ہو۔ فرق بتاؤ نا۔"

"بتاتا ہوں۔" آذر نے کہا۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر زہرہ کا سرتاپا جائزہ لیا پھر اس نے پیچھے کھڑے ہو کر زہرہ کے دونوں پہلوؤں کو کمر کے مقام سے چھوا۔ "یہاں پیمائش میں ایک ایک انچ کی کمی ہو اور یہاں سے یہاں تک۔" اس کی انگلیاں اوپر نیچے حرکت میں آگئیں۔ "ایک خم ہو۔ کمان جیسا۔"

زہرہ نے کسمساتے ہوئے اس کے ہاتھ جھٹکے اور مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولی۔ "کمال کرتے ہو۔ لو۔ ایسے ایک انچ سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"لگتا ہے کہ فرق نہیں پڑ سکتا۔" آذر نے عالمانہ شان سے کہا۔ "لیکن فرق پڑے گا۔ دیکھو۔ اوپر نیچے سب کچھ ویسا ہی رہے گا' جیسا اب ہے مگر یہاں کے ایک انچ کے فرق سے یہاں سے وہاں تک۔" ہاتھوں کی تیز حرکت۔ "۔یہ سب کچھ بدل جائے گا۔" اب وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ "اور یہاں۔" وہ اسے سمجھاتا رہا۔ یا سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اس کی بات نہیں سن رہی ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور کچھ حیران' کچھ پریشان سا رہ گیا۔ زہرہ کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے سے اتر آئے تھے اور سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

آذر اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔ بات تو اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی مگر اسے یہ احساس ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی اس کی اپنی بھی یہی کیفیت ہو جاتی تھی۔ وہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جبلت نے اسے احساس دلا دیا کہ زہرہ کی بھی ویسی ہی کیفیت ہے۔

"کیا بات ہے اتنا تو تم چھینا جھپٹی میں بھی نہیں ہانپی تھیں؟" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

جواب میں زہرہ نے دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیل دیا۔ "ہاتھ ہٹاؤ اپنے۔ مجھے نہ چھونا۔"

"میرے ننھے منے ہاتھ تمہیں تکلیف تو نہیں پہنچا سکتے۔" اس نے صفائی پیش کی۔ "تم تو مجھے ننھا منا کہتی ہو۔"

"تم ننھے منے نہیں ہو۔" زہرہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "...... ہو بھی اور... اور ہرگز نہیں ہو۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ ہوں بھی اور ہرگز نہیں ہوں۔" آذر کے لہجے میں الجھن تھی۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ماحول کا سارا کھنچاؤ ایک پل میں دور ہو گیا۔ "تم نہیں سمجھو گے' چھوٹے سے مرد ہو نا۔"

"خیر چھوڑو۔ میں تمہیں فرق سمجھا رہا تھا۔" آذر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

"مجھے کوئی فرق نہیں سمجھنا۔ تم اپنے ہاتھ دور رکھو۔" زہرہ نے سخت لہجے میں کہا۔

آذر حیران سا اسے دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحے آئینے میں اپنا سراپا دیکھتی رہی پھر دروازے کی طرف چل دی۔

"ناراض ہو کر جا رہی ہو؟" آذر نے اسے پکارا۔

"نہیں تو۔ میں ننھے منے سے ناراض کیسے ہو سکتی ہوں۔" زہرہ نے پلٹ کر کہا۔

"اچھا۔ میرا اسکیچ تو دیتی جاؤ۔"

زہرہ نے اپنے ہاتھ میں موجود اسکیچ کو دیکھا اور اٹھلا کر بولی۔ "یہ تو میں نہیں دوں گی۔ اس کی مدد سے میں فرق کو سمجھوں گی۔"

"ٹھیک ہے میں دوسرا بنا لوں گا مگر دیکھنا' کیسا خراب بناتا ہوں۔ اب ویسی تصویر بناؤں گا جیسی تم ہو۔"

زہرہ نے جواب میں اسے منہ چڑایا اور کمرے سے نکل گئی۔ آذر دیر تک اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ 'میرے ان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں ایسی کیا بات ہے' وہ سوچ رہا تھا۔

○☆○

آذر چونکا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ مخروطی آرٹسٹک انگلیاں' جنہیں بڑھاپا چھو نہیں سکا تھا۔ اس نے چونک کر اسٹوڈیو کا جائزہ لیا۔ سائڈ ٹیبل پر اس کا جام رکھا تھا۔ اس میں دو گھونٹ ابھی باقی تھے۔ اس نے ایک ہی سانس میں جام خالی کر دیا اور سوچنے لگا۔

اس بار وہ اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔

چند دہائیوں پہلے فنِ مصوری کے ایک ناقد نے اس کے بارے

میں لکھا تھا۔ ”آذر جمیل پیدائشی مصور ہے۔ حسنِ تناسب کا جو شعور اسے قدرتی طور پر ودیعت ہوا ہے‘ وہ اسے اس کے ... ہم عصروں میں ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے جینئس ہونے میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ ابتدا ہی سے غیر معمولی بچہ رہا ہو گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ اس کا بچپن بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں گزرا ہے۔ وہ لوگوں کو حیران کر دیتا ہو گا۔ کاش میں اسے اس کے بچپن میں دیکھ پاتا۔“

یہ یاد کرتے ہوئے آذر مسکرا دیا۔ اس ناقد کو اندازہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس نے کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے۔

ابھی چند لمحے پہلے آذر نے اپنے لڑکپن کی ایک یاد تازہ کی تھی۔ جیسے کوئی فلم دیکھی ہو۔ ذات کے نہاں خانے میں سب کچھ چھپا ہوا تھا۔ لیکن تازہ تھا۔ وہ اپنا اور دوسروں کا کہا ہوا ایک ایک لفظ سن سکتا تھا۔ اور چند لمحے پہلے اس نے سنا بھی تھا۔ اب وہ اسی حوالے سے سوچ رہا تھا۔

وہ خود بھی حیران ہوتا تھا کہ کتنی کم عمری میں وہ کتنی بڑی بڑی باتیں کرتا تھا۔ کیسے کیسے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ کتنا وسیع تھا اور لہجے میں کیسی پختگی اور اعتماد تھا۔ آج کل یہ اتنی غیر معمولی بات نہیں۔ بچے بہت ذہین ہو رہے ہیں۔ ورثے میں ملی ہوئی اس دور کی آگہی انہیں قبل از وقت بڑا بنا دیتی ہے مگر جو کچھ اس نے چند لمحے پہلے دہرایا‘ وہ ۱۹۱۹ء کی بات تھی۔ اس عہد میں جب کہ تعلیم عام نہیں تھی۔ اس کے وہ نکالے خود اس کے لئے بھی غیر معمولی اور ناقابلِ یقین تھے مگر یہ بھی تھا کہ وہ تعلیم یافتہ اور بے حد دولت مند باپ کا بیٹا تھا۔

اور پھر پہلی نظر کی وہ محبت جو اسے کم عمری میں ہوئی اور سترہ سال کی بھرپور لڑکی سے ہوئی۔ اس وقت تو بس وہ یہ جانتا تھا کہ زہرہ اسے اچھی لگتی ہے۔ اسے چھونے کو دل چاہتا ہے بلکہ کبھی کبھی اسے کھلونے کی طرح توڑ دینے کی خواہش ہوتی ہے لیکن بعد میں اس کی سمجھ میں پوری طرح آگیا تھا کہ اس محبت کی اساس جسم تھا۔ وہ خالص جسمانی محبت تھی اور وہ جسم سے نظریں چرا کر بھی محبت کر بھی نہیں سکا۔

اور اس محبت نے کتنی کم عمری میں اس کی دنیا بدل کر رکھ دی ۔ اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے۔ اگر اس کی زندگی میں زہرہ نہ ہوتی تو شاید وہ ایک بالکل مختلف آدمی ہوتا۔ مصور تو وہ پیدائشی تھا۔ اسے مصوری بننا تھا لیکن وہ مختلف انسان ہوتا۔ اس کی زندگی میں اتنے خلا نہ ہوتے۔ اس سے باپ کی محبت اور شفقت نہ چھنی ہوتی اور شاید وہ اتنا بڑا مصور بھی نہ ہوتا۔ زہرہ نے ۔ ہاں‘ ایک عام سی خوش بدن لڑکی نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔ جیسے وہ اس کے لئے تقدیر تھی جس کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔

آذر نے اپنے لئے جام بھرا۔ اس میں سے ایک گھونٹ لیا اور یادوں کی کتاب کھول لی۔

○☆○

آذر کو زہرہ سے اور زہرہ کو آذر سے ابتدا ہی سے خاص انسیت تھی۔ امی بتاتی تھیں کہ بچپن میں جب بھی وہ ضد کرتا اور مچلتا تو صرف اور صرف زہرہ کے قابو میں آتا تھا۔ زہرہ کے پاس جانے کیسا جادو تھا کہ وہ اس کی گود میں جاتے ہی چپ ہو جاتا۔۔۔ بلکہ ہنسنے کھیلنے لگتا۔ چار پانچ سال کی عمر کی باتیں تو اسے خود بھی یاد تھیں۔ وہ صرف اور صرف زہرہ کے ساتھ کھیل کر خوش ہوتا تھا۔ اس کی آغوش اسے سب سے زیادہ پسند تھی اور اس سے پہلے ہی سے وہ زہرہ کے ساتھ سونے لگا تھا۔

وہ زہرہ سے لپٹ کر سوتا تھا۔ پوری معصومیت کے ساتھ‘ ننھے بچوں کی طرح۔ ڈرائنگ تو اس نے چار سال کی عمر سے ہی شروع کر دی تھی۔ تناسب کا شعور اسے ابتدا ہی سے تھا۔ اگلے چند برسوں میں یہ ہوا کہ اس نے شعوری طور پر ہر چیز پر غور کرنا شروع کر دیا کہ اس میں کہاں اور کس حد تک تناسب کی کمی ہے۔ اس کے اندر چھپے ہوئے پیدائشی مصور کی تربیت شروع ہو گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے اندر ایک شعلہ ہے جو اظہار چاہتا ہے لیکن اسے عجیب سی بے چینی رہنے لگی تھی پھر وہ بے چینی جستجو کا روپ دھار گئی اور کیونکہ وہ زہرہ سے لپٹ کر سوتا تھا اس لئے زہرہ غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر اس جستجو کی منزل بن گئی۔

یہ اس وقت ہوا جب وہ نو سال کا تھا۔ وہ سردی کی ایک رات تھی اور وہ لحاف میں زہرہ سے لپٹ کر سویا ہوا تھا۔ اسے اب بھی یاد تھا کہ اس رات اس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ خواب میں اس نے بہت ساری تتلیاں دیکھیں اور وہ ان تتلیوں کو پکڑنے کے لئے دیوانہ وار دوڑ رہا تھا مگر تتلیاں اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھیں اور اس پر وحشت طاری ہو رہی تھی۔

بچے تتلیوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ وہ بھی دوڑتا تھا بلکہ تتلیاں اسے زیادہ ہی اچھی لگتی تھیں۔ ان کے پیچھے دوڑتے ہوئے حقیقی زندگی میں اسے سرشاری کا‘ لطف و انبساط کا احساس ہوتا تھا مگر خواب میں وہ جنون تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تتلیاں تناسب سے محروم تھیں اور اسے بہت خوفناک لگ رہی تھیں۔ کچھ تتلیوں کے دونوں پر چھوٹے بڑے تھے کچھ کا سر اور وجود پروں کے مقابلے میں بہت بڑا تھا اور کچھ کے پر ان کے وجود اور سر کے مقابلے میں بہت بڑے تھے۔ ان سب میں بس ایک قدرِ مشترک تھی ۔ وہ بہت بدصورت‘ بدنما اور بھیانک لگ رہی تھیں۔

وہ ہانپتا‘ دوڑتا انہیں پکڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس پر خوف بھی طاری تھا۔ بالآخر ایک تتلی اس کے ہاتھ آگئی لیکن جیسے ہی اس نے تتلی کو پکڑا‘ تتلی نے اپنا منہ پلٹا کر اس کی انگلی میں کاٹ لیا۔

دہشت سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے حلق

سے خوف ناک چیخ نکلی۔ وہ جاگا لیکن اپنے حواس میں نہیں تھا۔ اسے ہوش اس وقت آیا' جب زہرہ نے جھنجوڑ ڈالا۔ "کیا ہوا ننھے منے۔ کیا ہوا؟" وہ کہے جا رہی تھی۔

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا مگر سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔

پھر اسے احساس ہوا کہ وہ خواب گاہ میں ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ ٹٹولنے والے انداز میں زہرہ کے پہلوؤں پر نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے حرکت کر رہے تھے۔ چند لمحے وہ بول بھی نہیں سکا۔ زہرہ بدستور پوچھے جا رہی تھی۔ "کیا ہوا ننھے منے۔ کیا بات ہے؟"

"آپا۔ آپا۔" بالآخر اس کی آواز نکلی۔

"کوئی خواب دیکھا ہے۔ ڈراونا خواب؟" زہرہ نے پوچھا۔

"ہاں آپا۔"

زہرہ نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ "کیا دیکھا تھا ننھے منے؟"

"تتلیاں دیکھی تھیں آپا۔"

"پگلے کہیں کے۔ تتلیاں دیکھ کر تو خوشی ہوتی ہے۔ ڈر تھوڑا ہی لگتا ہے۔" زہرہ نے اسے سینے سے بھینچے بھینچے کہا۔

"وہ بہت خوفناک تتلیاں تھیں آپا۔"

زہرہ نے اسے ذرا سا پیچھے ہٹا کر اس کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا۔ "تتلیاں خوبصورت ہوتی ہیں' خوفناک نہیں۔"

"مگر وہ خوفناک تھیں۔" اس نے کہا اور تفصیل سے بتانے لگا۔

زہرہ اس کی بات توجہ سے سنتی رہی پھر بولی۔ "وہ تو خواب تھا۔ ورنہ تتلیاں تو پریاں ہوتی ہیں۔ تتلیوں کے بھیس میں۔ خیر بھول جاؤ اس خواب کو۔ لیٹو اور مجھ سے لپٹ کر سو جاؤ۔"

وہ لیٹ بھی گیا اور زہرہ سے لپٹ بھی گیا مگر دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ زہرہ لیٹتے ہی سو گئی مگر اس کے تصور میں تناسب سے محروم وہ خوفناک تتلیاں تھرکتی رہیں۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ زہرہ کے پہلو پر حرکت کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی بہت غیر محسوس طور پر وہ پُرسکون ہوتا گیا۔ تتلیوں کا خواب بتدریج اس کے ذہن سے محو ہوتا گیا۔

اس وقت تو وہ کچھ نہیں سمجھ سکا لیکن برسوں بعد اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ سب کیا تھا اور کیوں ہوا تھا۔ اس رات زہرہ کو چھوتے رہنے سے اس کا خوف کیوں دور ہوا تھا۔ اسے سکون کیوں ملا تھا۔ خواب ڈراونا اس لئے تھا کہ اس میں خوبصورتی تناسب کھو بیٹھنے کے بعد خوف ناک بد صورتی میں تبدیل ہو گئی تھی لیکن زہرہ کے حسنِ تناسب نے اس کے خوف کو زائل کر کے اسے پُرسکون کر دیا تھا۔

مگر اس رات پُرسکون ہو جانے کے بعد ایک دور رس اور انقلابی تبدیلی بھی اس کے اندر رونما ہوئی۔ پُرسکون ہو جانے کے بعد زہرہ کے جسم پر اپنے ہاتھوں کی حرکت سے اسے لذت کا احساس ہونے لگا اور وہ بڑی انوکھی لذت تھی۔ اس کے لئے بالکل نئی۔ لذت کا وہ احساس لئے وہ نجانے کب سو گیا۔

اس کے بعد تو یہ معمول بن گیا۔ وہ اس کے لئے عرصۂ تربیت تھا۔ اس کے مصور ہاتھ جسمانی خطوط اور پیچ و خم کی آگہی حاصل کر رہے تھے۔ حسنِ تناسب کا سبق یاد کر رہے تھے۔

اس عرصے میں اس کی سمجھ میں اور بھی بہت سی باتیں آئیں۔ وہ لمس اور جذبوں میں فرق کرنا سیکھ گیا۔ لذت ماں کی آغوش میں بھی تھی اور زہرہ کی آغوش میں بھی تھی لیکن دونوں میں فرق تھا۔ ماں کی آغوش میں ٹھنڈک اور ایک طرح کی مٹھاس تھی جب کہ زہرہ کی آغوش میں گرمی' گداز اور عجیب سا کھٹا میٹھا ذائقہ تھا۔ ماں کو چھونے سے اپنے اندر روشنی کا احساس ہوتا تھا جب کہ زہرہ کو چھونے سے اپنے اندر اندھیرے سرسراتے محسوس ہوتے اور وجود کی عمارت میں تاریک گوشوں کی موہوم سی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ ماں کو چھو کر سکون ملتا تھا مگر زہرہ کو چھو کر لگتا تھا کہ جسم میں کوئی آگ سی بھڑک اٹھی ہے۔ وحشت سی سر اٹھانے لگتی تھی۔ لگتا تھا' کوئی خواہش مچل رہی ہے۔ وہ خواہش کیا ہے' یہ وہ نہیں سمجھ پاتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اس نے جان لیا کہ ماں کو وہ کسی بھی وقت' کسی بھی طرح پوری بے تکلفی سے چھو سکتا ہے۔ زہرہ کو وہ اس بے تکلفی سے نہیں چھو سکتا اور اس کی جبلت نے بتا دیا تھا کہ زہرہ کو کسی بھی طرح چھونا اس کے لئے معیوب ہے۔ ہاں چھپ کر ایسا کیا جا سکتا ہے مگر اس وقت یہ محض ایک موہوم سا احساس تھا۔ بعد میں زہرہ کے طرزِ عمل نے اس کی تصدیق کر دی۔ کچھ بھی ہو' اس کے وجود میں موجود آگہی کا بیج نمو پا کر پھوٹ نکلا تھا اور ممنوعات کے ننھے سے پودے نے سر ابھار لیا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی بچہ تھا' مستقبل کا ایک بے حد بڑا مصور۔

زہرہ کی نیند بہت پکی تھی۔ وہ بے خبر سوتی تھی اس لئے کچھ عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا مگر پھر تنویر کی وحشت اور تجسس نے مل کر اسے اکسایا اور وہ براہِ راست اور بے حجاب لمس کے لئے مچل گیا۔

مگر پہلے ہی موقع پر زہرہ کی آنکھ کھل گئی۔ شروع میں تو اسے صرف کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔ نیند میں ڈوبا ذہن کچھ سمجھ نہیں سکا لیکن بالآخر اسے تنویر کے بے حجاب ہاتھ کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ اس نے تنویر کو کئی بار پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ تنویر کو جبلت نے بتا دیا کہ اس کے لئے سوتا بنے رہنے ہی میں عافیت ہے۔ زہرہ اسے پسند نہیں کرے گی۔

یوں نو سال کی عمر میں اسے علیحدہ کر دیا گیا۔ وہ الگ سونے لگا۔ یہ بات اسے اچھی نہیں لگی لیکن دل میں چور تھا اور یہ خوف تھا کہ زہرہ اباجان کو اس حرکت کے متعلق بتا نہ دے اس لئے اس

نے احتجاج نہیں کیا۔ ابا جان سے وہ ڈرتا بہت تھا۔ شاید اس لئے کہ ان سے واسطہ کم ہی پڑتا تھا حالانکہ وہ بہت شفیق باپ تھے۔

مگر وہ دوری اسے تکلیف دہ لگی۔ وہ کمی بہت بڑی تھی۔ وہ دن بھر زہرہ سے قریب رہنے کے بہانے تلاش کرتا۔ مختلف حیلوں سے اسے چھوتا لیکن تسلی نہ ہوتی۔ اس عرصے میں اس پر منکشف ہوا کہ اسے زہرہ سے محبت ہو گئی ہے۔ اس وقت محبت کا بس یہ مطلب اس کی سمجھ میں آیا کہ آدمی کسی کی ضرورت محسوس کرے اور اس کے لئے تڑپے تو اسے محبت کہتے ہیں۔

اس جدائی اور محرومی میں اس کے اندر کا مصور یک لخت بڑا ہو گیا۔ ایک رات اسے نیند نہیں آرہی تھی اور وہ یونہی کاغذ پنسل لئے بیٹھا تھا۔ اچانک اس کا ہاتھ پنسل کو لے کر جسمانی خطوط اور پیچ و خم کے اس راستے پر چل پڑا جو اسے ازبر ہو چکا تھا۔ یہ تو اسے بعد میں پتا چلا کہ اس نے زہرہ کا اسکیچ بنا دیا تھا۔

اس کے بعد تو یہ اس کی محروم راتوں کا مشغلہ بن گیا پھر اسے زہرہ کے اسکیچ دیکھتے ہوئے تشنگی اور کمی کی۔۔۔ یا یوں کہئے کہ زیادتی کا احساس ہونے لگا۔ وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا فطری حسن تناسب اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں گیارہ سال کی عمر میں اس نے زہرہ کو IMPROVE کرتے ہوئے وہ اسکیچ بنایا جسے دیکھ کر زہرہ کو احساس ہوا کہ وہ خوبصورت تو ہے ہی لیکن حسین ترین بھی بن سکتی ہے۔

مگر اس دوران اس نے تنہائی میں زہرہ کو تم کہہ کر مخاطب کرنا اور زہرہ اور آپا میں بے تکلفی کی حد تک فاصلہ پیدا کرنا سیکھ لیا تھا۔ زہرہ اس بات سے چڑتی بھی تھی لیکن محبت سے مجبور تھی۔ آخر اس نے آذر کو گود میں کھلایا تھا۔

OOO

آذر نے جام اٹھا کر دو اور گھونٹ لئے۔ کیسا دن ہے! اس نے سوچا۔ آج تو نئے خوش رنگ میں تلخی کے سوا کچھ نہیں۔ ہر گھونٹ اندر کی تلخی کو اور بڑھا رہا ہے اور پھر اس ماضی کو دہرانا کتنا تکلیف دہ ہے۔ اس سے تو وہ ہمیشہ بچتا تھا۔ اس کی تنہائی۔۔۔ راجا اندر کی سبھا تو بہت رنگین تھی۔ تنہائی کا تو وہ ہمیشہ منتظر اور خواہاں رہا تھا۔

اس نے اس امید پر آنکھیں موندیں کہ اس کے سامنے اس کی رنگین محفل آجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید اس لئے کہ اس نے راج ترنگی کو دھتکار دیا تھا۔ اس کی پاداش میں وہ ماضی کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ جو ماضی کو حال سے ہم آہنگ کرکے رنگینیوں سے آراستہ کرنے کا عادی تھا۔

اس نے جان لیا کہ آج اسے ماضی کا سفر کرنا ہے۔ اپنی محرومیوں کی یاد تازہ کرنی ہے۔ سو اس نے سپر ڈال دی۔

OOO

آذر نے زہرہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی ایک اور تصویر بنا لے گا۔۔۔ اور بہت خراب بنائے گا۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا لیکن اسے اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ اس تصویر نے اس کی زندگی کو بدل ڈالا۔۔۔ یہ الگ بات کہ زہرہ کو اس تصویر کا کبھی پتا نہیں چلا۔۔۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا۔

اس بار وہ پنسل اسکیچ تک محدود نہیں رہا۔ اس نے بڑی مہارت سے زہرہ کی تصویر کو رنگوں کا لباس پہنایا۔۔۔ یہ الگ بات کہ تصویر بے لباس تھی۔ اس وقت اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ مصوری کی دنیا میں NUDE تصویروں کا وجود ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

زہرہ کی اس تصویر پر اس نے کئی ماہ کام کیا لیکن اس طرح کہ کسی کو پتا نہیں چلا۔ زہرہ کو بھی نہیں۔ زہرہ کو اس نے کس طرح دیکھا کب دیکھا۔۔۔ یہ صرف وہی جانتا تھا۔

اس روز زہرہ کی طبیعت خراب تھی۔ بخار تھا، جس کی وجہ سے اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ سر میں بھی درد تھا۔ سردی کا احساس بھی تھا اسی لئے اس نے سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھ رکھا تھا۔

زہرہ کے کمرے کے برابر ہی آذر کا کمرا تھا۔ آذر دروازہ بند کئے زہرہ کی تصویر پر کام کر رہا تھا۔ وہ اس تصویر کو ہر لحاظ سے بے داغ اور مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اچانک اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے تصویر کو اپنی کتاب میں رکھا اور زہرہ کے کمرے میں چلا آیا۔

زہرہ کو لحاف اوڑھ کر لیٹے دیکھ کر اسے تشویش ہوئی مگر اس نے شرارت بھرے انداز میں لحاف الٹ دیا۔

"کیا کرتے ہو چھوٹے سے مرد؟" زہرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں احتجاج کیا۔ لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"ہوا کیا ہے زہرہ۔۔۔ آپا؟" آذر نے پوچھا۔

"سردی لگ رہی ہے۔ بخار ہے مجھے۔ سر میں اور پورے بدن میں شدید درد ہے۔" زہرہ نے جواب دیا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

آذر نے جلدی سے اسے لحاف اڑھا دیا پھر بچوں کے سے لہجے میں التجا کی۔ "چہرہ تو باہر نکال لو زہرہ۔۔۔ آپا۔"

زہرہ نے چہرہ لحاف سے باہر نکال لیا۔ اس عالم میں بھی وہ مسکراہٹ نہ روک سکی۔ "کیوں چھوٹے سے مرد؟"

"عجیب سا لگتا ہے۔ چہرہ تو سامنے رہنا چاہئے۔"

زہرہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ آذر اسے بہت غور سے دیکھتا رہا۔ اس لئے زہرہ کو تکلیف میں دیکھ کر اسے اس پر عجیب طرح سے پیار آیا۔ اسے ایسا لگا، جیسے وہ ایک جوان مرد ہے اور زہرہ چھوٹی سی بچی۔ اس لئے وہ اس تصویر کو بھی بھول گیا جو عرصے سے اس کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کا خیال کبھی محو نہیں ہوتا تھا۔

اچانک زہرہ کراہنے لگی۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

"بہت درد ہو رہا ہے آپا؟" اس بار آذر فکر کے مارے اسے زہرہ کہنا بھی بھول گیا۔



زہرہ نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اسے یوں دیکھا جیسے اب تک اس کی موجودگی سے بے خبر رہی ہو پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

آذر نے جھک کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور بوکھلا گیا۔ وہ تو آگ ہو رہی تھی۔ "تمہیں تو بہت تیز بخار ہے آپا۔"

زہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں امی کو بلا کر لاتا ہوں۔"

"تائی اماں کو معلوم ہے۔ انہوں نے مجھے دوا بھی دی ہے۔" زہرہ نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم پریشان نہ ہو چھوٹے میرے۔ بس درد کم ہو جائے تو میں بالکل بھلی چنگی ہو جاؤں گی۔"

"آپا۔ ذرا اس طرف کھسکو۔"

"کیوں؟"

"کھسکو تو۔"

زہرہ تخت پر دوسری طرف لیٹی اور آذر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"میں تمہارا سر دباتا ہوں آپا۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ زہرہ کا سر دبانے لگا۔ زہرہ نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ شاید اس میں سکت بھی نہیں تھی۔ آذر بھی بہت خلوص سے اس کا سر دباتا رہا۔ اس وقت وہ اس کے لئے بس محبت کرنے والی آپا تھی۔ اسے بس یہ خیال تھا کہ اس کی آپا تکلیف میں ہے۔ وہ آپا جس نے ہمیشہ اس کے آرام کا خیال رکھا تھا۔

زہرہ وقفے وقفے سے کراہ بھی رہی تھی۔ ایک بار جو وہ کراہی تو آذر نے پوچھا۔ "کیا بات ہے آپا؟"

"پورا جسم دکھ رہا ہے' بہت درد ہے۔" زہرہ نے کراہتے ہوئے کہا۔

آذر کا ایک ہاتھ پیشانی پر رکا اور دوسرا لحاف کے اندر چلا گیا۔ وہ پورے خلوص سے اس کا درد اپنے ہاتھوں سے کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زہرہ نے اس بار بھی کوئی تعرض نہیں کیا۔ درحقیقت اسے بہت آرام مل رہا تھا۔

لیکن چند منٹ بعد صورتِ حال بدل گئی۔ آذر کے ہاتھوں کو نہ محبت کرنے والی آپا یاد رہی نہ اس کی تکلیف لیکن یہ سلسلہ چلنے والا نہیں تھا۔ زہرہ کا ردِ عمل نہایت تند تھا۔ اس نے لحاف الٹا اور آذر کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا۔ لگتا تھا' اسے سردی' بخار اور درد کا احساس نہیں رہا ہے۔

آذر شرمندہ تھا۔ زہرہ سے بھی اور خود سے بھی۔ وہ نظریں نیچی کیے بیٹھا رہا۔

"ہٹ جاؤ میرے پاس سے" زہرہ نے تند لہجے میں کہا اور دونوں ہاتھوں سے اسے دھکیل دیا۔ "تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔" زہرہ دہاڑی۔ "میں تمہیں چھوٹا سمجھ کر طرح دیے جاتی ہوں لیکن آج تم حد سے گزر گئے۔"

آذر اس کے دھکیلنے سے تخت سے گر گیا تھا۔ کچھ تکلیف کا

کتا کہانیاں

"تمہارا کتا ذہین ہے؟"

"بہت۔ جب میں اس سے کہتا ہوں' بھئی تمہارا دل چاہے تو میرے پاس آ جاؤ۔ دل نہ چاہے تو مت آؤ' تو وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے تو آ جاتا ہے۔ دل نہیں چاہتا تو نہیں آتا۔"

○☆○

"کل میں نے اپنے کتے کو ڈکشنری چباتے ہوئے پکڑ لیا۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

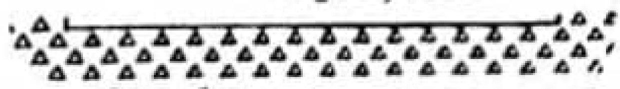
"بس۔ یوں سمجھو میں نے الفاظ اس کے منہ سے چھین لئے۔"

○☆○

"عرفان میاں برسوں تک اپنے کتے کے ساتھ اسکول جاتے رہے لیکن ایک وقت آیا کہ آخر انہیں جدا ہونا پڑا۔"

"کیوں؟"

"کتے نے میٹرک کر لیا تھا۔"



اور کچھ توہین کا احساس۔ اس پر مستزاد شرمندگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے بسی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

زہرہ ان آنسوؤں کو دیکھ کر نرم پڑ گئی۔ "چھوٹے بھائی۔ کیوں خود کو اور مجھے تکلیف پہنچاتے ہو۔ کیا شیطان گھس گیا ہے تم میں؟" اس کی آواز دھیمی اور لہجہ نرم ہو گیا۔

یہ دیکھ کر آذر کو حوصلہ ہوا۔ "زہرہ۔" اس نے کہنا چاہا۔ زہرہ کے تیور دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اس نے خاصے فاصلے پر آپا کا اضافہ کیا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"بس خاموش ہو جاؤ۔" زہرہ کی آواز تو دھیمی رہی لیکن لہجہ سخت ہو گیا۔ "تم نے مجھے میری نظروں میں ہی گرا دیا۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے تمہیں غلط ڈھیل دی۔ صرف اسی لئے کہ تم سے محبت ہے مجھے' لیکن تم تو محبت جانتے ہی نہیں۔ میرا کوئی سگا چھوٹا بھائی ہوتا تو میں اس سے بھی اتنی محبت نہیں کر سکتی تھی اسی لئے میں تم سے لاڈ کرتی رہی اور اس میں تمہیں تباہ کر دیا۔"

"زہرہ۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے گھگیائے

ہوئے لہجے میں کہا۔
"آج کے بعد تم نے مجھے تم کہا یا بچوں کی طرح بے تکلفی سے میرا نام لیا تو میں عمو جان سے شکایت کردوں گی۔" زہرہ نے تنبیہہ کی۔

یہ دھمکی سن کر آذر کے ہوش اڑ گئے۔

"اور رہی محبت تو تم کیا جانو کیا سمجھ کر محبت کیا ہے۔" زہرہ اپنی کہے جا رہی تھی۔ "تم تو بس وقت سے پہلے بڑے ہو گئے ہو اور تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ کیا سمجھتے ہو مجھے؟ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا اور وہ مجھے یوں چھوتا تو خدا کی قسم' ہاتھ کاٹ کر پھینک دیتی اس کا۔ خون پی جاتی۔ تم مجھے ذلیل کرتے ہو میری اپنی نظر میں۔"

"لیکن آپا' میں آپ سے محبت کر سکتا ہوں۔ مجھے آپ سے اچھا کبھی کوئی نہیں لگے گا۔ میں آپ سے۔"

زہرہ نے اس کی بات کاٹ دی لیکن اب اس کا لہجہ بہت نرم تھا۔ "آخر ہو تو چھوٹے ہی۔ وہی راگ الاپے جا رہے ہو۔ دیکھو۔ میں کوئی بھی ہوں' سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے عمر میں بہت بڑی ہوں۔"

اس موقع پر آذر کو کوئی دور کی سی آواز سنائی دی۔ کوئی اسے پکار رہا تھا۔ شاید اس کے کمرے کے سامنے لیکن اس نے اس پکار پر کوئی توجہ نہیں دی۔ گفتگو اس نہج پر تھی کہ وہ زہرہ کے لئے ہمہ تن سماعت بن گیا تھا۔ وہ کچھ اور سن ہی نہیں سکتا تھا۔

زہرہ کی بات جاری تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم پیدا ہوئے تو میں ہوش مند لڑکی تھی۔ تم میرے لئے وہ نومولود بھائی تھے' جو مجھے کبھی نہیں مل سکا تھا۔ میں نے تمہیں گودوں میں کھلایا ہے۔ تمہارا گو موت کیا ہے میں نے۔ اس لئے تم میری نظر میں چھوٹے ہو اور ہمیشہ چھوٹے ہی رہو گے۔ اب تو یہ کو میرے سامنے۔"

آذر کو وہ پکار اب بھی سنائی دے رہی تھی لیکن اب آواز دھیمی تھی۔ اس نے ذرا دھیان دیا تو اسے احساس ہوا کہ پکارنے والا اب اس کے کمرے میں ہے پھر وہ آواز بھی پہچان گیا۔ وہ ابا جان تھے۔ اس پر خوف طاری ہو گیا۔

وہ لپک کر کمرے سے نکلا۔ اسی لمحے ابا جان اس کے کمرے سے نکلے۔ وہ اس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس نے کہا۔

"جی ابا جان۔"

لیکن ابا جان چہرے پر چٹان کی سی سختی لیے اس کی طرف دیکھے بغیر گزر گئے۔ وہ چند لمحے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور الجھتا رہا۔

ابا جان ناراض کیوں لگ رہے ہیں۔ اسے خیال آیا کہ شاید وہ دیر سے اسے پکار رہے تھے۔ اس نے ان کی پکار یاد کی تو خیال آیا کہ اس وقت ان کی آواز اور لہجے میں غصہ نہیں تھا تو پھر اب کیا ہو گیا؟ اس کا دل خوف اور اندیشوں سے بھر گیا۔ اسے معلوم کچھ بھی نہیں تھا لیکن یہ یقین تھا کہ کوئی بہت بری بات ہوئی ہے۔

اس پریشانی میں اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ زہرہ کے کمرے کے بجائے اپنے کمرے میں آ گیا ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا ویسا ہی تھا' جیسا وہ چھوڑ کر نکلا تھا۔ اب وہ زہرہ کے اور اس کی گفتگو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

یہ کہتے ہوئے زہرہ کے لہجے میں قطعیت تھی کہ وہ ہمیشہ اسے چھوٹا سمجھے گی۔ وہ جھنجلانے لگا۔ چھوٹا تو وہ اب بھی نہیں ہے۔ چھوٹے بچے ایسی تصویریں نہیں بناتے جیسی وہ بنا رہا ہے۔

تصویر کا خیال آتے ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور تصور میں ابا جان کا ناراض چہرا لہرا گیا۔ ساتھ ہی اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اس کتاب کو اٹھایا' جس میں وہ زہرہ کی تصویر رکھ گیا تھا۔

تصویر کتاب کے نیچے میز پر رکھی تھی!

اس نے سکون کی سانس لی مگر وہ لمحہ بھر کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ تصویر اس نے میز پر' کتاب کے نیچے نہیں' کتاب میں رکھی تھی اور اب تصویر کتاب میں نہیں۔ کتاب کے نیچے ملی تھی۔

اس کا مطلب ہے کہ تصویر ابا جان نے دیکھ لی ہے!

یہ خیال ہی اس کے لئے لرزا دینے والا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ محض خیال نہیں' حقیقت ہے۔ ابا جان جس غصے میں گئے تھے' وہ ظاہر کرتا تھا کہ انہوں نے تصویر دیکھ لی ہے ورنہ پہلے تو وہ اسے نرمی سے پکار رہے تھے۔

اب وہ ابا جان سے کیسے نظریں ملائے گا۔ وہ تو ان کا سامنا بھی نہیں کر سکے گا۔ وہ سوچتا رہا اور ہولتا رہا۔ عشق کا بھوت اس کے سر سے ایسا اترا کہ اسے زہرہ کا خیال بھی کئی دن تک نہیں آیا۔

ایک ہفتہ ایسا گزرا' جیسے سزائے موت پانے والا مجرم اپنے وقت کا انتظار کرتا ہے۔ اس ایک ہفتے میں ابا جان کا کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا۔ بات تو وہ ویسے بھی کم ہی کرتے تھے لیکن اس دوران جب بھی سامنا ہوا' ابا جان نے منہ پھیر لیا۔ ان سے بات کرنے کی اسے ہمت بھی نہیں ہوئی۔

دسویں دن امی نے اسے بلایا۔ ان کے چہرے پر بڑی گمبھیرتا تھی۔ "بیٹے۔ میں نے تمہیں یہ کہنے کے لئے بلایا ہے کہ ولایت جانے کی تیاری کر لو۔"

آذر کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے سنبھلنے میں چند منٹ لگے۔ "یہ اچانک۔"

"اچانک نہیں۔ تمہارے ابا جان مہینوں۔ اور بعض اوقات برسوں سوچتے ہیں۔ ہاں اعلان اچانک کرتے ہیں۔"

آذر نے احتجاج سے پہلے اپنا حوصلہ مجتمع کیا "لیکن امی' میں یہیں پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں انگلینڈ نہیں جانا چاہتا" بالآخر اس نے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ تم چاہو یا نہ چاہو' تمہیں کرنا یہی ہے۔" امی نے اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو زیادتی ہے امی۔"

"غلط سمجھ رہے ہو۔ تمہارے ابا جان نے تمہاری بہتری کی خاطر فیصلہ کیا ہو گا۔ تم تو ابھی اپنا برا بھلا نہیں سمجھ سکتے۔"

"میں اتنا نا سمجھ نہیں ہوں جتنا آپ اور ابا جان سمجھتے ہیں۔"

"بہرحال بیٹے' یہ تمہارے ابا جان کا حکم ہے اور تم جانتے ہو کہ یہ ٹل نہیں سکتا۔"

آذر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جانتا تھا کہ ابا نے اسے سزا دی ہے لیکن یہ سزا کتنی سخت ہے' یہ ابا جان بھی نہیں جانتے تھے۔ اپنے گھر سے دور جانا اور دور رہنا۔ اور خاص طور سے زہرہ سے دور رہنا بہت بڑی سزا تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ زندہ رہ سکے گا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر امی کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ "تمہارے ابا جان کے اس فیصلے سے مجھے جو تکلیف پہنچی ہے' وہ تمہاری تکلیف سے بہت بڑی ہے بیٹے!" انہوں نے اسے سینے سے لگا کر کہا۔ "لیکن تمہارے ابا جان کی خوشنودی اور تمہاری بہتری کے خیال سے میں نے دل پر پتھر رکھ لیا ہے۔"

آذر سے کچھ نہیں کہا گیا۔ باپ کے سامنے دم مارنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بے بسی اور دکھ کے احساس سے شل ہو کر وہ رو پڑا۔ امی کا ضبط بھی جواب دے گیا۔ دونوں دیر تک روتے رہے۔

اس رات وہ زہرہ کے پاس بھی گیا۔ "آپا۔ ابا جان مجھے انگلینڈ بھیج رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں چھوٹے سرو' میں جانتی ہوں۔" زہرہ کے لہجے میں اداسی تھی۔

"میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے آپا۔"

زہرہ اس کی تبدیلی پر مسکرائی۔ وہ اس کا نام نہیں لے رہا تھا' آپا کہہ رہا تھا۔ "یہ زیادتی نہیں ہے آذی۔ بہتری کے لئے قربانی تو دینی پڑتی ہے۔ کچھ کھو کر ہی کچھ بن سکتا ہے آذی۔ یہ کوئی سزا نہیں' انعام ہے عمو جان کی طرف سے۔"

آذر نظریں چرانے لگا۔ وہ کیسے بتاتا کہ یہ واقعی سزا ہے۔ یہ کہتا تو اسے جرم بھی بتانا پڑتا' جو اسے گوارا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "میں نے آپ کو بہت ستایا ہے آپا۔ مجھے معاف کر دیجئے گا۔"

زہرہ اور بھی خوش ہو گئی۔ وہ اسے آپ کہہ رہا تھا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ننھے منے۔ چھوٹے کیا' غلطیاں تو بڑے بھی کر دیتے ہیں۔ بس غلطی کا احساس ہو جائے اور اس کی اصلاح کر لی جائے یہی بہت ہے۔"

آذر نے ایک جھٹکے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ "انگلینڈ جانے میں فائدہ بھی ہے آپا۔ میرا کام آسان ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

"کون سا کام؟" زہرہ نے پوچھا۔

"مجھے مرجانا ہے۔ وہاں میں آسانی سے مرجاؤں گا۔"

زہرہ نے ملامتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "چھی' چھی' کیسی گندی باتیں کرتے ہو۔ جینا شروع کیا نہیں اور مرنے کی باتیں کرنے لگے۔"

"آپ نہیں سمجھیں گی آپا۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور آپ مجھے ڈانٹتی ہیں۔ میں تو یوں بھی آپ کے بغیر مرجاؤں گا۔ اتنی دور جا کر یہ کام آسانی سے ہو جائے گا۔ دیکھ لیجئے گا آپا' میں مر جاؤں گا آپ کے بغیر۔"

زہرہ نے چاہتے ہوئے بھی اس کی سرزنش نہیں کی۔ اتنی دور جانے والوں کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے۔ الٹا اس نے اپنے زانو پر اس کا سر رکھ لیا اور اسے تھپکنے لگی۔

○☆○

آذر نے جام سے ایک اور گھونٹ لیا اور تلخی سے مسکرایا۔ اس مرنے والی بات کو ۲۷ سال ہو چکے تھے۔ زہرہ جوانی میں ہی مر گئی تھی۔ اب تو اس کی ہڈیاں بھی خاک ہو گئی ہوں گی اور وہ اس کے بغیر بھی اب تک زندہ تھا۔ اس نے طویل عمر پائی تھی۔ اور وہ بھی صحت اور تندرستی کے ساتھ۔

بارہ سال کی عمر میں تو ایسا ہی رومینٹک ہوتا ہے۔ اس نے سوچا۔ بات بات پر مرنے کی تیاری کرتا ہے۔ زہرہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کچی عمر کے لڑکے جینا شروع کیے بغیر مرنے کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

اس نے جام میز پر رکھا اور دوبارہ ماضی کی کھڑکی سے جھانکنے لگا۔

○☆○

خان بہادر جمیل الرحمان کے لئے اپنے بیٹے کو انگلینڈ بھجوانا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ انگریزوں سے ان کے مراسم بہت گہرے تھے۔ کیوں نہ ہوتے۔ ان کے اور انگریزوں کے درمیان رشتہ ہی ایسا تھا۔ وفاداری کا رشتہ! ۱۸۵۷ء میں ان کے والد نے اور اس کے بعد جمیل الرحمان نے اپنے! انگریز رہنماؤں کے لئے گراں قدر۔ اور بیش بہا خدمات انجام دی تھیں۔ اس کے صلے میں نہ صرف انہیں بڑی بڑی جاگیریں ملیں بلکہ وائسرائے اور دیگر بارسوخ انگریزوں سے ان کے ذاتی تعلقات بھی قائم ہوئے۔ سو بیٹے کو انگلینڈ بھجوانا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بس مسئلہ یہ تھا کہ پہلی جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ بہرحال جنگ میں زندگی کہاں رکتی ہے۔ آذر جمیل کا جانا بھی نہ رک سکا۔ بالآخر وہ انگلینڈ چلا گیا۔

شروع شروع میں آذر کو بہت پریشانی ہوئی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ وہ انڈیا کے بہترین اسکول میں تعلیم پا رہا تھا۔ انگریزی بڑی روانی سے بولتا تھا لیکن یہاں تو ماحول ہی مختلف تھا۔ آکسفورڈ کے لہجے کی شستگی سے تو بیشتر انگریز بھی محروم رہتے ہیں۔ وہ تو پھر کالا ہندوستانی تھا۔ دوسری وجہ اس کی اداسی اور دل گرفتگی تھی۔ گھر چھوڑ کر اتنی دور پردیس آنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ آدمی بارہ سال کی عمر میں اپنی پہلی محبت سے بہ جبر دور کر دیا گیا ہو۔ وہ انگلینڈ پہنچا تو بہت دل شکستہ تھا۔

پھر اسے یہ احساس دلایا گیا کہ یہاں وہ خان بہادر کا بیٹا نہیں، محض ایک غلام زادہ ہے۔ اس کے باپ اور دادا نے اپنے۔۔۔ ہم وطنوں کے لہو کا سودا کر کے اپنے اور اپنی اولاد کے لئے ایک خطاب اور بے شمار مراعات اور انعامات ضرور حاصل کر لئے ہیں لیکن وہ اوّل و آخر غلام ہیں۔ طبقۂ امرا میں شامل ہونا تو دور کی بات ہے، وہ عام انگریزوں کی برابری بھی نہیں کر سکتے۔

سو آذر جمیل گھٹ کر رہ گیا۔ اسکول جانے کے بعد اس کے دو ہی کام رہ گئے۔۔۔ گھر خط لکھنا اور تصویریں بنانا۔ گھر خط لکھنے کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ زیادہ تر خط وہ زہرہ کو لکھتا تھا۔۔۔ اور لکھ کر خود ہی پڑھتا تھا اور پڑھ کر پھاڑ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ کبھی امی کو خط لکھ دیتا تو اسے پوسٹ بھی کر دیتا۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ ابا جان کو خط لکھے اور ان سے معافی مانگے مگر اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر ایک سرکشی سر ابھارتی۔ ابا جان کے لئے اس کے ذہن میں ایک لفظ گونجنے لگتا تھا۔۔۔ غدار۔۔۔ غدار۔ اس کے اندر باپ کی محبت مزاحمت کی شکل میں ابھرتی لیکن غدار کی پکار کے سامنے اس کی ایک نہ چلتی۔ وہ کبھی ابا جان کو خط نہ لکھ سکا۔ ابا جان نے بھی کبھی اسے خط نہیں لکھا۔ شاید وہ اسے معاف نہ کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا زور مصوری پر پڑ گیا۔ اس نے تو آخری پناہ کے طور پر مصوری کا سہارا لیا تھا لیکن مصوری نے اس پر انگلینڈ کی سوشل لائف کے دروازے کھول دیے۔

یورپ وہ خطۂ زمین ہے، جہاں کی ثقافت مصوری کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ہندوستان میں اسے مصوری کے حوالے سے کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا لیکن انگلینڈ میں یہ حوالہ بہت معتبر ٹھہرا۔ اس کے روم میٹ کے ذریعے اس کی مصوری کی شہرت رات کی رانی کی خوشبو کی طرح پھیلنے لگی۔

سب سے پہلے اسکول کے ایک ٹیچر نے اس سے مصوری کے بارے میں استفسار کیا پھر پرنسپل نے اسے بلا کر پوچھا۔ پرنسپل نے اس کا کام بھی دیکھا اور بہت متاثر ہوا۔ پہلی بار کسی نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور ہر ممکن مدد اور رہنمائی کی پیش کش کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اسکول میں کالے غلام زادے کے بجائے ایک اہم آرٹسٹ کی حیثیت اختیار کر گیا۔

کچھ عرصے کے بعد اسے پارٹیوں میں مدعو کیا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا لیول بڑھا اور وہ طبقۂ امرا تک جا پہنچا پھر اسے آرتھر کنگسلے نے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ آرتھر کوئی بڑا مصور نہیں تھا لیکن جہاں تک مصوری کی تاریخ اور فنِ مصوری کی باریکیوں کا تعلق ہے تو وہ بلاشبہ بہت بڑا عالم تھا۔ وہ ہر بڑے مصور کے اسٹائل سے واقف تھا اور ان کے عیوب و محاسن سے بھی باخبر تھا۔ دوسری طرف آذر میں مصوری کی فطری صلاحیت تھی۔ آرتھر سے اسے بہت کچھ حاصل ہوا بلکہ سچ یہ ہے کہ آج وہ جو کچھ بھی تھا، اس میں آرتھر کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

آذر کی ذہنی نشوونما کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ وہ بہت صحت مند اور زندگی کی توانائیوں سے بھرپور لڑکا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ ایک خوب رو نوجوان تھا۔ اسے جنسِ مخالف کی توجہ کی کبھی کمی محسوس نہیں ہوئی بلکہ اسے توجہ کی زیادتی کی شکایت تھی۔ ہندوستان کے گھٹے گھٹے ماحول کے مقابلے میں اسے انگلینڈ میں بہت زیادہ آزادی نظر آئی۔ حالانکہ انگریز بے حد قدامت پرست تھے لیکن آذر کی سمجھ میں یہ قدامت پرستی نہیں آئی تھی۔ بہرکیف جب وہ چھٹیاں گزارنے پیرس اور روم گیا تو اسے اندازہ ہوا کہ انگریز آزادی کے معاملے میں یورپ سے کتنا پیچھے ہیں۔

وطن میں جو کچھ ہوا تھا، اس کے حوالے سے اپنے بارے میں آذر کا ایک امیج بن گیا تھا اور وہ امیج بہت خراب تھا۔ اپنی نظر میں وہ نفسانی و حیوانی خواہشات کا اسیر ایک بگڑا ہوا بچہ تھا لیکن اس بچے نے انگلینڈ اور یورپ میں اسے حیران کر دیا۔ وہیں اس کا خود سے پہلا تعارف ہوا۔ جہاں جلوے خود نگاہوں پر مہربان ہوتے ہوں، وہاں نگاہوں کی بے نیازی معمولی بات نہیں ہوتی۔ یہاں حسن دامن گیر تھا اور وہ دامن بچا کر گزرتا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کا خود پر اعتماد بحال ہو گیا۔ وہ حسن پرست ضرور تھا، بوالہوس

نہیں تھا۔ اس کے تصور پر زہرہ کی حکمرانی تھی۔ زہرہ کی محبت دبی نہیں تھی بلکہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ زہرہ جیسا حسین دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اعضا کا وہ تناسب جو زہرہ میں تھا، جسے اس نے تصویر میں اور بت بنانے کی کوشش کی تھی، دنیا میں کسی کے پاس نہیں تھا مگر یہ صرف اسی کی نظریں دیکھ سکتی تھیں۔

زہرہ کی وہ NUDE تصویر، جو فساد کا باعث بنی تھی، اس کی رفیق تھی۔ وہ اپنے سامان میں اس تصویر کو رکھنا نہیں بھولا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ اس تصویر کو دیکھتا اور تصور میں گھر پہنچ جاتا۔ گھر، جس کا تصور اب اسے خواب سا لگتا تھا۔ حقیقت سے کوسوں دور۔

انگلینڈ میں اسے سات سال ہو گئے۔ نفسانی خواہشیں اور جسمانی تقاضے تو اس کے وجود میں بہت پہلے سر اٹھا چکے تھے۔ اب ماحول بھی سازگار تھا اور آوارگی کے مواقع بھی حاصل تھے مگر حیرت انگیز طور پر اس نے ان سے استفادہ نہیں کیا۔ وہ بس زہرہ کے تصور سے حظ اٹھاتا رہا۔ لندن میں عورتوں کے حلقوں میں اسے برف کا انسان اور لاوے کا مصور کہا جاتا تھا۔ اس کے فن میں جذبوں کی حدت اور جذبات کی تپش تھی۔

اکیس سال کی عمر میں اس نے تعلیم مکمل کر لی۔ پرنسپل کا کہنا تھا کہ اسے پیرس کی آرٹ اکیڈمی میں بھی تعلیم حاصل کرنی چاہئے لیکن اس نے ابا جان کو اس سلسلے میں خط لکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ پرنسپل نے خان بہادر صاحب کو خط لکھا اور اجازت لے لی۔ پیرس کی آرٹ اکیڈمی سے دو سال بعد اسے سند مل گئی۔ اب اسے وطن واپس جانا تھا۔

وطن واپس جاتے ہوئے اس کا وجود ابا جان کے لئے محبت اور شکرگزاری سے لبریز تھا۔ ابا جان نے اسے انگلینڈ یوں بھیجا تھا، جیسے کالے پانی کی سزا دی ہو لیکن درحقیقت وہ اس کے لئے بہت بڑا انعام ثابت ہوا تھا۔ اس نے خود کو اور اپنی صلاحیتوں کو پہچانا تھا۔ اب وہ اپنے بارے میں زیادہ جانتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایک بڑا مصور بننے کے مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔ یورپ کے تجربات نے بھی اسے بہت کچھ سکھایا تھا۔

○☆○

آذر نے چونک کر دیکھا۔ اسٹوڈیو میں جانے کب سے اندھیرا تھا۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر مختلف سوئچ دبائے اور اسٹوڈیو جگمگا منور بن گیا۔ وہ اپنی جگہ آ کر بیٹھا اور جام اٹھا کر ایک گھونٹ لیا اور دوبارہ یادوں میں کھو گیا۔

○☆○

ائرپورٹ پر اسے ریسیو کرنے کے لئے صرف اختر بھائی آئے تھے اور آتا بھی کون۔ ابا جان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بڑی محبت سے اختر بھائی سے لپٹ گیا۔ اختر بھائی سے کبھی اس کی قربت نہیں رہی تھی مگر گیارہ سال کی جدائی نے ان کی دبی ہوئی محبت کو ابھار دیا تھا۔

وہ گلے مل کر پیچھے ہٹا تو اختر بھائی رو رہے تھے۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم آ گئے۔" انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ حیرت سے بھائی کو دیکھتا رہا۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتے ہیں، یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

گھر جاتے ہوئے راستے میں وہ بار بار اختر بھائی کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ اس سے چار سال بڑے تھے۔ اس حساب سے وہ صرف ۲۷ سال کے ہوئے لیکن وہ اتنے بڑے لگ رہے تھے، جیسے ایک دم ادھیڑ عمر ہو گئے ہوں۔ شاید اس لئے کہ اتنے برسوں میں اس نے ان کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔

گھر پہنچ کر اسے اور بڑا شاک لگا۔ امی تو بالکل ہی بوڑھی ہو گئی تھیں۔ ان کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرہ جھریوں سے بھر گیا تھا۔ ان کی نظر بھی کمزور ہو گئی تھی۔ تبھی تو وہ اس کے چہرے کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں پھر انہوں نے اسے سینے سے بھینچا اور بلک بلک کر رونے لگیں۔

آذر کو پہلی بار انگلینڈ میں گزارے برسوں کا ملال ہوا۔ اس عرصے میں گھر کے لوگ کتنے بدل گئے تھے۔ جس وقت نے اسے سنوارا تھا، اس نے اس کے گھر کے تمام لوگوں کے ساتھ بہت سختی برتی تھی۔ جیسے وہ انہیں روند کر گزرا ہو۔

امی دیر تک روتی رہیں۔ وہ بھی روتا رہا۔ انہیں سنبھلنے میں خاصی دیر لگی۔ بالآخر امی نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "اپنے کمرے میں جاؤ اور نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔"

نوکر نے اس کا سامان کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ اس نے کمرے میں جا کر اپنے لئے کپڑے نکالے۔ غسل خانے جانے کے ارادے سے وہ کمرے سے نکلا تو دل مچل گیا۔ اب تک اس نے کسی سے زہرہ کے بارے میں نہیں پوچھا تھا مگر اب اس کے کمرے کو دیکھ کر ضبط جواب دے گیا۔

اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی، دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔

وہ اس کے لئے ایک اور بڑا شاک تھا۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، وہ مکمل طور پر اس کی توقع کے برعکس تھا۔ زہرہ کمرے میں نہیں تھی۔ اس میں تو ایسی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بشرطیکہ اسے یہ خیال آتا کہ زہرہ شاید امی کے پاس ہے یا باورچی خانے میں کام کر رہی ہے۔ ابھی آ جائے گی لیکن گیارہ برس کے بعد اس کمرے میں بے محابانہ داخل ہونے والے کے دل میں ایک ثانیے کو بھی یہ خیال نہیں آیا۔ اس کا تو دل دھک سے رہ گیا۔

کمرا ویسا ہی تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا لیکن ہر چیز پر گرد کی اتنی دبیز تہ تھی کہ کسی چیز کی اصل صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دیواروں پر اور چھت پر مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے بُن دیے

تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ مہینوں ـــ بلکہ برسوں سے کسی نے کمرے میں قدم بھی نہیں رکھا ہے۔

اس کا دل خوف اور اندیشوں سے بھر گیا۔ اسے لگا کہ وہ کسی آسیب زدہ مقام پر کھڑا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

اچانک باہر کسی نے اسے پکارا۔ پھر آواز سے ایسا لگا' جیسے پکارنے والا اس کے کمرے میں چلا گیا ہے۔ ایک دم سے وہ بارہ سال کا لڑکا ہو گیا۔ ابا جان نے بھی تو اس دن اسے ایسے ہی پکارا تھا۔ اس نے سننے میں دیر کر دی تھی اور اس کا نتیجہ کتنا بھیانک نکلا تھا۔ آج پھر ابا جان اسے پکار رہے ہیں۔ اس مرتبہ دیر نہیں ہونی چاہئے۔

وہ لپک کر کمرے سے نکلا۔ اسی لمحے اس کے کمرے سے ابا جان نکلے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس بار بھی ابا جان اس سے منہ پھیر کر کچھ کہے بغیر نکل جائیں گے اور پھر ایک لمبی سزا اس کا مقدر ہو گی لیکن نہیں ـــ اس بار وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ گیارہ برس ہو گئے۔ اس نے ابا جان کو دیکھا بھی نہیں۔ ان کی آواز بھی نہیں سنی۔ یہ تو ظلم ہے لیکن ابا جان اس کی طرف بڑھے۔ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے رہے پھر بولے۔ "کیا بات ہے؟ میں کب سے آوازیں دے رہا ہوں۔"

وہ آواز بھی اس کے لئے شاک کا باعث بنی۔ یہ آواز ـــ یہ ابا جان تو نہیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھند صاف ہونے لگی۔ اس نے حیرت سے دیکھا۔ وہ تو اختر بھائی تھے۔

"کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس بار اختر بھائی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"یہ سب کیا ہے بھیا؟" آذر نے زہرہ کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "زہرہ آپا کہاں ہیں؟"

اختر بھائی کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ "تمہیں معلوم تو ہے۔ آپا اپنے گھر میں ہیں۔ شادی کے بعد لڑکیاں اپنے گھر میں ہی رہتی ہیں۔"

آذر نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "کب ہوئی ان کی شادی؟"

"تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے تمہیں معلوم ہی نہیں۔ ان کی شادی کو تو دس سال ہو گئے۔ تمہیں انگلینڈ گئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کی شادی ہو گئی۔"

"مجھے واقعی نہیں معلوم بھیا۔" اس نے جیسے فریاد کی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابا جان نے تمہیں خط لکھا تھا۔"

"ابا جان نے مجھے کبھی خط نہیں لکھا تھا۔"

"حیرت ہے۔ ابا جان کا حکم تھا کہ گھر میں کوئی اور تمہیں خط نہیں لکھے گا۔ وہی تمہیں خط لکھتے رہیں گے۔ کیا واقعی تمہیں آپا کی شادی کا پتا نہیں؟"

"صرف یہی نہیں۔ مجھے کبھی کسی نے ایک خط بھی نہیں لکھا۔ ابا جان نے بھی نہیں۔"

اختر بھائی کی آنکھوں سے الجھن جھلکنے لگی۔ "حیرت ہے۔ ابا جان نے ایسا کیوں کیا؟ خیر اب ان سے کوئی پوچھ بھی نہیں سکتا۔"

یہ سچ تھا۔ ابا جان سے کون پوچھتا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ یہ بات آذر بھی جانتا تھا لیکن اس لمحے اس کے سینے میں جو لاوا کبھی سا دہک اٹھا۔ ابا جان کی محبت اور شکر گزاری جو وہ انگلینڈ سے لے کر آیا تھا' جل کر بھسم ہو گئی۔ ابا جان کو دیکھنے اور ان سے لپٹنے کی تڑپ سرد پڑ گئی۔ سب اچھے جذبوں کی جگہ غصے اور نفرت نے لے لی۔ اس وقت وہ اس کے سامنے ہوتے تو وہ یقیناً ان سے بدتمیزی کر بیٹھتا۔ اب وہ ان کا سامنا کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"جاؤ۔ تم جا کر نہا لو۔" اختر بھائی نے کہا۔

"بھیا پلیز' اس کمرے کی صفائی کرا دیں۔ میں اسے پہلے جیسا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اختر بھائی مسکرائے۔ "یہ کام ابھی ہو جائے گا۔ تم جاؤ۔"

وہ غسل خانے میں چلا گیا لیکن ٹھنڈا پانی بھی اس کے غصے اور نفرت کی آگ کو سرد نہ کر سکا۔

نہا کر لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ باہر نکلا تو ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ وہاں جاگیر کا بڑا کارندہ نعمت علی بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ کیسے ہیں چھوٹے سرکار؟" اس کے لہجے میں احترام تھا۔

"ٹھیک ہوں نعمت علی۔" اس نے کہا۔ "تم سناؤ' کیسے ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے چھوٹے سرکار۔ آپ کے سائے میں عزت سے جی رہے ہیں۔"

"کیسے آئے ہو؟"

"بڑے سرکار سے ملنے آیا ہوں۔"

"وہ تو گھر میں نہیں ہیں۔"

نعمت علی الجھا ہوا نظر آنے لگا۔ "انہوں نے مجھے بلوایا ہے چھوٹے سرکار۔ ابھی دو منٹ پہلے مجھے ان کا پیغام ملا تو میں دوڑا آیا ہوں۔"

'تو کیا ابا جان گھر میں موجود ہیں؟ اور مجھ سے نہیں ملے! آخر میں بھی کب ان سے ملنا چاہتا ہوں۔'

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اختر بھائی ڈیوڑھی میں آئے۔ نعمت علی نے لپک کر ان کی دست بوسی کی۔ "کیا حکم ہے بڑے سرکار؟" اس نے عاجزی سے پوچھا۔

آذر نے چونک کر اختر بھائی کو دیکھا۔ اس لمحے وہ بالکل بدل کر رہ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر' ان کے انداز میں عجیب سا جاہ و جلال اور حکمت تھی پھر وہ بولے تو ان کا لہجہ بھی ابا جان کا سا تھا۔ "نعمت علی' تمہیں فوری طور پر جہانگیر پور جانا ہے۔ فصلوں کا

حساب کر کے لے آؤ۔"

"جو حکم سرکار کا۔" نعمت علی نے کہا اور فوراً ہی چلا گیا۔

آذر کی سمجھ میں پہلے تو کچھ نہیں آیا مگر اس کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ وہ حیران تھا کہ گھر واپسی پر یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیسی ذہنی الجھن ہے جو اس کے اعصاب توڑے ڈال رہی ہے۔

"یہ سب کیا ہے، بھیا؟"

"کیا۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔" اختر بھائی بولے۔

پہلے تو آذر خود بھی نہیں سمجھا تھا کہ وہ کس بات پر ہراساں ہے مگر ٹوٹتی زبان میں لفظ اس کی زبان سے نکلے تو بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس کا پورا جسم کسی کمزور سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ "بھیا آپ۔۔۔ اور بڑے سرکار۔"

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اختر بھائی کا چہرہ بجھنے لگا۔ ان کے کندھے جھک گئے۔ ایک دم سے وہ ادھیڑ عمر اور پژمردہ نظر آنے لگے۔ انہوں نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

اندیشے آذر کے شعور میں حقیقت کا روپ دھارتے جا رہے تھے۔ اس نے اختر بھائی کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "آپ بتاتے کیوں نہیں مجھے؟"

"کہہ تو رہا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔" اختر بھائی کی آواز رندھ گئی تھی۔ "آؤ۔ امی کے پاس چلیں۔"

اختر بھائی اس کا ہاتھ تھام کر امی کے کمرے میں لے گئے۔ امی نماز پڑھنے کے بعد جاء نماز سمیٹ رہی تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ نماز پڑھنے کے دوران روتی رہی ہیں۔ ان کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

"امی۔۔۔ اب آپ ہی بتا دیں اسے۔" اختر بھائی نے ٹوٹتی۔۔۔۔ آواز میں کہا۔

امی نے سر اٹھا کر پہلے اختر اور پھر آذر کے چہروں کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایک طرح کی استقامت ابھری۔ انہوں نے بڑی نرمی سے آذر کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے تخت کی طرف لے چلیں۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے اس سے کہا۔ "اوپر آ کر لیٹ جاؤ۔ میری گود میں سر رکھ کر۔"

اس وقت آذر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ نہ اسے کچھ سجھائی دے رہا تھا۔ وہ گم صم سا تخت پر بیٹھ گیا۔ "امی۔۔۔ کیا بات ہے۔ مجھے بتائیں تو۔ ابا جان کی موجودگی میں بھیا بڑے سرکار کیسے بن گئے؟"

امی نے زبردستی اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ "اللہ کی یہی مرضی تھی بیٹے۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولیں۔

آذر ان لفظوں کے مفہوم سے آشنا تھا مگر اس کے اندر انہیں قبول کرنے کے لئے آمادگی نہیں تھی۔ "امی۔ مطلب کیا ہے آپ کا؟"

آذر کے چہرے پر گرم گرم آنسو گرے تو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

"تمہارے ابا جان اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" امی نے بڑی مشکل سے کہا۔

آذر نے بڑی بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ وہ بے آواز رو رہی تھیں۔ اس نے اختر بھائی کو دیکھا۔ وہ بھی خاموشی سے رو رہے تھے۔ آذر جان گیا تھا کہ یہ سچ ہے مگر پھر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ "یہ کب کی بات ہے؟" اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ ایک دم سے وہ بہت بڑا ہو گیا تھا۔ شاید اختر بھائی کی طرح!

"سوا سال ہو گیا۔" امی نے دھیمی آواز میں کہا۔

آذر کے اندر جیسے دھماکا ہوا۔ وہ پھٹ پڑا۔ "اور کسی نے مجھے اطلاع بھی نہیں کی۔ جیسے میں اس گھر کا فرد ہی نہیں ہوں۔" اب وہ شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا۔ "اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ پہلے پتا چل گیا ہوتا تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔ خیر' اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔"

وہ اٹھنے لگا لیکن امی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے چھڑانا چاہا لیکن امی کی گرفت بہت سخت تھی۔ "کہاں جا رہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ یہاں نہیں رہوں گا۔"

"بیٹھ جاؤ ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا تم پر۔" امی بپھر گئیں۔

"مجھے تو جیتے جی مار دیا آپ لوگوں نے۔" وہ بھی بپھرا ہوا تھا۔

جواب میں امی کا تھپڑ اس کے رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔ چٹاخ کی آواز بہت خوفناک تھی۔ اختر بھائی نے امی کا ہاتھ تھام لیا۔ "امی۔ یہ تو خیال کریں کہ اس کے لئے یہ صدمہ کتنا بڑا ہے۔ خدا کے لئے امی۔"

تکلیف سے آذر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ امی نے کھینچا تو وہ دوبارہ تخت پر بیٹھ گیا۔ "بیٹھو۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ تمہارے ابا جان کی زندگی میں اس گھر میں کبھی ان کے حکم کے خلاف کچھ نہیں ہوا۔ ہم نے یہ روایت ان کے مرنے کے بعد بھی نبھائی ہے۔ انہوں نے تمہیں خط لکھنے کو منع کیا تھا۔ ہم تمہیں خط نہیں لکھ سکتے تھے۔"

"لیکن امی' یہ اور بات تھی۔ اتنی بڑی بات۔۔۔"

"میرے بھائی' میری جان' ابا جان کا حکم تھا کہ تمہیں ان کی بیماری کی خبر دی جائے نہ موت کی۔" اختر بھائی نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "ہم کیا کرتے بلکہ میں تو تمہارے بغیر خود کو بہت اکیلا محسوس کرتا رہا۔"

آذر جانتا تھا کہ امی اور اختر بھائی دونوں سچ بول رہے ہیں۔ ابا جان یہ حکم دے سکتے تھے۔ اور انہوں نے دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا اس حکم کی تعمیل ہونی چاہئے تھی۔ امی تو خیر نصف صدی کی عادت سے مجبور تھیں مگر بھیا۔

اس نے شکایتی نظروں سے اختر بھائی کو دیکھا۔ اختر بھائی نے

اس کی نگاہوں کا مفہوم پا لیا۔ انہوں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "بھائی، تم سے تو میں معافی مانگ سکتا ہوں اور مانگ رہا ہوں لیکن ابا جان سے تو مجھے قیامت تک معافی نہیں مل سکتی تھی۔ تم تو مجھے معاف کردو گے نا۔"

آذر نے ان کے سینے سے لپٹ کر اس کا جواب اثبات میں دے دیا۔

امی اور اختر بھائی دیر تک اسے ابا جان کی بیماری اور موت کے متعلق بتاتے رہے۔ آنکھیں برستی رہیں پھر آذر نے کہا۔ "بھیا۔ مجھے ابا جان کی قبر نہیں دکھائیں گے۔"

"آؤ چلو۔" اختر بھائی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دونوں بھائی قبرستان کی طرف چل دیے۔ راستے میں آذر نے کہا۔ "بھیا۔ آپ مجھے قبر دکھا کر واپس آجائیے گا۔"

اختر بھائی نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "کیوں بھائی؟ دیکھو آذی۔۔۔"

"بھیا۔ مجھے ابا جان سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

اختر بھائی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ اسے ابا جان کی قبر پر لے گئے اور خود فاتحہ پڑھ کر قبرستان سے نکل آئے۔

اب وہ تھا اور باپ کی قبر۔ وہ متضاد جذبوں کا اسیر تھا۔ ایک طرف اسے باپ پر غصہ تھا۔ اس سے شکایت تھی۔ دوسری طرف جانے والے کی محبت جوش مار رہی تھی۔ ان متضاد اور متصادم جذبوں کا اظہار اس کے تیزی سے بدلتے لہجے اور آواز کے زیروبم سے ہوتا۔ کبھی وہ سرگوشی میں بات کرتا اور کبھی ایک دم سے چلانے لگتا۔ وہ ان سے باتیں کرتا رہا، جیسے وہ اس کے سامنے موجود ہوں۔ "یا تو آپ اتنے شفیق باپ تھے یا ایک غلطی کی سزا دینے میں اتنے بے رحم ہوگئے۔ مجھے آپ نے گیارہ سال اپنی دید سے، اپنی آواز تک سے محروم رکھا۔" وہ اچانک چلانے لگا۔ "یہ کہاں کا انصاف ہے۔ آپ نے مجھے گھر سے، گھر کے رشتوں سے محروم کر دیا۔ کیا حق پہنچتا تھا آپ کو اس کا اور انتہائی سزا دینے میں غلطی آپ کی تھی۔ آپ مجھے۔ اپنے بیٹے کو جانتے ہی نہیں تھے۔ غلطی تو میری تھی مگر اتنا بڑا گناہ نہیں تھا وہ۔ ہوتا تو میں انگلینڈ میں گیارہ سال گزار کے اتنا پاک صاف واپس نہ آتا۔ آپ نے ظلم کیا مجھ پہ۔" وہ اچانک رونے لگا۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر۔ اب تک وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ابا جان، اس کے سامنے ہیں۔ قبر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی لیکن اسے نظر نہیں آرہی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ وہ تو قبر سے ہم کلام ہے اور ابا جان اس دنیا میں جا چکے، جہاں جانے کے بعد کوئی کسی سے نہیں ملتا۔ وہ ابا جان سے کبھی بات نہیں کر سکے گا۔

"آپ نے مجھے معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ صفائی پیش کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔" وہ پھر بپھر گیا۔ "آپ میری بات سنتے کیوں نہیں۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟" اس ابتر ذہنی کیفیت میں اسے ایک بار پھر احساس ہوا کہ ابا جان تو مر چکے ہیں۔ اس بار اس احساس کی چوٹ براہِ راست دل پر پڑی۔ پہلی بار موت کی مکمل اہمیت اور احساس اس کے شعور تک بغیر روک ٹوک کے پہنچا۔

باپ کی موت کا غم بہت بڑا ہوتا ہے پھر اس باپ کی موت جو بیٹے سے دس سال۔۔۔ ناراض رہا ہو اور اسی ناراضی کو لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔ موت تو یوں بھی پچھتاوے لاتی ہے لیکن آذر کا پچھتاوا بہت بڑا تھا۔ اور تلافی بھی کوئی نہیں تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ سینے پر کوئی بہت بھاری چٹان آپڑی ہے، جو اسے ہلنے بھی نہیں دے گی، لگتا تھا، سینہ پھٹ جائے گا۔ سانس رکنے لگی تھی۔ وہ رونا چاہتا تھا لیکن اس سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا۔ ایسی کیفیت اس پر پہلے کبھی نہیں گزری تھی مگر ایسی صورتِ حال بھی کبھی پیش نہیں آئی تھی۔

پھر قدرت نے اس کی مشکل آسان کردی۔ قبر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی اور وہاں ابا جان لیٹے نظر آئے۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا اور ان کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اس نے ابا جان کا سینہ جل تھل کر دیا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ آنسوؤں کا ذخیرہ کب ختم ہوا۔ وہ اس سے پہلے ہی بے ہوش ہو چکا تھا۔

ایک گھنٹے بعد اختر بھائی پریشان ہو کر آئے تو اسے قبر پر بے ہوش پایا۔ وہ اسے ملازموں کی مدد سے گھر لے گئے۔ وہاں بظاہر تو اسے تھوڑی دیر بعد ہوش آگیا لیکن درحقیقت سنبھلنے میں اسے کئی دن لگے۔ وہ آنکھیں کھولتا، بیگانگی سے ہر شخص کو۔ گھر کے درودیوار کو دیکھتا اور آنکھیں بند کر لیتا، جیسے کچھ بھی نہیں پہچانتا ہو۔ باجی آگئی تھیں اور وہ انہیں بھی نہیں پہچانتا تھا۔

ہوش و حواس کی دنیا میں اسے زہرہ ہی واپس لائی۔ یہ اسے بعد میں پتا چلا کہ زہرہ کا سسرال سے آنا آسان نہیں تھا۔ اسے اس بات کی اجازت ہی نہیں ملتی تھی۔ یہ بات سب جانتے تھے۔ اس لئے خاص طور پر اسے بلوایا نہیں جاتا تھا۔ کوئی تقریب ہوتی تو پورے گھر کو دعوت نامہ بھیج دیا جاتا لیکن زہرہ کم ہی آتی تھی اور ایک دن سے زیادہ وہ کبھی رکی ہی نہیں تھی۔

مگر اس بار زہرہ کو رہنے اور ٹھہرنے کے لئے بلوایا گیا تھا۔

امی آذر کے لئے بہت پریشان تھیں۔ ڈاکٹر بھی اپنی سی کر کے ہار گئے تھے مگر اس کا ذہنی جمود نہیں ٹوٹتا تھا۔ اس پریشانی میں اچانک امی کو زہرہ کا خیال آیا۔ انہیں حیرت بھی ہوئی کہ یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔ انہوں نے اختر بھائی سے بات کی کہ اس جمود کو توڑ کر اسے ہوش کی سرحد میں صرف زہرہ ہی لا سکتی ہے۔ بچپن میں بھی جب وہ کسی ضد پر مچلتا تو صرف زہرہ ہی کے قابو میں آتا تھا۔

بات اختر بھائی کی سمجھ میں آگئی۔ وہ خود زہرہ کو لینے اس کی

سسرال چلے گئے۔ زہرہ کی سسرال میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ زہرہ کا میکے سے بلاوا آیا تھا اور اسے کچھ دن میکے میں رہنا تھا۔ باقی لوگ ایک طرف' لیکن زہرہ کا شوہر اسے ہرگز بھیجنا نہیں چاہتا تھا لیکن خان بہادر صاحب سے انکار کی جرأت بھی نہیں تھی۔ سو زہرہ میکے چلی آئی۔

"اختر۔ خیریت تو ہے؟" زہرہ نے راستے میں اختر سے پوچھا۔ اختر نے آذر کی آمد اور اس کی کیفیت کے متعلق بتایا۔ زہرہ بھی پریشان ہو گئی۔

گھر پہنچتے ہی امی زہرہ کو آذر کے کمرے میں لے گئیں۔ آذر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ لگتا تھا' سو رہا ہے۔ زہرہ اسے بہت غور سے دیکھتی رہی۔ درمیان میں گیارہ برس کا فاصلہ تھا۔ اسے جانے کیا کیا یاد آیا۔ آذر کے بچپن سے اس کے انگلینڈ جانے تک مگر یہ جوان مرد جو بستر پر لیٹا تھا' اس کے لئے اجنبی تھا۔ وہ اس کے چہرے میں پرانا چھوڑ ڈھونڈ رہی تھی۔ چند لمحے بعد وہ اسے اپنا پرانا والا آذر لگنے لگا۔ شاید اس لئے کہ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اور اس لئے بھی کہ چند ہفتوں سے وہ واقعی ننھا منا بچہ بن گیا تھا اور اپنے شعور کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ اپنے سب لوگوں کو۔ شاید خود کو بھی بھول گیا تھا۔ اسے راہ بھولے ہوئے اس ننھے منے بچے پر پیار آنے لگا۔

"آذی۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو' کون آیا ہے۔" امی نے آذر کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

لیکن آذر نے کئی بار پکارنے پر بھی آنکھ نہیں کھولی۔ "عجیب ہو گیا ہے۔" امی نے زہرہ کو بے بسی سے بتایا۔ "کچھ بولتا نہیں۔ سنتا ہے نہ پہچانتا ہے۔"

"آذی۔۔۔ ننھے منے۔ خفا ہو گیا۔" زہرہ نے جھکتے ہوئے اسے پکارا۔

آذر بری طرح چونکا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ امی کو دیکھتے ہوئے اس کی نگاہوں میں اجنبیت تھی پھر اس کی نگاہیں زہرہ کے چہرے پر ٹکیں۔ ایک لمحے ان نگاہوں میں اجنبیت رہی پھر عجیب سی چمک نظر آئی۔ اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہلے۔

زہرہ اور جھکی۔ اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے گئی۔ آپا۔ آپا۔ وہ ہولے ہولے پکار رہا تھا۔ لہجے میں بے چینی تھی۔

"ہاں ننھے منے' یہ میں ہوں زہرہ۔ تمہاری آپا۔"

وہ بدستور اسی لہجے میں آپا۔ آپا۔ پکارتا رہا۔

زہرہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آذی۔ مجھے نہیں پہچانتے؟ میں تمہاری آپا ہوں۔"

آذر کی آنکھوں میں شناسائی جھلکی۔ "آپا۔ کہاں چلی گئی تھیں تم؟ یہ سب کیا ہو گیا؟"

امی خوشی سے رونے لگیں۔ کتنے دن بعد وہ ہوش کی باتیں کر رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ننھے منے؟" زہرہ نے اسے چمکارا۔

"ابا جان چلے گئے آپا اور کسی نے مجھے بتایا بھی نہیں۔" اس نے شکوہ کیا۔

وہ شکوے کرتا رہا اور زہرہ اسے بچوں کی طرح بہلاتی رہی۔ وہ نارمل زندگی کی طرف اس کا پہلا قدم تھا۔ اگلے چند دنوں میں اس کے قدم بڑھتے رہے۔ وہ زہرہ کا ہاتھ تھامے بڑھ رہا تھا۔ زہرہ بھی اسے پورا پورا وقت دے رہی تھی۔ اسے پوری طرح نارمل ہونے میں ایک ہفتہ لگا۔

"آپا تمہیں پتا ہے' ابا جان مجھ سے ناراض تھے۔" ایک دن اس نے زہرہ سے کہا۔

"یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم؟"

"دیکھو نا' انہوں نے کبھی مجھے خط نہیں لکھا۔ کسی اور کو بھی نہیں لکھنے دیا۔ مجھے اپنی بیماری کی۔۔۔ بلکہ موت کی بھی خبر نہیں ہونے دی۔"

"یہ بات نہیں۔" زہرہ نے کہا۔ "وہ نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری پڑھائی پر کوئی برا اثر پڑے۔ وہ تم سے اتنی محبت کرتے تھے کہ تمہیں دکھ سے بچانا چاہتے تھے۔"

"آپا' تمہیں نہیں معلوم' ابا جان مجھ سے بہت زیادہ ناراض تھے۔"

اس بار زہرہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "تم مجھے بے خبر سمجھ رہے ہو حالانکہ تم خود بے خبر ہو۔ تمہیں ان کی محبت کا اندازہ ہی نہیں اس لیے کہ انہوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔"

اب کے وضاحت طلب کرنے کی باری آذر کی تھی۔ "یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم؟"

"یہ تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔" زہرہ نے کہا۔ "ممو جان کو تم نے ان کی زندگی کے آخری دس برسوں میں دیکھا ہی نہیں۔ میں جانتی ہوں' وہ ویسے ہی محبت کرنے والے انسان تھے۔ مجھے انہوں نے اتنی محبت دی کہ ابو جان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی لیکن وہ محبت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ "مگر جب انہوں نے تمہیں انگلینڈ بھیجا تو تمہاری محبت نے انہیں کمزور کرنا شروع کر دیا۔ شروع کے تین چار سال تو وہ ضبط کرتے رہے پھر ان کا ضبط جواب دے گیا۔ میری شادی تو تمہارے جانے کے کچھ ہی عرصے بعد ہو گئی تھی۔ میں شادی کے بعد یہاں آئی ہی کم ہوں بلکہ رہنے کے لئے تو اب پہلی بار آئی ہوں۔ کبھی ایسے ضرور آ جاتی تھی کہ صبح آئی اور شام کو چلی گئی۔ ممو جان میں تبدیلی یہ آئی کہ وہ میرے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگے۔ صرف اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ میں تم سے کتنی قریب تھی۔ وہ مجھ سے صرف تمہاری باتیں کرتے تھے۔ اور ان کے لہجے میں بے پناہ محبت ہوتی تھی۔ تم جانتے ہو کہ وہ بیٹی کے گھر جانے کو کتنا برا سمجھتے تھے لیکن وہ ہمارے

ہاں آتے اور گھنٹوں تمہاری باتیں کرتے۔"

آذر حیرت زدہ سا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ یہ سب اس کے لئے ناقابلِ یقین تھا۔

"پھر ایک دن وہ آئے تو بہت خوش تھے" زہرہ کہے جا رہی تھی۔ "مجھ سے کہنے لگے 'میری توقع کے برعکس میرا آذر قابلِ فخر بیٹا ثابت ہوا ہے۔ جانتی ہو' وہ انگلینڈ میں پوری آزادی حاصل ہونے کے باوجود نہیں بھٹکا'۔ میری نگاہوں میں حیرت دیکھ کر انہوں نے وضاحت کی کہ انہوں نے تمہیں ولایت بھیج کر ایسا آزاد بھی نہیں چھوڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں تمہارے پل پل کی خبر رہتی ہے۔"

آذر سناٹے میں آ گیا۔ یہ تو اس نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا تھا۔

"یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ وہ ہمیشہ تمہارے کردار کے بارے میں فخریہ لہجے میں باتیں کرتے مگر جانے کیا بات تھی کہ بات کرتے کرتے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہتے 'کاش۔۔۔ کاش اس نے' لیکن انہوں نے کبھی جملہ پورا نہیں کیا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ بات ادھوری چھوڑ کر وہ افسردہ ہو جاتے پھر وہ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتے اور کہتے۔ 'تم نہیں جانتیں زہرہ' آذر بھی نہیں جانتا کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو۔ تم آبرو ہو میرے گھر کی۔۔۔ میرے بھائی کی نشانی ہو' میری سمجھ میں ان کی افسردہ کاش کا اس آخری بات سے تعلق کبھی نہیں آیا۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی۔

وہ تعلق جو زہرہ کی سمجھ میں نہیں آیا' اسے آذر سمجھ سکتا تھا اور سمجھ گیا تھا۔ زہرہ کی باتیں سنتے ہوئے وہ ابا جان کے اس تضاد کی وجہ سے الجھتا رہا تھا کہ ایک طرف وہ اس سے اتنی محبت کرتے تھے اور دوسری طرف انہوں نے اسے اتنی بڑی سزا دی کہ اسے اپنے جنازے میں بھی شریک نہیں ہونے دیا اور گھر بھر سے کاٹ کر رکھ دیا مگر اس آخری اشارے نے اسے سب کچھ سمجھا دیا۔ ابا جان اس سے بہت محبت کرتے تھے لیکن اس نے غلطی ہی اتنی بڑی کی تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود اور اتنی محبت کے باوجود اسے معاف نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی دانست میں اس نے ان کے گھر کی آبرو پر ہاتھ ڈالا تھا۔ شاید وہ ان کا بیٹا نہ ہوتا تو وہ اسے زندہ ہی نہ چھوڑتے۔ کاش۔۔۔ کاش وہ انہیں سمجھا سکتا۔۔۔ بتا سکتا کہ وہ غلط سمجھے تھے۔

اگلے روز زہرہ اپنے گھر چلی گئی۔ زندگی معمول کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ وہ مصوری میں کھو گیا۔

O☆O

آذر جمیل نے جام خالی کیا اور میز پر پٹک دیا۔ اس کا سر اور سر کے اندر دماغ یوں دکھ رہا تھا جیسے وہ سر کے بل میلوں دوڑا ہو۔ کچھ نشہ بھی تھا' جس نے اس کے اندر کی جھنجلاہٹ کو اور بڑھا دیا تھا۔ جھنجلاہٹ اس بات کی تھی کہ وہ زندگی کی کتاب کے ابتدائی صفحے کھولنے اور انہیں پڑھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ صفحے ایسے نہیں تھے جنہیں وہ شوق سے دہراتا' یاد کرتا۔ اس نے تو ان صفحات کو ذہن کے کسی نامعلوم نہاں خانے میں چھپا رکھا تھا۔ وہ یہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا لیکن آج پورا انتظام درہم برہم ہو گیا تھا' اس کی محفلِ نشاط برہم ہو چکی تھی۔ جن محرومیوں کو وہ چھپاتا تھا۔۔۔ خود سے بھی۔۔۔ تاکہ دنیا کے سامنے مضبوط انسان بن کر رہے' وہ تن برہنہ سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں اور پھر ماضی نے خود کو اس پر تھوپ کر اسے دکھی کر دیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں میں نمی محسوس کی تو جلدی سے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھیں لیکن آنکھوں میں نمی نہیں تھی۔ گویا اس کی مضبوطی کا حصار ماضی کی اس شورش کے نتیجے میں اندر سے چٹخا تھا مگر باہر سے ثابت و سالم تھا۔

وہ اٹھ کر گیا' نیند کی دو گولیاں نکالیں اور پانی کی مدد سے حلق سے اتار لیں پھر وہ نیند کے انتظار میں کاؤچ پر دراز ہو گیا۔ نیند ہی اسے ماضی اور اس کی محرومیوں کی یلغار سے بچا سکتی تھی۔

O☆O

ٹھیک اسی وقت اداکارہ ثنا گل اسٹوڈیو میں ایک رقص فلم بند کرا رہی تھی!

کیمروں کی رینج سے باہر کرسی پر بیٹھے ہوئے فلم فن کے نمائندے ریاض تبسم نے گہری سانس لے کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس سیٹ پر بیٹھے اسے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ کافی عرصے سے وہ انٹرویو کے لئے ثنا کے پیچھے پڑا ہوا تھا لیکن ثنا کے پاس وقت نہیں تھا۔ بڑی کوشش کے بعد وہ اس بات پر رضامند ہوئی کہ فلم زنگی کے سیٹ پر شوٹنگ کے دوران جب بھی موقع ملے گا' وہ اس کے سوالوں کے جواب دے گی مگر دو گھنٹے ہو چکے تھے اور اب تک ریاض کو ایک سوال کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ ریاض کو کوفت تو ہو رہی تھی لیکن اس کا کام ایسا تھا کہ اس میں یہ سب کچھ معمول کے مطابق تھا پھر یہ بھی تھا کہ یہاں وہ انجوائے کر رہا تھا۔ رقص اور وہ بھی ثنا گل۔ اس کے لئے تو سیٹ پر انتظار ہو جاتا تھا کہ لوگوں کو ہٹانا پڑتا تھا مگر ریاض یہاں ثنا کا مہمان تھا۔ اس کی تو تواضع بھی ہو رہی تھی۔

ریاض تبسم شوٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ثنا اس وقت رقص کا ایک ایکشن دے رہی تھی۔ بالآخر ہدایت کار آکاش ورما مطمئن ہو گیا۔ وہ اس پورے ایکشن کو ایک ہی شاٹ میں فلم بند کرنا چاہتا تھا اور وہ خاصا طویل شاٹ تھا۔ اسی لئے اتنی ریہرسل کی ضرورت پڑی ورنہ ثنا اتنی ماہر رقاصہ تھی کہ ایک ریہرسل کے بعد ہی شاٹ اوکے کر دیتی تھی۔

"اب ہم ٹیک کریں گے۔" آکاش ورما نے بلند آواز میں کہا پھر وہ کیمرا مینوں کو ہدایات دینے میں مصروف ہو گیا۔

ریاض تبسم برسوں سے فلمی صحافت سے وابستہ تھا۔ اس کی

سوجھ بوجھ کے سب ہی قائل تھے۔ اس وقت بھی یہ بات اس سے چھپی نہ رہ سکی کہ اس طویل شاٹ کے لئے اتنی زیادہ ریہرسل نینا کی وجہ سے نہیں کی گئی ہے۔ اس نے تو ہر ریہرسل میں درست ایکشن دیا تھا۔ درحقیقت آکاش ورما کو فکر اس بات کی تھی کہ کیمرامین اپنے کیمروں کو موو کرنے میں نینا کی رفتار کا ساتھ بھی دے سکیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ریہرسل کے دوران کیمرامینوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

شاٹ اوکے ہو گیا۔ سیٹ پر موجود ہر شخص مطمئن نظر آنے لگا۔ نینا ریاض کی طرف چلی آئی۔ "سوری۔" اس نے مترنم آواز میں کہا۔ "میں آپ کو بالکل وقت نہیں دے پا رہی ہوں۔ بہت شرمندگی ہے مجھے آپ سے۔"

ریاض کو حیرت ہوئی۔ ایسے موقعوں پر اسٹار معذرت نہیں کرتے تھے بلکہ ڈپلومیسی سے کام لے کر بہلاتے تھے اور نینا تو سپر اسٹار تھی پھر بھی وہ معذرت کر رہی تھی۔ "کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں پھر بھی انجوائے کر رہا ہوں۔"

"آپ کا یہ انتظار بے ثمر نہیں ہو گا۔" نینا بولی۔ "مجھے دو شاٹ اور دینے ہیں پھر شوٹنگ پیک اپ ہو جائے گی اور میں آپ کو پورا انٹرویو دوں گی۔ ایک مکمل نشست میں۔" ریاض کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ تو عنایت خسروانہ تھی اس کے لئے۔

آخری دو شاٹس میں دیر نہیں لگی۔ نینا تھوڑی دیر بعد اس کے پاس آ گئی۔ "آیئے میرے ساتھ۔"

ریاض اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ نینا نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "آجایئے۔"

ریاض کو پھر حیرت ہوئی۔ تاہم اس نے اگلی سیٹ سنبھال لی۔ "کہاں لے جا رہی ہیں آپ مجھے؟"

"کہیں بھی لے جاؤں۔ آپ کو انٹرویو چاہئے یا نہیں۔" نینا کے لہجے میں شوخی تھی۔

"آپ سے انٹرویو کے لئے تو میں کہیں بھی جا سکتا ہوں۔"

چند لمحوں بعد گاڑی سڑکوں پر بہہ رہی تھی۔ نینا مشاق ڈرائیور بھی ثابت ہو رہی تھی۔ ریاض خاموش بیٹھا ڈرائیو سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

دس منٹ بعد نینا نے گاڑی ایک بنگلے کے گیٹ پر روکی اور ہارن دیا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور نینا گاڑی اندر لے گئی۔

ڈرائنگ روم کی آرائش دیکھ کر ریاض کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بالکل انوکھی آرائش تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نینا کو واقعی رقص سے عشق ہے۔ دیواروں پر مجسمے تھے اور ہر مجسمہ رقص کے ایکشن میں تھا۔ ریاض ان مجسموں میں ایسا کھویا کہ اسے نینا کی موجودگی کا احساس بھی نہیں رہا۔

"میں دس منٹ لوں گی۔" نینا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "میں چینج کر کے آتی ہوں پھر کھانا کھائیں گے۔" وہ اسے جواب دینے کا موقع دیئے بغیر زینوں سے اوپر چلی گئی۔

ریاض بیٹھ گیا مگر وہ ان مجسموں میں ہی الجھا رہا۔ یہاں تک کہ نینا واپس آ گئی۔ "بہت اچھے لگے ہیں یہ مجسمے؟" اس نے پوچھا۔

ریاض نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ اس کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ اسے دیکھنے کا دیکھتا رہ گیا۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ نینا اتنی حسین ہے اور میک اپ اس کے حسن میں اضافہ نہیں کرتا بلکہ کمی واقع ہوتی ہے۔ اس کا حسن تو صحیح معنوں میں بے داغ تھا۔

اس کی محویت دیکھ کر نینا نے شوخ لہجے میں کہا۔ "آپ نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔"

"آپ بہت خوبصورت ہیں۔" ریاض نے بے ساختہ کہا پھر اسے خیال آیا کہ نینا کیا پوچھ رہی تھی۔ "آپ کا ڈرائنگ روم بہت خوبصورت ہے۔"

"آیئے۔ کھانا کھا لیں۔"

وہ ریاض کو ڈائننگ روم میں لے گئی۔ کھانے کے دوران ریاض نے جب بھی کوئی بات کرنا چاہی' نینا نے اسے روک دیا۔ "کھانا سکون سے کھائیں۔ انٹرویو بعد میں کر لیجئے گا۔" وہ بولی۔

کھانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ ملازمہ کافی لے آئی۔ نینا نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔۔۔ اب سوال کریں۔ اب یہ خصوصی انٹرویو ہو گا۔ میرا ایسا انٹرویو کبھی نہیں چھپا ہو گا۔ اب تو خوش ہیں۔"

"میں بہت شکر گزار ہوں آپ کا۔" ریاض نے پوری سچائی سے کہا۔ نینا اس کے انتظار کی وہ تلافی کر رہی تھی' جو اس کے گمان میں بھی نہیں تھی۔

ریاض سوال کرتا رہا اور نینا جواب دیتی رہی۔ ریاض کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ خطرناک حد تک صاف گو ہے۔ اس میں اپنے ساتھی اداکاروں اور اداکاراؤں کی سی ڈپلومیسی نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ اسے فلم انڈسٹری میں اپنے مستقبل کی پروا نہیں ہے بلکہ ریاض نے یہ رائے قائم کی کہ نینا تمام تر آثار اور امکانات کے باوجود فلم انڈسٹری میں زیادہ عرصہ رہے گی نہیں۔ حالانکہ بہت کم وقت میں وہ سپر اسٹار بن چکی تھی۔ اس جیسی کوئی اداکارہ جو رقص میں بھی ایسی مہارت رکھتی ہو' نہ تو فلم انڈسٹری میں موجود تھی اور نہ ہی یہ امکان تھا کہ طویل عرصے تک سامنے آ سکے گی۔ پروڈیوسر اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے لیکن وہ اندھا دھند فلمیں سائن کرنے کی قائل نہیں تھی۔ معاوضہ بھی وہ ایسا لے رہی تھی کہ بڑی سے بڑی اداکارہ کا معاوضہ اس کے نصف سے بھی کم تھا۔ اس کے باوجود ریاض تجسم کے خیال میں اسے فلمی صنعت سے تھوڑے عرصے میں جدا ہو جانا تھا۔ خواہ فلمی صنعت اسے خیرباد کہے یا وہ فلمی صنعت کو۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے صاف گو اور سچے لوگ جھوٹ اور مصلحت کی اس دنیا میں زیادہ دن نہیں

چلتے' خواہ کتنے ہی باصلاحیت ہوں۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ سپر اسٹار بن چکی ہیں۔" ریاض نے کہا۔ "لیکن یہ بھی ہے کہ ابھی تک آپ بڑی اداکارہ ثابت نہیں ہوئی ہیں بلکہ ابھی تک آپ محض ایک رقاصہ ہیں۔"

"مجھے اس کا اعتراف ہے۔ ابھی تک مجھے کوئی ایسا کردار نہیں ملا' جس میں میری اداکاری کی صلاحیتیں سامنے آئیں۔ وجہ یہی ہے کہ میں بہت اچھی رقاصہ ہوں پھر یہ بھی ہے کہ باکس آفس پر فلم ہٹ ہونا ضروری ہے۔ فلمیں ناکام ہوں گی تو پیسہ کون لگائے گا۔ فلم کون بنائے گا۔ یہ کاروبار ہے' آرٹ کی خدمت کوئی نہیں کرتا۔ آپ جانتے ہیں کہ کثرت سے فلمیں فلاپ ہونے کے نتیجے میں ہماری فلم انڈسٹری کس حال کو پہنچ گئی تھی لیکن اب اس میں جان پڑ رہی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اس میں میرا بھی کنٹری بیوشن ہے۔" وہ کہتے کہتے رکی اور اس نے گہری سانس لی۔ "لیکن اب زندگی میں مجھے موقع ملا ہے۔ یہ رول بہت پاور فل ہے۔ اس میں' میں خود کو بڑی اداکارہ ثابت کر سکوں گی۔"

"بہت خوب۔ یہ بتائیں کہ رقص کی آپ نے باقاعدہ تربیت لی ہے؟"

"جی ہاں اور ریاض بھی باقاعدگی سے کرتی ہوں۔"

"کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی فلموں میں ڈانس ڈائریکٹر کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔"

"وہ غلط کہتے ہیں۔" نینا نے بے حد سکون سے کہا۔

"وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ رقص کے ہر ایکشن میں کچھ اسٹیپس آپ کے اپنے ہوتے ہیں اور ان پر اچھے سے اچھا ڈانس ڈائریکٹر بھی اعتراض نہیں کر پاتا بلکہ وہ آپ کی صلاحیتوں کو سراہنے پر مجبور ہوتا ہے۔"

"یہ ایک الگ بات ہے۔" نینا مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں رقص کی گرامر سے واقف ہوں اس لئے اضافی اسٹیپس رچتی ہوں۔ ڈانس ڈائریکٹر سچے فنکار ہیں اس لئے انہیں سراہتے ہیں۔ یہ ان کی عالی ظرفی ہے۔ جہاں تک رقص کا تعلق ہے میں آزادانہ رقص کر سکتی ہوں لیکن فلم کا رقص مختلف چیز ہے۔ ڈانس ڈائریکٹر کے بغیر بات نہیں بن سکتی ہے۔ لہٰذا ایسی کوئی بات کہنا ڈانس ڈائریکٹرز کے ساتھ زیادتی ہے۔"

ریاض اس کی منصف مزاجی اور راست گوئی کا اور قائل ہو گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ ایک شاہکار انٹرویو کر رہا ہے اور اس میں نینا کا بڑا دخل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نینا نے اس سے پہلے کوئی انٹرویو دیا ہی نہیں تھا۔ وہ سوال کرتا رہا اور اسے بے ساختہ جواب ملتے رہے۔

پھر وہ محبت کی طرف آ گیا۔ "محبت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

نینا پہلی بار ہچکچائی۔ "محبت انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔" بالآخر وہ بولی۔ "لیکن ہر محبت محبت نہیں ہوتی۔ وہ لوگ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں' جنہیں سچی محبت مل جائے ورنہ محبت کسی ضرورت کے تحت بھی کر لی جاتی ہے اور کسی اور جذبے پر بھی لوگ محبت کا نقاب ڈال دیتے ہیں۔ وہ محبت بہرحال نہیں ہوتی۔"

"یعنی آپ کے خیال میں محبت بڑی کمیاب چیز ہے؟"

"جی ہاں۔ اور ہم فلمی لوگوں کے لئے تو نایاب ہی سمجھیں۔"

"اس کی وجہ؟"

نینا کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ "دراصل ہم لوگوں کی شخصیت کے گرد گلیمر کا ہالہ ہوتا ہے۔ ہماری شخصیت کے اصل خدوخال کسی کو نظر نہیں آتے۔ کوئی دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ سب ہمارے ظاہر پر مرتے ہیں۔ باطن کی خوبیوں اور خامیوں سے بے نیاز ہو کر اور محبت کا نتیجہ شادی کی صورت میں نکلے تو پھر خامیاں بری اور بڑی لگنے لگتی ہیں۔ یہ میں اس محبت کی بات کر رہی ہوں' جو سچائی سے قریب تر ہوتی ہے۔ ورنہ زیادہ تر لوگوں کی محبت محبت نہیں' کچھ اور ہوتی ہے۔ خاص طور پر دولت مند لوگ جو محبت کے نام پر کسی اداکارہ کو پروپوز کرتے ہیں تو درحقیقت وہ اس اداکارہ کو اس کی شہرت سمیت فتح کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تاکہ انہیں دیکھ کر لوگ کہیں۔ دیکھو' یہ ہے اداکارہ نینا کا شوہر۔ اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ ذرا سوچو نینا سے شادی کر لی اس نے۔"

"اس کی بھی کوئی وجہ ہو گی۔" ریاض کو اب اس انٹرویو میں لطف آ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے' شہرت کی آرزو ہر انسان کو ہوتی ہے' کسی کو کم کسی کو زیادہ لیکن جنہیں دولت مل جائے' انہیں شہرت کی کمی بہت بڑی لگتی ہے۔ یہ احساس انہیں کچوکے دیتا ہے کہ اتنی دولت کے ہوتے ہوئے بھی انہیں کوئی نہیں جانتا' کوئی اہمیت نہیں دی جاتی انہیں۔ انہیں پتا چلتا ہے کہ دولت کوئی بہت بڑا حوالہ نہیں اور یہ تلخ حقیقت ان سے ہضم نہیں ہوتی۔ جب وہ کچھ نہیں کر پاتے تو کسی اداکارہ سے اظہارِ محبت کرتے ہیں اور تحفے تحائف کے ذریعے اسے تسخیر کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ایسی شادیاں چار چھ ماہ چلتی ہیں۔ کسی فریق کو افسوس بھی نہیں ہوتا۔ زیادہ تر ایسی محبت ملتی ہے ہم اداکاراؤں کو۔"

ریاض مجسم حیران رہ گیا۔ یہ جواب ایسا تھا' جیسے انٹرویو پہلے سے طے شدہ ہو اور سوال نینا کو ایک ہفتہ پہلے دے دیے گئے ہوں اور اس نے اس پر ہوم ورک کیا ہو لیکن ایسا نہیں تھا اور اس کا مطلب واضح طور پر یہی تھا کہ نینا ان باتوں پر غور کرتی رہتی ہے۔ اس سے اس کی شخصیت کی گہرائی سامنے آتی تھی۔ ریاض کا واسطہ ایسی کسی ایکٹریس سے کبھی نہیں پڑا تھا بلکہ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ حسن کی یہ دیویاں سوچ بھی سکتی ہیں۔

"آپ کو کبھی محبت ملی؟" ریاض کا سوال بہت شارپ تھا۔

"جی نہیں۔ البتہ اظہارِ محبت کرنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔" نینا نے بلا جھجک جواب دیا۔

"آپ نے کسی کو قبول بھی نہیں کیا؟"

"جی نہیں۔ میں نے ایسے ہر اظہار کو 'جھنے' پرکھنے کی کوشش کی اور آخر میں رد کردیا۔ میرے خیال میں ہر اداکارہ کو یہی کرنا چاہئے اس لئے کہ سب سے زیادہ ہمیں ہی جھوٹے اظہارِ محبت سے واسطہ پڑتا ہے۔ ذاتی طور پر میں محبت کے نام پر دھوکا کھانے کی قائل نہیں۔ غرض کی تجارت کرنی ہوئی تو اسے تجارت سمجھ کر ہی کروں گی۔ اس پر محبت کا جھوٹا لیبل کبھی نہیں لگاؤں گی۔"

"تو کبھی یوں بھی ہوتا ہوگا کہ کوئی اداکارہ سچی محبت سے محرومی کے ساتھ پوری زندگی گزار دے؟"

"کبھی نہیں، زیادہ تر یہی ہوتا ہے۔ ہمیں ہر طرح کے فریب سے واسطہ پڑتا ہے۔ جذباتی طور پر ہم اداکارائیں سب سے زیادہ عدم تحفظ کا شکار ہوتی ہیں۔ دیکھیں نا، ہمارے پرستار بھی ایک عام عورت کی طرح ہماری عزت نہیں کرتے۔ ہمیں وقتی طور پر دل بہلانے والا کھلونا سمجھا جاتا ہے پھر ہمارے پاس دولت بھی ہوتی ہے۔ اس کے شکاری الگ ہماری گھات میں رہتے ہیں۔ ایسے میں سچی محبت کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔"

وہ اداکاروں کے نفسیاتی مسائل بہت اچھی طرح بیان کررہی تھی۔ ریاض نے کہا۔ "تو گویا یہ کوئی کمپلیکس ہوا۔"

"ہاں۔ عدم تحفظ کمپلیکس تو پیدا کرتا ہی ہے۔"

"تو کسی اداکارہ کے سامنے سچی محبت آئے تو زیادہ امکان یہی ہوگا کہ وہ اس پر شک کرکے اسے مسترد کردے گی۔"

وہ پھر کچھ دیر کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ "جی ہاں، یہ تو ہوگا۔ دیکھیں، میرے نزدیک محبت بھی ایک طرح کا رزق ہے اور رزق مقدر سے ملتا ہے لیکن شاید زیادہ تر اداکارائیں ایک دو تجربے کے بعد محبت کا خیال ہی دل سے نکال دیتی ہیں۔ انہیں محبت کی پروا نہیں رہتی مگر میں اپنے بارے میں کہہ سکتی ہوں کہ مجھے سچی محبت ملی تو میں اسے پہچان لوں گی اور اسے کمپلیکس کی نذر کرکے ضائع نہیں کروں گی۔ میں محبت کی طلب سے دست بردار نہیں ہوئی ہوں۔"

"یعنی آپ محبت کی اہلیت رکھتی ہیں؟"

"محبت کی اہلیت تو ہر انسان میں ہوتی ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی سبھی کو ہوتی ہے۔ جو لوگ اس کی طلب سے دست بردار ہوجائیں، وہ نرمی اور گداز سے 'لطافت سے' زندگی کی بہت بڑی خوبصورتی سے محروم ہوجاتے ہیں۔ میں اپنے لئے یہ پسند نہیں کروں گی۔"

"آپ نے کبھی محبت کی؟"

"میری تو زندگی ہی محبت کرتے ہوئے گزری ہے۔" نینا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ جانتی ہیں، میں کس محبت کی بات کررہا ہوں؟"

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "ہاں۔ ایک بار کی تھی۔ مگر دکھ اور جدائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ اب بھی مجھے کسی سے محبت ہوئی تو میں اسے ضائع نہیں کروں گی۔"

"آپ کو کس قسم کے لوگ اچھے لگتے ہیں؟"

"مجھے مردوں میں جو خوبی سب سے زیادہ پسند ہے، وہ ذہانت ہے۔" نینا نے جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ مجھے جس شخص سے محبت ہوگی، وہ جینئس ہوگا اور اس کی شخصیت باوقار ہوگی۔ جامہ زیب وہ ایسا ہوگا کہ جو لباس بھی پہن لے، وہ اس پر سجے۔" اس کا لہجہ خوابناک ہوگیا۔ "اور وہ بہت مضبوط مرد ہوگا۔"

"آئے دن آپ کے اسکینڈل بنتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی اخبار میں کسی کے ساتھ بھی آپ کی شادی کی خبر چھپ جاتی ہے۔"

"لیکن میں اب بھی غیر شادی شدہ ہوں۔" نینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ تردید کرتی ہیں نہ تصدیق۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"سادہ سی وجہ ہے۔ تصدیق اس لئے نہیں کرتی کہ غلط بات کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ تردید اس لئے نہیں کرتی کہ ہر اگلی افواہ پچھلی افواہ کی تردید کردیتی ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ اٹ از پارٹ آف دی گیم۔ اسکینڈل سے پبلسٹی ملتی ہے۔"

"شادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں واضح طور پر کہہ رہی ہوں کہ میری شادی خفیہ نہیں ہوگی۔" نینا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میرے شادی کرنے سے ایک سال پہلے پوری دنیا کو معلوم ہوجائے گا کہ میں شادی کررہی ہوں۔ اس لئے کہ میں فلمیں سائن کرنا بند کردوں گی اور اپنے فلم سازوں کو نوٹس دے دوں گی کہ میری شادی سے پہلے ایک سال کے اندر اندر میرا کام مکمل کرلیں۔"

"کیوں؟"

"میں صرف شادی نہیں کرنا چاہتی، ازدواجی زندگی گزارنا چاہتی ہوں اور میرے خیال میں یہ فل ٹائم جاب ہے۔ شادی کے بعد میں خالص گھریلو عورت بن کر رہوں گی۔ میں بہت اچھی بیوی اور بہت اچھی ماں ثابت ہوں گی۔"

"بہت بہت شکریہ نینا جی۔" ریاض تبسم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"وش یو گڈ لک۔"

ریاض باہر نکلا تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ ایک تہلکہ مچا دینے والا انٹرویو اس کے پاس تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس انٹرویو کی اشاعت سے اسے بہت فائدہ ہوگا لیکن اس سے کہیں زیادہ فائدہ نینا کو پہنچے گا۔ اس کا امیج ایسا بنے گا... مگر وہ اس کی مستحق بھی تھی۔ اتنی مختلف، پڑھی لکھی اور سلجھے ہوئے ذہن کی ہیروئن فلمی صنعت کو کبھی میسر نہیں آئی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک سرخی گونجی۔ جھوٹ کی نگری میں سچ کی روشنی!

○☆○

نینا نے دودھ کا گلاس خالی کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھا اور بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔

وہ بہت خوش تھی۔ یہ انٹرویو اس کے لئے بہت بڑی کامیابی تھی۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا کہ اس نے اس قدر تفصیلی انٹرویو دے ڈالا تھا۔ اس سے پہلے وہ سیٹ پر سرسری سے انٹرویو دیتی رہی تھی۔ وہ بے حد ذہین تھی' پڑھی لکھی بھی تھی۔ جانتی تھی کہ صحیح وقت پر درست قدم اٹھانے کی کتنی زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور نامناسب وقت پر صحیح قدم اٹھانا بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔

اب تک وہ اداکارہ سے زیادہ رقاصہ تھی جو کم سے کم لباس میں ہیجان انگیز رقص فلم بند کرانے کے لئے تیار رہتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اسے کوئی اچھا رول نہیں ملا تھا۔ اسے اچھے رول کا انتظار تھا اور اس انتظار کے دوران اسے انڈسٹری میں وقت گزارنا تھا۔

آٹھ ماہ پہلے اسے وہ رول مل ہی گیا جس کی وہ منتظر تھی۔ نرگی کا ٹائٹل رول ایک رقاصہ کا تھا لیکن اس میں اداکاری کا اسکوپ بہت زیادہ تھا اور وہ جانتی تھی کہ اس نے بہت اچھی پرفارمنس دی ہے۔ فلم تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ دو تین ماہ کے بعد اسے ریلیز ہونا تھا۔ نینا جانتی تھی کہ نرگی ہٹ ہو گئی تو وہ نمبرون کہلائے گی اور فلم کا ہٹ ہونا قسمت سے ہوتا ہے لیکن نینا صرف قسمت پر انحصار کرنے کی قائل نہیں تھی۔ اس فلم کو ہٹ کرانے کے لئے وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ اور کر رہی تھی۔ یہ انٹرویو بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا۔

نینا نے اس انٹرویو کے معاملے میں ایک تیر سے دو نہیں' کئی شکار کئے تھے۔ ریاض تبسم یہ سمجھ رہا تھا کہ سرسری انٹرویو کی جگہ تفصیلی انٹرویو کا موقع اسے خوش قسمتی سے ملا ہے پھر وہ نینا کے حسنِ اخلاق کا بھی ہمیشہ کے لئے معترف ہو گیا تھا۔ اس کے خیال میں نینا نے اس کے انتظار کی تلافی کی تھی حالانکہ نینا کو ہر قیمت پر وہ انٹرویو دینا تھا۔ اس کے لئے اس نے بساط بچھائی تھی اور ہر چال بہت سوچ سمجھ کر چلی تھی ورنہ ایک بار ریاض کی طرح ایک اور صحافی چھ گھنٹے تک نینا کے سرسری سوال جواب کے لئے خوار ہوا تھا اور آخر میں نینا نے اسے سوری کہہ کر ٹال دیا تھا۔

نینا نے حساب لگایا تھا کہ اب تفصیلی انٹرویو کا وقت آ چکا ہے۔ وہ ایک بہت اچھے کردار میں بہت اچھی پرفارمنس دے چکی تھی۔ فلم کی ریلیز سے پہلے اس کی پاور فل پبلسٹی کے لئے ایک ایسا انٹرویو ضروری تھا جو پڑھنے والوں کے ذہن سے کبھی محو نہ ہو اور جو اس انٹرویو کو پڑھے وہ فلم نرگی دیکھنے پر مجبور ہو جائے۔ پہلا اہم فیصلہ یہ تھا کہ انٹرویو کسے دیا جائے۔ بہت غور و خوض کے بعد نینا نے ریاض تبسم کا انتخاب کیا۔

ریاض تبسم فلمی پرچے فلم فن کا نمائندہ تھا لیکن نینا جانتی تھی کہ صحافتی حلقوں میں اس کی بڑی وقعت ہے۔ ملک کے سب سے بڑے اخبار میں اس کے کئی انٹرویو چھپ چکے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ ریاض اس غیر معمولی انٹرویو کو فلم فن تک محدود نہیں رکھے گا بلکہ یہ انٹرویو روزنامہ نسکار میں بھی ضرور شائع ہو گا اور روزنامہ نسکار ہر گھر میں پڑھا جانے والا اخبار تھا۔

یعنی نینا طے کر چکی تھی کہ ریاض کو یہ انٹرویو دینا ہے!

پھر نینا نے حساب لگایا کہ اسے پڑھنے والوں پر اور اپنے پرستاروں پر اپنی آف دی اسکرین شخصیت کا کیا اثر مرتب کرنا ہے۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد عام اداکاروں سے مختلف امیج اپنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک بے لاگ تبصرہ کرنے والی سیدھی' سچی اور صاف گو لڑکی کے روپ میں ان کے سامنے آئے۔ اسی امیج کے تحت اس نے ریاض تبسم کے ہر سوال کا جواب بظاہر بے ساختہ' لیکن درحقیقت بہت سوچا سمجھا اور محتاط جواب تھا۔ خصوصاً محبت اور شادی کے بارے میں جواب بہت سوچے سمجھے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سوال ضرور کئے جائیں گے۔ تمام اداکارائیں انٹرویو دیتے ہوئے یہیں تو مار کھاتی ہیں۔

اس انٹرویو میں سچ بھی تھا اور جھوٹ بھی۔ سچ بہت بڑے لیکن غیر اہم تھے اور جھوٹ بہت چھوٹے چھوٹے لیکن اس اعتبار سے بہت اہم تھے کہ انہیں اس کا بہت اچھا امیج بنانا تھا۔ مثلاً محبت اور شادی کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا تھا' سچ تھا۔ ہر اداکارہ محبت کی طلب کرتی' لیکن محبت سے ڈرتی ہے۔ عدم تحفظ اور استعمال ہونے کا خوف ہر اداکارہ کو ستاتا ہے۔ یہی معاملہ شادی کا ہے۔ یہ بہت بڑی سچائیاں تھیں۔ پڑھنے والا ان کے حوالے سے اسے بہت شدت کے ساتھ سچی' کھری اور صاف گو اداکارہ سمجھے گا اور فطری طور پر پورے انٹرویو کو' اس کی ہر بات کو سچ سمجھے گا۔

جھوٹ چھوٹے چھوٹے لیکن اہم تھے۔ مثلاً ڈانس ڈائریکٹرز والا سوال۔ درحقیقت وہ خوش ہوتی تھی اس بات پر کہ اس کے معاملے میں ڈانس ڈائریکٹرز کو غیر ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ رقص کے معاملے میں اس کی عظمت کا اعتراف تھا لیکن اس کے جواب سے تمام ڈانس ڈائریکٹرز اس سے خوش ہو جائیں گے۔ وہ اس کا اور زیادہ احترام کریں گے اور اس کے رقص پر اور زیادہ محنت کریں گے۔ اسی طرح سے اس نے صاف گوئی کا امیج بنا کر تمام اہم لوگوں کو خوش کیا تھا۔

نرگی کے بارے میں اس نے جو کچھ بھی کہا تھا' سچ تھا لیکن اس میں اس کی غرض بھی شامل تھی۔ اس فلم ہی کی خاطر تو اس نے یہ انٹرویو دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اس طرح کا انٹرویو دینے سے بچتی رہی تھی کہ ناقدین کی نظر میں وہ چھوٹی اداکارہ کا بڑا انٹرویو ٹھہرتا لیکن اب وہ مستقبل کی نمبرون اداکارہ تھی۔

وہ جانتی تھی کہ اس نے جو جھوٹ بولے ہیں' انہیں کوئی جھوٹ نہیں سمجھے گا۔ لوگ جب کسی کو سچا مان لیں تو اس کے منہ سے نکلنے والی ہر بات سچ سمجھی جاتی ہے۔ اہم ترین بات یہ تھی کہ

اس نے انٹرویو لینے والے صحافی کو متاثر کر دیا تھا۔ ایک ایسے صحافی کو جو فلمی ستاروں کے جھوٹ سننے اور پکڑنے کا عادی تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب ریاض تبسم ہمیشہ اس کی مدح سرائی کرے گا اور اپنی تحریروں میں اس کی تعریف کر دے گا۔ قارئین کا متاثر ہونا تو لازمی ہے۔

ایسا ہوتا ہے کہ کوئی عقل مند اور ذہین آدمی لوگوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے اور بے ضرر راز بے ساختگی کے ساتھ بتا کر یہ تاثر قائم کرتا ہے کہ وہ منہ پھٹ ہے اور خود کو چھپا کر رکھنا اسے نہیں آتا لیکن کسی کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس شخص نے اپنے بڑے اور اہم رازوں کو ہمیشہ کے لئے ان کے تجسس تک سے محفوظ کر لیا ہے۔

نیا کو یاد تھا' ریاض نے اس سے پوچھا تھا۔ "آپ کی زندگی کا سب سے بڑا خواب؟"

اور اس نے بے ساختہ جواب دیا تھا۔ "میرے پاس خواب دیکھنے کی فرصت ہی نہیں۔ بڑی مشکل سے سونے کے لئے وقت ملتا ہے تو بے سدھ ہو کر سوتی ہوں اور نیند پوری ہونے سے پہلے اٹھنا پڑ جاتا ہے۔ خواب کیسے دیکھوں؟"

حالانکہ اس کا ایک خواب تھا۔ وہ خواب شاید فلمی دنیا کی ہر ہیروئن دیکھتی ہے۔ ان میں جو بے وقوف ہوتی ہیں وہ اسے ٹی وی پر یا صحافیوں کے یا پبلک کے سامنے بیان کر دیتی ہیں۔ یہ نہیں سوچتیں کہ صرف خواب دیکھنا کافی نہیں۔ جس خواب کی تعبیر ناممکن ہو' اسے بیان کرنا اپنا مذاق اڑوانے کے برابر ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں' یہ منہ اور مسور کی دال! نیا یہ نہیں سننا چاہتی تھی اس لئے اس نے اپنا خواب چھپا کر رکھا تھا۔

نیا کا خواب بھی وہی تھا جو شاید ہر فلمی ہیروئن کا ہوتا ہے۔ ہالی ووڈ لیکن اس کے لئے وہ محض خواب نہیں تھا۔ وہ اس خواب کو سچ ہوتے دیکھنا چاہتی تھی۔ بس اسے ایک موقع کی تلاش تھی اور پہلا مرحلہ ملک میں نمبرون ہیروئن کا مقام حاصل کرنا تھا۔ اس نے اس سمت میں پہلا قدم اٹھا لیا تھا۔

اس نے تکیے پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور بڑبڑائی۔ "تو ہالی ووڈ۔ سوئٹ ہالی ووڈ۔ ویٹ فار می۔ آئی ول بی کمنگ۔"



انور کی امریکا روانگی کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے اب اگلے روز اسے چلے جانا تھا مگر وہ بہت پریشان تھا۔ جس دن اس نے پاپا سے امریکا جانے کے سلسلے میں بات کی تھی اور مضبوط انسان بننے کے عزم کا اعلان کیا تھا اس دن سے پاپا بالکل بدل کر رہ گئے تھے۔ یہ تبدیلی ظاہری طور پر تو اتنی نمایاں نہیں تھی۔ کسی اور کو تو پتا بھی نہ چلتا لیکن وہ پاپا کا چہیتا بیٹا تھا اور بچپن سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہے۔

ظاہری تبدیلی یہ تھی کہ پاپا کی آنکھیں متورم رہنے لگی تھیں اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ انور جانتا تھا کہ اس کی دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پاپا کی مے نوشی بڑھ گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی نیند پوری نہیں ہو رہی ہے۔ شاید انہیں اچھی اور گہری نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔

"تو کیا اس کا سبب میرا دور جانا ہے؟" اس نے سوچا۔ یہ بہت خوش کن خیال تھا لیکن اس نے فوراً ہی اسے مسترد کر دیا۔ اسے پاپا سے آخری گفتگو بہت اچھی طرح یاد تھی۔ پاپا نے زندگی میں کبھی کسی کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ اسے بھی نہیں۔ حالانکہ دنیا میں سب سے زیادہ وہ اسی کو چاہتے تھے لیکن وہ عقل سے سوچنے والے آدمی تھے۔ جذباتی نہیں تھے۔ ہر معاملے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے اسی لئے وہ اس کے امریکا جانے کے حق میں تھے۔ ملک کی فضا ایسی تھی اور بے یقینی ایسی شدید تھی کہ ان کے خیال میں یہاں کوئی یکسوئی سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

پاپا کی مے نوشی معمول کے خلاف نہیں تھی لیکن وہ ہمیشہ فائدہ مند ثابت ہوئی تھی۔ ذرا ترنگ میں آتے تو پاپا خوش مزاج ہو جاتے۔ ان کی شخصیت تبدیل ہو کر رہ جاتی' جیسے ان کے اندر سورج طلوع ہو گیا ہو۔ شراب پی کر وہ بہکے کبھی نہیں تھے۔ خیر بہکتے تو وہ اب بھی نہیں تھے لیکن اب پینے کے بعد خوش مزاجی نہیں آتی تھی بلکہ وہ اور بجھ جاتے تھے۔

انور پریشان تھا تو غلط نہیں تھا۔ باپ کی عمر ۸۸ سال تھی اور وہ اسے چھوڑ کر امریکا جا رہا تھا جب کہ اس کے جانے کی بات ہونے کے بعد سے باپ کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آئی تھی اور وہ تبدیلی حتمی تھی۔ ایسے میں وہ یہی سوچ سکتا تھا کہ باپ کو تنہائی کے احساس نے پریشان اور پژمردہ کر دیا ہے۔ یہ غیر فطری بات بھی نہیں تھی۔ ۸۸ سال کی عمر میں تنہائی را جا اندر کی محفل نہیں ہو سکتی' کوئی لاکھ دعویٰ کرتا رہے۔ وہ تو بہت خوف ناک تنہائی ہوتی ہو گی۔ جیسے روئے زمین پر صرف ایک انسان رہ گیا ہو۔

انور یوں کب تک پریشان ہوتا۔ اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ باپ کے پاس چلا گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ آذر جمیل بہت سویرے اٹھنے کا عادی تھا۔ اسے بیدار ہوئے دیر ہو چکی تھی لیکن ابھی وہ خواب گاہ میں ہی تھا۔

انور نے دروازے پر دستک دی۔ "کم اِن" اندر سے آذر نے بھاری آواز میں کہا۔

انور نے دروازہ کھولا اور کمرے میں چلا گیا۔

آذر بیڈ پر ہی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے رائٹنگ پیڈ رکھا تھا اور ہاتھ میں پنسل تھی۔ اس نے سر اٹھا کر انور کو دیکھا اور مسکرا دیا لیکن وہ بے جان مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ زبردستی مسکرایا ہو۔ "آؤ انور' بیٹھو۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

انور نے کرسی اٹھائی' بیڈ کے پاس لا کر رکھی اور اس پر بیٹھ گیا۔ "شکریہ پاپا۔" اس نے آہستہ سے کہا پھر اس نے آذر کو غور

سے دیکھا۔ آج اس کی آنکھیں اور زیادہ متورم لگ رہی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور گہرے ہو گئے تھے۔

"تو کل تم جا رہے ہو۔" آذر نے کہا۔ انداز ایسا تھا' جیسے اسے یاد دلا رہا ہو۔

"جی پاپا۔"

"اور اپنی ضد پر قائم ہو؟"

"یہ ضد نہیں پاپا' آپ کو خوش کرنے کی کوشش ہے۔ آپ کی ایک خواہش کا احترام ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ تم میری کس خواہش کی بات کر رہے ہو؟"

"آپ مجھے مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ میں تنہائی جیسی فطری چیز سے نہ ڈروں۔ میں مضبوط بننے کی' آپ کی خواہش پوری کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

آذر جھنجلا گیا۔ "کسی کے لفظ پکڑنا۔ اور ان کا اصل مفہوم سمجھے بغیر پکڑنا ذہانت کی کمی کی دلیل ہے لیکن میرے بیٹے کے پاس ذہانت کی کمی نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب ہے کہ تم ذہانت سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہو۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم مضبوط ہو مگر جذباتیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر حقائق سے نظریں چرانا کمزوری ہے اور یہ کمزوری دور ہونی چاہئے۔ دوسری بات یہ کہ پردیس کی تنہائی کا تمہیں تجربہ نہیں۔"

"اب ہو جائے گا۔" انور نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ "اور میں نے جذباتیت والی کمزوری سے بھی نجات حاصل کر لی ہے۔ آپ پھر بھی مجھ سے شکایت کر رہے ہیں۔ میں تو امریکا بھی مضبوط بننے کے لئے جا رہا ہوں۔" پاپا کی نظروں میں سوال دیکھ کر اس نے وضاحت کی۔ "دیکھیں نا' یہاں میں اوسط درجے کا ڈاکٹر ہوں اور اوسط درجہ کمزوری کی دلیل ہے اسی لئے مجھے امریکا جا کر اسپیشلائزیشن کرنے کا خیال آیا ہے۔"

آذر یہ سن کر مسکرایا۔ وہ اس کی مخصوص مسکراہٹ تھی' جس میں آنکھیں چمکنے لگتی تھیں۔ "مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔" اس نے کہا۔ "لیکن ڈاکٹر بھی اوسط درجے کا نہیں ہوتا۔ وہ خدمت جو کرتا ہے انسانوں کی اور وہ کمزور بھی نہیں ہوتا۔ میں تمہیں روک اس لئے نہیں رہا ہوں۔ بلکہ تمہارے جانے پر اس لئے اصرار کر رہا ہوں کہ تم بہت بڑے ڈاکٹر بن جاؤ گے۔ یہ میرا خواب ہے اسی لئے میں نے تمہیں اصرار کر کے میڈیکل میں داخلہ دلایا تھا۔"

انور نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "پریکٹیکل لوگوں کے پاس خواب بھی ہوتے ہیں؟" اس کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔

"ہاں ہوتے ہیں بلکہ خواب دیکھنے کا حق بھی انہی کو ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ تعبیر کی فکر کرتے ہیں اور تعبیر پاتے بھی ہیں۔"

انور لاجواب ہو گیا۔ "لیکن میرا ڈاکٹر بننا آپ کا خواب کیسے تھا۔ اور کیوں تھا؟"

آذر چند لمحے سوچتا رہا جیسے یادیں تازہ کر رہا ہو پھر وہ بولا۔ "میری والدہ۔ تمہاری دادی کا انتقال ہوا تو میں چالیس سال کا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری دادی کی موت ڈاکٹر کی نااہلی کی وجہ سے ہوئی۔ اس کے ساتھ میرا جی چاہا کہ کاش میں نے ڈاکٹری کی ہوتی اور امی کا علاج میں خود کرتا۔ سینے میں آگ بھڑک اٹھی تھی مگر پریکٹیکل آدمی ہوں۔ جانتا تھا کہ میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ مجھ میں اہلیت ہی نہیں ہے اس کی سو میں نے اس خواب کو اپنے سب سے پسندیدہ بیٹے کے لئے محفوظ کر لیا۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ "اولاد ہوتی ہی اس لئے ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "آدمی اپنی ہر محرومی کی تلافی اولاد کے ذریعے کر سکتا ہے۔ یہی ایک صورت ہوتی ہے محرومی سے نجات حاصل کرنے کی۔ تم نے میری محرومی دور کر دی۔"

انور کے لئے وہ انکشاف تھا۔ پاپا نے پہلی بار یہ بات بتائی تھی لیکن اسے یہ یاد تھا کہ پاپا جو اپنے فن اور اپنی مصروفیات کے علاوہ ہر چیز سے بے نیاز تھے' اس کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیتے رہے تھے۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اب اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی تھی۔

"تم ہمیشہ بات اِدھر کی اُدھر کر دیتے ہو۔" آذر نے جھنجلا کر کہا۔ "میں تمہیں یہ سمجھا رہا ہوں کہ میری ہر چیز پر تمہارا حق ہے۔ میرا ریفرنس تمہارے لئے باعثِ شرم نہیں ہونا چاہئے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پردیس میں اجنبی اور اکیلے رہو۔"

"ایسا نہیں ہو گا پاپا۔ میں اپنے لئے خود ماحول بنا سکتا ہوں اور بناؤں گا۔ میں وہاں تنہائی کا شکار بھی نہیں ہوں گا۔ میں بچہ تو نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ جو جی چاہے' کرو۔" آذر نے غصے سے کہا۔

"شکریہ پاپا۔" انور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن آج آپ نے مجھے بھٹکایا ہے۔ میں آپ کے پاس یہ باتیں کرنے نہیں آیا تھا۔ مجھے کوئی اور بات کرنی تھی آپ سے۔"

"کرو۔" آذر نے بے زاری سے کہا۔

"پاپا۔ میں آپ کے لئے پریشان ہوں۔"

آذر نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم پریشان ہو؟ میرے لئے! کیسی احمقانہ بات ہے۔ کیا تک ہے پریشانی کی؟ کوئی وجہ بھی تو ہو۔"

"وجہ تو ہے۔ پچھلے دو ہفتوں سے آپ پریشان لگ رہے ہیں۔"

"میں پریشان نہیں ہوں۔"

"آپ پریشان ہیں اور اس کا اثر آپ کی صحت پر پڑ رہا ہے۔ نمایاں طور پر نظر آ رہا ہے۔"

آذر ہنسنے لگا۔ "اوہ تم ڈاکٹر ہو نا۔"

"جی نہیں۔ یہ فرق تو عام آدمی کو بھی نظر آ جائے گا۔" انور

نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "آپ نے شاید کئی دن سے آئینہ نہیں دیکھا۔"

"روز دیکھتا ہوں۔ خود سے بہت پیار ہے مجھے۔" آذر نے شگفتگی سے کہا۔

"تو یہ کیسی حقیقت پسندی ہے کہ آپ کو اپنی متورم آنکھیں اور ان کے نیچے سیاہ حلقے نظر نہیں آتے۔"

"نظر آتے ہیں۔ میری عمر میں یہ اونچ نیچ' یہ دھوپ چھاؤں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔"

"اس کا عمر سے کوئی تعلق نہیں" انور کے لہجے میں جھنجلاہٹ آگئی "آپ سدا بہار آدمی ہیں لیکن ان دنوں کوئی پریشانی آپ کو نڈھال کر رہی ہے۔ اور وہ یقیناً کوئی بہت بڑی پریشانی ہوگی۔"

"تم ڈاکٹر ہو۔ علم قیافہ کے ماہر نہ بنو۔"

"یہ قیافہ نہیں' مشاہدہ ہے۔ آپ کی نیند بھی متاثر ہوئی ہے۔"

"یہ درست ہے۔ بات صرف نیند کی کمی کی ہے۔" آذر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ میری پوری بات سن لیں۔ آج کل آپ کی مے نوشی بھی بڑھ گئی ہے اور آپ خوش مزاج بھی نہیں رہے۔ یہ بھی پریشانی کی علامت ہے۔ پھر میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آپ معمول سے زیادہ ٹرینکولائزرز لے رہے ہیں اور نیند آپ کو پھر بھی نہیں آتی۔"

"اتنے عالم و فاضل ہو تو پھر میری پریشانی سے بھی واقف ہوگے" آذر جھنجلا گیا۔

"اندازہ لگا سکتا ہوں" انور نے کہا "میرا خیال ہے کہ آپ میرے اتنی دور جانے سے اور اپنی تنہائی کے خیال سے پریشان ہیں۔"

آذر جوش اور غصے میں اٹھ کھڑا ہوا "کیا بک رہے ہو۔ ہزار بار بتا چکا ہوں کہ مجھے تنہائی سے کبھی ڈر نہیں لگا اور نہ ہی کبھی لگے گا اور رہی تمہارے جانے کی بات تو تم میرے خواب کی تعبیر کو آگے بڑھانے کے لئے جا رہے ہو۔ یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے' پریشانی کی نہیں۔"

"تو پھر اپنی پریشانی بتایئے مجھے۔"

"مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے" آذر نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

"پریشانی تو ہے لیکن آپ بتانا نہیں چاہتے۔ اب میرے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ میں اپنا جانا کینسل کر دوں۔ میں آپ کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں سکون سے کچھ کر بھی نہیں سکوں گا وہاں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ جانا تو تمہیں پڑے گا" آذر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"پاپا میں بچہ نہیں ہوں" انور نے احتجاج کیا۔

"میرے لئے تو بچے ہی ہو" آذر نے کہا پھر نرم لہجے میں بولا۔ "تم جانتے ہو کہ تمہارے جانے کی میرے لئے کیا اہمیت ہے۔"

"لیکن میں اس طرح نہیں جا سکتا۔ آپ مجھے بتا دیجئے کہ آپ کو پریشانی کیا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

"فرق پڑے یا نہ پڑے۔ میرے لئے یہ ضروری ہے۔"

"میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ کوئی اہم بات نہیں" آذر نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مجھے جو پریشانی ہے' وہ بے حد نجی نوعیت کی ہے۔ میں کسی کو بھی نہیں بتا سکتا۔ تمہیں بھی نہیں۔"

"تو پھر میں جاؤں گا بھی نہیں۔"

"اس لئے میں مضبوطی اور کمزوری کی بات کرتا ہوں" آذر کو ایک دم غصہ آگیا "آج پہلی بار میں نے تمہیں اپنے ایک خواب اور اس کی تعبیر کے بارے میں بتایا اور آج ہی میں کمزور بھی ہو گیا۔ مضبوط ہونا اس لئے ضروری ہے کہ انسان طبعاً بلیک میلر ہوتا ہے۔ فائدہ اٹھانے کے ہر موقع کی تاک میں رہتا ہے۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" انور نے کمزور لہجے میں کہا۔ اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

"تم جانتے ہو کہ تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔"

"یہ بلیک میلنگ نہیں ہے پاپا۔ میں آپ کے لئے پریشان ہوں اور اس پریشانی کے ساتھ امریکا نہیں جا سکتا۔"

"تم مانو یا نہ مانو' یہ بلیک میلنگ ہے" آذر نے سخت لہجے میں کہا "خواب آدمی کی کمزوری ہوتے ہیں اور کسی کے ہاتھ کسی کی کمزوری لگ جائے تو وہ اس سے کس طرح فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی لئے میں ہمیشہ مضبوط بن کر رہا۔ پہلی بار مجھ سے چوک ہوئی اور وہ بھی بیٹے کے معاملے میں۔ انجام خود دیکھ لو۔ تمہیں اندازہ ہو گیا کہ میں تمہارے امریکا جانے میں انٹرسٹڈ ہوں' تو تم نے شرطیں لگانا شروع کر دیں۔"

"یہ بات نہیں ہے پاپا۔ آپ مجھے اپنی پریشانی بتا دیں نا۔"

"یعنی ایک اور کمزوری تمہارے ہاتھ میں دے دوں" آذر نے زہریلے لہجے میں کہا پھر اس نے لہجہ نرم کر لیا "میں تمہیں صرف یہ اطمینان دلا سکتا ہوں کہ میرا کوئی صحت کا مسئلہ نہیں۔ مجھے کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں' جو تمہارے لئے کسی بھی طور پریشانی کا باعث ہو۔ میرا ایک ذاتی معاملہ ہے' جو میں تمہیں ہرگز نہیں بتا سکتا۔ اب تمہاری مرضی' امریکا جاؤ یا نہ جاؤ۔ مجھے اتنی زیادہ پروا بھی نہیں۔"

انور بے بسی سے اسے دیکھتا رہا پھر اس کی نظروں میں ستائش ابھری۔ پاپا واقعی مضبوط آدمی تھے۔ وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹ سکتے تھے۔ اس وقت انہوں نے اسے کتنی آسانی سے ہینڈل کیا تھا اور بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ اب وہ امریکا نہ جاتا تو ہمیشہ خود کو بلیک میلر سمجھتا رہتا۔ اس نے ہاری ہوئی جنگ کو ایک اور

زاویے سے جیتنے کی کوشش کی "ٹھیک ہے پاپا۔ میں امریکا جا رہا ہوں لیکن میں وہاں آپ کا ریفرنس کبھی استعمال نہیں کروں گا۔ میں آپ کو مضبوط بن کر دکھاؤں گا۔ میں اپنی انفرادیت بنانے کے لئے آپ کے نام کو بھی ترک کر دوں گا۔"

آذر نے اطمینان کی سانس لی۔ مشکل لمحہ خوش اسلوبی سے گزر گیا تھا "ٹھیک ہے بیٹے۔ میرے لئے تو یہ خوشی کی بات ہے۔ اپنے جانے کے سلسلے میں اور ایڈمیشن کے سلسلے میں تم نے اپنا ہر کام خود کیا ہے۔ اپنے زور پر۔ مجھے تو تم پر فخر ہے۔"

"میں چلتا ہوں پاپا۔ جانے کی تیاری بھی کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے انور۔"

انور جاتے جاتے پلٹا "پاپا۔ اپنا خیال رکھیے گا۔"

"تم جانتے ہو کہ اپنا آپ مجھے کتنا پیارا ہے۔ میں ہمیشہ اپنا خیال رکھتا ہوں۔"

انور نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ [illegible] آپ مجھے پوری سچائی سے یقین دلا دیں کہ یہ جو آپ کا ذاتی قسم کا مسئلہ ہے' جو پریشانی ہے آپ کی' یہ جلدی دور ہو جائے گی اور آپ پہلے جیسے ہو جائیں گے۔ ایسا ہو جائے تو میری بے اطمینانی کم ہو جائے گی۔"

"یقین کرو بیٹے' یہ سچ ہے۔ وہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں صرف ضد سے کام لے رہا ہوں ورنہ اب تک مسئلہ حل ہو گیا ہوتا۔"

"تو پاپا' اپنی ضد چھوڑ دیں" انور نے کہا پھر وہ مسکرایا۔ "تھینک یو پاپا۔"

انور کے جانے کے بعد آذر بھی مسکرایا۔ وہ بیٹے کو کیا بتاتا' کیسے بتاتا کہ وہ اپنے ماضی سے اور اس کی محرومیوں سے بھاگ رہا ہے۔ ماضی ہے کہ خود کو اس پر تھوپ رہا ہے۔ اسے خود کو دہرانے پر مجبور کر رہا ہے اور وہ لڑ رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی محرومیوں کی یاد تازہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اس ضد کے نتیجے میں اسے ایک اور محرومی مل گئی ہے۔ اس کی تنہائی اب راجا اِندر کی سبھا نہیں رہی۔ وہ تنہا ہوتا ہے تو ماضی اسے ستاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ جام پر جام لنڈھاتا ہے لیکن لذت اور سرور سے محروم رہتا ہے۔ نشہ اور اذیت دہ ہو گیا ہے پھر نیند کی گولیاں بھی بے اثر ہو گئی ہیں۔ نیند برائے نام آتی ہے۔ اور اچھی نہیں آتی۔

اسے انور کا مشورہ یاد آیا۔ کیا اسے ضد چھوڑ دینی چاہئے۔ یوں تو اس کی صحت تباہ ہو جائے گی اور اس عمر میں وہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

○☆○

زندگی کا صرف پیچ ورک باقی رہ گیا تھا۔ نیا ایک عجیب طرح کی سنسنی محسوس کر رہی تھی۔ یہ فلم اس کے کیریئر کے لئے نہایت اہم تھی۔ وہ فلم سے اور اپنی پرفارمنس سے مطمئن تو تھی۔ مگر یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے باوجود فلم فلاپ ہو سکتی ہے۔ پچھلے برسوں میں فلاپ ہونے والی بہت معیاری فلموں کی فہرست بہت طویل اور حوصلہ شکن تھی۔ ان دنوں وہ سوچتی تھی کہ فلم کی کامیابی کے لئے کچھ کرنا ہوگا۔ اس کی پبلسٹی کے لئے اچھوتا آئیڈیا سوچنا ہوگا۔

اس دوران ایک اور بات بھی ہوئی تھی۔ ایک مرد اس کی زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ارب پتی صنعت کار جگدیش تھا۔ اس کی متعدد انڈسٹریز کامیابی سے چل رہی تھیں اور اب وہ فلم انڈسٹری میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ نیا کا اندازہ تھا کہ درحقیقت جگدیش کو فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس وہ اس تک پہنچنے کے لئے مصنوعی روشنیوں کی اس دنیا میں چلا آیا تھا۔

نیا کی جگدیش سے پہلی ملاقات ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ یہ پارٹی جگدیش نے مشہور ہدایت کار امرجیت کے اعزاز میں دی تھی۔ امرجیت وہ شخص تھا' جس نے نیا کو فلمی دنیا سے متعارف کرایا تھا۔ نیا دنیا میں سب سے زیادہ لحاظ اسی کا کرتی تھی۔ اگر امرجیت نے نہ کہا ہوتا تو شاید وہ اس پارٹی میں بھی شریک نہ ہوتی۔ اس پارٹی میں شریک ہونے والے تمام افراد فلمی صنعت سے تعلق رکھتے تھے۔

نیا نے اس پارٹی میں جگدیش کو پہلی بار دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اس کے تصور میں جگدیش کوئی موٹی توند والا بھدا سیٹھ تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ وہ تو بہت خوبرو اور وجیہہ آدمی تھا۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ نیا دل میں یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکی کہ وہ فلمی دنیا کے کئی ہیروز سے بہتر ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ اس میں روایتی ہیرو کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔

تقریب ویسی ہی تھی' جیسی عام طور پر فلمی دنیا کی تقریبات ہوتی ہیں۔ شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ ہر درجے کی اداکارائیں اِدھر اُدھر تھرکتی پھر رہی تھیں۔ پی آر کا سلسلہ زوروں پر تھا۔ نیا کو ایسی تقریبات میں کوفت ہوتی تھی چنانچہ وہ اس شخص کے ساتھ چپکی رہی جس کی وجہ سے تقریب میں شریک ہوئی تھی... یعنی امرجیت۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔" بھاری آواز میں ایک اناؤنسمنٹ نے نیا کو چونکا دیا۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ جگدیش مائیک ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ "میں چند لمحوں کے لئے آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔"

ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ ہر نگاہ جگدیش کے چہرے پر جم گئی۔

"مجھے ایک اہم اعلان کرنا ہے۔ آج کی یہ تقریب بے سبب نہیں۔ میں آپ کو اس کا سبب بتانا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے' میرا تاثر غلط ہو لیکن میرے خیال میں آپ کی فلمی صنعت ایک فیملی کی طرح ہے۔ ہدایت کاروں اور فن کاروں سے لے کر تکنیک کاروں تک ہر شخص اس گھرانے کا فرد ہے اور گھر میں لاکھ اختلافات ہوتے رہیں لیکن گھر گھر ہی رہتا ہے۔"

مختلف سمتوں سے بے شک' بے شک کی آوازیں ابھریں۔

"آج اس گھرانے میں اپنی شمولیت کے لئے التجا کر رہا ہوں اور اس شمولیت کے لئے میں نے اس گھرانے کے ایک بزرگ کی سفارش حاصل کی ہے۔ میرے محترم دوست امرجیت کو کون نہیں جانتا۔ ان کے فلمی صنعت پر بے حد احسانات ہیں۔ انہوں نے اس انڈسٹری کو ایسے ایسے روشن ستارے دیئے ہیں' جن سے یہ دنیا دمک رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے جگدیش کی نظر ایک ثانیے کو نتا کے چہرے پر رکی اور پھر امرجیت کے چہرے پر جا ٹھہری۔ "امر صاحب کیا آپ میری سفارش نہیں کریں گے۔"

امرجیت نے ہاتھ میں موجود جام کو بلند کیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسٹرونگلی ریکومینڈیڈ۔"

"تھینک یو سر۔" جگدیش نے سرخم کرتے ہوئے کہا۔ "اب خواتین و حضرات' یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ مجھے قبول کریں یا مسترد کردیں۔"

ہر طرف سے ویل کم' موسٹ ویل کم کی آوازیں آنے لگیں پھر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

جگدیش نے چاروں طرف رخ کرکے کئی بار سرخم کیا۔ "شکریہ۔ میں آپ سب کا شکرگزار ہوں ۔ میں آپ کی اس فیملی کا ایک اچھا ممبر ثابت ہوں گا۔ میں نے فی الحال بڑے پیمانے پر فلم سازی کا اور اس کے علاوہ فلم ڈسٹری بیوشن کا پروگرام بنایا ہے۔ بھگوان نے چاہا تو ہم سب مل کر کام کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ مجھے آپ سب کا تعاون حاصل رہے گا اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ہر تعاون کے لئے حاضر ہوں۔ اب آپ سب انجوائے کیجئے۔ شکریہ۔"

ایک بار پھر تالیاں بجیں اور بجتی رہیں۔

جگدیش کی اس اناؤنسمنٹ کے بعد محفل کا مزاج تبدیل ہو گیا۔ مہمان خصوصی ایک طرف رہ گیا اور میزبان جانِ محفل بن گیا۔ ہر شخص اس سے ملنا' اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ ظاہر ہے' وہ ایک ارب پتی تھا جو کئی زاویوں سے ہر ایک کے کام آسکتا تھا۔ خاص طور پر وہ اداکارائیں اس کے پیچھے لگ گئیں' جو کوئی مقام بنانے کی جدوجہد کررہی تھیں یا پھر وہ ہدایت کار تھے جو کبھی ایک مکمل فلم نہیں بنا سکے تھے اور نہ ہی بنانا چاہتے تھے۔ چھ آٹھ مہینے وہ فلم بنانے کی اداکاری کرتے رہتے۔ اس دوران ان کی مرغی روٹی سکون سے چلتی رہتی اور جب فائنسر خالی ہو جاتا تو وہ اسے لات مار کر پھر سے دال دلیے کی کوشش میں لگ جاتے۔

نتا جگدیش کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سب سے بہت خوش اخلاقی سے مل رہا تھا لیکن وہ بہت ریزرو بھی تھا۔ اس کا انداز عامیانہ نہیں تھا۔ وہ تیسرے درجے کی ادا فروش اداکاراؤں سے بھی بہت احترام سے بات کر رہا تھا لیکن اس کے انداز میں ان کے لبھانے کی کوششوں کے لئے حوصلہ افزائی نہیں تھی۔

نتا کو نجانے کیوں ایسا لگا' جیسے وہ اداکاری کر رہا ہے۔ اسے اس کے انداز میں بناوٹ محسوس ہوئی۔

"فیملی کے گدھ نئے ممبر پر منڈلا رہے ہیں۔" امرجیت نے نتا سے کہا۔ "آؤ کسی پرسکون گوشے میں بیٹھیں۔"

نتا امرجیت کے ساتھ ایک خالی میز کی طرف چل دی۔ وہ بیٹھ گئے۔ ویٹر ان کے لئے مشروب لے آیا۔ "تمہاری فلم زندگی کی اسٹوڈیو رپورٹ بہت اچھی ہے۔" امر نے کہا۔

"میرا خیال ہے' وہ اچھی فلم ثابت ہوگی۔" نتا نے محتاط لہجے میں کہا۔

"مجھ سے بات کرتے ہوئے اتنی احتیاط۔" امرجیت نے اسے چھیڑا۔ "میں جانتا ہوں تم پوری طرح اس فلم پر تکیہ کررہی ہو۔"

"جی ہاں" نتا نے کہا پھر پوچھا "آپ کی کیا رائے ہے اس فلم کے بارے۔" مجھے معلوم ہے' آپ اس کے رشز دیکھ چکے ہیں۔"

"ہاں' میرا خیال ہے کہ یہ فلم تمہاری اور آکاش ورما کی فلم ہے۔ دونوں نے ہی کمال کر دیا ہے۔"

نتا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ استاد کے منہ سے یہ تعریف غیر معمولی تھی۔ "آپ کا کیا خیال ہے فلم کامیاب ہوگی؟"

"کامیابی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" امرجیت نے خشک لہجے میں کہا۔ "میری سب سے خوبصورت فلم نے مالی طور پر میری کمر توڑ دی تھی۔"

نتا نے سر جھکا لیا۔ امر درست کہہ رہا تھا۔ اس لمحے اس نے فیصلہ کرلیا کہ کوئی آئیڈیا سوچنا اور کچھ کرنا ہوگا۔ فلم کو غیر معمولی پبلسٹی ملنی چاہئے۔

پارٹی ختم ہوتے ہوتے نتا کو اندازہ ہو گیا کہ جگدیش اسے دانستہ نظرانداز کر رہا ہے۔ وہ مسکرا دی۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی لیکن اسے یقین بھی ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

ایک ہفتے بعد جگدیش نے ایک ساتھ چار فلمیں شروع کرنے کا اعلان کیا۔ ایک کا ہدایت کار امرجیت تھا اور دوسری فلم زندگی کے ڈائریکٹر آکاش ورما کو ڈائریکٹ کرنا تھی۔ نتا کو حیرت ہوئی کہ اسے ان میں سے ایک فلم بھی نہیں ملی۔ اس بات سے اسے دھچکا لگا لیکن وہ اسے زیادہ اہمیت اس لئے نہ دے سکی کہ اس کے سر پر زندگی کی پبلسٹی کا بوجھ تھا۔

بالآخر اسے ایک آئیڈیا سوجھ گیا۔

○☆○

انور کو امریکا گئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔

انور اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھا جام پہ جامِ ناب سے شغل کر رہا تھا۔ وہ پریشان تھا۔ پچھلے دو ماہ سے وہ کوئی کام بھی نہیں کر سکا تھا۔ طبیعت اس طرف مائل ہی نہیں ہوتی تھی۔ بے زاری اس قدر

تھی کہ لطف و کیف ایک ایسی لفظی ترکیب بن کر رہ گیا تھا، جس کا اس سے کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔

اس کیفیت میں وہ کام کر بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو بہت سکون سے، سرشاری کے عالم میں کام کرنے کا عادی تھا۔ ایسے میں اس کی رگوں میں جیسے خون کی جگہ سرور و نشاط رقصاں ہوتے تھے اور پھر کام کرتے ہوئے اسے گرد و پیش کا احساس بھی نہیں رہتا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور جام خالی کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ یہ جنگ تو بہت طویل ہو گئی۔ اس نے آزردگی سے سوچا۔ اور اس میں اپنے جیتنے کا کوئی امکان ہی نظر نہیں آتا۔

اسے وہ دن یاد تھا، جب انور نے اس کے زخم محرومی کو کریدا تھا۔ جیسے بلاؤں کا بکس کھول دیا تھا۔ اس کی خوبصورت تنہائی مجروح ہو گئی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے ماضی کو دہرانے پر مجبور ہو گیا تھا اور یہ ماضی بھی عجیب تھا کہ وہ اپنے تمام مصائب، تمام محرومیوں کو یاد کرے۔ اور اس نے پوری قوت سے مزاحمت کی تھی لیکن اس مزاحمت کے نتیجے میں وہ سکون سے محروم ہو گیا تھا۔ نیند اس سے روٹھ گئی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کام کرنے کی خوشی اس سے چھن گئی تھی۔ زندگی کی سب سے بڑی خوشی۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ تو سراسر خسارے کا سودا ہے۔

وہ بہت ضدی تھا۔ انور نے جانے سے ایک دن پہلے اسے ضد چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے اس مشورے کو در خور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ زندگی میں جب بھی اس نے ضد کی تھی، پوری ضرور کی تھی لیکن اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے ہار ماننا ہو گی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے پُرسکون نیند کا تصور کیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ نیند میں کیسی لذت ہوتی ہے اور اب پچھلے دو ماہ سے وہ نہ صرف اس لذت سے محروم تھا بلکہ بے خوابی کی اذیت بھگت رہا تھا۔

بس بہت ہو گئی۔ اس نے سوچا۔ اس کے اندر ایک عجیب سی آمادگی ابھری۔ "میں ہار گیا۔" وہ بڑبڑایا۔ "بس مجھے میری نیند اور میری تنہائی کی حسین محفلیں لوٹا دے اے وقت، مجھے تجھ سے کچھ نہیں چاہئے۔ بس اتنا کر دے۔ اس کے لئے وہ اذیتیں ایک بار اور سہی۔"

اس نے آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے اندھیرا تھا پھر اچانک روشنی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے فلم سی چل پڑی۔

اب وہ اپنے آبائی مکان میں تھا!

○☆○

گھر میں بڑی گہما گہمی، بڑی رونق تھی!

اختر بھائی کی شادی ہو رہی تھی۔ ابا جان کی موت کے بعد وہ پہلی خوشی تھی، جو گھر میں آئی تھی ورنہ ہر طرف دکھ ہی دکھ تھا، پچھتاوے ہی پچھتاوے تھے۔

آذر اپنے کمرے میں بیٹھا زہرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

انگلینڈ سے آنے کے بعد جب اس نے پہلی بار زہرہ کو دیکھا تھا تو درحقیقت دیکھا نہیں تھا۔ اس وقت وہ ابا جان کے صدمے سے دوچار تھا۔ وہ زہرہ کی وجہ سے سنبھل تو گیا تھا لیکن زہرہ پر توجہ نہیں دے سکا تھا۔

اختر بھائی کی شادی میں شرکت کے لئے زہرہ ایک ہفتہ پہلے آ گئی تھی۔ اس دوران آذر نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ اور اسے شاک لگا تھا۔ زہرہ بہت بدل گئی تھی۔ خوب صورت وہ اب بھی تھی مگر جس نے برسوں پہلے اسے دیکھا ہو، وہ فرق محسوس کر سکتا تھا۔ وہ اب مرجھائی ہوئی لگتی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر آذر کو حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی کسی سے اتنی محبت بھی کرے اور برسوں کے بعد دیکھنے پر اتنی بڑی تبدیلی بھی اسے نظر نہ آئے۔ یہ تو خود غرضی کا ثبوت ہے۔ اپنے دکھ میں گھر کر اس نے زہرہ کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔

شادی کے ہنگاموں میں مصروف زہرہ کو وہ مسلسل دیکھتا رہا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے انداز میں شوخی تھی۔ وہ ہر رسم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی لیکن اس بار آذر دھوکا نہ کھا سکا۔ اس نے دیکھ لیا کہ وہ خوشی، خوش مزاجی اور شوخی محض ایک نقاب ہے۔ زہرہ خود کو خوش و خرم ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کوئی دکھ ہے، جسے وہ چھپا رہی ہے اور وہ جو دکھ بھی ہے، وہی اس کے مرجھانے کا سبب بھی ہے۔

آذر اسے دیکھتا، اس کے بارے میں سوچتا اور الجھتا رہا۔ سوال یہ ہے کہ دکھ ہے تو اسے چھپایا کیوں جا رہا ہے۔ آدمی کسی عام دکھ کا پردہ نہیں رکھتا۔ کوئی بہت ذاتی دکھ ہو سکتا ہے، جسے دوسروں سے چھپایا جائے اور اتنا ذاتی دکھ عام طور پر کسی محرومی کا ہی ہوتا ہے۔

لیکن زہرہ کو ایسا کون سا دکھ ہو سکتا ہے۔ کون سی محرومی ہے، جو اسے ستاتی ہے۔

انسان اپنے معاملے میں بڑا خوش فہم ہوتا ہے۔ بہت محبوب لوگوں کے دکھ میں بھی اپنے لئے آسائش کا پہلو تلاش کرتا ہے۔ آذر نے بھی یہی کیا۔ اس نے سوچا، کہیں زہرہ کے دکھ کا سبب میں تو نہیں۔ کہیں یہ مجھ سے دوری کا۔ مجھ سے محرومی کا تو دکھ نہیں۔

اور جیسے جیسے وہ اس امکان پر سوچتا رہا، اسے یقین ہوتا گیا کہ یہی بات ہے۔ محبت۔۔۔ اور سچی محبت خواہ اس کی اساس جسم پر ہو، اتنی بے اثر نہیں ہوتی کہ اس کی آنچ دوسرے فریق تک نہ پہنچے۔

اس پختہ یقین کے ساتھ اس نے فیصلہ کیا کہ اختر بھائی کی برات واپس آنے کے بعد زہرہ سے بات کرے گا۔

وہ اختر بھائی کا شہ بالا بنا لیکن پوری تقریب میں وہ کھویا کھویا سا رہا۔ وہ زہرہ کے منہ سے اپنی محبت کا اعتراف سننے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا اور وہ بے تابی اس نوجوان کی سی تھی، جسے پہلی بار محبت ہوئی ہو۔

نکاح اور رخصتی کی پوری تقریب اس کے لئے خواب کی طرح

تھی۔ وہ تو بس خواب کے بعد آنکھ کھلنے کا منتظر تھا۔

برات واپس آئی۔ رسموں کا سلسلہ چلتا رہا۔ بالآخر دلہا اور دلہن کو حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی رونقیں ختم ہو گئیں۔ ہنگامہ تھم گیا۔ جیسے اچانک رات ہو گئی ہو۔ ہر طرف سکوت چھا گیا اور وہ سکوت بتا رہا تھا کہ اس رات کی صبح بہت دیر سے ہو گی۔

وہ کچھ دیر اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ وہ احتیاطاً سکوت کے اور گہرا ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا دل اس عاشق کے دل کی طرح سینے میں رقص کر رہا تھا' جو پہلی بار اپنے محبوب سے ملاقات کا... وصل کا منتظر ہو۔

اسی کیفیت میں آدھا گھنٹا گزر گیا۔ گھر میں نہ کوئی چاپ تھی نہ سرگوشی۔ لگتا تھا' رات نے بھی سانسیں روک لی ہیں۔ بالآخر وہ اٹھا اور دبے پاؤں اپنے کمرے سے نکل آیا۔ زہرہ کے کمرے کا دروازہ سامنے ہی تھا۔ فاصلہ دو قدم بھی نہیں تھا لیکن آج پہلی بار اس کا انداز چوروں کا سا تھا۔ زہرہ کے کمرے کے دروازے پر وہ چند لمحے جھجکتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ دستک سے کوئی اور نہ جاگ جائے اور بغیر دستک کے وہ کمرے میں جانا نہیں چاہتا تھا۔

جھجکتے جھجکتے اس نے دروازے پر ناخنوں سے بہت آہستگی سے دستک دی۔ اس دستک کی آواز خود اس نے بھی مشکل سے سنی۔ اس نے سوچا' اس دستک کا تو جواب نہیں مل سکتا۔

یہ سب ایک ثانیے کی بات تھی۔ وہ دوبارہ دستک دینے ہی والا تھا کہ اندر سے زہرہ نے کہا "کون ہے؟ کیا بات ہے؟"

"زہرہ آپا' یہ میں ہوں آذر۔"

"آذی" لہجے میں حیرانی تھی۔ "آ جاؤ ننھے منے۔"

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ زہرہ بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کے آثار بھی نہیں تھے اسی لئے اس نے ہلکی سی دستک پر بھی جواب دے دیا تھا۔

آذر کے دل میں خوش فہمی اور زور پکڑ گئی۔ اتنی مصروفیت اور ہنگامے کے بعد وہی جاگ سکتے ہیں' جو فرقت زدہ اور مجبور ہوں۔ اس نے سوچا... اس وقت اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ بات حقیقت سے کس قدر قریب' لیکن درحقیقت اس کی سوچ سے بہت بڑی ہے۔ وہ ہجر و فراق تو عمر بھر کا تھا' جو زہرہ کو جگا رہا تھا۔

"کیا بات ہے آذی۔ نیند نہیں آ رہی ہے؟" زہرہ نے شفقت سے پوچھا۔

"نہیں لیکن مجھے حیرت ہے کہ آپ بھی جاگ رہی ہیں" آذر نے کہا۔

"کیوں' میں نہیں جاگ سکتی" زہرہ نے شوخی سے کہا لیکن اس شوخی کی تہ میں واضح دکھ تھا "تمہاری نیند اڑ سکتی ہے تو میری بھی اڑ سکتی ہے۔"

"میری نیند تو یہاں آنے کے بعد مستقل طور پر اڑ گئی ہے۔ ایک سال ہو گیا۔"

"صرف ایک سال" زہرہ نے عجیب سے لہجے میں کہا "یہاں تو صدیوں سے نیند اڑی ہوئی ہے۔"

آذر کا دل سینے میں اس زور سے دھڑکا کہ اس کا وجود دہل کر رہ گیا۔ منہ زور جذبے ایسے امنڈے کہ اسے خود کو روکنا مشکل ہو گیا۔ گھبرا کر اس نے شوخی کا سہارا لیا "کیوں زہرہ... آپا۔ کسی سے محبت تو نہیں ہو گئی؟"

"محبت اور نفرت' دونوں کی تاثیر ایک سی ہوتی ہے" زہرہ کا لہجہ عجیب سا تھا "فرق صرف اذیت کی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ایک دھیمی دھیمی آنچ ہوتی ہے' جس میں ہلکی ہلکی تڑپ اور اذیت میں بھی لذت ہوتی ہے۔ دوسری جہنم کی آگ کی طرح جھلساتی ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ آپ نے محبت ہی کا انتخاب کیا ہو گا۔"

"انتخاب کا موقع کہاں ملتا ہے۔ یہ تو رزق کی طرح ہے... نصیب اپنا اپنا۔"

آذر کی دھڑکنوں کی لے بدل گئی۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ کہیں زہرہ کو NUDE تصویر کا علم تو نہیں۔ اس نے سوچا۔ ورنہ نفرت کا اور کیا جواز ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا "زہرہ... آپا' نفرت تو بہت بری چیز ہے۔ آپ تو کسی سے نفرت نہیں کر سکتیں... کسی سے بھی نہیں۔"

"یہ بے اختیار جذبے!" زہرہ نے سرد آہ بھر کے کہا "ان پر اختیار کہاں ہوتا ہے۔"

اب وہ تجسس آذر کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ تو بس یہ جاننا تھا کہ زہرہ کے پاس جو بھی جذبہ ہے بس اس کے لئے ہے "آپا... آپ نفرت کرتی ہیں؟"

"ہاں آذی' ننھے منے بچے" زہرہ نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔

"آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں؟" آذر کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

اس کے لفظوں نے زہرہ کو جھنجوڑ ڈالا۔ ...س نے حیرت سے اسے دیکھا "تم سے... نفرت! یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

دل میں آس کا دیا سا جلنے لگا "ممیں... میں بہت برا ہوں نا... اس لئے۔"

"ارے نہیں ننھے منے' میں بھلا تم سے نفرت کر سکتی ہوں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا" زہرہ نے بے حد خلوص سے کہا۔

"تو پھر کس سے نفرت ہے آپ کو؟"

زہرہ جیسے اچانک ہوش میں آ گئی "یہ میں نے کب کہا" وہ گڑبڑا کر بولی "مجھے کسی سے نفرت نہیں۔"

"تو اتنی دیر سے خواہ مخواہ نفرت کی بات کئے جا رہی ہیں۔ سچ سچ بتائیں' کس سے نفرت ہے آپ کو؟"

"کسی سے بھی نہیں" زہرہ نے کہا پھر بے بسی سے بولی "مجھے

نفرت ہے اپنے نصیب سے" اچانک اس نے بات بدلی "یہ تو بتاؤ، تم اس وقت کیوں آئے ہو؟"

"آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔"

"اتنی رات کو! جاؤ، صبح پوچھ لینا۔"

"نہیں زہرہ۔ آپا۔ وہ بات اسی وقت کی جا سکتی ہے۔"

"تم بچ بچ پگلے ہو آذی۔ اچھا۔ پوچھو۔"

"زہرہ۔ آپا، آپ خوش نہیں ہیں نا؟"

زہرہ کا چہرہ فق ہو گیا "یہ کس نے کہا تم سے؟"

"آپ کے چہرے لے، یہ بات تو آپ کے پورے وجود پر لکھی ہے۔ آپ کا ہر انداز یہ بات کہتا ہے" آذر نے اعتماد سے کہا۔ "چھپانے کی کوشش کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ چھپانے میں کامیاب بھی ہو گئیں۔"

"وہم ہے تمہارا۔ کسی اور نے تو کبھی نہیں کہی یہ بات۔"

"مجھ میں اور کسی اور میں بہت فرق ہے۔ میری نگاہ اور طرح کی ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ میری نظر کی بینش بھی ڈھونڈ لیتی ہے اور اسے ظاہر میں چھپی اصلیت بھی نظر آجاتی ہے" آذر کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

زہرہ کا چہرہ تمتما اٹھا "فضول باتیں مت کرو" اس نے جھنجلا کر کہا "میں ناخوش نہیں ہوں۔"

"آپ اپنی شادی سے۔ اپنے شوہر سے خوش نہیں ہیں۔ یہی بات ہے نا؟"

اس بار زہرہ کا چہرہ یوں زرد ہوا، جیسے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ رہا ہو۔ "ایسی باتیں مت کرو آذی۔"

اس کے چہرے نے، اس کے کمزور لہجے نے آذر کے دل میں پھر خوش فہمی جگا دی۔ زہرہ شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہے تو اسی لئے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے "اب میں بچہ نہیں ہوں زہرہ" اس نے پہلی بار حد درجہ اعتماد کا مظاہرہ کیا "میں تمہیں تمہارے شوہر سے رہائی دلواؤں گا۔ اب مجھے تم سے دور کوئی نہیں کر سکتا۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا" زہرہ اچانک بپھر گئی "یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا سمجھتے ہو تم خود کو۔ بہت بڑے ہو گئے ہو۔"

اس کے یوں پھٹ پڑنے سے آذر کا انداز مدافعانہ ہو گیا۔ "دیکھو زہرہ۔ تم اور میں دونوں جانتے ہیں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اس محبت کو چھپا کر، گھل گھل کر جینے کا کیا فائدہ۔ جب کہ بات کچھ ایسی مشکل بھی نہیں۔"

"تم بچ بچ پاگل ہو گئے ہو" زہرہ نے ترحم آمیز لہجے میں کہا۔ "ننھے منے بچے، خود کو بڑا سمجھتے سمجھتے کیسی خطرناک غلط فہمیاں پال لی ہیں تم نے۔"

"تم کسے بہلانے کی کوشش کر رہی ہو زہرہ؟ مجھے یا خود کو" آذر نے سمجھانے والے انداز میں کہا "ممکن ہے، میری محبت کو تم خود سے بھی چھپاتی رہی ہو لیکن میں حقیقت سے واقف ہوں۔ اب میں

یہ سب کچھ۔۔۔"

"تمہیں کچھ بھی پتا نہیں" زہرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔۔۔ سمجھ بھی نہیں سکتے کہ میں کس آگ میں جل رہی ہوں۔"

"میں سب سمجھتا اور جانتا ہوں زہرہ" آذر نے کہا اور زہرہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

زہرہ کا ردِ عمل ہلا دینے والا تھا۔ جیسے ہی آذر نے اس کا ہاتھ تھاما، زہرہ پر جیسے لرزہ چڑھ گیا۔ آذر اپنی بات بھول کر حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ یوں پوری جان سے کانپ رہی تھی، جیسے اپنے بدن پر اس کا اختیار ہی نہ ہو۔ یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اسے دھکیلنا چاہتی ہے۔ وہ اپنا دوسرا آزاد ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر اسے ہٹانا چاہتی تھی لیکن لرزے کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور پلکیں جھپکنے لگی تھیں۔

"خدا کے لئے آذر۔۔۔ خدا کے لئے۔۔۔ خدا کے لئے۔۔۔"

زہرہ سے کچھ کہا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ بس خدا کے لئے کی گردان کئے جا رہی تھی۔ آذر کو اس پر بھی حیرت تھی کہ وہ اسے ننھے منے یا آذی کے بجائے آذر کہہ کر پکار رہی ہے۔

آذر اس کے ردِ عمل کے طلسم میں ایسا اسیر ہوا کہ بت بن کر رہ گیا۔ چند لمحوں میں اسے احساس ہوا کہ اگر اس نے کچھ نہ کیا تو زہرہ کو کچھ ہو جائے گا لیکن الجھن یہ تھی کہ اس طلسم کو توڑنے کے لئے وہ کیا کر سکتا ہے اور یہ ضروری تھا۔

جو کچھ کرنا چاہئے تھا، وہ آذر سے خود بخود سرزد ہو گیا۔ اسے پتا بھی نہ چلا اور بے اختیار اس نے زہرہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ حالانکہ اس کی گرفت اتنی سخت نہیں تھی لیکن اس گرفت سے آزاد ہوتے ہی زہرہ بستر پر گری۔ اس کا جسم اب بھی لرز رہا تھا لیکن لرزش کم ہوتی جا رہی تھی۔

آذر حیرت سے کبھی اپنے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا اور کبھی زہرہ کو لیکن در حیرت ابھی بند نہیں ہوا تھا۔ اچانک زہرہ بھنچی بھنچی آواز میں بولنے لگی "آذر، خدا کے لئے، مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ مجھے نہ چھونا۔ کیوں میری اذیت بڑھاتے ہو۔ مجھے نہ چھونا آذر۔۔۔"

وہ یہی کچھ دہرائے جا رہی تھی۔ اس کا لہجہ التجائیہ تھا لیکن لفظ کچھ اور کہہ رہے تھے اور انداز اور لہجہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ وہ اسے چھونے کو، ہاتھ لگانے کو منع کر رہی تھی لیکن آواز اور لہجے میں بھکاریوں کی سی پکار تھی۔۔۔ اپیل تھی کہ وہ اسے چھوئے۔۔۔ ہاتھ لگائے اور اس کا جسم بھی یہی پکار رہا تھا۔ وہ پکار بالکل واضح تھی۔

ابتدائی لمحے میں زہرہ کے ردِ عمل کو دیکھ کر آذر کے دل میں جس اندیشے نے سر اٹھایا تھا، وہ اس پکار کے بعد حقیقت میں بدل گیا۔ سب کچھ واضح ہو کر رہ گیا۔ وہ ایک مصور تھا۔ اس کے پاس زرخیز تخیل تھا۔ اور اس طرح کے معاملات کی اسے قدرتی طور پر

سمجھ تھی۔

اس نے لفظوں اور لہجے کے اس نفاق کو محسوس کرنے کے بعد اس زمین کا تصور کیا' جس پر برسوں سے ابر رحمت کی عنایت نہیں ہوئی ہو۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ایسی زمین پر پانی کے چند بھولے بھٹکے چھینٹے کیا قیامت جگائیں گے۔ زمین کیسے چٹخے گی۔ گرم ہوا کے بھبکے اٹھیں گے۔ جیسے جہنم دہک اٹھا ہو۔

اس نے زہرہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی وہی لفظ دہرا رہی تھی۔۔۔ آذر مجھے نہ چھونا۔ ہاتھ مت لگانا مجھے...... لیکن آواز دھیمی ہوتے ہوتے سرگوشی کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ مگر لہجے میں چھونے کی پکار اب اتنی ہی زیادہ بلند آہنگ ہو چکی تھی۔ وہ اب بھی ہوش و حواس میں نہیں تھی۔

"میں سمجھ گیا۔ پوری طرح سمجھ گیا" آذر نے خود کلامی کی۔

اور وہ واقعی سمجھ گیا تھا۔ زرخیز زمین نظر انداز کر دی جائے تو اس میں خود رو جھاڑیاں اگنے لگتی ہیں۔ کانٹے نمو پاتے ہیں۔ پھول تو جب کھلیں گے نا جب نگہداشت کرنے والے ہاتھ موجود ہوں۔ پھل تو جب آئیں گے' جب کوئی پھل دار درخت کے بیج ڈالے اور پانی دے۔ فصل کے لئے تو بوائی ضروری ہوتی ہے۔ نگہداشت نہ ملے تو زرخیز زمین بھی پھول کی طرح مرجھا جاتی ہے۔

○☆○

زہرہ کی لرزش اور سرگوشی دونوں معدوم ہو چکی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "تم اپنے کمرے میں جاؤ آذر" اس نے کہا۔

آذر نے جیسے یہ بات سنی ہی نہیں "زہرہ۔۔۔ میں تمہارا مسئلہ سمجھ گیا ہوں" وہ بولا۔

زہرہ گھبرا گئی "کیا سمجھ گئے ہو؟"

"یہی کہ تمہارا شوہر......"

زہرہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سخت لہجے میں بولی۔ "بس اب ایک لفظ نہ کہنا۔"

"مجھے نہ کچھ کہنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی تم سے تصدیق کرانا چاہتا ہوں اس لئے کہ میں پوری طرح سمجھ چکا ہوں۔"

زہرہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں خوف تھا۔

"اب تو مجھے بس علاج کرنا ہے تمہارا اور وہ کچھ مشکل نہیں۔"

"کیا کرو گے تم؟" زہرہ کے لہجے میں بھی خوف تھا۔

"آپریشن" آذر نے کہا "پہلے تمہیں تمہارے شوہر سے رہائی دلاؤں گا پھر تمہارے ہر دکھ اور ہر محرومی کی تلافی کر دوں گا۔"

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے آذر۔"

"مجھے ایسا کرنا ہو گا زہرہ۔ ابا جان زندہ ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے" اس کا لہجہ نرم ہو گیا "میں تمہیں بہت خوشیاں دوں گا زہرہ۔"

"تم نادان ہو۔ نہیں سمجھتے کہ میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں۔ نہیں سمجھتے کہ تم میرے لئے ہمیشہ ننھے منے رہو گے۔ میں نے تمہیں گود میں کھلایا ہے۔"

"دیکھوں گا میں" آذر کے لہجے میں چیلنج تھا۔

زہرہ نے اسے نظر انداز کر دیا "اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ تم مداخلت کرکے میری گیارہ برس کی تپسیا غارت کرو گے۔ میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔"

"زہرہ' تم سمجھ نہیں رہی ہو' مجھے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوئی بچہ نہیں' ذمے دار آدمی ہوں۔ اپنے گھر اور گھر کے لوگوں کے مفادات میری ذمے داری ہیں۔" وہ کہتے کہتے رکا "اور تم یہ نہ سمجھنا کہ میں کسی غرض کے تحت ایسا کروں گا۔ میری قسمت چاہے نہ سنورے۔ میں تمہاری قسمت سنوارنے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

زہرہ نے اسے غور سے دیکھا اور سمجھ لیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' کر بھی گزرے گا "تم نہیں مانو گے؟"

"یہ ناممکن ہے۔ میں ضمیر پر بوجھ رکھنے کا قائل نہیں۔"

"تو پھر سن لو کہ اس کے نتائج کے ذمے دار بھی تم ہو گے اور نتائج جو ہوں گے' تم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"میں اس معاملے میں نتائج کی پروا نہیں کروں گا۔ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ میں اسے جاری رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا" آذر نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا "اب تم سکون سے سو جاؤ۔ شب بخیر۔"

وہ کمرے سے نکلا تو صبح ہو چکی تھی۔ آذر کو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ قیامت کے دن کی صبح ہے۔ وہ سویا اور دوپہر کو جاگا۔ زہرہ اپنے گھر جا چکی تھی۔ آذر نے سوچا کہ وہ آج ہی زہرہ کے سلسلے میں اختر بھائی سے بات کرے گا اور پھر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے گا۔ یہ مسئلہ جتنی جلدی حل ہو جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔

لیکن اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مسئلہ اتنی جلدی ختم ہو جائے گا۔ شام کو زہرہ کی موت کی خبر آگئی۔ اس نے خود کشی کر لی تھی۔

○☆○

وہ اپنے اسٹوڈیو میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ آنکھوں سے آنسو یوں بہہ رہے تھے جیسے اندر سینے میں کوئی سیلاب آیا ہوا ہو۔

وہ اسی بات سے ڈر رہا تھا اسی لئے اس نے اتنی طویل اور اذیت ناک جنگ لڑی تھی۔ زہرہ کی موت ۳۳ سال پہلے جتنا بڑا صدمہ تھی' آج بھی اتنا ہی بڑا صدمہ تھی۔ وہ اس تکلیف دہ حقیقت کو دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو عمر بھر اس سے نظریں چراتا رہا تھا۔ اس کی زہرہ مری نہیں تھی۔ وہ تو اس کی تنہائی کی محفلوں میں راج نرتکی کے روپ میں آتی تھی۔

لیکن آج ماضی کو دہرانے کے نتیجے میں وہ حقیقت پوری طرح سامنے آگئی تھی' جس سے اس نے عمر بھر نظریں چرائی تھیں۔ وہ

حقیقت یہ تھی کہ وہ زہرہ کا قاتل تھا۔

اس رات اس نے زہرہ سے کہا تھا کہ وہ ضمیر پر بوجھ رکھنے کا قائل نہیں اور اسے نتائج کی بھی پروا نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ یہ سوچنے سے بھی بچتا رہا تھا کہ یہ کہہ کر اس نے زہرہ کے لئے زندگی کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ صرف ایک راستہ کھلا چھوڑا تھا۔ موت کا! اور آج یہ بات اسے شعوری طور پر تسلیم کرنی پڑ گئی تھی۔

آنسو اب بھی بہے جا رہے تھے!

زہرہ کی موت کے بعد راز رازہی رہ گیا تھا۔ صرف وہ تھا جو حقیقت جانتا تھا اور اس کے بعد اس پر بہت کچھ کھلا تھا۔ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ زہرہ بے حد عظیم عورت تھی۔ اس کا شوہر اس ڈر سے اسے میکے نہیں جانے دیتا تھا کہ وہ اس کی پول نہ کھول دے۔ لیکن زہرہ نے اس کے راز کو کھلنے کے بعد بھی نہیں کھلنے دیا تھا اور جان سے گزر گئی تھی۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیسا بدنصیب انسان ہے کہ جسے اس نے جان سے زیادہ چاہا، اس کی جان لے لی۔

آنسو تھم گئے تھے!

اس نے اٹھ کر اپنے لئے ایک جام بنایا۔ جام سے ایک گھونٹ لے کر وہ بڑبڑایا "اسی وجہ سے تو میں ماضی سے نظریں چرا رہا تھا۔ اب یہ زہر بیٹے میں اتار لیا تو ماضی سے ڈر کیسا۔ چلو آج یہ قرض بھی اتار دیں۔"

اس بار وہ خود ماضی کی طرف لپکا تھا۔

○☆○

"امی۔ آذر فنکار ہے۔ تصویریں بناتا ہے" اختر بھائی امی سے کہہ رہے تھے "لڑکی غیر معمولی حسین ہونی چاہئے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ یہ بات میں بھی سمجھتی ہوں" امی نے جواب دیا۔

امی اور اختر بھائی کی یہ گفتگو آذر کی شادی کے سلسلے میں ہو رہی تھی۔

اور جب آذر نے حجلۂ عروسی میں پہلی بار ثمر کا گھونگھٹ اٹھایا تو مبہوت ہو کر رہ گیا۔ وہ بے حد حسین تھی۔ نہیں، وہ تو کسی ماہر سنگ تراش کا شہ پارہ تھی۔ حسنِ تناسب کا شاہکار "سبحان اللہ۔ امی نے تو کمال کر دیا" اس نے بے ساختہ کہا۔

وہ ثمر کے حسن کا ایسا اسیر ہوا کہ اپنے فن کے سوا سب کچھ بھول گیا۔ پانچ سال ایسے گزرے، جیسے کوئی حسین خواب پل بھر میں ختم ہو جاتا ہے۔

عورتیں شادی کے بعد خود سے بے نیاز ہو جاتی ہیں۔ ثمر نے اس کی وارفتگی اور اس کا عشق دیکھا لیکن یہ نہ سمجھ سکی کہ اس عشق کی بنیاد ایک فانی اور عارضی چیز پر ہے۔ اگر اس نے سمجھا ہوتا تو اس عارضی چیز کو سنبھال کر رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہوتی

لیکن وہ تو سمجھانے پر بھی نہیں سمجھی۔

ایک دن آذر نے اسے ٹوک دیا "اپنا خیال رکھو ثمر جان۔ تمہاری کمر پھیل رہی ہے۔"

"ہٹیں۔ کیسی بات کرتے ہیں۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں" آذر نے سنجیدگی سے کہا "بھدی ہونا شروع ہو گئیں تو پھر قابو نہیں پا سکو گی۔ موٹاپا بڑی خطرناک چیز ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"احتیاط۔ کھانے پینے میں بھی اور ہر وقت بیٹھی نہ رہا کرو۔"

ثمر چڑ گئی "آپ کے خیال میں میں خالی بیٹھی رہتی ہوں۔"

"تمہارے ہی بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں۔"

لیکن ثمر کی سمجھ میں نہیں آیا اور جب وہ سمجھی تو دیر بہت ہو چکی تھی۔

ثمر کے ساتھ گزرے ہوئے وہ پانچ سال آذر کی زندگی کے سب سے خوب صورت دن تھے۔ اس عرصے میں وہ تین بیٹوں کا باپ بنا۔ اس عرصے میں اس کے لئے آسودگی ہی آسودگی تھی۔ لگتا تھا، ہر محرومی کی تلافی ہو گئی ہے لیکن فن کار کے فن کو جلا محرومیوں ہی سے ملتی ہے۔ اسی لئے قدرت اس کے لئے بطورِ خاص محرومیوں کا اہتمام کرتی ہے۔

موٹاپا وہ چیز ہے، جو ایک بار آ جائے تو پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ثمر پر آذر کی تنبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس دور میں عورتیں عام طور پر خود سے بے خبری رہتی تھیں۔ ثمر کو بھی اپنے موٹاپے کا پتا نہیں چلا۔ شاید پتا چلتا بھی نہیں مگر آذر کی بے التفاتی نے اسے اس کا احساس دلا دیا لیکن صرف احساس سے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ وہ خود کو بھدے پن سے محفوظ رکھ سکی اور نہ ہی اس کے بعد اسے کبھی آذر کی توجہ ملی۔ اس کی شکایت دل میں لئے وہ دنیا سے رخصت ہو گئی مگر درمیان میں شوہر کی بے التفاتی کے اڑتیس اذیت ناک برس اسے گزارنا پڑے۔

آذر نازک طبع تھا، پیدائشی فنکار تھا۔ بھدا پن اس کی برداشت سے باہر تھا۔ ثمر کی خوش بدنی کے پانچ برسوں میں اسے زہرہ بھی یاد نہیں آئی تھی لیکن جب ثمر بھدی ہو گئی تو زخم محرومی پھر سے ہرا ہو گیا۔ وہ پھر سے زہرہ کے لئے تڑپنے لگا۔ طبیعتاً آوارہ نہیں تھا مگر ایک خوب صورت عورت کے قرب سے محرومی اس کے لئے ایک بڑی محرومی تھی۔ اس محرومی کا ازالہ بھی کرنا تھا۔ یوں اس نے اپنی تنہائی کی محفلیں سجانا شروع کر دیں۔

ہر چیز کا کوئی مثبت رخ بھی ہوتا ہے۔ ثمر کا بھدا ہو جانا اور اس کی طرف سے آذر کا دل بھر جانا۔ اس کا فائدہ اس کے فن کو پہنچا۔ اس نے متناسب جسم کی عورتوں کو حالتِ رقص میں پینٹ کرنا شروع کر دیا۔ یہ اس کے فن کے بلندی کی طرف سفر کا آغاز تھا۔ یہ

سفر بھی نہیں رکا اور وہ آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔
اسے مستقل مزاجی کہئے، حسن پرستی کہئے یا نزاکتِ احساس کہ شمسہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ کبھی شمسہ کے پاس نہیں گیا۔ اس نے شمسہ کی ضرورتوں کا خیال رکھا۔ اسے کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی لیکن ایک بار کے سوا اس نے کبھی شمسہ کو اپنی قربت نہیں دی اور وہ جو قربت کا ایک موقع تھا، اس میں بھی اپنی دانست میں وہ شمسہ کے نہیں، زہرہ کے پاس تھا۔

اس نے آبائی مکان میں بھی اپنے اسٹوڈیو کو گھر سے الگ تھلگ کر رکھا تھا۔ شمسہ سے دل بھر جانے کے بعد وہ زیادہ وقت اپنے اسٹوڈیو ہی میں گزارتا۔ کبھی کبھی تو وہ کئی کئی دن گھر نہ آتا۔ دہلی آجانے کے بعد بھی یہی سلسلہ رہا۔ اور یہ بات بھی دہلی ہی کی ہے۔

ایک دن اس کی تنہائی کی محفل بھی ہوئی تھی۔ اس روز اس نے معمول سے زیادہ ہی پی لی تھی اس لئے زیادہ ترنگ میں تھا اور کچھ محرومی کا احساس بھی اس روز زیادہ تھا ورنہ جسمانی تقاضوں سے تو سمجھوتا کرنا اس نے بہت پہلے سیکھ لیا تھا۔

راج نرتکی کے روپ میں زہرہ اس کے سامنے رقص کا مظاہرہ کررہی تھی۔۔۔ اور وہ خود زیادہ ہی وارفتگی دکھا رہا تھا۔ اچانک زہرہ ناچتے ناچتے اس کے بہت قریب آئی اور اس پر جھکتے ہوئے سرگوشی میں بولی "آج رات جب سب سوجائیں گے تو میں تمہاری خوابگاہ میں آؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔"

آذر کو اب بھی یاد تھا۔ یہ ۴۳ء کی بات ہے۔ وہ جولائی کا مہینہ تھا۔ اپنی وہ سرشاری بھی وہ کبھی نہیں بھول سکا۔ ۵۲ سال کی عمر میں وہ نوجوانوں کی سی بے تابی سے دوچار تھا۔ وہ خواہش سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

اپنی اِندر سبھا ختم ہو جانے کے بعد عام طور پر وہ کچھ دیر کام کرتا تھا اور پھر سکون سے سو جاتا تھا۔ اس رات مگن کے وعدے نے اسے ایسا بے تاب کیا کہ اس کی محفل معمول سے جلدی ختم ہوگئی پھر وہ کام کرنے بیٹھا تو اس سے کام نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پینے بیٹھ گیا۔ نشہ گہرا ہونے لگا تو وہ اسٹوڈیو میں اپنی خوابگاہ میں چلا گیا۔

خوابگاہ میں بھی وہ زہرہ کا انتظار کرتا اور پیتا رہا۔ دیر ہوگئی۔۔۔ بہت دیر ہوگئی اور زہرہ وعدے کے مطابق نہیں آئی۔ مزید تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد اس کے نشے میں ڈوبے ہوئے ذہن نے اسے یہ نکتہ سمجھایا کہ زہرہ کا مطلب اسٹوڈیو والی خوابگاہ نہیں بلکہ اس کی اصلی خوابگاہ تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ گھر کی طرف لپکا۔ اس وقت تک رات بہت ہوچکی تھی۔

گھر پہنچتے ہی وہ سیدھا خوابگاہ میں گیا۔ وہاں وعدے کے مطابق زہرہ موجود تھی۔ وہ اس کی قربت میں کھو گیا۔

آذر کو اور پھر اس کی وارفتگی کو دیکھ کر شمسہ کو لگا کہ ایک بار پھر اس کے بھاگ جاگ گئے ہیں۔ اس کی تمام دعائیں قبول ہوگئی ہیں۔ اس نے بڑھ چڑھ کر آذر کی پذیرائی کی۔ بیس سال کی خزاں کے بعد اس کے آنگن میں بہار آئی تھی۔ اس پر خود بھی وارفتگی طاری ہوگئی تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ آذر اسے زہرہ کے نام سے پکار رہا ہے۔ وہ تو یہ سوچ کر خوش ہورہی تھی کہ اسے بیس سال بعد کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہے۔ وہ سکون سے بے سدھ ہو کر سوگئی۔

اس رات آذر بھی بڑی طمانیت سے سویا لیکن صبح بیدار ہونے کے بعد اپنے پہلو میں شمسہ کو دیکھ کر اسے دھچکا لگا۔ مگر اس کے ذہن نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ رات اس کے پاس زہرہ نہیں شمسہ تھی۔

مئی ۴۴ء کے پہلے ہفتے میں انور کی ولادت ہوئی۔ آذر کو قدرتی طور پر اس سے بڑی محبت تھی۔ اس کے خیال میں وہ اس کے اور زہرہ کے تعلق کی واحد نشانی تھا۔ اس نے اپنا ہر خواب اسے سونپ دیا۔

شمسہ کو بہت دنوں کے بعد یقین آیا کہ خوش قسمتی نے وہ ایک خوب صورت رات اتفاق سے اس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ اس کے بعد اس طرح کی کوئی خوشی اس کی زندگی میں نہیں آئی۔ تین جوان بیٹوں کی ایک حادثے میں موت کا صدمہ اس نے اکیلے سہا۔

آذر کو اعتراف تھا کہ قدرت نے اسے بھائی کے روپ میں



بہت بڑی نعمت عطا فرمائی تھی ورنہ خود اسے زندگی کے عملی پہلو اور مالی معاملات کی تمیز تھی ہی نہیں' اختر بھائی شروع ہی سے جائداد کے معاملات سنبھالتے رہے۔ انہوں نے اسے ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا۔ انہوں نے دورِ جدید کے تقاضے جلد ہی سمجھ لئے۔ زراعت کو چھوڑ کر وہ صنعت کے میدان میں اترے۔ اس کے نتیجے میں دولت اور بڑھی۔ یہ سب کچھ وہ بہ آسانی ہڑپ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اس طرح کا انتظام کیا کہ آذر مستقبل کی طرف سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز ہو گیا۔ اسے دہلی میں بہت اچھا گھر اور اسٹوڈیو بھی مل گیا اور ہر ماہ ایک خطیر رقم کے حصول کی ضمانت بھی۔ آذر کو اپنی تصویروں کی فروخت سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا' وہ اس کے علاوہ تھا۔ بہر حال اگر وہ نہ ہوتا تو بھی اسے کبھی پریشان نہ ہونا پڑتا۔ وہ اس بھائی کو آخری سانس تک دعائیں دے سکتا تھا' جس نے اپنے فنکار بھائی کو فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیا تھا۔ آذر جانتا تھا کہ اس کے فنی قامت کی بلندی میں اختر بھائی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

○☆○

آذر نے ایک گہری سانس لی۔ وہ ایسی تھکن محسوس کر رہا تھا' جیسے میلوں پیدل دوڑا ہو لیکن ایک اطمینان بھی تھا۔ وہ اس سخت مرحلے سے گزر چکا تھا۔ اب شاید باقی عمر۔۔۔ جتنی بھی ہو' سکون سے گزر جائے گی۔

اس نے جام خالی کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ اس نے ملازمہ سلطانہ کو کھانا بیڈ روم میں ہی لانے کی ہدایت کی۔ کھانے کے بعد اس نے کچھ دیر لان میں چہل قدمی کی۔ حالانکہ تھکن کا احساس بہت شدید تھا۔ خواب گاہ میں واپس آ کر وہ بستر پر لیٹا' اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ سونے والا ہے۔ چند لمحوں کے اندر وہ سو چکا تھا۔

بہت عرصے کے بعد وہ نیند کی دوا کے بغیر سویا تھا۔

○☆○

فلم زندگی کی پبلسٹی بہت مختلف اور منفرد انداز میں ہوئی تھی۔ فلم کی ریلیز سے ایک ہفتہ پہلے سے ایڈوانس بکنگ شروع کر دی گئی۔ اس سلسلے میں جو اشتہار اخبارات میں شائع ہوا' اس کے مطابق فلم کی ریلیز سے ایک دن پہلے تک ایڈوانس بکنگ کرانے والوں کو فلم کی ہیروئن نیتا کے آٹوگراف کے ساتھ اس کی ایک بڑی کلر تصویر کا تحفہ ملنا تھا۔ یہ آئیڈیا نیتا کا ہی تھا۔

آئیڈیا بے حد کامیاب ثابت ہوا لیکن نیتا کی مصیبت ہو گئی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں تصویروں پر دستخط کرنے پڑیں گے۔ پہلے ہی دن یہ نوبت آ گئی کہ تصویروں کی پشت پر اس کے آٹوگراف پرنٹ کرانے پڑ گئے۔ اتنی بڑی تعداد میں تصویریں چھپوانا ایک علیحدہ مسئلہ تھا۔

بہر حال فلم کی ریلیز سے پہلے ہی اس کی کامیابی یقینی ہو گئی۔ بمبئی کے مین سینما پر فلم کی ریلیز سے ایک دن پہلے تک آٹھ ہفتے کی بکنگ ہو چکی تھی۔ یہ کسی بھی فلم کی ایڈوانس بکنگ کا ایک نیا ریکارڈ تھا۔ فلم پورے ملک میں بیک وقت ریلیز ہو رہی تھی۔

اس دوران جگدیش والی بلی بھی تھیلے سے باہر آ چکی تھی۔ جگدیش ایک بار اس کے گھر آیا تھا اور اسے شادی کی پیشکش کی تھی۔

"آپ حیران ہوئی ہیں یہ سن کر؟" جگدیش نے اس سے پوچھا تھا۔

"جی نہیں لیکن یہ میرے لئے خلافِ توقع ضرور ہے" نیتا نے شائستگی سے جواب دیا پھر پوچھا "آپ برا نہ مانیں تو میں یہ پوچھوں کہ یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟"

"اس کے جواب میں مجھے ایک بہت گھسی پٹی بات کہنی پڑے گی جو میں کہنا نہیں چاہتا۔"

"آپ اظہارِ محبت کر رہے ہیں مجھ سے؟" نیتا نے شوخی سے کہا۔

"جی ہاں اور یہ آپ کے لئے کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں بلکہ آپ تو عادی ہوں گی اس کی۔"

"یہ تو ہے لیکن آپ کے معاملے میں مجھے حیرت ضرور ہے۔"

"کیوں؟ میں آپ کو محبت کا اہل نہیں معلوم ہوتا؟"

"یہ بات نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ چار فلمیں بنا رہے ہیں اور مجھے آپ نے ان میں سے ایک فلم کے لئے بھی سائن نہیں کیا۔"

"میں آپ کو زندگی بھر کے لئے اپنی شریک کی حیثیت سے سائن کرنا چاہتا ہوں اور میں اپنی بیوی کو فلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسی خیال سے میں نے آپ کو سائن نہیں کیا۔ حالانکہ آپ میری کاروباری ضرورت بھی ہیں۔"

نیتا مسکرا دی۔ اس کے پہلے تاثر کی تائید ہو رہی تھی۔ جگدیش چالاک آدمی تھا۔ وہ اس کا انٹرویو پڑھ چکا تھا۔۔۔ اور اب اپنی محبت کی سچائی ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ پابندی تو میرے لئے قابلِ قبول نہیں۔" اس نے کہا۔

ایک لمحے کو جگدیش گڑبڑا گیا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی شرط واپس لے لیتا لیکن اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ "دیکھیے' آپ کو فلموں میں کام کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں آپ کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کروں گا۔ میں آپ کی ہر خواہش پوری کر سکتا ہوں۔۔۔"

"میں جانتی ہوں کہ دس بیس کروڑ کی آپ کے لئے کوئی اہمیت نہیں" نیتا نے اس کی بات کاٹ دی "لیکن آپ مجھے نہیں جانتے۔ فلم میں کام کرنا میری ضرورت نہیں' شوق ہے۔ اچھا رول ملے تو میں معاوضے کی بھی پروا نہیں کرتی۔ فلم میں جب تک ایک خاص مقام حاصل نہ کر لوں' میں اداکاری نہیں چھوڑوں گی۔"

"ایک بات صاف گوئی سے بتائیں" جگدیش نے کہا "آپ

مذہب کے فرق کی وجہ سے تو نہیں ہچکچا رہی ہیں؟"

"جی نہیں۔" نیا مسکرائی۔ "فلم انڈسٹری کا اپنا ایک مذہب ہے۔ یہ [illegible] ہندو ہے نہ مسلمان۔"

"[illegible] آپ چاہیں تو میں مسلمان ہو سکتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں جگدیش جی۔"

"[illegible] آپ کا انتظار کروں گا نیا" جگدیش نے اٹھتے ہوئے وقار سے کہا "میری محبت آپ کی منتظر رہے گی۔ کیریئر ختم [illegible] کا فیصلہ کرتے وقت مجھے ذہن میں ضرور رکھئے گا۔ اس وقت [illegible] محبت کی سچائی بھی ثابت ہو جائے گی۔"

نیا دل میں اسے سراہے بغیر نہ رہ سکی "ایک منٹ" وہ بولی۔ "ایک اور بات سن لیں۔ میں شادی دولت کی وجہ سے بھی [illegible] کروں گی۔ میں محبت کی شادی کی قائل ہوں۔ صرف آپ کی محبت شادی کے لئے کافی نہیں۔ یہ الگ بات کہ مجھے بھی آپ سے محبت ہو جائے۔ مگر فی الحال ایسا نہیں ہے۔"

جگدیش کی رنگت ایک لمحے کو متغیر ہوئی پھر وہ بولا "مجھے آپ تو اچھی لگی ہیں کہ سب سے مختلف ہیں۔ آپ کی یہ صاف [illegible] مجھے اچھی لگی ورنہ فلمی اداکاراؤں میں تو یہ خوبی ہوتی ہی [illegible] نیا! اجازت چاہتا ہوں۔"

نیا اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک مسکراتی رہی۔ جگدیش [illegible] کی ہی اپنی شکست کا سبب بن گئی تھی لیکن اس نے [illegible] کے بعد بھی جس وقار کا مظاہرہ کیا تھا' وہ متاثر کن تھا۔ اور اس [illegible] ایک خطرناک وار بھی کیا تھا۔۔۔ مذہب کے حوالے سے۔ بھارتی فلم انڈسٹری میں مسلمانوں کو ہمیشہ بڑا مقام اور اہمیت حاصل رہی [illegible] وہ خواہ [illegible] سے مذہبی ہی کیوں نہ ہوں' انہیں سیکولرازم کا لبادہ اوڑھ کر جینا پڑا۔ نیا کو خوشی تھی کہ اس نے برجستہ درست [illegible] ورنہ وہ ہندو کے تعصب سے خوب واقف تھی۔ اس [illegible] ایسی ویسی بات منہ سے نکل جاتی تو اسے جگدیش سے [illegible] پڑتی ورنہ وہ اسے بلیک میل کرتا اور اس کا کیریئر تباہ

پریمیئر سے تین دن پہلے ریاض تجسم نیا سے ملنے آیا [illegible] تھا' جسے اس نے پہلا تفصیلی انٹرویو دیا تھا۔ [illegible] اس سے [illegible] متاثر ہوا تھا کہ ہمیشہ اس کے لئے اچھے لفظ [illegible] تھا بلکہ دونوں کے درمیان خاصی دوستی ہو گئی تھی۔

"پریمیئر میں کس کس کو مدعو کیا گیا ہے؟" ریاض نے نیا سے پوچھا۔

نیا نے بڑے بڑے [illegible] کے نام گنوا ڈالے۔

"تمہیں بھی کسی کو مدعو کرنے کا اختیار ہے؟" ریاض نے [illegible] اب ان کے درمیان ایسی ہی بے تکلفی تھی۔

"اختیار ہے [illegible] تمہارا نام مدعوئین کی فہرست میں دیکھ چکی ہوں۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہا ہوں۔"

"تو پھر؟"

"میں اس شخص کی بات کر رہا ہوں' جسے تمہاری فلم کے اس پریمیئر کی تقریب کا مہمانِ خصوصی ہونا چاہئے لیکن تم فلم والوں کے ساتھ مسئلہ ہی یہ ہے کہ تم لوگوں کو فلم کے سوا کچھ پتا نہیں ہوتا ورنہ مدعو کرنے والے اسے نہیں بھول سکتے تھے۔"

نیا کو اس شخص کی اہمیت کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا' جو ریاض تجسم کے خیال میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت کا مستحق تھا "کون ہے وہ شخص؟" اس نے پوچھا۔

"بین الاقوامی شہرت رکھنے والا ایک مصور ہے۔ یہاں کوئی اسے جانتا بھی نہیں لیکن امریکا اور یورپ میں اس کا بڑا مقام ہے۔ وہاں اس کی تصویروں کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔ اور ہمیشہ کامیاب ہوتی ہے۔ وہاں اس کی تصویریں بہت مہنگے داموں بکتی ہیں۔"

امریکا کے حوالے پر نیا کی آنکھوں میں چمک ابھری پھر اس نے تمسخرانہ لہجے میں کہا "ایک مصور اور میری فلم کے پریمیئر کا مہمانِ خصوصی! میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔"

"اس کا مطلب ہے تم واقعی اس سے ناواقف ہو۔"

"کچھ بتاؤ تو۔"

"وہ مصورِ رقص کہلاتا ہے۔ وہ رقص کرتی دیوداسیوں کا"

زنگیوں کا مصور ہے۔ اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں اس نے برسوں گزارے ہیں۔ صرف رقص کی خاطر ہندو دیو مالا کو وہ گھول کر پی گیا ہے۔ وہ رقص پر اور جسمانی حسن تناسب پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔" ریاض کے لہجے میں چیلنج آگیا "اب تم بتاؤ، تمہاری اس فلم کے پریمیر میں مہمانِ خصوصی کے لئے اس سے بہتر کوئی شخص ہو سکتا ہے؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو" نینا بولی "پلیز۔ تم انہیں مدعو کرلو۔"

"یہ کام میرے بس کا نہیں" ریاض نے کہا "میرا مشورہ ہے کہ تم خود دعوت نامہ لے کر جاؤ۔ وہ بہت نخریلے اور نازک طبع ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمہیں جھڑک کر بھگا دیں لیکن میں بتا رہا ہوں، وہ شخص تمہاری اس فلم کو پروموٹ بھی کرسکتا ہے اور سنو۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ زنگی تمہاری فلم ہے۔ اس میں صرف اور صرف تمہارا پیسہ لگا ہے۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو یہ آخری بات سن کر نینا کو شاک لگا ہوتا لیکن اس وقت وہ اس مصور کے بارے میں سوچ رہی تھی "نام کیا ہے ان کا؟" اس نے پوچھا۔

"آذر جمیل اور وہ دہلی میں رہتے ہیں" ریاض نے کہا اور ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا "یہ ان کا پتا ہے اور ہاں نینا، دیکھنے میں وہ ۴۰ سے زیادہ کے نہیں لگتے لیکن ان کی عمر ۹۰ کے لگ بھگ ہے۔"

"ٹھیک ہے ریاض، شکریہ۔ میں کوشش کروں گی کہ انہیں رضامند کرلوں۔"

ایک گھنٹے بعد نینا دہلی جانے والی فلائٹ پر تھی۔ رات اس نے ہوٹل میں گزاری۔

اگلے روز پریمیر شو کا دعوت نامہ لے کر وہ آذر کے گھر پہنچ گئی۔ آذر کی ملازمہ سے بات کرکے اسے اندازہ ہوگیا کہ ریاض واقعی آذر تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ملازمہ اسے بھی ٹرخانے کی کوشش کررہی تھی۔

"دیکھیے بی بی۔۔۔ صاحب کسی سے نہیں ملتے۔ خواہ مخواہ مجھے ڈانٹ پڑ جائے گی۔"

"اچھا۔۔۔ تم جا کر اپنے صاحب کو بتاؤ تو میرے بارے میں۔"

"کیا بتاؤں بی بی؟"

"کہنا، میں ایک مشہور رقاصہ ہوں اور ان سے ملنے کے لئے بہت دور سے آئی ہوں۔"

ملازمہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلی گئی۔ نینا ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتی رہی۔ سادہ سی آرائش تھی اور آؤٹ آف ڈیٹ لگ رہی تھی۔

"بی بی۔۔۔ صاحب اس وقت کام میں مصروف ہیں۔ کہہ رہے ہیں پھر کسی وقت آنا" ملازمہ نے واپس آکر بتایا "اس وقت وہ اسٹوڈیو سے نہیں نکلیں گے۔"

"اسٹوڈیو کہاں ہے ان کا؟"

ملازمہ نے اندر کی طرف اشارہ کردیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسٹوڈیو میں جا کر مل لیتی ہوں" نینا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"صاحب ناراض ہوں گے۔ میری نوکری چلی جائے گی"

ملازمہ نے احتجاج کیا۔

"نہیں جائے گی۔ اگر گئی تو میں اس سے زیادہ تنخواہ پر تمہیں رکھ لوں گی" نینا نے کہا۔

ملازمہ نے ایک نظر سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور ہتھیار ڈال دیے "آخر میں سامنے کی طرف دروازہ ہے۔ دستک دیجئے گا" اس نے رہنمائی کی۔

وہ ایک راہداری تھی، جو ایک چوڑے دروازے پر ختم تھی۔ نینا نے اس پر دستک دی۔ اندر سے کسی نے جھنجلائی آواز میں کہا۔ "میں نے منع کیا تھا کہ اب مجھے ڈسٹرب نہ کرو، کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔"

نینا نے ہینڈل گھما کر آہستگی سے دروازہ کھولا "کیا آپ مجھ سے بھی ملنا نہیں چاہیں گے؟" اس نے مترنم آواز میں کہا۔

کینوس پر چلتا ہوا برش رکا۔ تصویر بنانے والے نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر غضب ناکی تھی "یہ کیا بدتمیزی۔۔۔" چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کا جملہ ٹوٹ گیا۔ چہرے پر غضب کی جگہ حیرت نظر آنے لگی پھر اس کی آنکھیں پھیلتی گئیں۔

نینا خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس نے دانستہ [illegible] اپنایا تھا، جیسے کوئی رقاصہ رقص کرتے کرتے بت بن [illegible] جسمانی نشیب و فراز کو پوری طرح نمایاں کرنے کے لئے انداز تھا۔

مصور کے ہونٹ لرزے لیکن کوئی آواز نہ نکلی [illegible] اس نے بڑی مشکل سے کہا "زہرہ! زہرہ۔۔۔ تم!" اس کے ہاتھ سے برش چھوٹ گیا۔

وہ لمحہ نینا کے لئے حیرت کا لمحہ تھا۔ وہ ذہن پر زور دیتی [illegible] کون ہے یہ شخص اور اسے کیسے جانتا ہے؟ "آپ۔۔۔ [illegible] کیسے واقف ہیں؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا "[illegible] معلوم ہوا آپ کو۔"

مصور مسکرایا "اب میرے سوا کون جانے گا [illegible]

"ایک میں ہی تو [illegible] جو ۸۰ سال سے تم سے [illegible] میں پہلا عمل [illegible]" وہ اس کی طرف [illegible]

نینا کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ خوف اور [illegible] نے اس کے جسم کو شل کرکے رکھ دیا۔ اس کے الجھے ہوئے ذہن میں ایک ہی خیال تھا۔۔۔ یہ کوئی جادوگر ہے۔۔۔ یا پھر دیوانہ ہے

اس کے پاؤں من من بھر کے ہوگئے تھے [illegible] اس کے بس میں ہوتا تو وہ پلٹ کر بھاگ کھڑی ہوتی۔ مگر وہ تو اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ بے بس کھڑی اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی اب اس [illegible] کی جھلک نظر آرہی تھی۔

★★★

JA 197

ان میں خطوط میں وہ واحد خط تھا جو مسز جولیا مارٹن ' ایڈیٹر، بچوں کی کتابیں کے نام تھا۔ باقی انیس خط ایڈیٹر ولیسٹر پبلشنگ کمپنی کے نام تھے... اور وہی ایک خط دہشت کا نقطۂ آغاز تھا۔

جولیا کو یہ بات کچھ اچھی نہ لگی۔ وہ گمنام رہنا پسند کرتی تھی۔ اس کا کام کچھ ایسا تھا کہ اُسے لوگوں کو نفی میں جواب دینا ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ خطوط کو نظر انداز کرتی تھی اور خط کھولتے ہی خط سے منسلک مسودوں کی طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔ وہ خطوط مبتدیوں کے ہوتے تھے، جو ادب کی دنیا میں تہلکہ مچا دینے کے خوابوں میں گم رہتے تھے۔

اس خط میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا... اور بس۔ جولیا نے اُسے لفافے سے کھینچ لیا۔ "ڈیئر مسز مونٹ..." خط اس انداز میں شروع ہوتا تھا۔ جولیا نے سرد آہ بھری۔ اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی منتقم مزاج مبتدی کا خط ہے۔ مزید لکھا تھا... "دوسرے خط میں تمہارے لیے تحفہ موجود ہے۔ یہ سب کچھ میں نے صرف اور صرف تمہارے لیے کیا ہے۔ امید ہے یہ کارآمد ثابت ہو گا... نہ ہوا تو میری طرف سے مزید خط کی امید رکھنا۔ خلوص کیش جے اسمتھ۔"

جولیا نے دوسرے لفافوں پر نظر ڈالی۔ پھر اُسے ایک اور لفافہ نظر آ گیا جس پر اسی تحریر میں پتا درج تھا۔ اس لفافے پر چھ سات جگہ مہر لگی ہوئی تھی: "نازک چیز ہے۔ احتیاط برتیے۔"

اسی وقت فریڈ جولیا کی طرف چلا آیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں آرٹ بورڈ تھے۔ اس نے لفافے کو تعجب سے دیکھا اور بولا۔ "قیمتی لگتا ہے۔ شاید اس میں سونا ہو گا۔"

"تب تو قیمتی نہیں ہو سکتا۔" جولیا نے خشک لہجے میں کہا۔ "اس کا وزن نہ ہونے کے برابر ہے۔ مجھے تو خالی معلوم ہوتا ہے۔" اس نے لفافہ کھولا... اور حیران رہ گئی۔ لفافے میں سے ایک سیاہ مکڑی برآمد ہوئی تھی۔ پہلے تو وہ مُردہ نظر آئی، لیکن پھر اس کی ٹانگیں متحرک ہو گئیں۔

"اوہ۔" جولیا چیخی۔ "نہیں... نہیں۔" پھر وہ کرسی سے اٹھ گئی۔ کرسی اُلٹ گئی۔ اس کا جسم بُری طرح لرز رہا تھا۔ اُسے ہر رینگنے والی چیز سے خوف آتا تھا۔ فریڈ نے آرٹ بورڈ کی مدد سے اُسے کچل ڈالا۔

**

وہ روشن روشن ڈرگ اسٹور اس کے گھر کی سرحد کی حیثیت رکھتا

ایک خاتون کا قصہ، جو اپنا فرض دیانت داری سے ادا کر رہی تھی

بعض اوقات بہت معمولی باتیں بڑھ کر وبالِ جان بن جاتی ہیں۔ آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا وہ معمولات کے مطابق بنے ہوئے اصولوں کے تحت کام کرتا رہتا ہے اور پھر ایک دن اچانک اس پر کسی غلطی کا انکشاف ہوتا ہے

علیم الحق حقی



تھا۔ وہ گھر واپس جاتے ہوئے بس سے اترتی... وہاں رنگین اور اخبار، آئس کریم یا آئی واش خریدتی۔ آئی واش اُس کے لیے بے حد ضروری تھا کیونکہ اُسے بہت زیادہ پڑھنا ہوتا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ وہ اسٹور اُسے بہت پسند تھا۔ وہ اُسے اس اسٹور کی یاد دلاتا تھا، جہاں کالج کے دِنوں میں اس نے پہلی ملازمت کی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات تھی جب وہ مارٹن سے نہیں ملی تھی... جب اس نے مارٹن سے شادی نہیں کی تھی، جب مارٹن نے اُسے مسترد نہیں کیا تھا۔

اس نے سفید کوٹ میں ملبوس اسٹور والے کی طرف نسخہ بڑھایا!

اور اخبار اٹھالیا پھر اس نے پچاس سینٹ کا سکہ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"اور کچھ؟" اسٹور کے مالک نے پوچھا۔

"نہیں!" جولیا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ناخوشگوار دن گزارنے کے بعد وہ اسٹور اُسے خوشگواریت کا احساس دلا رہا تھا۔ ناخوشگواری کا احساس پبلشنگ کمپنی کے اسٹاف نے بڑھا دیا تھا۔ انھوں نے بات کا بتنگڑ بنا ڈالا تھا۔ فریڈی کی آنکھوں سے فکرمندی مترشح تھی، حالانکہ اس کا تبصرہ بےضرر تھا۔ اس کے خیال میں وہ بےضرر سا مذاق تھا، لیکن اس کی آنکھوں کا تاثر اس کے الفاظ کی نفی کر رہا تھا۔ پھر کاپی ریڈر اور سیکریٹریز... وہ سب مس مونٹ اور اُس کی سیکریٹری کے متعلق طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ حد یہ ہوئی کہ مسٹر ولیسٹر خود اس کے پاس استفسار کرنے چلے آئے، حالانکہ وہ اس طرف بہت کم آتے تھے۔

اُسے دوسروں کی توجہ کا مرکز بننا پسند نہیں تھا۔ اس نے اپنی ذات کے گرد جو حصار قائم کیا تھا، وہ توجہ اس حصار کو توڑنے لگتی تھی۔ وہ حصار قائم کرنا بہت مشکل تھا اور نفسیات دانوں کی رائے میں غلط بھی تھا۔ لیکن وہ اس کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ اس نے حماقت کی حد تک پہنچتے ہوئے خلوص کے ساتھ اپنی ذات کا تحفہ بیکراں محبت میں پیک کر کے مارٹن کی خدمت میں پیش کیا تھا لیکن نتیجہ کیا نکلا تھا۔ اس کا تحفہ بغیر شکریے کے اُسے واپس کر دیا گیا تھا۔ ایسے میں آدمی خود کو محصور نہ کرے تو کیا کرے۔ اب وہ کسی پر کیسے انحصار کر سکتی تھی۔ مارٹن سے طلاق کے بعد اس نے بڑی مشکل سے خود سے... صرف خود سے دوستی کرنا سیکھا تھا۔

لیکن اس کے انتشار کا سبب صرف اس کے ساتھیوں کی توجہ نہیں تھی۔ اسٹور سے نکل کر اپنے اپارٹمنٹ کی طرف چلتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی۔ اس کا سبب وہ سکریٹری بھی نہیں تھی، جو کسی نے اُسے بھیجی تھی کیونکہ سکریٹری بے ضرر تھی۔ وہ یہ سوچ کر پریشان تھی کہ وہ اپنی ذات کو کسی بھی تعلق سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش میں ناکام ہوگئی ہے۔ اس دنیا میں کہیں کوئی جے اسمتھ تھا، جو اس سے پوری شدت سے نفرت کرتا تھا۔ اس نے خود کو ہر جذبے سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود وہ ایک اجنبی شخص کے تند و تیز جذبے میں ملوث ہوگئی تھی۔

اس نے اپنے میل باکس میں سے ڈاک نکالی۔ اس میں کچھ بل تھے۔ دو کتب کانفرنس میں شرکت کے دعوت نامے تھے۔ ایک اس کی خالہ کا خط تھا... اور ایک اور خط تھا، جو مسز جولیا مارٹن کے نام تھا۔ اس نے اس خط کے سوا تمام خطوط اپنے بیگ میں رکھے اور لفٹ میں گھس گئی۔ پھر اس نے وہ خط کھولا۔ اب وہ اس تحریر کو پہچاننے لگی تھی۔ اس بار تخاطب مختلف تھا۔

"ڈیر مس ہمٹی ڈمٹی... میرا پہلا تحفہ پسند آیا؟ دوسرے تحفے کی توقع بھی رکھو۔"

لفٹ اُوپر کا سفر کر رہی تھی۔ اس نے ایمرجنسی اسٹاپ کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ٹھٹک گئی۔ لفٹ کی رفتار کم ہوئی۔ بالآخر لفٹ ٹھہر گئی۔ دروازے کھلے... اور اب اس کے سامنے جانی پہچانی راہداری تھی۔ وہ باہر نکلی اور کچھ دیر اپنی بےترتیب دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا دل گویا حلق میں دھڑک رہا تھا۔

"ہمٹی ڈمٹی بُری طرح گرے؟" اُسے بچّوں کی نظم کا وہ مصرع یاد آگیا۔ وہ لفٹ میں گر سکتی تھی، نہیں، راہداری میں... لیکن وہاں بہت سے لوگ رہتے تھے۔ کوئی اور بھی تو شکار ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے جال اپارٹمنٹ میں بچھایا گیا ہو۔

وہ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف چل دی۔ اگر وہ اپنی عام رفتار سے چل رہی ہوتی تو یقیناً بُری طرح گرتی لیکن احتیاط کے خیال اور خوف نے اس کی رفتار بہت کم کر دی تھی۔ جیسے ہی تار اُس کے ٹخنے سے مَس ہوا وہ ٹھہر گئی۔ پھر وہ بیٹھ گئی۔ اس کے گھٹنے بُری طرح لرز رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ پتلا سُرمئی رنگ کا تار تھا، راہداری میں بچھے ہوئے قالین کا ہم رنگ تار۔ وہ دونوں جانب کے دروازوں کی چوکھٹ میں کیلیں گاڑ کر فرش سے تین انچ اوپر تانا گیا تھا۔ اپنے رنگ کی وجہ سے ایک فٹ کے فاصلے سے اُسے دیکھنا ناممکن تھا۔

چند لمحے بعد جولیا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اب اس کی کیفیت بہتر تھی۔ اس نے پرس سے اپنا سفید رومال نکال کر تار پر ڈال دیا تاکہ کسی اور کے گرنے کا امکان نہ رہے۔ پھر وہ دروازہ کھول کر اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔ اس نے ایک ایک کمرہ چھان مارا لیکن سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ پھر اس نے نشست میں آکر پولیس کو فون کر دیا۔

اگلی صبح اس نے مسترد شدہ مسوّدوں کی فائل سنبھالی اور کانفرنس روم کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ پولیس کا خیال تھا کہ یہ کسی ایسے شوقیہ لکھنے والے کی حرکت ہے، جس کا مسوّدہ مسترد کیا گیا ہوگا۔ اس صورت میں صرف جولیا ہی اُسے پہچان سکتی تھی۔

فائل میں جے اسمتھ کا صرف ایک ہی خط موجود تھا۔ اس کے ساتھ بچّوں کی حماقتوں پر مشتمل ایک مسوّدہ بھی تھا۔ دستخط جے اسمتھ کے تھے۔

عمر ۸۹ سال۔ وہ خط دو سال پرانا تھا، اس کے باوجود جولیا فائل میں الجھی رہی۔ لیفٹیننٹ نے خیال ظاہر کیا تھا کہ نام فرضی ہوگا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ خط لکھنے والے نے اپنی تحریر بگاڑنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن یہ بات قرینِ قیاس نہیں تھی کہ وہ دستخط اپنے اصلی نام کے کرے گا۔ اپنے خلاف ایسی ٹھوس شہادت کون فراہم کرسکتا ہے۔

ابھی وہ اپنے کام میں الجھی ہوئی ہی تھی کہ دروازہ کھلا اور فریڈ اندر آگیا۔ ”کہو... کچھ کامیابی ہوئی؟“ اس نے پوچھا۔

جولیا نے نفی میں سر ہلایا، پھر نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کے لبوں پر پھیلی بے حد کشادہ مسکراہٹ دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

”سب جانتے ہیں کہ تم یہاں کس کام میں مصروف ہو۔“ فریڈ نے کہا۔ ”کم از کم چھ افراد نے تمہاری آج کی ڈاک کے سلسلے میں تمہاری سیکرٹری کا ہاتھ بٹایا ہے... لیکن کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی۔“

جولیا اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ سب کچھ بے حد احمقانہ ہے۔ دفتر کے لوگ اس بات کو بھول کیوں نہیں جاتے۔“ اس نے بے حد تند و تلخ لہجے میں کہا۔

”آخر مصیبت کیا ہے؟“ فریڈ کا لہجہ بھی تلخ ہوگیا۔ ”تم کیوں نہیں چاہتیں کہ کوئی تمہاری پروا کرے... تمہارا خیال رکھے۔ کیا تمہاری لغت میں یہ کوئی جرم ہے؟“

وہ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ جولیا خاموش رہی۔

”اچھا یہ موضوع ختم۔“ بالآخر فریڈ نے خاموشی توڑی۔ ”ہم اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔ آج رات چارلیز میں ڈنر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“

”جی نہیں، شکریہ۔“

”ہم سیاست پر گفتگو کریں گے۔“

”مزید شکریہ۔“

بعد میں بند دروازے کو دیکھتے ہوئے جولیا کو شرمندگی کا احساس ہونے لگا۔ اگر وہ ہاں کہہ دیتی تو کتنا خوشگوار وقت گزرتا۔ فریڈ بہت اچھا آدمی تھا۔ نرم خو اور مہربان، اس کے شوہر سے بالکل مختلف۔ کاش وہ اذیت ناک ماضی کو بھلا کر از سر نو زندگی کا آغاز کرسکتی۔ اچانک اسے اپنی ازدواجی زندگی کے وہ آخری چند ماہ یاد آگئے، جب مارٹن طلاق کی تجویز پیش کرچکا تھا۔ وہ ایام ہی تو حاصلِ محبت تھے۔ وہ راتیں ہی تو کسی کا خیال رکھنے کا صلہ تھیں... وہ پُر اذیت روز و شب... نہیں... وہ دوسری حماقت کیسے کرسکتی تھی۔

شام تک اس نے تمام فائلیں دیکھ ڈالیں۔ وہ تحریر اسے کہیں نظر نہ آئی جو اس کے نام آنے والے دو خطوں میں تھی۔ گویا ایک دن رائیگاں چلا گیا۔ اتنی دیر میں کتنا کام ہوسکتا تھا۔ پھر اس کی سیکرٹری نے دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ چھٹی کررہی ہے۔ جولیا بدستور بیٹھی رہی۔ اس نے وہ تمام خطوط علیحدہ کرلیے تھے جن میں بطخ ماں کا تذکرہ تھا۔ وہ ان خطوط کی دوبارہ پڑتال کرنا چاہتی تھی۔ اسے ملنے والے دونوں خطوط میں نظموں کی اس مشہور کتاب کے حوالے موجود تھے... موفٹ اور ہمپٹی ڈمپٹی۔

وہ ایک ایک خط کھنگالتی رہی، تفصیل سے پڑھتی رہی۔ تعریفی خطوط بھی تھے، تنقیدی بھی اور سوالیہ بھی۔ پھر اس کی نظر ایک خط پر پڑی۔ جو ریوسینی ٹوریم کے پیڈ پر لکھا گیا تھا۔ اس پر گیارہ فروری کی تاریخ تھی۔ اس خط نے نہ جانے کیوں اس کے دل کو چھولیا۔

”ڈیئر ایڈیٹر: میں ننھے بچوں کے لیے جدید بطخ ماں کی نظمیں ارسال کررہی ہوں۔ اپنی بیماری کے دوران مجھے یہ خیال آیا تھا اور میں نے اس پر خاصا وقت صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے، یہ نظمیں آج کے بچوں کے لیے بے حد پُرکشش ہیں۔ مجھے ہر روز صرف آدھے گھنٹے کے لیے بیٹھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ تمام نظموں کی نقول میں نے طویل عرصے میں، اسی مہلت کے دوران تیار کی ہیں۔ یہ بات میں ہمدردی سمیٹنے کے لیے نہیں لکھ رہی ہوں بلکہ اپنے بے پایاں خلوص کا اظہار مقصود ہے۔ اگر آپ ان نظموں کو کسی قابل سمجھیں تو میں شکرگزار ہوں گی۔“

خط پر ڈوروتھی کیسل کے دستخط تھے۔ نیچے نوٹ لکھا تھا کہ معمول کے مطابق استرداد کا چھپا ہوا خط ۱۴ فروری کو ارسال کردیا گیا ہے۔ جولیا نے فون اٹھایا اور آپریٹر سے کولوریڈو میں ریوسینی ٹوریم سے رابطے کے لیے کہا۔ ”میں سینی ٹوریم کے اس ڈاکٹر سے بات کرنا چاہتی ہوں جو ڈوروتھی کیسل نامی خاتون کا علاج کررہا ہے۔“ اس نے مزید کہا۔

اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران اس نے اس خط کو بار بار پڑھا۔ پھر فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف آپریٹر تھی۔ جولیا خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ پھر اس نے آپریٹر کا شکریہ ادا کیا اور لیفٹیننٹ شلز سے فون ملانے کی ہدایت کی۔

”میں جولیا مارٹن ہوں۔“ اس نے رابطہ ملنے پر لیفٹیننٹ سے کہا۔ ”میرا خیال ہے، مجھے سراغ مل گیا ہے۔ تقریباً دو ماہ پہلے ڈوروتھی کیسل نامی خاتون نے ہمیں بچوں کی نظمیں بھیجی تھیں۔ ہم نے معمول کے مطابق انہیں مطلع کردیا تھا کہ نظمیں ناقابلِ اشاعت ہیں۔ ڈوروتھی کیسل ٹی بی کی مریضہ تھیں۔ جس روز ہمارا خط انہیں ملا، اسی روز ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ کولوریڈو کے ایک سینی ٹوریم میں زیرِ علاج تھیں۔ سینی ٹوریم سے پتا چلا ہے کہ ان کی موت کے بعد ان کے شوہر اڈولف نے اس شہر میں رہائش اختیار کرلی ہے۔“

اس رات جولیا بس سے آئی اور معمول کے مطابق اپنے اپارٹمنٹ

ہاؤس کی طرف چل دی۔ گلیوں میں بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ جولیا دو رویہ مکانوں کی کھڑکیوں کی طرف دیکھتی اور ان کے مکینوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ کیا وہ لوگ خوش ہیں؟ تنہا ہیں؟ وہ اُسے ہر روز یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے ہیں؟

ڈرگ اسٹور سے اس نے اخبار اور چند رسالے لیے پھر اُس نے اپنی دوالی۔ کاؤنٹر پر موجود لڑکی دوا پیک کر رہی تھی۔

"کیا حال ہے؟" اس نے لڑکی سے پوچھا۔ لڑکی حیران رہ گئی۔

"یہ تو موسم بہار ہے نا!" اس نے بچکانہ سے انداز میں مزید کہا۔

باہر نکل کر اُسے احساس ہوا، جیسے وہ بیمار ہے.... جیسے کاؤنٹر گرل سے وہ رسمی گفتگو بیماری کی پہلی علامت ہے۔ ہوا اُن لوگوں کے دکھوں، مایوسیوں، محرومیوں اور خوشیوں سے بوجھل تھی جو اُسے نفس نفس پی رہے تھے۔ اس نے سر جھٹکا لیکن آگہی کا وہ احساس بدستور موجود رہا۔ ذات کی فصیل چیخ رہی تھی، اگر اس نے اُسے نہ بچایا تو جلد ہی ساری خلقت اس کے قلعے میں گھس آئے گی۔

اس نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ وہ بچوں کے قہقہے نہیں سُننا چاہتی تھی۔ وہ خوش و خرم نوجوان جوڑوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ میل باکس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے میل باکس کو نظر انداز کرنا چاہا لیکن باکس کے رخنے سے جھانکتے ہوئے اس سفید لفافے نے اُسے مجبور کر دیا۔ اس نے بے تابی سے خط کھول کر پڑھا۔

"ڈیئر مس پیپ پیپ! مجھے نہیں معلوم کہ تم پیر اک ہو یا تمھیں کوہ پیمائی سے دلچسپی ہے۔ بہر حال اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ نام تم پر سجتا ہے یا عنقریب سجنے لگے گا۔ یہ میرا آخری خط ہے اور تمھاری ہمدردی، خدا ترسی اور انسان دوستی کا شاخسانہ ہے۔ خلوص کیش
نفے اسمتھ"

اس نے خط پڑھا اور کچھ فکر مند نظر آنے لگی۔ پھر وہ لفٹ کی طرف سے ہٹ آئی اور زینے کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے اپارٹمنٹ والی راہداری میں اس نے پھونک پھونک کر قدم رکھے۔ وہ کسی بھی اَن دیکھی رکاوٹ کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ اس نے اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا۔ اور چند لمحے باہر ہی کھڑی رہی۔ کیا پتا اُس بار کون سی مصیبت اس کی منتظر ہو۔ اس نے پیپ پیپ کا پہلے کبھی تذکرہ بھی نہیں سُنا تھا اور اس بار اُسے اسی نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔

کمرۂ نشست ویسا ہی تھا، جیسا وہ اُسے چھوڑ کر گئی تھی۔ اس نے پورے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے شیلف سے "ہسٹری آف مدر گوز" نکالی اور اس کا انڈیکس دیکھنے لگی۔ ہاں.... اُس میں ایک چھوٹی سی منظوم پہیلی موجود تھی۔

"میری ایک چھوٹی بہن ہے، سب اس کو کہتے ہیں پیپ پیپ،
وہ گھر بیٹھے سمندر پار کر لیتی ہے۔
وہ اونچے اونچے پہاڑ عبور کر جاتی ہے۔
لیکن اس بے چاری کی بس ایک ہی آنکھ ہے.... کانی ہے وہ۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ جولیا نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے لیفٹیننٹ شلز کی آواز سُنائی دی: "مطمئن ہو جاؤ مسز مارٹن! ہم نے اُسے پکڑ لیا ہے۔ وہ موڈلن مدر گوز والی ڈوروتھی کیسل کا شوہر ہے۔ اس نے اعتراف بھی کر لیا ہے۔ بیوی کی موت نے اُسے زبردست صدمہ پہنچایا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ اس کی بیوی نے اُن نظموں پر چھ ماہ کام کیا تھا، جو اس نے تمھیں بھیجی تھیں۔ اس کا کہنا ہے کہ تمھیں بذریعہ خط بھی اُس کی حوصلہ افزائی کی توفیق نہیں ہوئی حالانکہ اس سے بہت بڑا فرق پڑ سکتا تھا۔ وہ صرف تمھارے جواب کی آس پر زندہ تھی۔ تمھارا چھپا ہوا جواب ملتے ہی اس کی جینے کی اُمنگ ختم ہو گئی۔ اگر تم اپنی تحریر میں جواب دے دیتیں تو شاید ایسا نہ ہوتا.... یہ.... اس کا خیال ہے مسز مارٹن۔"

"میں تمھاری بات سمجھ رہی ہوں لیفٹیننٹ، لیکن سارا الزام مجھ پر رکھ دینا زیادتی ہے۔ سسٹم تو میں نے نہیں...."

"اس نے بتایا ہے کہ اس نے تمھیں تنبیہی خط لکھا ہے.... وہ تمھیں اشارے دیتا رہا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ اس بار وہ پکڑا جائے گا لیکن اُسے اس بات کی پروا نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے مسز مارٹن.... بہرحال اب فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"کیا میں اُسے جانتی ہوں؟"

"ممکن ہے.... دیکھا تو بہرحال ہوگا۔ آپ کے گھر کے قریب والے اسٹور میں دوائیں بناتا ہے۔"

جولیا نے ریسیور رکھ دیا۔ اُس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے کافی ٹیبل سے آئی واش کی بوتل اٹھائی اور اُس کا ڈھکنا کھول کر تھوڑا سا محلول کپڑے پر گرایا۔ جس جگہ محلول کے قطرے گرے تھے، اس جگہ سے کپڑا پھٹا اور پھر بالکل ہی معدوم ہو گیا۔ کپڑے کے نیچے کافی ٹیبل کا اُتنا حصہ بھی زرد ہو گیا تھا۔ تب اُسے پہیلی کا وہ حصہ یاد آیا: لیکن اس بے چاری کی بس ایک ہی آنکھ ہے.... کانی ہے وہ۔

جولیا نے اپنے کمرے کو بہ غور دیکھا۔ وہ بہت عرصے سے اس کا قلعہ رہا تھا۔ محفوظ اور خوش گوار پناہ گاہ۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ پھر ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ چند لمحے بعد اس نے نمبر ملایا۔

"ہیلو نرڈیہ!" اس نے رابطہ ملنے کے بعد کہا۔ "کیا تمھاری دعوت اب بھی موجود ہے؟ مجھے یقین ہے، میں اس دعوت سے بہت لطف اندوز ہوں گی۔"

THE MOTHER GOOSE MADMAN
Betty Ren Wright.

اُمید یقین اور ایمان سے جگمگاتی لازوال تحریر

اُمید کا دیا

علیم الحق حقّی

سسپنس کے ۱۴ اگست اور ۶ ستمبر کی درمیانی مدّت کے شمارے میں اُمید کی روشنی سے معموریہ کہانی بطورِ خاص شائع کی جارہی ہے۔ پاکستانی عوام ان دنوں جس بُحران سے گزر رہے ہیں‘ وہ ہر روز پچھلے روز سے بڑھ کر مایوس کُن ہوتا جارہا ہے۔ یہ کہانی یاد دلاتی ہے کہ مایوسی کُفر ہے کیوں کہ یہ فکر اور قوّتِ عمل کو مفلوج کر دیتی ہے۔ اللّٰہ سے تو مایوسی مسلمان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ مایوسی ہوتی ہے تو اپنے اعمال سے۔ اور بندے اعمال کو درست کرنے کی کوشش کے ساتھ اللّٰہ سے ہدایت، توفیق اور سعادت مانگیں تو انقلاب آجاتا ہے۔ ضرورت صرف ترجیحات کو ترتیب دینے کی ہے۔ ہم پہلے مسلم پاکستانی ہیں‘ اس کے بعد اور کچھ ہو سکتے ہیں اور وہ بھی بس اپنی ذات کے لیے۔ ملک و قوم کو تو بس مسلم پاکستانیوں کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کہانی پڑھ کر آپ کے دل میں یہ جذبہ جاگے تو اس کا اعلان کرتے ہوئے نہ ہچکچایئے انشاء اللّٰہ بے شمار لوگ آپ کے ہم آواز ہوں گے۔ یاد رکھیے ایمان کی آزمائش کا وقت شروع ہو چکا ہے۔ سچے دل سے مسلم پاکستانی بننا اُن اہلِ ایمان میں شامل ہونے کے لیے آپ کا پہلا قدم ہوگا جنہیں انشاء اللّٰہ مستقبل قریب میں دُنیا پر چھا جانا اور کفر پر غالب آنا ہے‘ جنہیں اللّٰہ نے جنّت کی بشارت دی ہے۔
آپ سے ایک استدعا ہے کہ یہ کہانی آپ کو پسند آئے تو اسے کہانی کی اشرفی کی طرح آگے بڑھا دیجیے، جہاں تک پہنچا سکتے ہیں‘ پہنچا دیجیے۔ اُن لوگوں تک بھی جو ڈائجسٹ نہیں پڑھتے اور اُن لوگوں تک بھی جو پڑھنا ہی نہیں جانتے۔



مجھے خوب یاد ہے‘ وہ ۲۶ فروری ۹۶ء کی رات تھی!

میری بیوی ناہید نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی‘ بھری ہوئی ایش ٹرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولی ”کیا بات ہے؟ لکھتے کیوں نہیں؟“

”کیسے لکھوں؟“ میں نے بے بسی سے کہا ”ایسا پیچ پھنسا ہے کہ نکلتا ہی نہیں۔“

”دن بھر میں تمہیں چائے بنا بنا کر پلاتی رہی۔ تم نے سگریٹ کے ٹوٹوں سے ایش ٹرے بھردی۔ یہ کیسا پیچ ہے کہ پھر بھی نہیں نکلا“ ناہید نے جھنجلا کر کہا۔

”میں کیا کر سکتا ہوں۔ کچھ سوجھ ہی نہیں رہا ہے۔“

وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی ”مجھے بتاؤ‘ مسئلہ کیا ہے؟“

”ایک پڑھا لکھا شخص ہے جو بینائی سے محروم ہوگیا ہے“ میں نے اسے بتایا ”چار سال کی ایک بچی کے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہیں۔ وہ بہت خوددار ہے‘ کسی سے مدد مانگنا اسے گوارا نہیں۔ پے درپے محرومیوں اور مصائب نے اسے اتنا تلخ کردیا ہے کہ اس نے اللہ سے بھی لڑائی کرلی ہے۔“

”توبہ توبہ!“ میری بیوی اپنے رخسار پیٹنے لگی ”تم تو کفر لکھتے ہو بھئی....“

”اس جھگڑے میں نہ پڑو۔ بات ایک پیچ کی ہو رہی ہے“ میں نے بے حد عاجزی سے اپیل کی۔

”خیر.... سناؤ“ ناہید نے بہت بے زاری سے کہا۔

”اس نے بہ ہزار دقّت اپنی آنکھوں کی محرومی سے سمجھوتا کیا۔ اپنی دوسری حسوں کو ڈیولپ کیا۔ یہاں تک کہ اس میں اتنی خود اعتمادی آگئی کہ وہ اس محرومی کے باوجود اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ اب وہ ربڑ کی واٹر بالز بنا کر بیچتا ہے۔ حساب کتاب کا آدمی ہے۔ جو کماتا ہے‘ اس کے تین حصے کرتا ہے۔ ایک حصہ واٹر بالز خریدنے کے لیے‘ دوسرا روز مرّہ کی ضروریات کے لیے اور تیسرا پس انداز کرنے کے لیے۔ رمضان کا مہینہ ہے اور اسے اپنی بچی کو عید کے کپڑے دلانے ہیں۔ اسے بہت اچھی عید کرانی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوگیا ہے اور اس کے پاس بچی کی بہت اچھی عید کرانے کے لیے معقول رقم موجود ہے....“

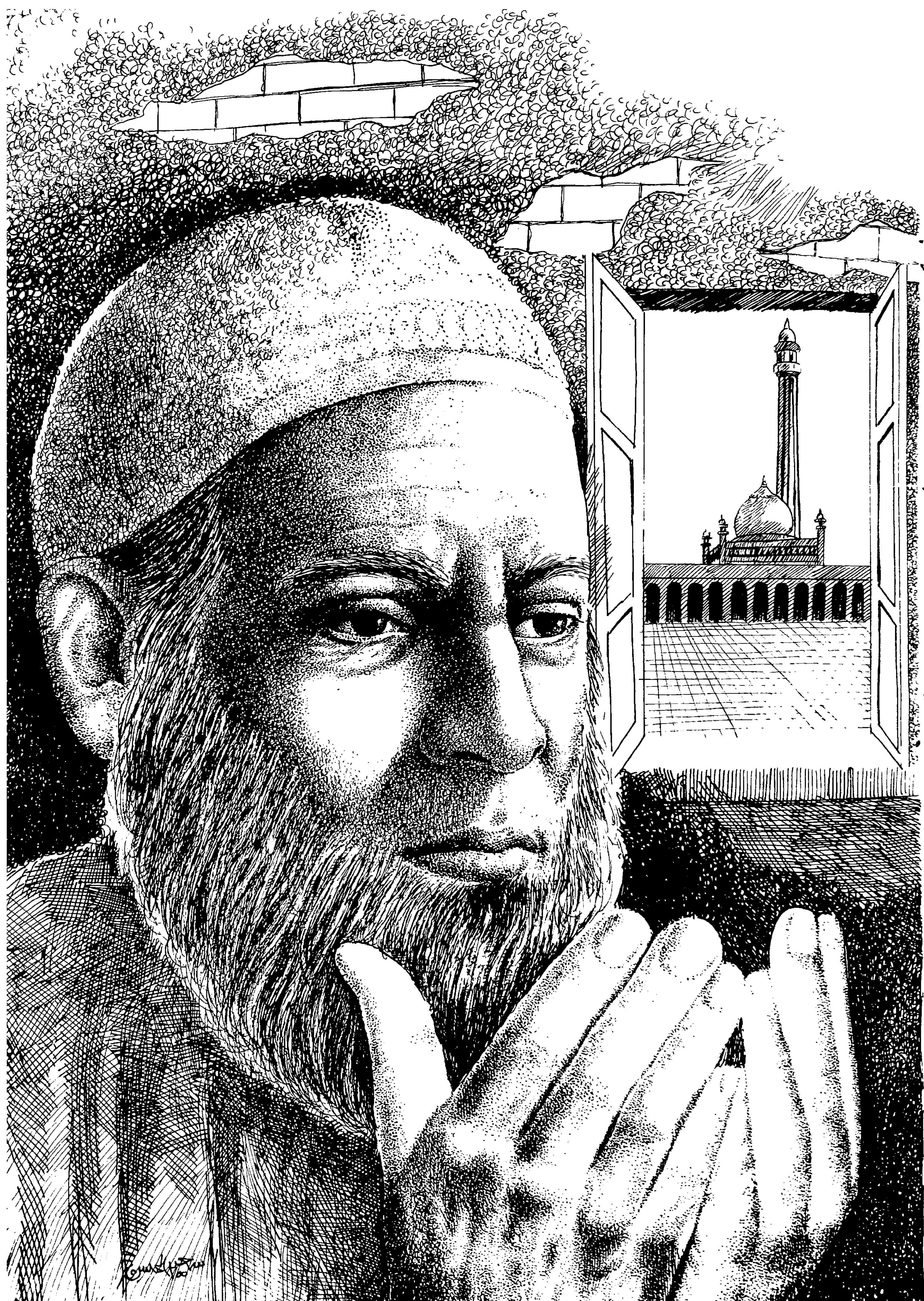
”تو اس میں پیچ کیا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اس کو بھیک مانگنے پر مجبور کرنا ہے؟“

”تو کردو۔ یہ کون سی بڑی بات ہے تمہارے لیے“ میری بیوی نے نہایت اطمینان سے کہا۔

”کیسے کردوں؟“ میں نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا ”وہ بہت خود دار آدمی ہے۔ سوچو کہ جو اللہ سے کچھ نہیں مانگتا‘ وہ اس کے بندوں کے سامنے ہاتھ کیسے پھیلا سکتا ہے۔“

یہ بات میری بیوی کی سمجھ میں آگئی ”ہاں‘ یہ تو ہے۔ تم اس



سے بھیک نہیں منگوا سکتے۔"

"مگر مجھے یہ کرنا ہے۔ اس کے بغیر کہانی منطقی انجام تک کیسے پہنچے گی۔"

"لیکن ٹھیک ٹھاک کمانے والا خود دار آدمی بھیک کبھی نہیں مانگے گا۔"

"مجبور ہو جائے تو مانگے گا۔"

"میری سمجھ میں تو نہیں آتی یہ بات۔"

"عید سے دو تین دن پہلے کوئی اسے لوٹ لے..... پیسے پیسے کو محتاج کر دے تو وہ کیا کرے گا؟"

"ہاں' یہ تو ہے۔ بس تو پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ اس کے لٹنے کے طریقۂ کار کا ہے۔"

میری بیوی نے مجھے یوں دیکھا' جیسے میں روئے زمین پر سب سے بے وقوف آدمی ہوں "لو..... یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ یہاں لوٹنے والے آنکھوں والوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ اس بے چارے اندھے کا لٹنا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

"بھئی' وہ بہت الرٹ ہے۔ ذہین ہے....."

"سب سے ذہین لوٹنے والے ہوتے ہیں" میری بیوی نے سادگی سے کہا۔

"اس نے اپنی دوسری حسوں سے بصارت کا کام لینا سیکھ لیا ہے۔ وہ کسی کے پاؤں کی چاپ کبھی نہیں بھولتا۔ کوئی بھی ایک بار اس کے قریب سے گزرا ہو تو وہ قدموں کی چاپ سے اسے پہچان لیتا ہے۔ اسے چاپ سے یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ آنے والا کس ارادے اور نیت سے اس کی طرف آ رہا ہے۔ ایسے آدمی کا لٹنا آسان نہیں ہوتا۔"

"کمال کرتے ہو تم۔ کوئی آ کر پستول کنپٹی پر رکھ دے تو مسلح آنکھوں والے بھی سب کچھ نکال دیتے ہیں۔ اس اندھے نہتے کی کیا بساط ہے' یہی ہو رہا ہے آج کل۔"

"تم سمجھ نہیں رہی ہو" میں بہت بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ "ایسے لٹنے سے وہ خود اعتمادی سے محروم تو نہیں ہو گا۔ بے بسی کا خوف ناک احساس اسے نہیں پچھاڑے گا۔ سچ ہے' پستول کے زور پر تو آنکھوں والے بھی لٹ جاتے ہیں۔ بے چارے اندھے کی کیا بساط ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے بے وقوف بنا کر یوں لوٹا جائے کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ وہ آنکھوں سے محرومی کے ساتھ اس دنیا میں کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لوٹنے والے اسے لوٹتے رہیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس واقعے کے نتیجے میں وہ یوں ٹوٹے کہ اس کے پاس بھیک مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔"

میری بیوی سوچ میں پڑ گئی "اچھا! تم یہ چاہتے ہو کہ اس لٹنے میں اس کے اندھے ہونے کا دخل ہو اور اس کی یہ خوش فہمی دور ہو جائے کہ آنکھوں کی کمی کا کسی طرح ازالہ ہو سکتا ہے۔"

"ہاں' یہی بات ہے" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"یہ تو واقعی پیچ ہے" میری بیوی نے تائید میں سر ہلایا "لیکن یہ تو تمہاری کہانی لگتی ہے۔"

"کیسے؟ میں اندھا تو نہیں ہوں" میں نے بھنا کر کہا۔

"عید کے دن تمہارا انجام بھی وہی ہو گا۔ بچوں کے کپڑے بھی نہیں بنیں گے۔ پتا بھی ہے' تین دن رہ گئے ہیں عید میں۔"

"بچوں کی فکر نہ کرو' وہ میرے بچے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جب ہوتا ہے تو انہیں سب کچھ مل جاتا ہے۔ وہ کبھی مطالبہ نہیں کرتے۔"

"لیکن میرا دل تو دُکھے گا عید کے دن اور پھر راشن بھی ختم ہو رہا ہے۔"

اس پر مجھے تشویش ہوئی "کیا صورتِ حال ہے؟"

"بس کل رات تک کام چل جائے گا۔ پھر آٹا' دال' چاول' گھی' شکر..... سب ختم" میری بیوی نے کہا۔ پھر تیز لہجے میں بولی۔ "یعنی پرسوں تمہیں روزہ رکھنا پڑے گا۔"

میرا تشویش سے برا حال تھا۔ مجھ سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ "کہانی پوری ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ' کہانی کتنی باقی ہے؟"

"آخری حصہ ہے۔ دس ایک صفحے اور لکھنے ہیں۔ روانی سے لکھی جائے تو ایک دن کا کام ہے لیکن یہ پیچ.....؟"

میری بیوی نے میری بات کاٹ دی "یہ پیچ تمہارے اندھے ہیرو کی ہی نہیں' ہماری عید بھی خراب کر دے گا" پھر وہ جھنجلا گئی۔ "چھوڑو یہ ایچ پیچ کے نخرے۔ اسے لٹواؤ جلدی سے اور کہانی پوری کر کے دے آؤ' میں بہت پریشان ہوں۔"

"ارے واہ..... ذرا سی جلد بازی میں کہانی تباہ کر دوں۔"

"مجھے کہانی کی نزاکتوں کا نہیں پتا۔ میں بس زندگی کی سختیوں سے واقف ہوں۔"

میں نے چونک کر اسے غور سے دیکھا۔ یہ آخری بات کہتے ہوئے اس کے لہجے میں تھکن اتر آئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہی ہے۔ وہ تو بڑی صابر و شاکر عورت تھی۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتی تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے کچھ طلب نہیں کیا تھا۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے کی قائل تھی۔ میرا دل کٹنے لگا..... اس کے لیے بھی اور بچوں کے لیے بھی۔ بہت شدت سے احساسِ جرم ہوا۔ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں نے الزام اِدھر اُدھر کرنے کی کوشش کی "ہر مہینے دس پندرہ ہزار لاتا ہوں۔ پھر بھی تنگی میں کمی نہیں ہوتی۔"

کوئی اور بیوی ہوتی تو اس پر بپھر جاتی۔ کہتی' میکے نہیں لے جاتی ہوں۔ اللّے تللّے بھی نہیں کرتی لیکن وہ میری بیوی تھی..... ناہید۔ اس نے بے حد ٹھنڈے دھیمے لہجے میں کہا "پتا تو ہے نہیں کہ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ جینا مشکل ہو گیا ہے۔ گھر کے اخراجات کا پتا نہیں' بس اپنے کونے میں بیٹھے ایران توران کی لکھتے رہتے ہو" وہ کہتے کہتے رکی پھر بولی "اور یہ بھی ہے کہ گھر میں برکت بھی نہیں ہے۔ کیسے ہو' یہ خیر و برکت کا مہینہ رمضان اللہ کا تحفہ ہے۔ مگر دیکھو' پورا مہینہ گزر گیا۔ تم نے ایک روزہ بھی نہیں

رکھا۔ پتا بھی ہے' آج جمعتہ الوداع تھا۔"

گفتگو اس رخ پر آئے گی' یہ مجھے اندازہ بھی نہیں تھا۔ میں گڑبڑا گیا "تم جانتی ہو کہ سگریٹ نہ پیوں تو مجھ سے لکھا نہیں جاتا۔"

"جانتی ہوں" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"دیکھو' میں اپنے' تمہارے اور بچوں کے لیے رزقِ حلال کمانے کی کوشش کرتا ہوں" میں نے صفائی پیش کی۔

"معلوم ہے مجھے۔ ہمارے حقوق ادا کرنے کے لیے اپنی عاقبت کا خطرہ مول لیتے ہو" اس کا لہجہ ایسا تھا کہ میرے دل کو ریشم کے نرم وملائم تار چھوگئے۔ وہ اٹھی' میری کرسی کے پیچھے آئی اور بڑی محبت سے میرے کندھے تھام لیے "مجھے معاف کردینا اس کم ظرفی پر۔ کوئی ایسی پریشانی بھی نہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ گھر میں کبھی فاقہ نہیں ہوا.... اور نہ انشاء اللہ کبھی ہوگا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم پریشان نہ ہو' چائے پی لو' ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

وہ چلی گئی مگر میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس روز شاید وہ بہت زیادہ بوجھل تھی ورنہ وہ کبھی اس طرح بات نہیں کرتی تھی۔ وہ بہت خیال رکھتی تھی کہ میں پریشان ہوں گا تو کام پر برا اثر پڑے گا مگر اس روز مجھے یقین تھا کہ اس کی باتوں کا اچھا نتیجہ نکلے گا اور وہ پیچ دور ہوجائے گا۔

میں نے چائے ختم کی اور سگریٹ جلالی۔ میں اس پیچ کو دور کرنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ صورتِ حال اب حوصلہ افزا بھی تھی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کردینے والی بھی۔ کوئی خیال تھا جو ذہن میں ایک پل کے لیے چمکتا اور فوراً ہی بجھ جاتا تھا۔ مسئلہ حل ہوتے ہوتے رہ جاتا تھا۔

میں اس آنکھ مچولی میں الجھا ہوا تھا کہ ناہید چائے کی پیالی اٹھانے کے لیے کمرے میں آئی "سنو..... ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانوگے؟"

"تمہاری بات کا میں برا کب مانتا ہوں۔ کہو۔"

"جمعتہ الوداع تو گزر گیا۔ آج رمضان کی ستائیسویں شب ہے۔ مسجد چلے جاؤ' عبادت کرلو۔"

"لیکن میں نے روزہ ایک نہیں رکھا....."

"تو شرمندہ بھی تو ہو۔ اللہ سے معافی مانگو۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ شرمندگی میں ایسی مبارک رات ضائع کرکے اپنا نقصان کیوں بڑھاتے ہو۔"

کوئی اچھا لمحہ تھا کہ بات میری سمجھ میں آگئی!

○☆○

اگر گھر کی صورتِ حال ابتر نہ ہوتی۔ اگر ناہید نے اس انداز میں بات نہ کی ہوتی اور اگر اس نے مجھے اس مبارک شب سے استفادہ کرنے پر نہ اکسایا ہوتا تو اس رات میں ہرگز گھر سے نہ نکلتا اور گھر سے نہ نکلتا تو میری زندگی یوں نہ بدلتی۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ سب نہ ہوتا۔ یہ تو اللہ کی طرف سے تھا' جو مسبب الاسباب ہے'

بہت مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

میں محلے کی مسجد کا چراغاں دیکھتے ہوئے آگے نکل گیا۔ ذہن میں خیالات کی یورش تھی۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایک طرف کہانی کا پیچ پھنسا ہوا تھا۔ دوسری طرف یہ فکر تھی کہ گھر کا راشن ختم ہو رہا ہے۔ پرسوں تک پیسے نہیں آئے تو رمضان کے مہینے میں فاقے کی نوبت آجائے گی۔ تیسری طرف عید کا خیال تھا۔ صرف بچوں کے نہیں‘ اس بار تو ناہید کے کپڑے بھی بننے چاہئیں۔ مگر کہانی تو پوری ہو اور اس کے ساتھ ہی ذہن کی سوئی پھر کہانی کے پیچ پر اٹک جاتی۔

میں محلے کی مسجد کے سامنے سے گزرا تو مجھے یاد تھا کہ میں عبادت کی غرض سے نکلا ہوں لیکن میں اس وقت ذہنی یکسوئی اور ارتکاز سے محروم تھا‘ پریشان تھا۔ میں نے سوچا‘ سوچنے سے یہ بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ چہل قدمی بھی ہو جائے گی۔ مسجدوں کی تو یہاں کمی نہیں۔ جب جی چاہے گا‘ کسی مسجد میں چلا جاؤں گا۔ ابھی تو رات پڑی ہے۔

سو میں آگے ہی آگے چلتا رہا۔ سوچوں میں یوں گھرا ہوا تھا کہ وقت اور فاصلے کا احساس ہی نہیں رہا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کتنی دیر سے چل رہا ہوں اور کتنا چل چکا ہوں۔ انتشار کے عالم میں وہ عجیب ارتکاز تھا۔ مجھے یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ میں چل رہا ہوں۔

پھر ایک کتے کے بھونکنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ شاید میرے چونکنے کی کوئی اور صورت تھی ہی نہیں۔ کتوں سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے اور وہ آواز آئی بھی بہت قریب سے تھی۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر گھوم کر دیکھا مگر کوئی کتا نظر نہیں آیا۔ میں پریشان ہو گیا۔ اتنے قریب سے آنے والی کتے کی آواز وہم تو نہیں ہو سکتی اور کتا ہے تو نظر تو آئے۔ ورنہ تو یہ بڑی تشویش ناک بات ہو گی۔ وہ کسی بھی وقت اچانک مجھ پر جھپٹ پڑے گا اور مجھے جان بچانا مشکل ہو جائے گی۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ دوبارہ بھونکنے کی آواز سنائی دی..... اور اس بار کتا مجھے نظر آ ہی گیا۔ وہ کافی دور تھا اور مخالف سمت میں دوڑ رہا تھا یعنی مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ مگر وہ سکون وقتی تھا۔ کتے کو دیکھنے کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا تھا‘ اسے دیکھ کر میرے دیوتا کوچ کر گئے۔

یہ انسانی فطرت کا کمال ہے۔ جب وہ پورے ارتکاز کے ساتھ کسی چیز یا شخص کی جستجو میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے تو اس کے سامنے‘ گردوپیش میں بہت کچھ ہوتا ہے لیکن وہ اسے نظر نہیں آتا اور جستجو پوری ہو جائے تو گردوپیش کو دیکھ کر اسے حیرانی ہوتی ہے۔

مگر میں حیران نہیں‘ دہشت زدہ ہوا تھا!

میں نے پھر گھوم کر چاروں طرف دیکھا مگر وہاں دیکھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ جہاں دیکھنے کو گھپ اندھیرے کے سوا کچھ نہ ہو‘ وہاں اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں ساکت کھڑا ہو گیا اور ایک طرف نظر جمادی۔ نظر اللہ کی دی ہوئی وہ نعمت ہے جو گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی کسی حد تک راہ بنالیتی ہے۔

میری نظر بھی ذرا دیر میں اس اندھیرے کی عادی ہو گئی مگر اب بھی وہاں دیکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ آسمان کے پیش منظر میں جا بجا گہرے رنگ کے دھبے نظر آرہے تھے۔ وہ جھاڑیاں بھی ہو سکتی تھیں‘ میں نے گھوم کر دیکھا۔ چاروں طرف وہی منظر تھا۔ سر جھکا کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ میں پتلی سی ایک سڑک پر چل رہا تھا۔

میں چکرا گیا۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ جہاں میں رہتا ہوں‘ وہاں دور دور تک میں نے کبھی ایسا صحرا اور یہ سڑک نہیں دیکھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں سر جھکائے چلتا رہا ہوں لیکن اتنا تو نہیں چلا ہوں کہ کسی اجنبی علاقے میں پہنچ گیا ہوں۔ ٹانگیں بھی اس کی تردید کر رہی تھیں کہ میں بہت چلا ہوں۔ میں پوری طرح تازہ دم تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے گھر سے نکلے بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔

بہرکیف یہ طے تھا کہ مجھے اس وحشت ناک ماحول سے بھاگنا ہے.... جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے اور آگے جانا مخدوش تھا۔ گھر کی طرف ہی چلا جائے۔ پلٹ کر ادھر چلوں جہاں سے آرہا ہوں۔ یہ سوچ کر میں پلٹا لیکن اگلے ہی لمحے ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ پلٹ کر میں نے اسی طرف رخ کیا ہے‘ جدھر سے آیا ہوں۔

میں نے سمجھ لیا کہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں۔ کتے کو دیکھنے کے لئے میں اتنی بار گھوما ہوں کہ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ میں کس طرف سے آرہا ہوں۔ میں تو یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ میں نے کتے کو کہاں دیکھا تھا۔ سمتوں کا تو مجھے احساس ہی نہیں تھا۔

اب ایسے میں آدمی اللہ سے رہنمائی طلب کرنے کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ میں نے بھی یہی کیا۔ اللہ سے دعا کی اور جس طرف قدم اٹھے‘ اس طرف چل پڑا۔ اب میں یہ امید ہی کر سکتا تھا کہ میں گھر کی سمت قدم اٹھا رہا ہوں۔

آتے ہوئے بے خبری میں جو میں نے سفر کیا تھا‘ اس کا تو پتا ہی نہیں چلا تھا مگر اب شعور کے ساتھ سفر کرنے میں ایک ایک پل بہت بڑا لگ رہا تھا اور میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میں واپس جا رہا ہوں یا مزید آگے بڑھ رہا ہوں۔ اس وقت میری پہلی طلب تو یہ تھی کہ مجھے کہیں روشنی نظر آجائے۔ میں روشنی کو ترس رہا تھا۔

کچھ آگے بڑھا تو اللہ نے میری سن لی۔ دور جلتی بجھتی ایک روشنی نظر آنے لگی۔ شروع میں تو میں اسے ستارہ سمجھا لیکن آگے بڑھتا گیا تو احساس ہوا کہ وہ ستارہ نہیں ورنہ میرے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ بلندی کی طرف جاتا لگتا اور اس کا وہ جلنا بجھنا فاصلے کی وجہ سے تھا۔ اسے دیکھ کر میری ڈھارس بندھی ورنہ میں بہت پریشان تھا کہ یہ کس لق ودق صحرا میں چل رہا ہوں کہ کہیں زندگی کے آثار نہیں۔ میں تو اپنے شہر میں اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔

میں اس روشنی کی طرف بڑھتا رہا۔ شروع میں تو ایسا لگا کہ وہ روشنی بھی میرے ساتھ ساتھ اس سمت میں سفر کر رہی ہے کیونکہ اس کی طرف بڑھنے کے باوجود فاصلہ کم نہیں ہو رہا تھا مگر پھر اچانک فاصلہ سمٹتا محسوس ہونے لگا... اور وہ بھی بہت تیزی سے۔

اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میرا تجربہ تھا کہ

نیکی..... کوئی بھی اچھا کام ابتدا میں مشکل لگتا ہے لیکن بعد میں بہت آسان ہو جاتا ہے اور بڑی روانی سے تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ درحقیقت مجھے اس کا تجربہ نماز کے دوران میں ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ میں کوئی نمازی ہوں بلکہ سچ یہ ہے کہ میں نماز بے قاعدگی سے بھی نہیں پڑھتا۔ کبھی دل میں اچانک لہر سی اٹھتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ نماز پڑھوں۔ جس وقت یہ تحریک پیدا ہوتی ہے تو اتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ اپنے زور میں بہا کر لے جاتی ہے۔ پھر میں نماز پڑھے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

مجھے وہ پہلا موقع یاد آیا جب مجھے اس کا تجربہ ہوا تھا۔

اس روز میں بیٹھا ٹی وی پر براہِ راست دکھایا جانے والا کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ کرکٹ پر میری جان جاتی ہے۔ ٹی وی پر کرکٹ میچ دکھایا جا رہا ہو تو میں ہر کام چھوڑ کر ٹی وی کے سامنے..... زمین جنبد نہ جنبد گل محمد..... کی تصویر بن کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس وقت سعید انور بیٹنگ کر رہا تھا۔ سعید انور کا میں ایسا فین ہوں کہ اس کی بیٹنگ چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ مگر اس وقت میچ دیکھتے دیکھتے اچانک میرے اندر بے چینی کی ایک تیز لہر اٹھی۔ میں نے اسے سمجھنے کے لیے پہلو بدلا۔ اسی لمحے میرے اندر سے کسی نے کہا..... نماز پڑھنی چاہیے۔ میں نے اسکرین کی طرف دیکھا۔ سعید انور نے ایک چھکا لگایا تھا۔

اس وقت چھوڑو یار، میں بڑبڑایا۔

لیکن بے چینی بڑھتی گئی۔ یہ نماز کا وقت بھی تو نہیں ہے۔ میں نے جان چھڑانی چاہی مگر بے چینی نے مجھے اٹھ کر باہر کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ باہر سورج غروب ہونے والا تھا۔ گویا مغرب کا وقت سر پر تھا۔

میں دوبارہ ٹی وی کے سامنے آبیٹھا اور سعید انور کے دو خوب صورت کور ڈرائیوز دیکھے مگر سچ یہ ہے کہ اندر کی بے چینی مجھے انجوائے نہیں کرنے دے رہی تھی۔ اوور ختم ہوا اور ٹی وی پر کمرشلز دکھائے جانے لگے تو اس بے چینی نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے لپک کر وضو کیا۔ باتھ روم سے نکلا تو اذان کی ابتدا ہو رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر میں نے جانماز بچھائی مگر میرا دھیان اب بھی میچ میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اچھا خاصا میچ نکل جائے گا اور سعید انور آؤٹ ہو گیا تو یہ میرا ذاتی نقصان ہوگا۔

مغرب کی نماز چھوٹی ہوتی ہے لیکن مجھے عصر کی قضا بھی پڑھنی تھی اس لیے میں اب بھی ہچکچا رہا تھا۔ مگر مجھے خود بھی پتا نہیں چلا کہ میں نے کب عصر کی قضا کی نیت کر لی۔

پہلی دو رکعتیں کتنی طویل، کتنی مشکل تھیں، میں بتا نہیں سکتا۔ لگتا تھا کہ یہ چار رکعتیں پوری ہوتے ہوتے میچ ختم ہو جائے گا۔ ٹی وی کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی مگر نماز میں اتنا ارتکاز ضرور تھا کہ ان کا مفہوم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ بات اور ڈسٹرب کر رہی تھی کیونکہ کمنٹیٹر ہیجانی آواز میں چلا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں سعید انور آؤٹ تو نہیں ہو گیا۔

مگر تیسری رکعت میں اچانک سب کچھ بدل گیا۔ سب سے پہلے ٹی وی کی آواز موقوف ہوئی، جیسے کسی نے ٹی وی بند کر دیا ہو۔ پھر نماز میں روانی آئی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں نے سلام پھیرا ہے..... اور مغرب کے فرض کی نیت باندھ لی ہے۔ مجھے تو ہوش اس وقت آیا، جب میں نماز مکمل کر کے تسبیح پڑھنے کے بعد دعا کر رہا تھا۔

نماز پوری کر کے میں واپس آیا "ٹی وی کیوں بند کر دیا تھا؟" میں نے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔

"ٹی وی تو ایک سیکنڈ کے لیے بھی بند نہیں ہوا بھائی جان!" میرے بھائی نے کہا۔

مجھے حیرت ہوئی..... مگر یہ جان کر میں اور حیران ہوا کہ میں نے صرف دو اوور مس کیے ہیں۔ اس وقت میں نے سوچا کہ آدمی کو نیکی، کوئی اچھا کام شروع میں وقت طلب بھی لگتا ہے اور وقت طلب بھی۔ اس لیے کہ نفس اس پر کڑھتا ہے مگر پھر اللہ اپنی نوازش سے اسے آسان اور تیز رفتار کر دیتا ہے۔ نیکی کا نقطۂ آغاز سب سے مشکل ہوتا ہے پھر اللہ ہاتھ تھام لیتا ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ یہ سب سوچنے کے دوران میں، میں روشنی کے بہت قریب پہنچ گیا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کوئی مقامِ خیر ہے۔ اس لیے تو شروع میں اتنا دشوار اور پہنچ سے دور لگ رہا تھا اور آخر میں، میں اتنی آسانی سے اس تک پہنچ گیا۔

میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ بڑا سا..... بہت وسیع و عریض کچا مکان تھا جو اندھیرے میں گھرا ہوا تھا۔ روشنی بس دروازے بھر تھی۔ وہ لکڑی کا عام سا مگر کافی چوڑا دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا اس لیے روشنی باہر تک آ رہی تھی۔ ورنہ وہاں اندھیرا ہی ہوتا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا، پھر سامنے دیکھا۔ کہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آگے سڑک پر بھی اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گویا امان کی وہی ایک جگہ تھی..... اور گرد و پیش کے بارے میں تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے اور میں کہاں ہوں۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کچے مکان کے کھلے روشن دروازے کی طرف بڑھا۔ سچی بات یہ کہ مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ کون جانے یہ جس کا مکان ہے وہ کیسا ہو، کون ہو؟ مجھے تھوڑی دیر ٹھہرنے کی اجازت دے یا نہ دے۔ مکان کے مالک کے بارے میں مجھے طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ میں خوف زدہ ہو گیا لیکن جا کہیں نہیں سکتا تھا۔ وہ مکان میری مجبوری تھا۔

میں نے دروازے پر کھڑے ہو کر پکارا "کوئی ہے؟ کوئی ہے تو باہر آئے؟ میں راستہ بھٹک گیا ہوں" میں نے کئی بار پکارا لیکن جواب میں کوئی آہٹ تک نہیں ابھری۔ فضا کا سناٹا بتاتا تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً اور کئی بار پکارا۔ اس کے بعد ڈرتے ڈرتے دھڑکتے دل کے ساتھ کھلے دروازے سے گزر کر اندر داخل ہو گیا۔



میں کہانی کار ہوں۔ لفظوں سے کھیلتا ہوں۔ اظہار میرا کھیل

ہے لیکن وہاں میں عاجز ہو گیا۔ اندر گھستے ہی جو کچھ میں نے دیکھا اس طرح کی کوئی اور عام سی اور دنیاوی صورتِ حال ہوتی تو میں بلا جھجک کہتا کہ اندر داخل ہوتے ہی جیسے جادو کے زور سے سب کچھ بدل گیا لیکن یہ اظہار' یہ خیال میرے ذہن کو چھو بھی نہیں سکا۔ جادو تو بہت بُری چیز ہوتی ہے۔ جبکہ وہ سب بہت پاکیزہ' بہت اچھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں گنگ ہو کر رہ گیا اور میں ساکت وصامت کھڑا اندر کا منظر دیکھتا رہا۔

وہ بہت بڑی' عظیم الشان اور پُرشکوہ مسجد تھی اور پوری مسجد بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ اس خوب صورتی کو دیکھ کر میں یوں مبہوت ہوا کہ مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ باہر میں نے کچا مکان دیکھا تھا۔ یہ اندر اتنی عظیم الشان مسجد کہاں سے آگئی؟ اور وہ بھی اس سنسان سڑک پر.... اس ویران علاقے میں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں کون ہوں اور کس حال میں' کس طرح یہاں پہنچا ہوں؟ میں تو بس اس خوب صورتی کو دیکھے جا رہا تھا۔

جہاں میں کھڑا تھا' وہاں جوتے اتارے جاتے تھے۔ بائیں جانب وضو خانہ تھا۔ اس کے پار بہت بڑا دالان تھا۔ دالان کے آگے مسجد کا بے حد وسیع وعریض ہال تھا۔ وضو خانے سے لے کر ہال تک درودیوار' فرش اور چھت..... سب کچھ سنگِ مرمر کا تھا۔ چھتوں سے بہت خوب صورت فانوس لٹکے ہوئے تھے اور اس مسجد کی فضا کیا بتاؤں..... درودیوار کیا' وہاں ذرّہ ذرّہ ثنا خوانی کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے دل میں بے اختیار یہ خیال ابھرا کہ مجھے یہاں نماز پڑھنی چاہیے۔ یہاں نماز پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

میں نے چپلیں اتاریں اور وضو کرنے کے لیے جا بیٹھا۔ میں نے ٹونٹی گھمائی اور ہاتھ دھوئے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ میں وضو کرنے کا طریقہ بھول گیا تھا۔ مجھے کچھ یاد ہی نہیں تھا۔ بے بسی کے احساس سے شل میں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ایسا لگتا تھا کہ میں نے زندگی میں کبھی وضو نہیں کیا ہے۔

میں یونہی ٹونٹی کھولے ہاتھوں پر پانی بہاتا رہا۔ آس پاس کوئی ہوتا تو اسے دیکھ کر ہی وضو کر لیتا۔ دل میں یہ خیال آتے ہی میں نے دالان کے اجتماع سے ایک شخص کو وضو خانے کی طرف آتے دیکھا۔ اس کی شخصیت بڑی بارعب تھی۔ کھچڑی بال' گھنی داڑھی' تندرست توانا جسم' چہرے کی سرخ وسپید رنگت۔ آنکھوں سے عمر زیادہ لگ رہی تھی مگر اس سے قطع نظر وہ دیکھنے میں چالیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر میری مخالف سمت وضو کرنے بیٹھ گیا۔ میں نے سکون کی سانس لی کہ اب میرا بھی وضو ہو جائے گا۔

وہ شخص اتنی آہستہ وضو کر رہا تھا کہ میرا کام اور آسان ہو گیا۔ لگتا تھا' وہ خود وضو نہیں کر رہا ہے' مجھے سکھا رہا ہے۔ اس کی رفتار ایسی تھی کہ میرا ہی وضو پہلے مکمل ہو گیا۔ میں اٹھنے لگا تو اس نے کہا۔ "سنو.... جاتے ہی سب سے پہلے دو نفل تحیتہ المسجد پڑھنا۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

اس نے مجھے تحیتہ المسجد کے بارے میں بتایا پھر بولا "جس کے گھر بھی جاتے ہو' پہلے اسے تعظیم دیتے ہو نا اور یہ تو پوری کائنات کے مالک کا گھر ہے۔"

"جی بہتر" میں نے کہا اور چلنے لگا۔

"سنو" اس نے پھر پکارا۔ "کثرت سے شکر کے نفل پڑھنا۔ یہ شکر کی رات ہے۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ تو شبِ قدر ہے لیکن میں نے کہا نہیں۔ ظاہر ہے' وہ مجھ سے زیادہ جانتا ہو گا۔

"اور سورۂ رحمٰن کی تلاوت ضرور کرنا۔ جو شخص سورۂ رحمٰن کی تلاوت کرتا ہے' وہ گویا اللہ کی ہر نعمت کا شکر ادا کرتا ہے۔"

"جی بہت بہتر۔"

مسجد کے ہال میں جا کر میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ سورۂ رحمٰن کی تلاوت کے بعد میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک جماعت ہال میں اور ایک جماعت باہر دالان میں ذکرواذکار میں مشغول تھی۔ میں دالان میں آگیا اور اس جماعت کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے شامل ہوتے دیکھ کر جماعت کے ایک بزرگ نے بہ آوازِ بلند کئی بار الحمدُللہ کہا۔ یہ گویا اعلان تھا کہ الحمدللہ کا ورد کیا جا رہا ہے۔ مجھے یہ بتانا مقصود تھا۔

ورد کے دوران میں جماعت میں شریک لوگوں کو دیکھتا بھی رہا۔ مجھ پر ہیبت طاری ہونے لگی۔ ایک سے بڑھ کر ایک نورانی چہرہ تھا کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ انہی میں مجھے وہ چہرہ بھی نظر آیا جسے وضو کرتے دیکھ کر میں نے وضو کیا تھا۔ وہاں اب وہی ایک مجھے شناسا لگ رہا تھا۔ حالانکہ اس سے بھی میں مسجد میں داخل ہونے کے بعد ہی ملا تھا۔

ورد کا سلسلہ چلتا رہا اور اپنی کیفیت میں کیا بتاؤں۔ لگتا تھا کہ کسی نے اندر سے اچھی طرح دھو کر مجھے پاک کر دیا ہے۔ میں ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ سارے وجود میں کیف وانبساط جیسے موج در موج امنڈ رہا تھا۔ میں عجیب سرخوشی اور سرمستی کے عالم میں تھا۔

اچانک وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے' جنہیں دیکھ کر میں نے وضو کیا تھا اور اٹھتے اٹھتے انہوں نے مجھے اشارہ کیا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دروازے سے گزرے اور باہر آگئے۔

"جی فرمایئے؟" باہر آکر میں نے ان سے کہا۔

"کچھ دیر ٹہلیں گے۔ ضروری باتیں کریں گے" انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن میں ابھی وہاں رکنا چاہتا تھا" میرے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا "زندگی میں پہلی بار مسجد میں ایسا دل لگا ہے میرا۔ نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔"

"مگر اٹھنے کا حکم ہو گیا تھا برخوردار" انہوں نے مجھے مخاطب کیا جیسے میں ان سے بہت چھوٹا ہوں حالانکہ وہ میرے ہم عمر ہی لگتے تھے۔

"کیسا حکم...؟" میں کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ حیرت سے میرا برا حال تھا "وہ.... وہ مسجد

کہاں گئی؟"

"مسجد کہیں نہیں گئی۔ ہماری سعادت اتنی ہی تھی اس لیے اب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔"

"لیکن میں..."

"میں نے کہا نا، ہماری سعادت اتنی ہی تھی اور یہ بھی اس کا کرم ہے ورنہ ہم اس قابل کہاں تھے" انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی "ہم خوش نصیب ہیں برخوردار۔"

مجھے محسوس ہورہا تھا کہ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آرہی ہے حالانکہ درحقیقت میں کچھ بھی نہیں سمجھا تھا۔

"اور تم ملال کیوں کرتے ہو، تم تو...."

"جی ہاں۔ میں تو اتفاقاً راستہ بھٹک کر یہاں آنکلا تھا" میں نے جلدی سے کہا۔

انہوں نے کڑی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان کی اس تہدیدی نگاہ کو دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ صبح کا اجالا رات کی تاریکی کو دھیرے دھیرے نگل رہا ہے "تمہاری بات صریحاً غلط ہے" ان کے لہجے میں بھی سنگینی تھی "تم راستہ بھٹک کر یہاں نہیں آئے۔ تمہاری زندگی گزر گئی راستہ بھٹکتے۔ آج پہلی بار صحیح راستے پر تمہارے قدم پڑے اور یہ اُس کی عنایت ہے" انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی "اور تم یہاں اتفاقاً بھی نہیں آئے۔ تمہیں بلایا گیا۔ تم پابند کر کے لائے گئے۔ تمہیں یہاں آنا ہی تھا۔"

"میں سمجھا نہیں، کس نے بلایا ہے مجھے؟"

"کون بلا سکتا ہے؟ جس کا گھر ہے، اس نے ہی بلایا تھا۔"

مفہوم سمجھ میں آیا تو مجھ پر لرزہ چڑھ گیا "مجھے! لیکن میں...... میں تو گناہوں کی سیاہ دلدل میں سرتاپا غرق...."

"اپنی باتیں وہ جانے" انہوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "اس بے نیاز کو برائیوں کے ازدحام میں کسی کی کوئی خوبی پسند آجائے تو وہ اسے دونوں جہان کی ہر نعمت سے نواز دے۔ وہ تو سب کچھ جانتا ہے نا۔"

"مگر مجھ میں تو کوئی خوبی ہی نہیں" میں گڑگڑایا۔ میری کیفیت یہ تھی کہ میں خوف سے لرز رہا تھا اور شرمندگی سے پانی پانی ہوا جارہا تھا۔

"وہ تمہیں جانتا ہے جبکہ تم خود سے بھی آگاہ نہیں" انہوں نے مجھے بہت غور سے دیکھا "ایک خوبی تو ہے تم میں۔"

"مجھے بھی بتایئے۔"

"میں کیا بتاؤں، ابھی منہ سے بول پڑے گی خود ہی۔"

"میں تو بہت گناہگار ہوں" مجھ پر رقّت طاری ہونے لگی "اب یہی دیکھ لیں کہ یہ برکت کا مہینہ ہے اور میں نے ایک روزہ نہیں رکھا، آج جمعتہ الوداع کا بھی نہیں۔ ایک وقت نماز بھی نہیں پڑھی۔ اس وقت بھی بلاوا نہ ہوتا تو شاید یہاں بھی نہ آتا میں۔"

انہوں نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا "کیوں..... روزہ کیوں نہیں رکھتے ہو تم؟ بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ پیاس سے گھبراتے ہو۔ ڈرتے بھی نہیں کہ اگر اس نے تم پر بھوک اور پیاس مسلّط کردی تو کیا کرو گے؟ روزے میں تو صبر دہی دیتا ہے لیکن بھوک کی سزا میں تم پر کیا گزرے گی۔"

میں تھر تھر کانپنے لگا "بددعا نہ دیں مجھے۔ اللہ اپنی خفگی سے امان میں رکھے مجھے۔ بات بھوک پیاس کی نہیں۔"

"تو پھر...؟" انہوں نے مجھے گھورا۔

میں نے انہیں سگریٹ کی مجبوری کے متعلق بتایا۔

"اکل حلال تو بہت بڑی چیز ہے" انہوں نے سہلاتے ہوئے کہا "ہاں، روزہ چھوڑنا بہت بڑا گناہ ہے لیکن اللہ بہت بخشنے والا بھی ہے اور قہار بھی ہے۔ فیصلہ تو وہی کرے گا" اچانک ان کا لہجہ بدل گیا۔ "مگر شاید یہ اس ملک کی خرابی ہے کہ یہ اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا اور اس کے باوجود یہاں کے باسی دین سے بے بہرہ ہوگئے۔ یہ ملک ہی خراب ہے۔"

مجھے اس پر شدت کا غصہ آیا کہ اپنی عاجزی...... حتیٰ کہ اپنی گناہ گاری بھی بھول گیا۔ گرم خون جیسے چہرے کی طرف لپکا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ تمتما اٹھا ہوگا۔ "بس اب ایک لفظ بھی نہ کہئے گا۔ میں اس معاملے میں بڑا بدلحاظ ہوں۔ وطن کی برائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی" میں نے بے حد تُند لہجے میں کہا۔

وہ میرے چہرے کو بہت غور سے دیکھتے رہے پھر مسکرا دیے "لو دیکھ لو برخوردار۔ تمہاری ایک خوبی تو منہ سے بول اٹھی۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ کوئی چھوٹی خوبی نہیں کہ تم وطن سے محبت کرتے ہو۔"

"لیکن آپ تو......"

"تمہیں اکسانے کے لیے...... یہ سب کہلوانے کے لیے کہی تھی وہ بات" انہوں نے بے حد حلیمی سے کہا "ورنہ یہ پاک وطن میرے لیے بھی بہت محترم ہے۔ وطن سے محبت تمہاری بہت بڑی خوبی ہے۔"

میں الجھنے لگا۔ کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن کچھ سوچ کر رہ گیا "مگر مجھے بلوایا کس لیے گیا تھا؟"

"کوئی کام لینا ہے تم سے۔"

میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا "کام! مجھ سے.... اللہ کو لینا ہے؟" میں حواس باختہ ہورہا تھا۔

"اس کی مرضی۔ وہ تو ایسا نوازنے والا ہے کہ توفیق عطا کرتا ہے۔ دل میں خیال ڈالتا ہے۔ قوتِ عمل کو تحرک عطا فرماتا ہے۔ نیکی کے راستے کو آسان کرتا ہے۔ پھر بندہ جب وہ نیکی کرے تو دنیا میں اس کا اجر دیتا ہے..... اور یہی نہیں، آخرت میں اس اجر کو ستّر گنا بڑھا دیتا ہے۔ ایسا نوازنے والا ہے وہ۔"

"بے شک۔ لیکن میں اس کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگے "نعوذ باللہ..... توبہ توبہ۔ کیا بکتے ہو" انہوں نے برہمی سے کہا "اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے کوئی کیا کرے گا۔ نعوذ باللہ ارے جو کرو گے، اپنے ہی لیے کرو گے اور لطف یہ کہ اس کی مزدوری بھی ملے گی۔"

مجھ پر لرزہ چڑھ گیا۔ میں بھی دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار

پینے لگا تم.... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"خیر...... وہ تو دل کا حال بھی جانتا ہے لیکن تم مصنف ہو۔ لفظ تمہارا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ تمہیں لفظوں کے انتخاب میں غلطی نہیں کرنی چاہیے" وہ نرم لہجے میں بولے "شاید تم یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ پر یہ ذہن میں رکھنا کہ سب کچھ اللہ کی دین ہے' اس کی طرف سے ہے اور سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں" اتنا کہہ کر انہوں نے گہری سانس لی اور کچھ سوچنے کے بعد بولے "ایک شخص تھا' جو بہت سخی تھا۔ اللہ نے دیا بھی بہت کچھ تھا۔ چنانچہ جسے مصیبت میں دیکھتا' اس کی مدد کرتا۔ ایک بار اس نے ایک ایسے شخص کو مفلوک الحالی میں دیکھا جسے اللہ نے معاشرے میں بڑی عزت دی تھی اور وہ بہت خوددار بھی تھا۔ سخی اس کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ وہ شخص احسان لینے والا نہیں۔ چنانچہ اس نے ایک ترکیب سوچی۔ اس کے پاس بہت بڑی لیکن بنجر زمین تھی' جس کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہاں پانی نہیں نکل سکتا۔ سخی اس شخص کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ اس سے کنواں کھدوانا چاہتا ہے۔ اسے معقول مزدوری ملے گی۔ وہ شخص راضی ہوگیا۔ کنواں کھدتا رہا اور مفلوک الحال شخص کو مزدوری ملتی رہی۔ کنواں مکمل ہوگیا تو سخی نے کہا..... افسوس' پانی نہیں نکلا۔ خیر' میرا نصیب۔ اس کنوئیں کو بھردو۔ میں تمہیں اس کی مزدوری بھی دوں گا۔ اس سوکھے کنوئیں سے زمین بدنما لگنے لگی ہے۔ کنواں بھر گیا تو اس نے ضرورت مند سے ایک اور جگہ کنواں کھودنے کو کہا۔ مزدوری کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔ سخی نے کہا' جب تک پانی نہیں نکلے گا' میں کنواں کھدواتا رہوں گا اور پانی نکل آیا تو تمہیں انعام بھی دوں گا۔ یوں سات کنوئیں کھودے اور بھرے گئے۔ ضرورت مند کا گھر عزت اور آبرو سے چلتا رہا۔ یہاں تک اللہ نے خوش ہو کر پانی کو حکم دیا اور آٹھویں کنوئیں میں پانی نکل آیا۔ سخی نے بڑی عاجزی سے ضرورت مند کو انعام میں اتنا زرِ کثیر دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا اور اللہ نے سخی کو یہ اجر دیا کہ اس کی بنجر زمین لہلہا اٹھی۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور چند لمحے بعد سلسلۂ کلام جوڑا "یہ اللہ کے ایک عام بندے کی سخاوت ہے تو اللہ کی سخاوت اور دین کا تو کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ بندے کی مدد کرنے' اس کے دین اور دنیا کے دلدّر دور کرنے کی خاطر اس کے لیے کام نکالتا ہے۔ اسے کسی سے کوئی ضرورت نہیں' اسے کسی کی کوئی ضرورت نہیں۔"

انہوں نے وہ حکایت اتنے دل نشیں انداز میں سنائی کہ اس کا مفہوم اور ماحصل میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ میرا حوصلہ دوچند ہوگیا کہ میرا رب اپنی کریمی سے میرے دلدّر دور کرنے کا سامان فرما رہا ہے۔ اس سے بڑی بشارت کیا ہو سکتی ہے۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر میں نے کہا "بات وہیں رہ گئی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے کرنا کیا ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم" وہ بولے "بابا عصری بتائیں گے تمہیں۔"

"بابا عصر! یہ کون ہیں؟"

"بس میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ایک بے حد برگزیدہ ہستی ہیں۔"

"وہ کب اور کہاں ملیں گے ہم سے؟"

"مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ بس ہمیں چل دینا چاہیے۔ ہمارے چلتے چلتے ہی وہ کہیں آملیں گے ہم سے۔"

میں نے اس جگہ کو دیکھا جہاں وہ کچا مکان تھا جس کے اندر وہ عظیم الشان مسجد تھی مگر اب وہاں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں ان صاحب کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

ہم چلتے رہے' اچانک ان صاحب نے کہا "کچھ بات تو کرو کہ سفر کٹے۔"

"مجھے اس مسجد کے بارے میں بتائیے" میں نے کہا۔

"مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ میں یہاں پہلی بار آیا تھا..... میرا مطلب ہے' بلایا گیا تھا۔"

"اور اس مسجد میں موجود لوگ؟"

"یہ عالم اسلام کا اجتماع عظیم تھا۔ یہ سب عالم اسلام کے چیدہ چیدہ لوگ تھے جو دنیا کے کونے کونے سے یہاں آکر جمع ہوئے تھے" انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا "تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تم نے یہاں کس کس کو دیکھا ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ میرے اور تمہارے لیے اس مبارک رات اس اجتماع میں شمولیت ایک بہت بڑی سعادت ہے۔"

"جی بے شک" میں نے اثبات میں سرہلایا "یہ شبِ قدر ہے۔ میں جانتا ہوں مگر آپ نے فرمایا کہ یہ شکر کی رات ہے۔"

"ہاں' یہ شکر کی رات بھی ہے۔ شبِ قدر تو یہ ہے ہی۔ مگر آج خاص طور پر شکر بھی ادا کرنا چاہیے۔"

"شکر تو ہر حال میں' ہر لمحے واجب ہے" میں نے کہا "مگر آج خاص طور پر کیوں؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟" انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے' تم کیسے بے خبر ہو۔"

"مجھے نہیں معلوم" میں نے شرمندگی سے کہا۔

"پاکستان سے محبت کرتے ہو اور تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ آج پاکستان بنے پچاس سال ہوگئے۔"

میں ششدر رہ گیا۔ میں نے تیزی سے تاریخ' ماہ اور سال یاد کرکے ذہن میں دہرائے۔ تقریباً ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔

"کیوں؟ سمجھ میں نہیں آئی میری بات؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے جلدی سے کہا "آپ حساب لگائیں۔ اگر آج پچاسواں یوم آزادی ہوتا تو ہر طرف جشن کا سماں ہوتا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر اس سلسلے میں خصوصی پروگرام چل رہے ہوتے۔ دیکھیں نا' پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بنا تھا..... اور آج ۱۶ فروری ۱۹۹۶ء ہے۔"

"یہی تو المیہ ہے" انہوں نے ملامت بھرے لہجے میں کہا "۱۴

اگست کو تو تم لوگوں نے حرزِ جاں بنالیا..... اور ناقابلِ فراموش ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کو بھول گئے۔ اب ذرا خود حساب لگالو۔ پچاس سال ہوئے کہ نہیں؟"

"میں تو یہ سمجھا تھا کہ..... دراصل یہاں تاریخ پیدائش یاد نہیں رکھی جاتی لیکن جب اسکول میں داخلے کے وقت پوچھی جائے تو سب اپنے بچوں کی تاریخ پیدائش ۲۳ مارچ، ۱۴ اگست یا ۲۵ دسمبر لکھوادیتے ہیں۔ میں سمجھا شاید یہ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ مشہور کردیا گیا کہ پاکستان ۲۷ رمضان المبارک کو بنا تھا۔"

"نہیں۔ میں خود اس کا گواہ ہوں۔ رات بارہ بجے ریڈیو پاکستان نے پہلا اناؤنسمنٹ کیا تو وہ رمضان کی ۲۷ ویں شب تھی۔"

میرا وجود خوشی سے بھر گیا۔ پاکستان... میرا محبوب وطن پچاس سال کا ہوگیا۔ شکر میرے دل کی پاکیزہ ترین گہرائی سے ابھر کر لبوں پر آیا اور میرا گمان ہے کہ اللہ کی بارگاہ کی طرف پرواز کرگیا۔ وہ میرے لیے بڑی طمانیت کا لمحہ تھا "تو مسجد میں یہ اجتماع اس سلسلے میں شکر ادا کرنے کے لیے ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ پاکستان کے قیام پر تو شکر ادا کیا جاتا رہا ہے۔ یہ قیام پاکستان کے پچاس سال گزرنے پر خصوصی شکر کی رات تھی۔"

"شکر ادا کیا جاتا رہا ہے؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں، دنیا بھر کے مسلمان قیامِ پاکستان پر اللہ کا شکر ادا کرتے اور استحکامِ پاکستان کے لیے دعائیں کرتے ہیں" انہوں نے کہا۔

"لیکن میں نے تو یہی دیکھا کہ دو ایک اسلامی ملکوں کو چھوڑ کر تمام اسلامی ممالک کے بھارت سے زیادہ اچھے تعلقات ہیں" میں نے دل گرفتہ لہجے میں اعتراض کیا "کوئی ملی مسئلہ ہو بین الاقوامی فورم پر یا تجارت، ہمیشہ پاکستان پر بھارت کو ترجیح دی جاتی ہے۔"

"یہ تو حکمرانوں کا رویّہ ہے۔ سچے دردمند مسلمان اور علماو فقہا پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ اب آج ہی دیکھ لو، تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ مسجد میں موجود لوگوں میں سے کون کہاں سے کتنی زحمت کرکے آیا ہے اور یہ سب نہ سرکاری طور پر آئے ہیں، نہ یہاں سرکاری مہمان کی حیثیت ہے ان کی۔"

"یہی تو مجھے حیرت ہے۔ پاکستان کو اتنی اہمیت....."

میں اپنی بات پوری نہ کرسکا۔ عقب سے کسی نے بھاری گونج دار اور بارعب آواز میں میری بات کاٹ دی "یہی تو رونا ہے۔ پاکستان کی اہمیت کوئی پاکستانی نہیں سمجھتا۔ تم جیسے لوگ جو پاکستان سے عشق کرتے ہیں، وہ بھی پاکستان کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔"

یہ آواز سنتے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا۔ آواز ذرا فاصلے سے آتی محسوس ہوئی تھی مگر میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس دوران میں مخاطب میرے برابر آچکا تھا۔ میں نے دوبارہ سر گھمایا تو وہ مجھ سے ایک قدم آگے تھا۔ اس کی رفتار پر مجھے حیرت ہونے لگی۔

میرے ساتھی نے خوش ہوکر چہکتی آواز میں کہا "لو..... بابا عصر آگئے۔"

میں بابا عصر کو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا اور اب ان کی پشت میرے سامنے تھی۔ ان کے بڑے بڑے برف جیسے سفید بال کندھوں پر پڑے نظر آرہے تھے۔ اتنے سفید بالوں کے ساتھ میں تو بس جھکی ہوئی کمر کا ہی تصور کرسکتا ہوں لیکن وہ تیر کی طرح سیدھے اور دبلے پتلے تھے۔ ان کی رفتار ان کے پھرتیلے پن کی گواہی دے رہی تھی۔

"ذرا قدم تیز کرو برخوردار آفاق!" میرے رفیق نے مجھ سے کہا "بابا عصر رک کر بات نہیں کرتے۔ سب کچھ چلتے چلتے ہی ہوگا۔"

میں نے قدم تیز کیے اور بابا عصر کو سلام کیا۔ انہوں نے چلتے چلتے ہی مصافحہ کیا۔ میں چلتے چلتے انہیں غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جو کچھ میں نے دیکھا، وہ بے حد متاثر کن تھا۔ ان کے صرف بال ہی نہیں، بھویں بلکہ پلکیں تک سفید تھیں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ عمر کے اعتبار سے وہ ضعیف ہیں لیکن سن کی سفیدی کے سوا باقی ہر چیز اس کی تردید کررہی تھی۔ ان کا چہرہ جھرّیوں سے پاک تھا۔ اس پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ چہرے کی جلد شفاف اور بے داغ تھی۔ ان کی آنکھیں ایسی چمک دار تھیں کہ ان سے زیادہ دیر تک نظر ملانا ناممکن لگتا تھا لیکن میں نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ چند لمحے بعد ان کی آنکھوں سے نرماہٹ جھلکنے لگی۔ تب میں نے دیکھا کہ بالوں کی طرح آنکھیں بھی ان کی طویل العمری کی غمازی کررہی ہیں۔ ان میں مشاہدے اور تجربے کی گہرائی تھی۔ مجموعی طور پر وہ بارعب شخصیت کے مالک تھے۔

وہ مسکرائے "آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا آتا ہے تمہیں؟" انہوں نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

مگر ان کے لفظوں نے مجھے گڑبڑا دیا۔ میں ان سے بہت زیادہ مرعوب ہوچکا تھا "میں اس غیرارادی گستاخی پر معافی چاہتا ہوں" میں نے گھبرا کر کہا۔

ان کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی "یہ گستاخی بالا رادہ کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

میں ڈرا کہ شاید وہ مجھ پر طنز کررہے ہیں "میں اتنا گستاخ بھی نہیں۔"

"یہ بات نہیں" انہوں نے نرم لہجے میں کہا "مجھے وہ لوگ اچھے لگتے ہیں جو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں۔ وہ کامیاب رہتے ہیں۔ میں ان کے لیے نرم ہوجاتا ہوں" وہ کہتے کہتے خاموش ہوئے پھر بولے "اور تم مجھے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو۔ میرا چہرہ یاد رکھ کر تم آئندہ مجھے پہچان نہیں سکوگے۔ بنانے والے نے مجھے ایسے لچک دار خدوخال دیے ہیں کہ ایک معمولی سی جنبش سے میرا چہرہ یکسر تبدیل ہوجاتا ہے۔ لو دیکھو..." انہوں نے بھویں ذرا اوپر اٹھائیں، میں حیران رہ گیا۔ واقعی وہ چہرہ بالکل بدل گیا تھا "میری پہچان اور ہے..... میری چال، میری رفتار۔ چہرے پر نہ جاؤ۔"

میں اور زیادہ مرعوب ہوگیا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ نے ایک بات کہی تھی..."

"سب باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی" بابا عصر نے خشک لہجے میں کہا "پہلے کام کی بات ہوگی۔ تمہارے لیے ایک کام کا حکم آیا ہے اس لیے تمہیں بلایا گیا ہے۔"

"اور میں اس پر حیران ہوں" میں نے کہا "میں تو کسی کام کا بھی نہیں۔ بے عمل اور نام کا مسلمان ہوں میں۔"

"اوپر والے کا اختیار تو جانتے ہو۔ وہ جب جسے چاہے ہدایت دے اور جب جسے چاہے گمراہ کردے۔"

"مگر میں نکما، ناکارہ انسان۔ مجھ میں تو کوئی خوبی بھی نہیں۔"

"ایک خوبی ہے..... پاکستان سے سچی محبت۔"

"یہی انہوں نے کہا تھا" میں نے اپنے رفیق کی طرف اشارہ کیا "لیکن میں اس کی اہمیت....."

بابا عصر نے میری بات کاٹ دی "یہ سب بعد میں سمجھایا جائے گا۔ پہلے یہ بتاؤ، کوئی ہنر ہے تمہارے پاس۔ اللہ نے کوئی بڑی طاقت دی ہے تمہیں۔"

"میں نے عرض کیا نا، میں بالکل بے کار آدمی ہوں۔"

"بے خبر، ناشکرے" بابا عصر نے گرج کر کہا "اللہ نے قلم نہیں دیا تجھے جو بہت بڑی طاقت ہے۔ اللہ نے لفظ نہیں دیے تجھے، جو بہت بڑی نعمت ہیں اور اس نے لفظوں کو استعمال کرنے اور برتنے کا سلیقہ نہیں دیا تجھے، جو بہت بڑا ہنر ہے۔ تیرے لفظوں کو تاثیر نہیں دی اس نے؟"

مجھ پر کپکپی چڑھ گئی "جی..... مجھے خیال نہیں رہا..."

"خیال اسی لیے نہیں رہا کہ تو نے کبھی ان کی اہمیت اور افادیت نہیں سمجھی" بابا عصر اب بھی غصے میں تھے "قلم کو طاقت، لفظوں کو نعمت اور لکھنے کی صلاحیت کو ہنر نہیں سمجھا اور جب آدمی نعمت کو نعمت نہیں سمجھے گا تو کفرانِ نعمت تو کرے گا ہی، اسی لیے تو سب کچھ رائگاں کرتا رہا۔ یاد رکھ، ناشکراپن نعمت سے بے خبری کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔"

"بابا، اللہ کا شکر ہے۔ میں نے ناشکراپن کبھی نہیں کیا۔"

"میری بات غور سے نہیں سنی تو نے۔ جب نعمت ملے، مگر آدمی اس سے بے خبر ہو تو شکر کیسے ادا کرے گا۔ سب سے اچھا شکر تو بہترین استفادہ ہے۔ اللہ نے لفظ دیے، قلم کی طاقت دی، تحریر کا ہنر دیا تو ان سب نعمتوں کو اللہ کے پیغام کی اشاعت کے لیے استعمال کر۔ یہ بہترین استفادہ ہے اور یہی شکر گزاری ہے اور یہ گمان بھی نہ کرنا کہ یہ تو اللہ کے لیے کررہا ہے۔ یہ تو اپنے لیے کررہا ہوگا۔ اللہ جب جسے چاہے، ہدایت دے سکتا ہے۔ تجھے وسیلہ بننے کی سعادت مل رہی ہے تو اس سے استفادہ کر۔"

"میں سمجھ گیا لیکن مجھے لکھنا کیا ہے؟" میں نے بے حد عاجزی سے کہا۔

"جو میں بتاتا رہوں، وہ لکھ۔ میں تجھے مختلف ادوار میں مسلمانوں کے عروج و زوال کے متعلق بتاؤں گا، مکمل پس منظر فراہم کروں گا۔"

"یعنی مجھے تاریخ لکھنی ہوگی" میں نے مایوسی سے کہا۔

"نہیں۔ تاریخ تو بادشاہ لکھواتے ہیں اور وہ عموماً جھوٹی ہوتی ہے۔ دباؤ کے تحت لکھی جاتی ہے، اگر بادشاہ زندہ ہو۔ اور وہ مرجائے تو نفرت اور تعصب کے تحت بدلے اتارنے کے لیے لکھی جاتی ہے۔ تجھے تو وہی لکھنا ہے جو تو لکھتا ہے۔ تجھے کہانی لکھنی ہے لیکن اس میں اچھی تلقین اور ترغیب شامل کرنی ہے۔ تجھے اس کہانی میں لوگوں کو آگہی دینی ہے۔ پاکستان سے محبت کا پرچار کرنا ہے۔"

"جی.... میں تیار ہوں۔ آپ مجھے پاکستان کی اہمیت کے متعلق بتائیے۔"

"آج نہیں۔ کل بتاؤں گا" بابا عصر نے کہا۔ "آج کے بعد ہر روز تم رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے نکلوگے۔ میں تم سے ملوں گا اور تمہیں سب کچھ بتاتا، سمجھاتا رہوں گا۔ وہ بے ترتیب ہوگا۔ اسے ترتیب دینا تمہارا کام ہے۔ وہ بیک گراؤنڈ میٹریل ہوگا۔ اسے کہانی میں استعمال کرنا تمہارا کام ہوگا۔"

میں گھبرا گیا "آپ یونہی چلتے پھرتے بتایا کریں گے مجھے؟"

"ہاں، میں رکتا نہیں۔ رک ہی نہیں سکتا۔"

"تو پھر آپ کی کوئی بات مجھے یاد نہیں رہے گی، یہ میری کمزوری ہے۔"

انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھا "میری کہی ہوئی کوئی بات تم انشاء اللہ کبھی نہیں بھولوگے۔ لکھنے بیٹھوگے تو سب یاد آجائے گا۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ نگاہوں کے سامنے نظر ہی آجائے اور ہاں، ذرا تیز چلنے کی عادت ڈالو۔ تمہاری خاطر آہستہ چلنے کی وجہ سے میں تھک گیا ہوں۔"

مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میرے تو ہانپنے کی نوبت آگئی تھی۔

"ایک کام اور ہے۔ وہ حارث بن عثمان تمہیں بتائیں گے" بابا عصر نے میرے رفیق کی طرف اشارہ کیا "اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہتے ہی ان کی رفتار تیز ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

میں نے گہری سانس لے کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا "تو آپ حارث بن عثمان ہیں؟"

"ہاں" انہوں نے کہا پھر بولے "چائے کی طلب ہورہی ہے۔ چلو تمہیں چائے پلادوں؟"

"چائے..... یہاں؟" میں نے حیرت سے کہا لیکن سر گھما کر دیکھا تو اور حیران ہوگیا۔ اس وقت میں اپنے علاقے کے بازار والی سڑک پر تھا۔ سامنے وہ ریسٹورنٹ تھا جو رمضان میں افطار سے لے کر ختمِ سحر تک کھلا رہتا تھا۔

"آؤ میرے ساتھ..." حارث بن عثمان نے میرا ہاتھ تھام کر کہا اور ریسٹورنٹ کی طرف بڑھ گئے۔



ہم نے چائے کے ساتھ ایک ایک پراٹھا کھایا۔ حارث بن عثمان نے بیرے سے مزید چائے لانے کو کہا اور مسکرا کر مجھ سے

بولے "اصل چائے تو اب پییں گے۔ وہ چائے تو پڑا اٹھا پی گیا۔"

اس اندازِ بیان پر میں بھی مسکرا دیا۔ میں نے ریسٹورنٹ کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے چار بجے تھے۔ اس وقت بیرا چائے کی دو پیالیاں رکھ گیا۔ میں نے گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے کا ایک گھونٹ لیا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ چھ گھنٹے سے مجھے سگریٹ کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے بے تابی سے سگریٹ نکال کر جلائی اور ایک گہرا کش لیا۔ دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے میں نے حارث بن عثمان سے کہا۔ "اب تجسس میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔"

"کس سلسلے میں؟" حارث بن عثمان نے پوچھا۔

"بہت سلسلے ہیں" میں نے گہری سانس لے کر کہا "پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں۔ آخر آپ میری اس کہانی کا بے حد اہم کردار ہیں۔ پھر مجھے یہ بھی بتائیں کہ آج جو میرے ساتھ ہوا' یہ سب کیا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کو مجھے ایک کام بھی سونپنا ہے۔"

"میرا تعارف تو ایسا کوئی خاص نہیں۔ تم جان چکے ہو کہ میرا نام حارث بن عثمان ہے۔ اب یہ بتا دوں کہ میں مہاجر ہوں....."

میں نے گرم جوشی سے ان کا ہاتھ تھام لیا "واہ' بہت خوب۔ میں بھی مہاجر ہوں۔"

انہوں نے سرد مہری سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور مجھے ملامت بھری نظروں سے دیکھا "تم..... تم مہاجر کیسے ہو سکتے ہو؟" ان کے لہجے میں ہلکی سی برہمی تھی۔

"حیرت ہے۔ آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ بھئی میرے والدین ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے۔"

"اور تم یہاں پیدا ہوئے؟"

"جی ہاں..... ۱۹۵۶ء میں۔"

"یعنی پاکستان بننے کے نو سال بعد..... پاکستان میں" ان کے لہجے میں کاٹ تھی۔

"جج..... جی ہاں" نہ جانے کیوں میں شرمندگی محسوس کرنے لگا۔

"کوئی..... جہاں' اپنے گھر میں' حالتِ قیام میں پیدا ہوا ہو' وہاں مہاجر کیسے ہو سکتا ہے؟" حارث بن عثمان نے کہا "اور اللہ تعالیٰ نے مہاجر کی تعریف یہ کی ہے..... سو وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی' نکالے گئے اپنے گھروں سے اور ستائے گئے میری راہ میں۔ مہاجر ہونا کوئی نسل در نسل منتقل ہونے والی وراثت تو نہیں۔ اس کا انحصار تو پرفارم کرنے پر ہے۔ جس نے ہجرت کی' وہ مہاجر ہے۔ تم ناشکرا پن کیوں کرتے ہو؟"

"جی' ٹھیک ہے۔ آپ نے درست فرمایا۔ میں تو آزاد سرزمین پر پیدا ہوا۔ میں تو پاکستانی ہوں" میں نے سر جھکا کر کہا "آپ اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"میں فلسطینی ہوں" انہوں نے سرد آہ بھر کے کہا "۱۳۶۶ھ کی شب برات کے موقع پر میں وہاں ایسی ہی ایک مسجد میں تھا..... آج کی طرح۔ وہاں بڑی بڑی ہستیاں موجود تھیں۔ پاکستان اس کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد قائم ہوا لیکن یقین کرو' وہاں پاکستان کے قیام کے لیے گڑگڑا کر دعائیں کی جا رہی تھیں۔ اس کے استحکام' اس کے لیے خیر و برکت کی دعا کی جا رہی تھی۔ میں نے حیران ہو کر ایک بزرگ سے استفسار کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انشاء اللہ دنیا کے نقشے پر ایک نیا اسلامی ملک ابھرنے والا ہے۔ یہ بڑا عظیم ملک ہو گا جیسے سرزمین عرب اسلام کا روحانی مرکز ہے اور قیامت تک رہے گا' ویسے ہی یہ نیا ملک اسلام کا عسکری مرکز ہو گا۔ یہ اسلام کا قلعہ اور مسلمانوں کی طاقت کا مرکز ہو گا۔ مسلمان دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہوں' یہ ان کے تحفظ کی علامت ہو گا۔ طاغوتی طاقتیں جب کمزور مسلمانوں کو کچل رہی ہوں گی تو یہ ان کی دادرسی کے لیے خود کو تیار کر رہا ہو گا۔ جب احیائے اسلام کی تحریک شروع ہو گی' حق و باطل آخری معرکے کے لیے صف آرا ہوں گے تو یہی ملک سب سے آگے ہو گا۔ یہی جذبۂ جہاد میں نئی روح پھونکے گا۔ یہی حق کی فتح میں کلیدی کردار ادا کرے گا" وہ کہتے کہتے رکے اور انہوں نے گہری سانس لی پھر انہوں نے سلسلۂ کلام جوڑا "مجھے اسی لمحے اس ان دیکھی سرزمین سے عشق ہو گیا جسے اللہ جل شانہٗ نے اتنی سعادتیں بخشنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"پھر آپ یہاں آ گئے؟"

"نہیں۔ ایسے کوئی آ سکتا ہے۔ اشتیاق کتنا ہی ہو پھر یہ ہوا کہ یہودی غاصب آئے اور فلسطین پر چھا گئے۔ ہم سے ہماری زمینیں چھین لی گئیں۔ ہم گھر سے بے گھر ہو گئے۔ ہم اللہ کی راہ میں ستائے جانے لگے۔ ہمیں کبھی حیلوں بہانوں سے اور کبھی کھلم کھلا نماز سے روکا جانے لگا۔ ظلم و ستم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے تاریخ کی روشنی میں سمجھ لیا کہ ہجرت کا وقت آ گیا ہے۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ اچانک ایک نام کی پکار میرے اندر ابھری اور میرا پورا وجود جیسے روشن ہو گیا..... پاکستان! پوری دنیا کے مسلمانوں کے تحفظ کی علامت۔ تمام مسلمانوں کی دادرسی کا..... اسلام کی طاقت کا مرکز۔ سو میں جوش و جذبے سے بھرا پاکستان چلا آیا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟ اور اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟"

"میں ۱۳۷۱ھ میں یہاں آیا۔ اس وقت میری عمر ۲۲ سال تھی۔"

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ میں دل ہی دل میں حساب لگاتا رہا پھر بولا "تو اب آپ کی عمر ۶۵ سے زیادہ ہے۔"

"ہاں۔" حارث بن عثمان مسکرائے "مجھے ۴۵ سال ہو گئے یہاں آئے۔"

"آپ کی اتنی عمر لگتی نہیں۔ پھر آپ واپس نہیں گئے؟"

"نہیں۔ میں یہیں کا ہو گیا۔ پاکستان سے محبت مجھے پہلے ہی سے تھی۔ اب تو میں پاکستانی ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔"

"آپ کو اپنی زمین' اپنا وطن یاد نہیں آتا؟"

"جس سرزمین پر برائیاں پھیلنے لگیں' ظلم حد سے گزر جائے' اللہ کے احکامات کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہونے لگے اور نیکی کی

گنجائش نہ رہے اور آپ میں اصلاحِ احوال کی طاقت نہ ہو تو ہجرت کرلینی چاہیے اور زمین کی محبت یہ ہے کہ وہاں اس وقت تک واپس نہ جاؤ' جب تک تم میں بدی کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنے کی اور ظلم کا سر کچلنے کی طاقت نہ آجائے۔ میں بھی اسی طاقت کا منتظر ہوں۔ انشاء اللہ ایک دن اپنے وطن بھی جاؤں گا۔"

میرا دل خوب صورت مگر اَن جانے جذبوں سے بھر گیا۔ عجیب باتیں کرتے تھے حارث بن عثمان۔ جو کچھ اندر.... بہت اندر تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا' وہ بھی سمجھ میں آنے لگتا تھا۔ اللہ کے احکامات کے تحت زندگی گزارنے کے طور طریقے' آداب اور قرینے سمجھ میں آنے لگتے تھے لیکن وہ سب بہت دور کی باتیں لگتی تھیں۔

"اندر اندھیرا بہت گہرا ہو تو ایسا ہی لگتا ہے" حارث بن عثمان نے میری سوچ پڑھ لی۔

"یہاں آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"ایک مسجد میں شب بسری کرتا ہوں۔ وہاں اذان دینا' مسجد کی دُھلائی صفائی میرے ذمے ہے" انہوں نے میری نگاہوں میں کچھ دیکھا تو جلدی سے وضاحت کی "اس کا محنتانہ نہیں لیتا میں۔ فجر کی نماز کے بعد مسجد سے نکل آتا ہوں۔ مزدوری تلاش کرتا ہوں۔ کچھ کرنے میں عار نہیں سمجھتا۔ بوجھ بھی ڈھولیتا ہوں۔ گڑھا بھی کھودلیتا ہوں۔ محنت کا کوئی کام بھی ہو' اجرت پر بھی بحث نہیں کرتا۔ دو وقت پیٹ بھرنے ہی کا تو مسئلہ ہے۔ وہ بھی کیا مسئلہ ہے۔ فاقے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ بازار کے سب دکان دار مجھے جانتے ہیں۔ روز کوئی نہ کوئی کام مل ہی جاتا ہے۔ تن ڈھانپنے کے لیے سال میں دو جوڑے بہت ہیں۔ ان کا بھی سامان میرا رزق دینے والا میری محنت کے بہانے کردیتا ہے۔ ایک جوڑا جمعتہ الوداع کے لیے اور دوسرا عید کے لیے۔"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دل ایک دم بھر آیا کہ زندگی یہ بھی ہوتی ہے۔

حارث بن عثمان میرے آنسو دیکھ کر بھڑک گئے "تم مجھ پر ترس کھاتے ہو اور مجھے تم پر ترس آتا ہے" انہوں نے برہمی سے کہا "میں کپڑوں کی آرزو نہیں کرتا۔ میرا رب دے دیتا ہے تو میں خوشی اور شکر گزاری سے روتا ہوں۔ تم کپڑوں کی فکر میں ہلکان ہوتے ہو۔ نہ ملیں تو اللہ سے شکوہ کرتے ہو اور دکھ سے روتے ہو۔ زندگی یہی ہے کہ میں سوکھی روٹی مل جانے پر شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ نے فاقے سے بچالیا۔ زندگی یہ نہیں کہ تم دو دن بگھاری ہوئی دال سے تازہ' نرم روٹی بے دلی سے کھا کر روتے اور شکوہ کرتے ہو کہ اے اللہ' تونے ہمارے نصیب میں صرف دال ہی لکھ دی ہے' یہ کیا ظلم ہے۔"

کیسی سچی بات تھی۔ مجھ پر اللہ کا ایسا خوف طاری ہوا کہ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ میں نے دل میں اللہ سے توبہ کی۔ اس لمحے میں اپنی ہر پریشانی بھول گیا تھا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں" میں نے کہا "زندگی وہ نہیں' جو ہم گزار رہے ہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں حارث بن عثمان کے بارے میں سوچتا رہا۔ اچانک مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے ان سے پوچھا۔ "آپ کے بھائی بہن اور رشتے دار بھی تو ہوں گے۔ کیا وہ فلسطین میں ہی ہیں؟"

"اگر میں جواب اس انداز میں دوں کہ کروڑوں کلمہ گو بھائیوں کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں تو یہ بہت بڑی ناشکری ہوگی۔ جہاں تک خونی رشتوں کا تعلق ہے تو...." انہوں نے ایک سرد آہ بھری "... میرے والدین' آٹھ بہن بھائی اور چار چچا' سب یہودیوں کے پھینکے ہوئے ایک بم کی نذر ہوگئے۔ سب شہید ہوگئے۔ ایک میں ہی بد نصیب' خوش نصیب بچا۔ سو میں ہجرت کر آیا۔"

"یہ بد نصیب' خوش نصیب کا کیا مطلب ہوا؟"

"ایسا خوش نصیب جو درحقیقت بد نصیب ہے۔"

"جان بچنا بد نصیبی تو نہیں ہوتی۔ یہ ناشکرا پن نہیں ہے؟"

"جان بچنا خوش نصیبی ہے لیکن موقع ہوتے ہوئے شہادت کا نہ ملنا اس سے بڑی بد نصیبی ہے اسی لیے میں خود کو ایسا خوش نصیب سمجھتا ہوں' جس کی بدنصیبی اس کی خوش نصیبی سے بڑی ہے۔"

"آپ مسجد میں رہتے ہیں۔ آپ کے بیوی بچے..."

"میں نے شادی ہی نہیں کی۔ اس طرزِ زندگی میں شادی نہ کرنا ہی بہتر تھا اور یقین کرو' میں ہمیشہ خوش رہا۔"

اس بار ان کی عید کا تصور کرکے میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ نہ گھر' نہ بیوی بچے' نہ کوئی اپنا۔ اور وطن سے دور! "آپ عید کے دن کیا کرتے ہیں؟"

"اتنے لوگوں سے عید ملتا ہوں کہ کوئی نہیں ملتا ہوگا" انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا "پہلے اپنی مسجد میں ہر شخص سے عید ملتا ہوں پھر باہر نکل آتا ہوں۔ بازار سے گزرتے ہوئے ہر جاننے والے' ہر اجنبی سے عید ملتا ہوں۔ پھر آگے ہی آگے چلتا جاتا ہوں۔ جو نظر آجائے' اس سے عید ملتا ہوں۔ چلتا چلا جاتا ہوں..... آگے ہی آگے..... لوگوں سے عید ملتا ہوں۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ کون سی بستی' کون سا علاقہ ہے۔ عصر پڑھ کر واپس چلنا شروع کرتا ہوں اور اگلے دن سے پھر معمول شروع۔"

میرا دل اور بھر آیا "میری ایک بات مانیں گے۔"

"کہو' کوشش کروں گا کہ مان لوں۔"

"آپ میرے گھر کو اپنا گھر سمجھ لیں۔ میرے ساتھ رہیں۔ میرے بیوی بچے آپ سے بہت خوش ہوں گے۔"

"برخوردار.... تم نے جس خلوص اور محبت سے یہ بات کہی ہے' اسے ٹالنا نہیں چاہیے لیکن خود سوچو' اللہ کے گھر مہمانی کی سعادت سے منہ موڑ کر کیسے آسکتا ہوں۔"

بات ایسی تھی.... اور انہوں نے ایسے لہجے میں کہی تھی کہ میں اصرار نہ کرسکا پھر بھی میں نے کہا "تو ٹھیک ہے۔ آپ عید تک تو میرے ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بات ٹال کر تمہارے خلوص کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔" انہوں نے کہا پھر گہری سانس لے کر بولے۔

"اپنے بارے میں، میں نے بتا دیا۔ اب آگے چلو۔ آج جو کچھ ہوا، تم جان چکے کہ تمہیں کس لیے بلایا گیا تھا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اب اس مسجد کا سن لو۔ وہاں شکرادا کرنے والوں میں شہدا بھی تھے اور اللہ کے مقرب صالحین بھی۔ اور وہاں کون کون سی بڑی ہستیاں تھیں، یہ میں بھی نہیں جانتا۔ میں ایک عام انسان ہوں.... اور عام انسانوں سے زیادہ گناہ گار۔ اللہ کا کرم کہ مجھے وہاں حاضری کی سعادت ملی۔ ہاں، میں یہ جانتا ہوں کہ ایسے اجتماع ہوتے رہتے ہیں اور وہی اس ملک میں خیروبرکت کا باعث ہیں۔"

"اور آپ کو مجھے کون سا کام سونپنا ہے؟"

انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا پھر انہوں نے بند مٹھی میرے سامنے کھول دی۔

میری آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

میں نے اشرفیوں کے متعلق سنا تھا، پڑھا تھا لیکن اشرفیاں دیکھی کبھی نہیں تھیں۔ پھر بھی میں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ اشرفیاں ہیں۔ میں سحرزدہ سا انہیں دیکھتا رہا۔ لیکن چند لمحے بعد مجھے شبہ ہونے لگا کہ وہ اشرفیاں نہیں ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اشرفیاں سونے کی ہوتی ہیں۔ ابتدا میں وہ مجھے طلائی رنگت کی لگیں مگر پھر مجھے احساس ہوا کہ ان کی رنگت اس دنیا کی چیز تو نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ وہ رنگت بدل رہی ہوں.... یا ان میں سے مختلف رنگوں کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔ ان کا ایک ہی رنگ تھا۔ دنیا میں جو رنگ ہوتے ہیں، ان کے حساب سے وہ سنہرے رنگ سے قریب تر تھا لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ سنہرا رنگ نہیں تھا۔ ان میں اندر جو شیڈ جھلملا رہے تھے، وہ بھی سنہرے رنگ ہی کے تھے۔ بہرحال مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کوئی ارضی شے نہیں، ان کا تعلق سماوات سے ہے۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ وہ شفاف نہیں تھیں لیکن شفاف ہونے کا تاثر دے رہی تھیں۔

میں مبہوت ہو کر انہیں دیکھتا رہا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ ان پر ہم رنگ حروف میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ ذرا غور سے دیکھا تو نظر آگیا۔ ان پر اللہ لکھا تھا۔

میری عجیب کیفیت ہو گئی۔ جی چاہا کہ سب کچھ بھول کر سمتوں کے متعلق سوچے بغیر وہیں سجدے میں گر جاؤں۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ باطنی اور روحانی عبادت کیا ہوتی ہے۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ میرا دل، میرا دماغ..... بلکہ میرے تمام اعضا حالتِ سجدہ میں ہیں۔ اور ہر بنِ مُو سے سبحان ربی الاعلیٰ کی صدا آرہی ہے۔ اسی کیفیت میں، میں نے سوچا کہ اگر یہ دونوں..... یک لخت میری سوچیں تک ساکت ہو گئیں۔ صرف اس لیے کہ میں انہیں اشرفی کہنا چاہ رہا تھا۔ تو پھر میں انہیں کیا کہوں، میں نے ... بےبسی سے سوچا اور ایک دم میرے اندر سے کسی نے جواب دیا۔ یہ نورانی مہریں ہیں بےوقوف..... مہرِوحدانیت!

وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ حارث بن عثمان کی کھلی ہوئی ہتھیلیوں پر وہ نورانی مہریں رکھی تھیں اور میں انہیں تکے جا رہا تھا۔ جانے کتنی دیر از خودرفتگی کی یہ کیفیت رہی۔ پھر میرے دل میں ایک خواہش بڑی شدت سے ابھری۔ اتنی شدت سے کہ میں احتراماً بھی اس سے لڑنہ سکا۔ میں نے حارث بن عثمان سے بےحد گھگیا کر کہا "یہ مجھے دکھائیں گے۔ میں انہیں ہاتھوں میں لے کر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ مسکرائے "کیوں نہیں۔ یہ تو ہیں ہی تمہارے لیے۔ یہی تمہارا دوسرا کام ہے، جو مجھے تم کو سونپنا تھا" یہ کہہ کر انہوں نے وہ نورانی مہریں مجھے دے دیں۔

وہ مہریں میرے ہاتھوں میں آئیں تو جسم میں ایک اداسی دوڑنے لگی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مجھے لگا کہ کوئی پانی بہا بہا کر اندر سے مجھے خوب رگڑ رگڑ کر دھو رہا ہے اور میں پاک ہو رہا ہوں۔ آنسو دیر تک بہتے رہے اور بہتے بہتے خود ہی رک بھی گئے۔ اب میں ان کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

مجھے اچنبھا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بہت ہلکی ہوں گی۔ سونے کا بہت وزن نہیں ہوتا لیکن وہ مہریں میری توقع سے بہت بھاری تھیں۔ مگر میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی ان کے قیمتی ہونے کا خیال نہیں ابھرا۔ ان کے مقدس اور متبرک ہونے کے پہلے تاثر نے کچھ اور سوچنے ہی نہیں دیا تھا۔

میں نے لفظ اللہ پر انگلی پھیری۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ حروف نہ لکھے ہوئے ہیں اور نہ کندہ ہیں۔ اسم ذات اس مہر کی سطح پر نہیں تھا۔ وہ اس کے اندر، گہرائی میں تھا۔ میری انگلیاں اسے چھو نہیں سکتی تھیں۔

پھر میرے اندر ایک اور تجسس ابھرا۔ میں نے ٹکیہ جیسی، کسی بڑے سکّے جیسی اس مہر کو پلٹ کر دیکھا۔ ایک لمحے کو میری دھڑکن رک سی گئی۔ دوسری طرف خوشنما نورانی حروف میں کلمۂ طیبہ لکھا تھا۔ میں نے انگلی پھیری۔ وہ بھی سطح پر تحریر نہیں تھا بلکہ اس مہر کے بطن میں تھا۔

میرے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ احترام نے میرے وجود کو شل کر دیا تھا!

جانے کتنی دیر بعد یہ کیفیت ختم ہوئی۔ میں نے سر اٹھا کر حارث بن عثمان کو دیکھا جو مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ "شاید آپ نے کہا تھا کہ یہ میرے ہی لیے ہیں" میں نے کہا۔

"ہاں اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہی تمہارا دوسرا کام ہے جو مجھے تم کو سونپنا تھا" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ذرا وضاحت کریں۔"

"ان میں سے ایک تمہارے لیے ہے یعنی تم چاہو تو اسے رکھ سکتے ہو۔ دوسری اللہ کی امانت ہے۔ بہت بھاری ذمے داری ہے۔" انہوں نے کہا اور ایک گہری سانس لی پھر وہ دوبارہ گویا ہوئے "جو امانت ہے، وہ تمہیں کسی اور کو دینی ہے..... کسی ایسے شخص کو جو امین اور دیانت دار ہو اور تمہیں اس کو یہی ہدایت دینی ہے جو میں نے تمہیں دی ہے۔ یعنی وہ کسی امین اور دیانت دار آدمی کو یہ مہر

اسی ہدایت کے ساتھ سونپ دے۔"

"یعنی یہ مہر سفر کرتی رہے گی...... ایک ہاتھ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہاتھ...."

"امین اور دیانت دار لوگوں کے درمیان" انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"لیکن ایسے لوگ ہیں کہاں؟" میں نے گھبرا کر کہا "انہیں دیکھ کر تو کسی کی بھی نیت خراب ہو سکتی ہے۔"

"تمہاری نیت تو خراب نہیں ہوئی؟" انہوں نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی... نہیں ہوئی..... اور میں خود اس پر حیران ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں امین اور دیانت دار نہیں ہوں" میں نے کہا۔ "میری نیت شاید اس لیے خراب نہیں ہوئی کہ ایک مہر میرے تصرف میں دے دی گئی ہے۔"

"اللہ تمہیں تم سے بہتر جانتا ہے۔"

"لیکن غرض کے سارے ضرورت مندوں کے اس ہجوم میں' میں ایسا آدمی کہاں تلاش کروں گا۔ یہ بہت بڑی ذمے داری ہے۔ اس کی حفاظت بہت مشکل کام ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے تو کوئی کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے۔" میرے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔

"اس کی حفاظت تمہاری ذمے داری نہیں" حارث بن عثمان نے خشک لہجے میں کہا "کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کیسی حفاظت کرنے والا ہے۔ جس چیز کی حفاظت کا وہ وعدہ کرلے' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا' نہ اس کی بے حرمتی ہو سکتی ہے۔ یاد کرو' انجیل اور توارت بھی اللہ کی کتابیں ہیں لیکن آج کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس تحریف و ترمیم سے پاک ایسی انجیل مقدس یا توارت موجود ہے....بالکل ویسی ہی' جیسی آسمان سے اتری تھی۔ کوئی دعویٰ کرے تو اس پر یقین کوئی نہیں کرے گا اور اللہ نے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ فرمایا تو آج اس میں کہیں اعراب کا بھی فرق نہیں ہے۔ تو برخوردار آفاق' یہ امانت اللہ کی حفاظت میں ہے۔"

"لیکن میں نے اسے غلط ہاتھوں میں دے دیا تو؟" مجھے ان کے جواب سے ڈھارس تو ہوئی لیکن میں اب بھی گھبرایا ہوا تھا۔

"دیکھو آفاق' اس ملک میں صرف ایک کمی ہے۔ یہاں سیاست داں اور اربابِ اقتدار مصلحت کوش' مفاد پرست اور خودغرض ہیں۔ بڑے بڑے جاگیردار' صنعت کار اور پیسے والے زیادہ تر بے ایمان ہیں لیکن عام' غریب آدمی ایسا نہیں۔ ایک ضرورت مند بھوکے کی بے ایمانی اور ایک صاحب ثروت تونگر کی بے ایمانی میں فرق کرنا سیکھو۔ اور یاد رکھو کہ جو شخص بھوک سے مر رہا ہو' اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حرام کو بھی جائز کر دیا ہے۔ جب اس انداز میں سوچنے لگو گے تو اتنے مایوس نہیں رہو گے۔ رونا ان لوگوں کا نہیں جنہیں ضرورت بے ایمان بنا دیتی ہے۔ رونا ان لوگوں کا ہے جن کے پاس سب کچھ ہے۔ مگر وہ عادتاً بے ایمانی کرتے ہیں۔ ہوس کے غلام ہو کر بے ایمانی کرتے ہیں۔"

"یہ میری بات کا جواب تو نہیں ہے۔"

وہ مسکرائے "مگر پھر بھی اسے یاد رکھنا' اسے لکھنا۔ تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ یہ جس کے ہاتھ سے بھی غلط ہاتھوں میں جائے گی' وہاں ٹھہرے گی نہیں۔ واپس انہی ہاتھوں میں آجائے گی۔ خواہ وہ ہاتھ تمہارے ہوں یا اگلے مرحلے کے کسی امین کے۔"

میں نے سکون کی سانس لی "لیکن یہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟"

"حکم کی تعمیل کے لیے وضاحت ضروری نہیں ہوتی" حارث بن عثمان نے سخت لہجے میں کہا پھر مسکرائے "لیکن اس معاملے میں سب کچھ بتا دیا گیا ہے اور جو کچھ بتایا گیا ہے' ان مہروں کو آگے بڑھاتے ہوئے اسے بھی آگے بڑھانا ضروری ہے۔ اسے بھی ہدایات کا حصہ سمجھ لو۔ یہ نورانی اشرفیاں یا اللہ کی مہریں پاکستان کی آزادی' خود انحصاری' استحکام اور اسلام کی عظمت اور سربلندی کی علامت اور امین ہیں۔ ان کی منزل پاکستان کا قومی خزانہ ہے۔ انہیں مختلف ہاتھوں سے گزرتے ہوئے پاکستان کے قومی خزانے تک پہنچنا ہے۔ جس دن یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا' اس دن سے پاکستان میں ایک نیا دور شروع ہوگا۔ اس ملک میں خیر و برکت ہوگی۔ حق کا بول بالا ہوگا۔ عہدِ نو کے تمام بت توڑ دیے جائیں گے۔ اسلام کی چیلنج کرتی ہوئی للکار پوری دنیا میں گونجے گی۔ اس اشرفی کا مجوزہ سفر جتنا طویل ہوگا' اتنی ہی سختی دیکھنی پڑے گی' لیکن تکلیف کے بعد ہی راحت ہوتی ہے۔"

"مگر اللہ تو بڑا کارساز ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ پھر اتنے پیچ کی کیا ضرورت ہے" میں نے اعتراض کیا۔

"اللہ کے ہر کام میں بے شمار حکمتیں ہوتی ہیں۔ یاد کرو' حق و باطل کے آخری معرکے سے پہلے کی صورتِ حال کے متعلق کیا بتایا گیا ہے۔ مسلمان ہر جگہ خوار و زبوں ہوں گے۔ ان کے حوصلے پست ہوں گے۔ وہ تنزلی کی آخری حد پر ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ مٹھی بھر رہ جائیں گے۔ پھر وہ اللہ کی راہ میں لڑیں گے اور طاغوتی قوتوں کو ملیامیٹ کر دیں گے۔ سنو آفاق' کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم بھی ان مٹھی بھر مسلمانوں میں شامل ہو؟"

"کیوں نہیں" میں نے آزردگی سے کہا "لیکن میرے اعمال ایسے نہیں۔"

"اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ اب سنو' یہ نورانی اشرفی اللہ کی ہدایت بھی ہے۔ یہ ان مٹھی بھر سعادت مند اور ہدایت یافتہ خوش نصیبوں میں شامل ہونے کی دعوت بھی ہے۔ جس کے ہاتھوں میں بھی یہ پہنچے گی' اسے گویا اللہ کی تائید و ہدایت پہنچے گی۔ خیر و برکت ملے گی اسے۔ وہ خوش نصیب ہوگا اور جو اسے دیانت داری کے ساتھ آگے بڑھا دے گا' اس کی خوش نصیبی پر مہرِ تصدیق ثبت ہو جائے گی۔ مگر ان خوش نصیبوں میں جس کی نیت میں فتور ہوا' فطرت میں بے ایمانی ہوئی' اس کے پاس سے یہ واپس آجائے گی اور ایسا شخص بد نصیب ہوگا۔ وہ ہر سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا جائے گا۔ یوں ہر مسلمان کو خوش نصیبوں میں شامل ہونے کا موقع ملے گا۔ آگے اس کا عمل' اس کا نصیب۔"

"سبحان اللہ..... میں سمجھ گیا۔ یہ تو اللہ کی بڑی رحمت ہے۔"

میں نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

"اب دوسرے پہلو سے دیکھو" حارث بن عثمان بولے "یہ معاشرہ اب انحطاط کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ یہاں نیچے سے اوپر تک' عام آدمی کی جیب سے قومی خزانے تک بے برکتی کا دور دورہ ہے۔ اخراجات آمدنی سے زیادہ ہیں۔ قرض سے گزارہ ہوتا ہے اور قرض کا بوجھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ بے سکونی ہے اور مسلسل بے سکونی مایوسی کو جنم دیتی ہے۔ اور مایوسی وہ چیز ہے کہ بڑھ جائے تو نیکی اور اچھائی کے امکان کو بھی کھا جاتی ہے۔ کسی کو کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ ایسے میں اچھا فرد بھی اپنی اچھائی کو بھول کر برائی میں ملوث ہو جاتا ہے۔ ایسے میں بیشتر لوگوں کو اللہ کا خیال ہی نہیں آتا۔ نہ برائی کرتے ہوئے خوف کے حوالے سے۔ نہ مستقبل کی سوچتے ہوئے دعا کے حوالے سے اور جنہیں اللہ کا خیال ہوتا ہے' وہ سوچتے ہیں کہ اللہ سے کس منہ سے کچھ مانگیں۔ ہمارے اعمال ہی ایسے نہیں۔ دونوں برائیاں ہیں' ایک بہت بڑی اور دوسری چھوٹی۔ بھئی اللہ سے ہدایت تو مانگے بندہ۔ استغفار تو کرلے۔ یہ کیسی نقصان دہ شرمندگی ہے کہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھی چھوڑ دے۔" انہوں نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا۔ ان کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ "یہ نورانی اشرفی جس کے پاس بھی جائے گی اور جو اسے سچائی اور دیانت داری سے آگے بڑھائے گا' وہ ایسی خیر و برکت اور اللہ کی ایسی تائید دیکھے گا کہ وہ اسے معجزہ ہی لگے گی۔ پھر جب وہ اشرفی اس کے پاس واپس نہیں آئے گی تو اس کا معاشرے کی اچھائی پر اعتماد بحال ہونا شروع ہوگا۔ یہ نیکی کے فروغ کا آغاز ہوگا۔ ایسا شخص سوچے گا کہ ابھی معاشرے میں اچھے لوگ بھی ہیں..... اور بہت اچھے بھی۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگی..... اپنی اچھائی کا بھی یقین ہوگا اور اس شخص کی اچھائی کا بھی' جسے اس نے یہ امانت سونپی اور وہ اس کے پاس پلٹ کر نہیں آئی۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا" میں نے جوش سے کہا "میں خوش نصیب ہوں اور انشاء اللہ مجھے اللہ کی ہدایت بھی نصیب ہوگی۔"

"انشاء اللہ" حارث بن عثمان نے بے حد خلوص سے کہا۔ "اور میری دعا ہے کہ اشرفی کا یہ سفر تیز رفتاری سے تکمیل کو پہنچے اور مختصر بھی ثابت ہو۔ کیونکہ جن لوگوں تک یہ اشرفی نہیں پہنچے گی' وہ ویسے ہی ہدایت یافتہ ہو جائیں گے..... بغیر کسی آزمائش کے۔ ہاں' یہ بے ایمانوں کو الگ اور نمایاں کردے گی۔"

یہ بات بھی میری سمجھ میں آرہی تھی۔ بس مجھے اس کو لکھنا تھا۔ میرے ذہن میں نئی کہانی کے خدوخال ابھرنے لگے۔

"چلو..... اب چلیں" حارث بن عثمان نے اٹھتے ہوئے کہا۔



اس روز سحری مجھے بہت اچھی لگی۔ اس لیے کہ وہ میری پہلی سحری تھی ورنہ میں اس وقت سو رہا ہوتا تھا۔ بچے روز ہی اٹھتے اور سحری کرتے تھے لیکن اس روز حارث بن عثمان کو دیکھ کر وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے حارث کو از خود ماموں بنا لیا تھا "ماموں' اب آپ ہمارے پاس ہی رہیں" میرے بڑے بیٹے نے کہا۔

"عید تک تو تمہارے ساتھ ہیں بیٹے!" حارث بن عثمان نے کہا "لیکن اس کے بعد ہمارے کام شروع ہو جائیں گے۔"

"ماموں' آپ کو کہانیاں آتی ہیں؟" میری چھوٹی بیٹی نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا' کہانیاں تو ہمارے پاس بہت ہیں اور ایسی ہیں کہ نہ کوئی سنائے گا' نہ لکھ سکے گا" حارث نے بڑی محبت سے کہا۔

"بس پھر ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے" میری بیٹی نے فیصلہ سنا دیا۔

میرا بیٹا کسی گہری سوچ میں تھا۔ اس نے سر اٹھایا اور بولا۔ "ماموں' ایک ترکیب ہے۔ آپ دن بھر اپنا کام کریں اور رات کو ہمارے پاس آجایا کریں۔ ہم آپ کی کہانی سنتے سنتے آپ کے پاس سو جایا کریں گے' ٹھیک ہے نا؟"

اس کے انداز میں اتنی معصومیت تھی کہ حارث انکار نہ کرسکے۔ تائید میں سر ہلا کر رہ گئے۔

میری بیوی ناہید کا رویہ حارث کے ساتھ بے حد احترام آمیز تھا۔ وہ بار بار ان کی طرف کوئی چیز بڑھاتی "یہ لیجئے نا بھائی جان۔ آپ تو تکلف کر رہے ہیں۔"

"نہیں بہن' سچ کہہ رہا ہوں۔ سحری میں اتنا زیادہ اور اتنا اچھا میں نے کبھی نہیں کھایا۔ ڈر رہا ہوں کہ بدہضمی نہ ہو جائے۔"

میرے ذہن میں ان کی سحری کا تصور لہرا گیا۔ وہ سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر کھا رہے تھے۔ میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"کھائیں گے تو بدہضمی ہوگی' لیجئے نا" ناہید نے حارث سے اصرار کیا۔

دو منٹ بعد حارث نے کہا "اب میں چلتا ہوں۔ وقت ہو رہا ہے۔ مجھے اذان بھی دینی ہے۔"

"میں بھی چلتا ہوں" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ناہید کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور وہ مجھے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ صرف اس لیے کہ میں فجر پڑھنے جا رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر شرم آنے لگی۔

ہم گھر سے نکلنے لگے تو ناہید نے حارث سے کہا "بھائی جان' افطار سے پہلے گھر آجائیے گا۔ روزہ یہیں افطار کرنا ہے۔"

"لیکن مسجد..... اذان..." حارث کے لہجے میں الجھن تھی۔

"مسجد میں بتا دیجئے گا۔ اذان کوئی بھی دے دے گا" میں نے کہا کیونکہ میں واقف حال تھا۔

"ٹھیک ہے۔ انشاء اللہ میں افطار سے پہلے آجاؤں گا۔ اچھا بہن' فی امان اللہ۔"

ہم وقت سے پانچ منٹ پہلے مسجد پہنچ گئے۔ مجھے پہلی صف میں جگہ مل گئی۔ وقت ہوا تو حارث بن عثمان نے اذان دی۔ ان کی آواز اور لہجے میں شیرینی' نرمی اور سوز کا عجیب امتزاج تھا۔ میں

نے محسوس کیا کہ ان کی پکار اندر اتر کر جگانے اور مسجد کی طرف بلانے کی بھرپور اہلیت رکھتی ہے۔

نماز کے بعد میں حارث سے ملا۔ انہوں نے کہا "تم جاؤ برخوردار۔ میں تو اب کام کے وقت ہی مسجد سے نکلوں گا۔"

میں انہیں سلام کرکے مسجد سے نکل آیا۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ یہ کیسی مبارک صبح ہے۔ آج پاکستان پچاس سال کا ہوگیا اور یہ کیسی مبارک صبح ہے کہ مجھ سا بد نصیب دن چڑھے تک سوتے رہنے والا آج جاگا ہوا ہے۔ مجھے سحری اور روزہ نصیب ہوا۔ میں نے فجر پڑھی اور اب پچاس سالہ پاکستان کے نئے سال کی پہلی صبح کا سورج طلوع ہوتے دیکھوں گا۔ اللہ.... میرے رب..... میرے معبود' تیرا کرم ہے۔ تیرا شکر ہے۔

میں گھر پہنچا تو ناہید بچوں کو اسکول کے لیے تیار کر رہی تھی۔ میں سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ اس وقت میری کیفیت عجیب تھی۔ میرے وجود میں شکر کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ آنکھیں رہ رہ کر نم ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے پچاس سالہ پاکستان پر تنے ہوئے شفاف نیلے آسمان کو دیکھا۔ چہچہاتے ہوئے پرندوں کی ایک ڈار میرے سر کے عین اوپر سے گزری۔ میرے زینے کی ریلنگ سے چمٹی ہوئی چنبیلی نے خوشبو کی زبان میں اللہ کی حمد و ثنا اور اس کا شکر ادا کیا۔ میرے جسم سے صبح کی خنک ہوا کا خوش گوار جھونکا ٹکرایا۔ اسی جھونکے نے گملے میں لگے پودے سے کچھ سرگوشی کی۔ پتے جھومے اور اللہ کی ثنا کا گیت گانے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ سامنے والے تمام مکانات' یہاں تک کہ وہ بلڈنگ' جس کے فلیٹ میں' میں رہتا ہوں اور اِدھر اُدھر استادہ درخت' سب رب واحد کے حضور سجدہ ریز ہوگئے ہیں۔ حمد و ثنا میں مصروف ہیں۔ اُس کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ میں پانی پانی ہوگیا اور وہ سمندر میری آنکھوں سے بہہ نکلا۔ میں بے اختیار سجدے میں گر گیا۔ وہ شکر اور استغفار کا لمحہ تھا۔

بعد میں' میں سیڑھیوں پر بیٹھا سوچتا رہا کہ اللہ کی کتنی نعمتیں ہماری نظروں کے سامنے ہوتی ہیں۔ مگر انہیں دیکھنا تو درکنار' ہم بدنصیب انہیں محسوس کیے بغیر ناشکرے پن سے سوچتے ہوئے محرومی' اضطراب اور بے سکونی کے راستے پر چلے جاتے ہیں..... چلتے..... بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ کتنی خوشیاں' کتنی سرشاریاں' کتنی طمانیت' کتنی آسودگی' اللہ نے چپے چپے پر ہمارے لیے بکھیری ہوتی ہے لیکن ہم اس سے خود کو محروم کر لیتے ہیں۔

وہ شب انقلاب کے بعد کی پہلی صبح تھی!



مجھے نہیں معلوم تھا کہ کس روز خیر و برکت کا مفہوم مجھ پر کھلے گا!

بچے اسکول چلے گئے تو میں سیڑھیوں سے اٹھا اور فلیٹ کا دروازہ بند کرکے اپنی اسٹڈی میں آبیٹھا۔ میز پر میرے رائٹنگ پیڈ کا کھلا اور نامکمل صفحہ مجھے کہانی کے پیچ کی یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا' لیکن میری توجہ اس طرف بالکل نہیں تھی۔

ناہید برتن وغیرہ سمیٹنے کے بعد اب انہیں دھونے اور کچن کی صفائی میں مصروف ہوگئی تھی۔ میں اس وقت ایسا سکون محسوس کر رہا تھا..... ایسا بے پایاں سکون جو میرے لیے بالکل نیا تھا۔

میں نے وہ نورانی مہریں یا اشرفیاں جیب سے نکالیں اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر انہیں بہت غور سے دیکھنے لگا۔ وہ میری ہتھیلی پر ایسی پوزیشن میں رکھی تھیں کہ ایک کا اللہ کے نام والا اور دوسری کا کلمۂ طیبہ والا رخ اوپر تھا۔ انہیں دیکھتے ہی پھر میری کیفیت عجیب ہوگئی۔ میرا جسم لرزنے لگا لیکن اس کا سبب خوف نہیں' ایک عجیب سا کیف و سرور تھا۔

اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ میرا وہ ہاتھ بے اختیار کپکپایا' جس پر وہ نورانی اشرفیاں رکھی تھیں..... اور میرے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ نیچے گرتی نظر آئیں۔ میں انہیں فرش پر گرنے سے بچانے..... انہیں ہوا میں پکڑنے کے لیے جھپٹا..... لیکن ناکام رہا۔ وہ فرش پر گر گئیں۔

اللہ کے نام اور کلمۂ طیبہ کی بے حرمتی اور اپنی کوتاہی کے تصور نے مجھے نیم جاں کر دیا۔ میں پوری جان سے کانپ رہا تھا۔ میں نے لرزتا ہوا ہاتھ بڑھا کر انہیں فرش سے اٹھانا چاہا لیکن میرا ہاتھ ان سے کوئی چھ انچ اوپر ہی ساکت ہوگیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس ناقابل یقین منظر کو دیکھتا رہا۔ میرے کانوں میں حارث بن عثمان کی آواز گونجی..... کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کیسی حفاظت کرنے والا ہے۔ جس چیز کی حفاظت کا وہ وعدہ کرے' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ نہ اس کی بے حرمتی ہوسکتی ہے..... اور برخوردار آفاق' یہ امانت اللہ کی حفاظت میں ہے۔

میں حیرت اور بے یقینی سے تکتا رہا۔ فرش پر گرتے ہی..... بلکہ شاید اس سے پہلے ہی وہ نورانی مہریں ہیئت بدل چکی تھیں۔ ان کی رنگت اب طلائی تھی..... عام سونے جیسی۔ وہ نورانی رنگت جس کی وجہ سے وہ شفاف لگتی تھیں' جس کی وجہ سے ان کے اندر سنہری شعاعیں پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں' وہ غائب ہوچکی تھی۔ اب ان کی وہ سماوی رنگت نہیں تھی۔ میں کہہ سکتا تھا کہ پرانے زمانے کی اشرفیاں بالکل ایسی ہوتی ہوں گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے اندر موجود اللہ کا نام اور کلمۂ طیبہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

سب کچھ بدل گیا تھا مگر میں اب بھی ان کی بے حرمتی کے خیال سے لرزاں تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان عام اشرفیوں کو چھوا۔ وہ واقعی عام اشرفیوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ میں نے بڑی احتیاط بھری نرمی سے انہیں اٹھایا اور پھر اپنی ہتھیلی پر رکھا۔ اگلا لمحہ پھر حیرت کا تھا۔ میری ہتھیلی پر وہی نورانی اشرفیاں رکھی تھیں۔ ایک میں اللہ کے نام اور دوسری میں کلمۂ طیبہ کے نورانی حروف نظر آرہے تھے۔

اسٹڈی کے دروازے پر قدموں کی چاپ ابھری تو میں نے نورانی اشرفیوں کو جلدی سے جیب میں رکھ لیا۔ ناہید اندر آئی اور اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "کیا بات ہے' سوئے نہیں تم؟ تم تو رات کو جاگتے نہیں ہو۔ نیند کے بہت پکے ہو۔"

"ہاں، مجھے بھی حیرت ہے" میں نے کہا "مگر مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔"

"واقعی..... حیرت کی بات ہے" وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

مجھے ایک خلش ستا رہی تھی "میں حارث بن عثمان کو لایا' تمہیں برا تو نہیں لگا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"دراصل گھر کی صورتِ حال ایسی ہے کہ ممکن ہے تمہیں وہ بوجھ لگے ہوں۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو ان کا آنا اچھا لگا۔ اس لیے تو ان سے افطار سے پہلے آنے پر اصرار کیا۔ ہاں یہ افسوس ہوا کہ ان کی ٹھیک سے خاطر نہیں کرسکے ہم۔ برا لگنے کا تو سوال ہی نہیں۔ مجھے تو وہ پہلی نظر میں بھا گئے۔ بہت بابرکت انسان ہیں۔"

"یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟"

"بھئی..... تم نے رات عبادت کی۔ پھر روزہ رکھا۔ فجر پڑھی ماشاءاللہ۔ اور برکت کیا ہوتی ہے؟"

میں کھسیا گیا "اللہ کی دی ہوئی توفیق ہے یہ تو۔"

"اچھے لوگوں کی سنگت بھی فیض پہنچاتی ہے" ناہید نے عالمانہ انداز میں کہا "اچھا' یہ تو بتاؤ' ان سے ملے کیسے؟"

میں ناہید کو اشرفیوں کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ بہرکیف اسی لیے اس کو تفصیل بھی نہیں بتا سکتا تھا "مسجد میں ملاقات ہوئی تھی" میں نے مختصراً کہا۔

"ان کے متعلق بھی تو بتاؤ..... گھر..... بیوی..... بچے.....؟"

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس سوال کا جواب دینے سے کیسے بچوں۔ اسی لمحے میرے دماغ میں جیسے روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ کہانی کی رکاوٹ دور ہوگئی تھی۔ کہانی کے پیچ کا بہترین حل مجھے سوجھ گیا تھا "ناہید..... بس اب تم جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" میرے لہجے میں مسرت اور سنسنی تھی۔

"ارے..... یہ تمہیں کیا ہوگیا اچانک؟" ناہید نے حیرت سے پوچھا۔

"کہانی کا پیچ دور ہوگیا۔ مسئلہ حل ہوگیا' اب مجھے لکھنا ہے۔"

ناہید بھی خوش ہوگئی "یہ تو بہت اچھا ہوا۔ کل کہانی دے کر پیسے لے آؤ تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔ سنو' آج تک کا گزارہ تو ہوجائے گا نا۔"

"ہاں لیکن کل کی سحری کا نہیں پتا۔"

"اللہ مالک ہے۔ اب مجھے لکھنے دو' تم جاؤ۔"

ناہید اٹھنے لگی مگر اچانک اس کے چہرے پر پریشانی کا تاثر ابھرا۔ "سنو..... کیا اب تم روزہ توڑ دو گے؟" اس نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا "اللہ نہ کرے' روزہ کیوں توڑوں گا میں؟"

"خود ہی تو کہتے ہو کہ سگریٹ کے بغیر کام نہیں ہوتا ہے۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا اس بات کا" میں نے گہری سانس لے کر کہا "خیر..... کچھ بھی ہو۔ روزہ تو میں توڑنے والا نہیں۔ مگر یہ کیا کم ہے کہ پیچ دور ہوگیا ہے۔ کم ازکم میں اسے تو نوٹ کرہی لوں گا۔"

ناہید کے چہرے پر مایوسی کا سایہ دیکھ کر مجھے رنج ہوا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ کہانی مکمل نہیں ہوئی اور میں وہ لے کر نہیں گیا تو پیسے نہیں ملیں گے۔ اس کا مطلب تھا کہ کل سے فاقے شروع۔ اور اب تو عید میں بھی زیادہ سے زیادہ تین دن ہیں۔ عید پر کیا ہوگا۔ خود میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کہانی مکمل ہونے کا امکان سامنے ہوتے ہوئے بھی روزے سے دستبردار ہونے کا خیال میرے ذہن میں بھی نہیں آیا۔ دیکھا جائے گا۔ میرے اندر کسی نے بڑی بے پروائی سے کہا لیکن میں نے ناہید کو حوصلہ دینے کے لیے بے حد امید افزا لہجے میں کہا "اور کیا پتا' کام ہی ہوجائے۔"

لیکن میرا دلاسا بھی اس کی آنکھوں میں امید نہ چمکا سکا۔ بہرحال وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔

میں اپنے پیڈ پر جھک گیا۔ میں نے سوچا یہ تھا کہ ذہن میں آنے والی ان نئی تفصیلات کو نوٹ کرلوں گا' جنہوں نے کہانی کی رکاوٹ دور کی ہے۔ مگر ہوا یہ کہ میں نے نامکمل کہانی آگے بڑھا دی۔ پھر میرا قلم اتنی روانی سے چلا اور کہانی اتنی تیزی سے آگے بڑھی کہ صفحے کے صفحے سیاہ ہونے لگے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ میں نے زندگی میں کبھی اتنی تیز رفتاری سے کام نہیں کیا تھا۔ اور لطف یہ کہ اس دوران میں مجھے سگریٹ کی طلب بھی محسوس نہیں ہوئی تھی بلکہ خیال تک نہیں آیا تھا۔

کلاک نے ایک بجایا تو میں چونکا۔ مجھے خیال آیا کہ ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا ہے اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ میں سات صفحے لکھ چکا ہوں۔ اب میرے اندازے کے مطابق کہانی بمشکل تین ساڑھے تین صفحے کی اور تھی۔ سچی بات یہ کہ کہانی کو اس مقام پر چھوڑ کر اٹھنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر باطن کی کسی قوت نے مجھے اٹھنے پر مجبور کردیا۔ میں نے جاکر وضو کیا اور گھر میں ہی نماز پڑھنے کھڑا ہوگیا۔

میرا خیال تھا کہ کہانی میں دھیان ہونے کی وجہ سے میں بس جیسے تیسے نماز پڑھ سکوں گا مگر اس نماز میں مجھے معلوم ہوگیا کہ اللہ کی توفیق و تائید اور اس کی عنایت کیا ہوتی ہے۔ میں نے وہ ایسی نماز پڑھی کہ جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ نماز میں ایسی یکسوئی اور ارتکاز تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

نماز پڑھ کر میں دوبارہ اسٹڈی میں آگیا مگر اس بار مجھ سے لکھا نہیں گیا۔ ایک سطر لکھتے لکھتے سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ خاصی دیر کی ناکام کوشش کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب سگریٹ کے بغیر

کام نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میں مطمئن تھا۔ اب اختتام تک کہانی میں کہیں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اور زیادہ کام بھی نہیں تھا۔ افطار کے بعد میں اسے بہ آسانی مکمل کرسکتا تھا۔

مجھ پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ میں ہلکا پھلکا تھا۔ رات بھر کا جاگا ہوا بھی تھا۔ نیند آنے لگی۔ میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ فوراً ہی نیند بھی آگئی۔

سوکر اٹھا تو چار بجے تھے۔ ہاتھ منہ دھوکر میں تازہ دم ہوا اور اسٹڈی میں آگیا۔ میں نے لکھنے کی نیم دلانہ کوشش کی لیکن پھر سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ میں نے قلم بند کرکے رکھا اور پاؤں پھیلا کر سکون سے بیٹھ گیا۔

اسی وقت ناہید اسٹڈی میں چلی آئی۔ اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیوں پریشان ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آج افطار کا اہتمام ہونا چاہیے تھا" وہ افسردگی سے بولی۔

"تو پھر؟"

"گھر میں کچھ بھی تو نہیں ہے۔ نہ بیسن' نہ تیل۔ ورنہ پکوڑے تل لیتی۔ دودھ ہوتا تو شربت بن جاتا۔ کل کے بچے ہوئے تھوڑے سے پھل ہیں مگران سے بہت تھوڑی چاٹ بنے گی۔ اور تم جانتے ہو کہ بچے ہمارے فروٹ چاٹ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ تو کسی کو کھانے ہی نہیں دیں گے۔"

"تو کیا ہوا۔ کام چل جائے گا" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"آج ایسی کیا خاص بات ہے کہ تم اس طرح پریشان ہورہی ہو۔"

"خاص بات نہیں' باتیں ہیں آج۔ ۲۷ واں روزہ ہے۔ تم نے روزہ رکھا ہے اور حارث بھائی بھی ہمارے ساتھ افطار کریں گے۔"

میں نے چند لمحے سوچا اور پھر کندھے جھٹک دیے "جب کچھ نہیں ہوسکتا تو پریشان ہونے سے فائدہ...."

اسی لمحے اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے جاکر دروازہ کھولا اور حیران رہ گیا۔ سامنے والی پرچون کی دکان کے مالک کا لڑکا سعید کھڑا تھا۔ اس کے پیروں کے پاس بہت سارا سامان رکھا تھا۔ لگتا تھا' گھر کا ماہانہ سودا آگیا ہے "کیا بات ہے سعید؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کا سودا لایا ہوں انکل!"

"لیکن ہم نے تو نہیں منگوایا؟" میں نے کہا۔ اسی لمحے ناہید بھی دروازے پر آگئی۔ سامان دیکھ کر اسے بھی حیرت ہوئی۔

"یہ دیکھیں' پرچہ آپ کا نہیں ہے؟" سعید نے میری طرف لسٹ بڑھائی۔ میں نے دیکھا۔ اوپر فلیٹ نمبر ۳۵ لکھا تھا جو کہ میرے ہی فلیٹ کا تھا۔ مگر وہ تحریر نہ میری تھی' نہ ناہید کی۔ ناہید بھی نفی میں سرہلا رہی تھی۔

"نہیں سعید۔ کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ نمبر تو ہمارے ہی فلیٹ کا ہے لیکن یہ پرچہ ہم نے نہیں بھجوایا۔"

سعید نے سر پکڑلیا "یہ سامان ۵۳ نمبر کا ہے۔ انہوں نے نمبر الٹ کر لکھ دیا" وہ بڑبڑایا پھر پریشان ہوگیا "اب روزے میں یہ

نٹنگ بھی ہوگی۔"

میں اور ناہید اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ بے چارہ اتنا سامان اٹھا کر تیسری منزل تک آیا تھا اور اب سامان نہ صرف واپس لے جانا تھا بلکہ ۵۳ میں بھی پہنچانا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ برابر والے زینے پر چوتھی منزل کا فلیٹ ہے۔

اچانک سعید کی آنکھوں میں چمک سی ابھری "انکل' آپ کا سودا بھی تو ہماری دکان سے آتا ہے۔ آپ کا مہینے کا سودا بھی تو آنا ہے۔"

"آنا تو ہے' ہم کل منگوائیں گے۔"

"اب روزے میں یہ سودا واپس لے جانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ پلیز.... آپ یہ رکھ لیں نا" سعید کے لہجے میں التجا در آئی۔

"لیکن اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"تو کیا ہوا۔ کل پرسوں میں دے دیجیے گا' میں ابّی کو بتادوں گا۔"

"لیکن...." ناہید نے احتجاج کرنا چاہا۔

"میں سمجھ گیا" سعید نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی "یہ تقریباً وہی کچھ ہے جو آپ کے ہاں بھی آتا ہے۔ پھر بھی آپ پرچے سے چیک کرلیں۔ کوئی چیز آپ کے حساب سے کم ہو تو میں لادوں گا۔ زیادہ ہوئی تو واپس لے جاؤں گا۔"

"اور ۵۳ والوں کو بھی تو ضرورت ہے" ناہید نے فکرمندی سے کہا۔

"آپ پانچ منٹ میں سودا چیک کرلیں۔ پھر میں یہ پرچہ لے کر جاؤں گا اور ۵۳ والوں کا سودا بھی افطار سے پہلے پہنچادوں گا۔"

میں اور ناہید مل کر سودا چیک کرنے لگے۔ سعید دروازے پر ہی کھڑا رہا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ آٹا' چاول' تیل' گھی' دالیں' چائے کی پتی' چینی' سرکہ' صابن' مسالے' بیسن.... "سب چیزیں وہی ہیں جو ہم منگواتے ہیں۔ حتیٰ کہ مقدار بھی وہی ہے ہر چیز کی" ناہید نے کہا۔

"سبحان اللہ" میں نے بے ساختہ کہا۔

"ہمارے ہی گھر کا سودا لگتا ہے" ناہید بولی۔

"الحمدللہ۔ گھر کا ہی نہیں' ہمارے نصیب کا ہے" میں نے کہا۔

"کچھ چیزیں کم ہیں' وہ دوسرے پرچے پر لکھ دیتی ہوں۔"

ناہید نے اضافی پرچہ سعید کو دیتے ہوئے کہا "واپس کچھ نہیں کرنا ہے' بس یہ چیزیں اور لادو۔"

"آج نہیں آنٹی' کل لادوں گا۔ آج تو ۵۳ والوں کو بھی سودا پہنچانا ہے ابھی۔ روزے میں میری اتنی ہمت نہیں۔"

"میں وحید کو ساتھ بھیج دیتی ہوں۔ یہ ہلکی چیزیں ہیں۔ وہ لے آئے گا۔ اسے دے دینا" ناہید نے بڑے بیٹے کو پکارا۔

"وحید.... ادھر آؤ...."

"ٹھیک ہے آنٹی۔"

"میں پیسے کل پہنچادوں گا" میں نے کہا۔
"وہ تو ہوتا رہے گا انکل۔ اس وقت تو آپ نے مجھ پر بہت بڑی مہربانی کی ہے" سعید نے ممنونیت سے کہا پھر وہ وحید کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ میں سودا کچن میں رکھوانے میں ناہید کا ہاتھ بٹانے لگا۔
"اسے کہتے ہیں چھپر پھاڑ کر ملنا" ناہید نے خوشی سے کہا۔
"جی نہیں۔ اسے کہتے ہیں اللہ کی تائید... اللہ کی مدد" میں نے بھیگی آواز میں کہا "ان تمام چیزوں کی طلب تھی ہمیں لیکن مل نہیں سکتی تھیں۔ اب دیکھو کہ یہ بن مانگے ملیں۔ پیسوں کا بھی کوئی مطالبہ نہیں اور الٹا وہ سعید ہمارا احسان مان رہا تھا۔"
"سچ کہتے ہو۔ اب ڈھنگ سے افطار ہو جائے گا۔"
میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ حارث بن عثمان نے کہا تھا.... یہ نورانی اشرفی' جس کے پاس بھی جائے گی اور جو اسے سچائی اور دیانت داری سے آگے بڑھائے گا' وہ ایسی خیر و برکت اور اللہ کی ایسی تائید دیکھے گا کہ وہ اسے معجزہ ہی لگے گی اور ابھی میں نے اشرفی آگے بڑھائی بھی نہیں تھی کہ یہ بات ثابت ہو گئی تھی۔
ناہید افطار کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ میں عصر کی نماز کے لیے مسجد کی طرف چل دیا۔



میں اور حارث بن عثمان عشا کی نماز پڑھ کر گھر کی طرف واپس آرہے تھے۔ میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ افطار کے بعد میں نے کہانی کا مزید ایک صفحہ لکھا تھا۔ ناہید بھی خوش تھی کہ اس نے افطار کا خاصا اہتمام کیا تھا۔ حارث بن عثمان افطار سے پانچ منٹ پہلے گھر آگئے تھے لیکن انہوں نے افطار میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ ناہید کے اصرار پر انہوں نے کہا "بیٹی' میں تو افطار کے فوراً بعد جو روکھی سوکھی مل جائے' کھالیتا ہوں۔ ان سب کی تو مجھے عادت ہی نہیں۔"
پھر بھی ناہید نے انہیں تھوڑا بہت کھانے پر مجبور کر دیا۔ پھر وہ خود کچن میں روٹی پکانے چلی گئی اور پانچ منٹ بعد اس نے کھانے کا دسترخوان لگا دیا۔ میں تو اتنی جلدی کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ البتہ بچے حارث کے ساتھ بیٹھ گئے۔

مسجد سے نکل کر حارث کے ساتھ چلتے ہوئے میں اس دن کی برکتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بڑا بابرکت دن ثابت ہوا تھا۔ مجھے اس دن نے طمانیت اور بے فکری سی دی تھی۔ گھر میں راشن کا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ دوسری طرف رکی ہوئی کہانی تقریباً مکمل ہو چکی تھی جس کے عید سے پہلے مکمل ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے اور اس کا مطلب تھا کہ ہمارے گھر میں بھی انشاء اللہ عید ہوگی۔
میں نے سوچا' گھر جاتے ہی کہانی مکمل کروں گا۔ اسی لمحے عقب سے جانی پہچانی آواز نے کہا "کہانی تو ابھی شروع کرنی ہے برخوردار!" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بابا عصر تھے اور اپنی مخصوص تیز رفتاری کے ساتھ چل رہے تھے۔

میں نے اور حارث بن عثمان نے انہیں سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ ہم اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکے تھے۔
"اپنا کام سمجھ میں آگیا ہے؟" بابا عصر نے مجھ سے پوچھا۔
"جی ہاں بابا!"
"تو اب ہم بات کر سکتے ہیں" بابا عصر نے گہری سانس لے کر کہا "کل میں نے محسوس کیا کہ پاکستان سے سچی محبت کے باوجود تم پاکستان کی اہمیت سے واقف نہیں ہو۔"
"میں پاکستان کی اہمیت تو سمجھتا ہوں بابا لیکن جیسی غیر معمولی اہمیت کا آپ کی باتوں سے اشارہ ملتا ہے' میں اسے سمجھنے سے قاصر ہوں۔" میں نے کہا۔
"پاکستان کی غیر معمولی اہمیت یہ ہے کہ اللہ نے اسے اہمیت دی ہے" بابا عصر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔
"یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔" میں نے کہا۔
"کیوں نہیں آتی' آنی چاہیے" بابا عصر نے جھنجلا کر کہا "اللہ کبھی خود بندوں کے سامنے نہیں آیا' انہیں سمجھانے اور قائل کرنے کے لیے۔ اور اسے قائل کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ یہ اس کی رحمت اور عنایت ہے کہ وہ اپنے بندوں کی فکر کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ وہ بے خبری میں گمراہ ہوں۔ وہ انہیں گمراہی سے بچانا چاہتا ہے۔ اس لیے انہیں سمجھاتا ہے کہ کیا غلط ہے اور کیا درست۔ وہ انہیں حق کا راستہ دکھاتا ہے اور میں نے کہا ناکہ وہ خود سامنے آکر بندوں کو نہیں سمجھاتا۔ یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ سو وہ ابتدا سے اپنے بندوں کے پاس سفارتیں بھیجتا رہا.... اپنے پیغمبر اور رسول۔ سرکش اور نافرمان بندوں نے' شیطان کے چیلوں نے اس کے سفیروں کا مذاق اڑایا' انہیں جھٹلایا' انہیں اذیتیں پہنچائیں۔ یہاں تک کہ انہیں قتل بھی کر دیا۔ یوں ان پر اللہ کا غضب ہوا لیکن بہرحال اللہ نے حجت تمام کر دی۔ اس کا کوئی بندہ بھی گمراہی کے جواز میں اپنی بے خبری کی ڈھال سامنے نہیں لا سکتا۔ حق سے اس کا انکار اس کے منہ پر مار دیا جائے گا۔"
"جی' یہ تو ہے لیکن پاکستان....."
"یہاں تک پہنچنے میں جو صدیاں لگی ہیں' انہیں کیسے چھوڑ دوں" بابا عصر نے مجھے ڈانٹ دیا "تم میری بات سنتے رہو۔ یہ سب کچھ تمہیں لکھنا ہے۔ لکھنے بیٹھو گے تو میرا کہا ہوا کوئی ایک لفظ بھی انشاء اللہ نہیں بھولو گے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے ہر دور میں سفارتیں بھیجتا رہا۔ خوش نصیب ان سے فیض اٹھاتے رہے لیکن بڑی تعداد میں بدنصیب اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حضرت موسیٰؑ کی امت پر اللہ نے خاص عنایات فرمائیں' انہیں بے حد نوازا' آسمان سے ان کے لیے خصوصی نعمتیں اتاریں مگر پھر اللہ نے انہیں دھتکار دیا۔ کیوں؟ یہ پوری انسانیت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ مسلمانوں کو خاص طور پر۔ تاکہ وہ ان اعمال سے بچے رہیں' جن کی وجہ سے اللہ کی ایک پسندیدہ قوم اس کی

مغضوب ہوئی اسی لیے تو سورۂ فاتحہ میں یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ دکھاہم کو راستہ سیدھا' ان لوگوں کا کہ جن پر تُو نے انعام فرمایا۔ نہ کہ ان بھٹکنے والوں کا' جن پر غضب ہوا تیرا۔

"بہر کیف پھر اللہ نے روئے زمین کے بدترین معاشرے کو اپنے سب سے محبوب پیغمبر سے نوازا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' جو وجۂ تخلیقِ کائنات ہیں۔ جن پر خود اللہ اور اس کے فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں جو کائنات کے واحد مثالی انسان ہیں۔ جن کی سیرت اور کردار ایک روشن معجزہ ہے۔ یہ اللہ کی آخری سفارت ہے۔ اللہ نے واضح طور پر بتادیا کہ اس کے بعد کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں آئے گا۔ نبوت کا سلسلہ حضورؐ پر مکمل کرکے ختم کیا جارہا ہے۔ تم دیکھ لو کہ دنیا میں ہمیشہ نیکی کے مقابلے میں بدی کی کثرت رہی اور لوگوں نے جھوٹی پیغمبری کے دعوے بھی کیے۔ لیکن بدی کی کثرت کے باوجود نہ وہ دعوے کرنے والے پنپے اور نہ ان کے ماننے والے۔

"تو یہ طے ہے کہ اب اللہ کی طرف سے کوئی پیغمبر نہیں آئے گا لیکن اللہ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے نعوذباللہ اپنے بندوں کو چھوڑ کر ان کی ہدایت سے ہاتھ اٹھالیا۔ ایسا نہیں ہے۔ اس نے مکمل ہدایت دے دی۔ دین مکمل کرکے اپنے بندوں کو روشنی کا منبع دکھادیا۔ گویا حجت تمام کردی۔ اب یوم حساب کسی ظالم کے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا اپنے ظلم اور گمراہی کا۔ اس لیے کہ اس آخری ہدایت کے بعد بھٹکنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ انسان کو عقل دے کر اس نے پہلے ہی تمام مخلوقات سے افضل بنادیا تھا۔ اب مکمل ہدایت کے ذریعے اسے درست طور پر سوچنے' سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی روشنی بھی دے دی۔ اب اس کے بعد بھی کوئی بھٹکے تو وہ اس کے نفس کی خرابی ہے اور وہ اپنی جان پر ظلم کررہا ہے۔"

"مگر ہم ان لوگوں کے مقابلے میں تو بد نصیب ہیں جنہیں حضورؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور آپؐ کی باتیں سننے کی سعادت حاصل ہوئی" میں نے کہا۔

"درست ہے۔ لیکن اللہ کا کرم دیکھو' اس نے اپنے روشن ہدایت نامے کو تمہارے لیے قیامت تک پوری درستی کے ساتھ محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا اور اللہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔ سو وہ روشن ہدایت نامہ تمہارے پاس ہے۔ اسے نہ پڑھو اور سمجھو تو یہ تمہاری بد عملی ہے۔ پھر سیرتِ طیبہ کا کون سا ایسا پہلو ہے' جو انسانوں کی نگاہ سے اوجھل ہے۔ حضور پاکؐ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ریکارڈ پر محفوظ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ گویا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ قرآن کے احکام پر عمل کیسے کیا جاتا ہے اور رہی محرومی کی بات تو اللہ اس محرومی کا تمہیں صلہ بھی دیتا ہے۔ ہر آگے بڑھتے ہوئے دور میں چھوٹی سی نیکی کا اجر بھی بیش از بیش ہوتا جاتا ہے۔ توفیق بھی بڑھادی گئی ہے۔"

"کچھ بھی ہو' وہ براہِ راست ہدایت کی بات تو نہیں آسکتی۔"

"یہ گمراہی کا جواز نہیں ہے۔ اپنے گناہوں کی اس طرح صفائی پیش نہیں کی جاسکتی۔"

میں کانپ کر رہ گیا "میرا یہ مطلب نہیں۔ میں تو بس ایک بات کہہ رہا ہوں۔"

"مگر میں بھی تو کچھ کہہ رہا ہوں" انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "اللہ نے عقل و دانش والوں کے لیے ہر چیز میں حق کی نشانیاں روزِ ازل سے ہی رکھ دی تھیں۔ جنہیں توفیق عطا ہوئی' انہوں نے تاریک ترین ادوار میں بھی ایک رب کو مانا اور اس کے آگے سر جھکایا۔ مگر اب تو اس نے رسالت اور ہدایت کے ذریعے عقل کو ایسی روشنی عطا کی ہے کہ بھٹکنے کی گنجائش ہی نہیں۔

"اور اللہ نے قرآن پاک میں سب کچھ کھول کھول کر بیان کردیا ہے۔ وہ کون سے جرائم تھے' جن کی پاداش میں اللہ کے پسندیدہ لوگ اس کے عتاب میں آئے اور راندۂ درگاہ ٹھہرے' یہ سب قرآن میں موجود ہے۔ تاکہ رسول کریمؐ کی امت ان اعمال سے بچی رہے اور وہ اعمال کیا تھے؟ بنی اسرائیل میں کچھ بنیادی خرابیاں تھیں' جنہیں وہ دور نہ کرسکے۔ پہلی بات یہ کہ وہ نافرمان تھے۔ وہ اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ اللہ نے جو قانون بنائے' انہوں نے توڑے۔ وہ کم ظرف تھے' اللہ نے ان پر جو انعام و اکرام کئے' انہوں نے انہیں مغرور اور بد دماغ کردیا۔ وہ ناشکری کرتے رہے۔ بجائے اس کے کہ شکر ادا کرتے۔ وہ اللہ' اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب پر ایمان لائے تو یوں جیسے کہ نعوذ باللہ انہوں نے احسان کیا ہو۔ پھر وہ سست' کاہل اور آرام طلب تھے۔ وہ تو اپنے لیے بھی کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اللہ کو وہ سرفروش پسند ہیں' جو اس کی راہ میں دامے' درمے' قولے' سخنے جہاد کریں' جن کے دل میں شوقِ شہادت ہو جبکہ ان سہل پسندوں کو جب بھی اللہ نے جنگ کا حکم دیا تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم اور خدا جاکر لڑو' ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ ہم کیوں لڑیں اور قتل ہوں جبکہ دشمن ہم سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جب اللہ سب کچھ کرسکتا ہے تو پھر ہمارے دشمنوں کو خود ہی زیر کیوں نہیں کردیتا۔ انہوں نے خدا کے اختیار کو صرف اس لیے مانا کہ اس طرح انہیں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے' بیٹھے بیٹھے تحفظ سمیت سب کچھ مل جائے گا۔ چنانچہ جب ان بدبختوں پر اللہ کا غضب ہوا تو وہ معزول کردیے گئے۔ اس کے بعد ان کی ذلت وخواری اور سرگردانی کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اللہ نے دکھادیا کہ یہ ہے سرکشوں اور نافرمانوں کا انجام۔

"تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اللہ نے تمہیں روشن عقل دی۔ ہدایت دی اور اس کی نشانیاں چپّے چپّے پر بکھری ہوئی ہیں۔ دیکھو' مشاہدہ کرو' سوچو اور انہیں پہچانو۔ ان سے نتائج اخذ کرو۔ کس کی کیا اہمیت ہے' اسے پہچانو.... اور اس اہمیت کے مطابق ہی اس کا خیال رکھو" یہ کہتے کہتے وہ چونکے۔ انہوں نے سر ایک طرف جھکایا' جیسے کوئی دور کی آواز سننے کی کوشش کررہے ہوں "اب میں چلتا ہوں" انہوں نے کہا۔ ان کے قدموں کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔

"لیکن ابھی تو میں کچھ سمجھا بھی نہیں ہوں" میں نے احتجاج

کیا۔ مجھے ان سے قدم ملا کر چلنے کے لیے اب تقریباً دوڑنا پڑ رہا تھا۔

"سب سمجھ جاؤ گے۔ میں کل یہیں سے ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑوں گا" بابا عصر نے کہا "بس اب جاؤ۔"

"مگر میں یہ سب بھول جاؤں گا" میں نے بلند آواز میں کہا کیونکہ میرے دوڑنے کے باوجود بابا عصر مجھ سے خاصا آگے جا چکے تھے۔

"تم کچھ نہیں بھولو گے" انہوں نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

لمحوں میں فاصلہ اتنا بڑھ گیا کہ اب چیخ کر بھی بات ان تک نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ بابا عصر تو ہوا کا جھونکا ہو گئے تھے۔ میں رک گیا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں ہانپ رہا ہوں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ حارث بن عثمان خاصا پیچھے تھے مگر ہموار قدموں سے اسی طرف آ رہے تھے۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

میں اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ چند لمحے بعد حارث مجھ سے آملے "بابا عصر کے ساتھ چلنا آسان نہیں ہے اور ان کے ساتھ اندھا دھند دوڑنا بھی ٹھیک نہیں۔ ایسا آدمی راستہ بھٹک بھی سکتا ہے" انہوں نے نرم لہجے میں کہا "آؤ... گھر چلیں۔"



میں نے کہانی مکمل کی اور سکون کی سانس لی۔ گھڑی دیکھی، سوا گیارہ بجے تھے۔ میں اس وقت بہت مطمئن تھا۔ سب کام ٹھیک ہو گئے تھے مگر میں اتنی جلدی سونے کا عادی نہیں تھا لہٰذا آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میں سوچتا رہا کہ اب کیا کروں؟

اچانک مجھے بابا عصر کا خیال آ گیا۔ میں نے سوچا کہ اب تک کی باتوں کو لکھ لوں۔ ابھی یاد تازہ ہے اس کے باوجود یہ کوئی آسان کام نہیں۔ کوئی اتنا سب کچھ کیسے یاد رکھ سکتا ہے اور ایک دن گزر گیا تو سب کچھ محو ہو جائے گا۔

میں نے پیڈ اپنی طرف کھینچا اور قلم کھولا۔ مجھے ڈر تھا کہ کچھ باتیں اب بھی رہ جائیں گی مگر قلم کھول کر پیڈ کی طرف جھکتے ہوئے جو کچھ ہوا، اس نے مجھے ڈرا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں تقسیم ہو گیا ہوں۔ میں کمرے میں بھی بیٹھا تھا..... اور میں ایک سڑک پر بابا عصر کے ساتھ چل بھی رہا تھا۔ حارث بن عثمان بھی میرے ساتھ تھے اور بابا عصر کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "پاکستان کی غیر معمولی اہمیت یہ ہے کہ اللہ نے اسے اہمیت دی ہے۔"

میرا قلم کاغذ پر چلنے لگا۔ وہ عجیب تجربہ تھا۔ میں بیک وقت دو جگہ تھا۔ حال کے اس لمحے میں بھی..... اور گزرے ہوئے ان لمحوں میں بھی۔ اور وہ تصور نہیں تھا کیونکہ میری ٹانگوں کو چلنے کا احساس بھی ہو رہا تھا اور تیز چلنے کی وجہ سے میری سانسیں بھی تیز ہو گئی تھیں اور وہ کوئی وڈیو فلم بھی نہیں تھی۔ وہ تو مکمل منظر تھا..... تین جہتوں کے ساتھ۔ بلکہ مجھے چوتھی جہت کی موجودگی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

میں لکھتا گیا..... اور لکھنے کے دوران میں مجھے یقین تھا کہ کہیں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔

میرا قلم رکا تو میں نے دیکھا کہ تقریباً دو صفحے بھر چکے ہیں۔ میں نے گھڑی دیکھی اور حیران رہ گیا۔ یہ سب کچھ میں نے صرف پندرہ منٹ میں لکھا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ ٹانگیں یوں دکھ رہی تھیں، جیسے میں میلوں دوڑ لگا کر آیا ہوں۔ پھر جماہی آئی تو اندازہ ہوا کہ مجھے نیند بھی آ رہی ہے۔ حالانکہ اتنی جلدی میں کبھی سوتا نہیں تھا۔

میں نے قلم بند کر کے رکھا۔ اسی وقت ناہید کمرے میں آ گئی۔ "چائے لاؤں، تمہارے لیے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں بھئی، مجھے تو نیند آ رہی ہے۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا "اتنی جلدی تم کب سوتے ہو؟" اس نے کہا پھر خود ہی بولی "اوہ..... کل رات کی نیند بھی تو ہو گی۔"

"ہاں..... یہی بات ہو گی" میں نے کہا پھر پوچھا "حارث بن عثمان کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ تو آتے ہی سو گئے تھے۔ میں نے دوسرے بیڈ روم میں انہیں سلا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں سونے کے لیے لیٹا تو ناہید نے پوچھا "سحری میں تمہیں جگاؤں یا نہیں؟"

"تم جانتی ہو، اب آنکھ کہاں کھلے گی؟"

ناہید نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔ جانتی تھی کہ مجھے جگانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

لیکن ہوا یہ کہ سحری میں، میں اس سے بھی پہلے جاگا۔ مجھے یاد ہے، میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ مجھے احساس ہوا تھا جیسے کسی نے سخت لہجے میں مجھے آواز دی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ناہید اور بچے سو رہے تھے، کمرے میں اندھیرا تھا۔

ایسے کبھی نیند اچٹ جائے تو میں دوبارہ لیٹتا ہوں اور فوراً ہی سو جاتا ہوں۔ اس روز بھی میں نے کوشش کی لیکن آنکھوں میں نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ تو رمضان کا مہینہ ہے..... اور یہ سحری کا وقت ہو گا۔ میں اٹھا اور بیڈ روم سے نکلا۔ لاؤنج میں روشنی کر کے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے پانچ بجے تھے۔ مجھے جھنجلاہٹ بھی ہوئی اور خود پر شرم بھی آئی۔ مجھے نہ انتہائے سحر کا وقت معلوم تھا، نہ افطار کا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ سحری تیار کرنے کے لیے ناہید کس وقت اٹھتی ہے۔

مجھے یاد آیا کہ کچن میں رمضان کے ٹائم ٹیبل والا کارڈ لٹکا ہوا ہے۔ میں نے جا کر اسے دیکھا اور پھر ناہید کو جگا دیا۔ اس بے چاری کو دہری حیرت کا سامنا کرنا پڑا "تم..... تم کیسے اٹھ گئے" اس نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس آنکھ کھل گئی۔ اور پھر سویا ہی نہیں گیا۔"

گھڑی دیکھ کر وہ اور حیران ہوئی "ٹھیک پونے پانچ بجے میں اٹھ

جاتی ہوں۔ آج آنکھ کیوں نہیں کھلی۔"

"میں جو جاگ گیا تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے دانت صاف کئے، منہ دھویا اور کچن میں چلی گئی۔ میں نے حارث بن عثمان کو جگانے کی غرض سے بڑی آہستگی سے دوسرے بیڈ روم کا دروازہ کھولا۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن وہ جاگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور انگلیاں تسبیح پر گردش کر رہی تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا "تم بھی جاگے ہوئے ہو۔"

"جی ہاں، خود بخود آنکھ کھل گئی۔"

"اسی کو خیر و برکت کہتے ہیں برخوردار آفاق۔ یہی اللہ کی تائید ہے" وہ بولے "فجر پڑھنے چلو گے نا؟"

"کیوں نہیں۔ انشاء اللہ ضرور چلوں گا۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

سحری کے بعد ہم گزشتہ روز کی طرح فجر پڑھنے گئے۔ حارث بن عثمان مسجد میں ہی رہ گئے۔ میں گھر آیا اور سو گیا۔



اس بار بھی میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ کوئی مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ میری بیوی ناہید تھی "کیا بات ہے؟ کیا دو بج گئے؟" میں نے بدمزگی سے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی تو نو بجے ہیں۔"

"تو اتنی جلدی کیوں اٹھایا مجھے۔ دفتر تو میں ظہر کے بعد ہی جاؤں گا۔"

"دفتر کے لیے تھوڑا ہی جگایا ہے۔ ادھر تو دیکھو..... یہ کیا ہے؟"

میں نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا۔ وہ نورانی اشرفیاں تھیں، جو سوتے میں میری جیب سے نکل کر بستر پر گر پڑی تھیں۔ ان پر ناہید کی نظر پڑ گئی تھی اس لیے اس نے مجھے جگایا تھا۔ میں نے دیکھا، اس وقت وہ عام سی اشرفیاں تھیں۔ ان کے اندر سے حروف غائب ہو گئے تھے۔ شاید اس لیے کہ میرا بستر نیچے تھا۔

"یہ اشرفیاں ہیں" میں نے سادگی سے کہا لیکن اشرفیوں کو اٹھایا نہیں۔

"بہت قیمتی لگتی ہیں۔ خالص اور بہت اچھی کوالٹی کا سونا ہے۔ تمہیں کہاں سے ملیں؟"

"کسی کی امانت ہیں" میں اسے ان کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا بلکہ دکھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سوچا تھا، چپکے سے کسی بھلے آدمی کو سونپ دوں گا مگر اب وہ انہیں دیکھ چکی تھی پھر بھی میں اسے بہلا سکتا تھا۔ اسی لیے اشرفیاں اس کی موجودگی میں اٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ ہاتھ میں آتے ہی حروف ظاہر ہو جائیں گے..... اور پھر اسے سب کچھ بتانا پڑے گا۔

"اتنی قیمتی امانت بھی کوئی رکھوا سکتا ہے" اس نے حیرت سے کہا اور بالکل اچانک ہی ہاتھ بڑھا کر دونوں اشرفیاں اٹھا لیں۔ اتنا اچانک کہ میں اسے روک بھی نہیں سکا اور اشرفیاں ہاتھ میں آتے ہی جو حروف چمکے تو وہ بوکھلا گئی۔ اشرفیاں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گریں اور گرنے سے پہلے ہی عام اشرفیاں بن گئیں۔

"یہ..... یہ کیا ہے؟"

اب اس سے کچھ چھپایا نہیں جا سکتا تھا چنانچہ میں نے اسے پورا ماجرا سنا دیا۔ شروع سے آخر تک۔ وہ حیران ہو کر سنتی رہی۔ پھر اس نے اس بار بڑے اعتماد اور احترام کے ساتھ ان اشرفیوں کو اٹھایا اور انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اس نے حروف پر انگلی بھی پھیری اور ایک لمحے کو حیران نظر آئی "یہ سونا تو نہیں ہو سکتا" اس نے بے حد یقین سے کہا "سونا شفاف نہیں ہوتا۔ جبکہ حروف صاف نظر آ رہے ہیں۔ حالانکہ اشرفی کے اندر ہیں۔"

"بھئی..... میں تو اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا" میں نے عاجزی سے کہا۔

"مگر میں دعوے سے کہتی ہوں کہ یہ سونے سے بہت زیادہ قیمتی کوئی دھات ہے۔"

"دھات ہی کیوں؟ ممکن ہے، کوئی اور مادہ ہو۔"

"وزن کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔"

"دھات شفاف کب ہوتی ہے" میں نے اعتراض کیا۔

وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی "پارہ بھی تو دھات ہے۔"

"مگر یہ کوئی نایاب قسم کا بلور..... یا اسی طرح کا کوئی پتھر بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"جو بھی ہے، یہ میں جانتی ہوں کہ ہے بہت قیمتی۔ اتنا قیمتی کہ اس کی قیمت ہمارے تصور سے بھی زیادہ ہو گی" اس نے کہا پھر بولی۔ "یہ بتاؤ، اب تم کیا کرو گے اس کا؟"

"کرنا کیا ہے۔ کسی بھلے آدمی کو سونپ دوں گا" میں نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"وہ تو امانت سونپو گے نا۔ میں تو اس کے بارے میں پوچھ رہی ہوں، جو تمہیں دی گئی ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی..... یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہونے لگی۔ ان اشرفیوں کو میرے پاس چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ لیکن میں نے اس انداز میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا۔ بلکہ میں نے تو مالیت کے حوالے سے بھی نہیں سوچا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ناہید نے ٹھیک کہا ہے۔ اس کی قیمت ہمارے تصور سے بھی زیادہ ہو گی۔ اتنی زیادہ بھی ہو سکتی ہے کہ کہانیوں کی طرح شہر کا سب سے بڑا جوہری بھی عاجزی سے کہے..... بھئی، اس کی قیمت تو میں اپنی دکان، اپنا محل اور تمام اثاثے بیچ کر بھی ادا نہیں کر سکتا۔ مگر یہاں تک سوچ کر ہی مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ اور زمانے کی بات تھی اور وہ بھی کہانیوں میں۔ جبکہ یہ اور دور تھا۔ آج کا جوہری تو کچھ اور ہی ہو گا۔ کہے گا..... میاں، یہ بس دیکھنے ہی دیکھنے کی ہے۔ ڈیکوریشن پیس سمجھ لو۔ سونا تو اس میں سرے سے نہیں ہے۔ کوئی نگ بھی نہیں ہے۔ پھر بھی خوب صورت ہے۔ ایک ہزار اس کے دے سکتا ہوں، مگر مجھے معلوم تھا کہ قیمت کیسے

بڑھے گی۔ میں کہوں گا، نہیں بھئی... مجھے یہ بیچنی ہی نہیں ہے۔ اس پر جوہری ہچکچانے کی اداکاری کرتے ہوئے گویا بولی بڑھائے گا۔ میں انکار کرتا رہوں گا.... اور وہ قیمت بڑھاتا رہے گا۔ وہ کہے گا.... بھئی پانچ لاکھ سے اوپر ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا۔

"نہیں بھئی، مجھے نہیں بیچنی...."

میرے تصور میں موجود جوہری اپنی پیشکش کو کروڑوں تک لے جاتا لیکن میں تصور میں اتنا کھو گیا تھا کہ میں نے یہ آخری مکالمہ بہ آوازِ بلند ادا کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری بیوی گڑبڑا گئی "یہ کیا کہہ رہے ہو، نہیں بیچو گے اسے؟"

میں چونکا۔ میرا تصور ٹوٹ گیا لیکن پھر بھی میں نے اسی رو میں جواب دیا "نہیں بیچوں گا۔"

"لیکن کیوں؟"

اس ایک لمحے میں میرے اندر یہ احساس ابھرا کہ میں نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ اشرفی بیچنے کی چیز نہیں اور اس احساس کے سامنے میری کیفیت سپردگی کی تھی۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ میں نے حتمی طور پر اس بات کا فیصلہ بھی کر لیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ بیوی کو قائل کرنے کے لیے بہت طاقت ور دلائل کی ضرورت ہوگی اور یہ امکان موجود تھا کہ اس کے باوجود وہ قائل نہیں ہوگی۔ تب مجھے اپنی ویٹو پاور استعمال کرنی ہوگی، جو خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنے پاس ہی رکھی تھی۔

مگر ایک لمحے میں میرے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔ دلائل اتنی تیزی سے ابھرے کہ میں حیران رہ گیا۔ میں نے سر اٹھا کر ناہید کو دیکھا، جو مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "بات سیدھی سی یہ ہے ناہید بیگم کہ اگر ایک اشرفی مجھے، میرے لیے نہ دی جاتی تو ابتدا ہی میں اس امانت پر میری نیت خراب ہو جاتی۔ میرے اندر کی مٹی میں پاسِ امانت اور دیانت داری کا کلّا صرف اس لیے پھوٹا کہ ایک اشرفی کی ملکیت کا احساس میرے ذہن میں تھا۔ یعنی ایک اچھی ترغیب موجود تھی۔"

ناہید بہت غور سے میری بات سن رہی تھی "یہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تمہاری جگہ میں ہوتی تو میرے ساتھ بھی یہی ہوتا۔ مگر اب نہیں بیچنے کی کیوں کہہ رہے ہو؟"

"اب صورتِ حال بدل جو گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"پاسِ امانت اور دیانت داری کا وہ کلّا پودا بن چکا ہے۔ مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا ہے۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ مقامِ شکر ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کفرانِ نعمت کیوں کر رہے ہو۔ جب ایک اشرفی تمہارے تصرف، تمہارے اختیار میں دے دی گئی...."

"یہی تو بات ہے۔ اسے میرے تصرف میں، میرے اختیار میں دیا گیا کہ چاہوں تو میں خود رکھ لوں۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ یعنی چاہوں تو کسی اور کو دے دوں۔"

"وہ تو ہے لیکن اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت سے منہ موڑنا کفرانِ نعمت ہے۔"

"میں کفرانِ نعمت نہیں کر رہا ہوں۔ میں اسے ممکنہ طور پر بہترین مصرف میں لا رہا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"ابھی میں نے کہا اور تم نے بھی تائید کی کہ اگر ایک اشرفی اپنے لیے نہ ملتی تو میں بے ایمان ہو جاتا۔ اب سوچو کہ صرف امانت والی اشرفی میں کسی اور کی طرف بڑھاؤں گا، یہ کہہ کر اسے وہ اشرفی کسی اور کی طرف بڑھانی ہے تو کیا وہ اس مسئلے سے دوچار نہیں ہوگا؟ کیا اس کی نیت خراب نہیں ہوگی؟ اس کا ایمان بہت بڑی اور سنگین آزمائش سے دوچار نہیں ہوگا؟"

"ہوتا رہے۔ یہ تمہارا دردِ سر تو نہیں ہے" ناہید نے بڑی بے رحمی سے کہا۔

"میں اس انداز میں نہیں سوچ سکتا" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "تم میری طرح نہیں سوچ سکتیں۔ یہ آزمائش تم پر نہیں آئی۔ تم خطرۂ ایمان سے دوچار نہیں ہوئیں۔ میں ہوا ہوں۔ مجھے تو اس شخص کی فکر کرنی چاہیے جو میری وجہ سے آزمائش میں پڑے گا۔ دو وجوہ کے تحت میرے لیے یہ کرنا ضروری ہے" میں نے گہری سانس لی "ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ دونوں اشرفیاں مجھے اس نظیر کے ساتھ پہنچی ہیں۔ حارث بن عثمان کو جس نے بھی یہ دی ہوں گی، اسی طرح دی ہوں گی مگر انہوں نے اپنے حصے کی اشرفی خود رکھنے کے بجائے میری طرف بڑھا دی اور یہ سلسلہ پیچھے سے اسی طرح چل رہا ہوگا تو مجھے بھی اس کی پیروی کرنی چاہیے۔"

"حارث بن عثمان دنیا دار آدمی نہیں ہیں" ناہید نے اعتراض کیا۔

"دنیا سامنے ہو اور آدمی دنیا دار نہ بنے.... موقع ملنے کے باوجود.... تو یہ تو بڑا اعزاز ہے۔ یہ اعزاز مجھے بھی مل رہا ہے۔"

"اب دوسری وجہ بھی بتا دو" ناہید نے خشک لہجے میں کہا۔

"دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ پاکستان کے استحکام اور خیر و برکت کی علامت ہیں۔ یہ اسلام کی سربلندی اور عظمت کی امین ہیں۔ ان کی منزل قومی خزانہ ہے۔ انہیں جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

"بھئی، تم نے کسی کو دی اور اس کی نیت خراب ہوئی تو یہ اس کے پاس رکے گی نہیں، واپس آجائے گی۔ اسے تو بہرحال اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔"

"تم ایک بات بھول گئیں" میں نے ملامت بھرے لہجے میں کہا "اس کا سفر جتنا مختصر ہو، جتنی جلدی پورا ہو، اتنا ہی اچھا ہے۔ سفر جتنا طویل ہوگا، ملک و قوم کو اتنی ہی سختی دیکھنی پڑے گی۔ میں تو چاہوں گا کہ میں جس پہلے آدمی کو یہ دوں، وہی امین ثابت ہو۔ میری تو دعا ہوگی کہ یہ کبھی کسی کے پاس سے واپس نہ آئے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں یہ اشرفی جسے دوں، اسے بے ایمانی کی ترغیب سے بچانے کا سامان بھی کروں۔"

"جسے بے ایمانی کرنی ہوگی، وہ دونوں اشرفیاں ہضم کرنے کی

کوشش کرے گا" ناہید نے منہ بنا کر کہا۔

"بہرحال ہمیں تو اتمام حجت کرنا چاہیے۔"

"تو تم یہ دونوں اشرفیاں آگے بڑھادو گے؟"

"ہاں..... اسی طرح، جیسے یہ میری طرف بڑھائی گئی ہیں" میں نے کہا اور اپنی بیوی کو غور سے دیکھا۔ وہ مایوس لگ رہی تھی۔

"مایوس کیوں ہو؟"

"یہ اشرفی ہمارے سارے دلدّر دور کرسکتی تھی" ناہید نے سوگوار لہجے میں کہا۔

میں مسکرادیا "اس نے تو ہمارے سارے دلدّر دور کردیے" میں نے کہا "تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"میں اس ڈیڑھ دن میں بہت کچھ سمجھ گیا ہوں بیگم۔ میں نے جان لیا ہے کہ مال و دولت سے دلدّر دور نہیں ہوتے۔ خیروبرکت اور اللہ کی تائید و نصرت سب سے بڑی چیز ہے۔ کل یہ اشرفی مجھے ملی اور جانتی ہو، اس کے بعد کیا کیا ہوا۔ میرا روزہ تھا۔ میں سگریٹ نہیں پی سکتا تھا مگر کل کہانی کا وہ پیچ ہی دور نہیں ہوا، زندگی میں پہلی بار میں نے بغیر سگریٹ پیے کام کیا..... اور بہت اچھا کام کیا۔ میں نے کہانی مکمل کرلی۔ آج انشاءاللہ مجھے پیسے مل جائیں گے اور ہماری عید کا سامان بھی ہو جائے گا۔"

وہ اچھل پڑی "کہانی مکمل کرلی تم نے؟"

"جی ہاں جناب!" میں نے اسے دیکھا۔ مایوسی دور ہوگئی تھی اور اس کی آنکھوں میں خوشی اور امید کے دیے جھلملا رہے تھے۔

"یہ تو ایک پہلو ہے خیروبرکت کا۔ دوسرا تم دیکھ چکی ہو، ہماری ضرورت کی تمام چیزیں کیسے بن مانگے عزت کے ساتھ مل گئیں ہمیں۔"

وہ یک لخت خوش ہوگئی، مسکرانے لگی "ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ میں سمجھ گئی۔ خیروبرکت کے ایک اور اشارے کا تو تمہیں علم ہی نہیں ہے۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیا مطلب ہے؟"

"راشن ختم ہو رہا تھا نا۔ میرا اندازہ تھا کہ آج سحری تک بھی شاید نہ چل سکے لیکن مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ ابھی تک نیا سامان کھولنے کی نوبت نہیں آئی ہے اور آج تو آئے گی بھی نہیں۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے، کل کی سحری بھی اس سے ہو جائے گی۔ واقعی..... یہ تو حیرت انگیز برکت ہے" یہ کہتے کہتے وہ رونے لگی۔

میں نے اسے لپٹالیا اور تھپکنے لگا "روتی کیوں ہو پگلی، بیگم!"

"رونے کی بات ہے۔ میں تو خیروبرکت کو تم سے زیادہ سمجھتی تھی مگر مجھے یہ کیا ہوگیا۔ حالات آدمی کو یوں خراب بھی کردیتے ہیں" وہ شرمندگی سے بولی۔

"اللہ مدد نہ کرے تو آزمائش سے کوئی سرخروئی کے ساتھ نہیں گزر سکتا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی "تم نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے۔ یہ اشرفی کوئی دنیاوی چیز نہیں۔ یہ تو اللہ کی بارگاہ سے پیش ہونے والا ٹھیک ہے۔ تم انہیں جلد از جلد آگے بڑھادو۔ تم بہت اچھے ہو۔"

"سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ہاں سنو....." میں نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا "میں ابھی اور کچھ دیر سوؤں گا۔ ظہر کے بعد دفتر جاؤں گا۔ تم کپڑے تیار رکھنا۔"

"بہت بہتر جناب!" وہ مسکرادی۔ شرمندگی کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی وہ مسکراہٹ مجھے بہت اچھی لگی۔

○☆○

اس روز دفتر جاتے ہوئے میں ہر شخص کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ورنہ عام طور پر سفر کے دوران میں اپنی سوچوں، اپنے خیالوں میں کھویا رہتا ہوں۔ مگر اس روز مجھے ایک ایسے اہل شخص کی جستجو تھی، جسے میں وہ بے حد اہم امانت سونپ سکوں۔

منی بس میں مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ مجھے گھورتا پاکر کچھ لوگ جواباً مجھے گھورنے لگے۔ مجھے اپنی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی۔ میں نے نظریں جھکالیں۔

دفتر تک کے پیدل راستے میں بھی میں اپنی جستجو میں لگا رہا مگر کہیں دل نہیں ٹھکا۔ یہاں تک کہ میں دفتر پہنچ گیا۔ کہانی دے کر معاوضہ وصول کرنا ذرا وقت طلب کام تھا۔ میں اس دوران میں حارث بن عثمان کی باتیں یاد کرتا رہا۔ ان کی ایک بات مجھے بہت اہم لگی۔ انہوں نے کہا تھا..... پاکستان کے عام، غریب لوگ بے ایمان نہیں۔ گویا بہتر یہی تھا کہ میں وہ امانت کسی غریب آدمی کے

سپرد کردوں۔

میں دفتر سے نکلا تو بہت خوش تھا۔ میری جیب میں معقول رقم تھی۔ دکان والے کو ادائیگی کرنے کے بعد بھی، ناہید اپنے اور بچوں کے لیے عید کے کپڑے اور ضروری چیزیں خرید سکتی تھی۔ عیدی وغیرہ بھی نمٹ سکتی تھی۔ سو میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ اس خوشی میں مجھے اشرفیاں یاد ہی نہیں رہیں۔ اپنی ذمے داری اور جستجو کا بھی مجھے خیال نہیں آیا۔

عصر کی اذان کی آواز سنائی دی تو میرے قدم خود بخود راستے میں نظر آنے والی مسجد کی طرف اٹھ گئے۔ اس پر مجھے خود بھی حیرت ہوئی۔ پہلے میں اذان سنتے ہوئے گزر جاتا تھا۔ نماز کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اذان کی آواز میں سن کر بھی نہیں سنتا تھا۔

عصر پڑھ کر میں مسجد سے نکلا تو اور مطمئن تھا۔ سکون کا سمندر تھا جو میرے اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پہلی بار مجھے پتا چلا تھا کہ باطن کی حقیقی طمانیت کیا ہوتی ہے۔ ایک عجیب سی سرشاری تھی۔

چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ جیب میں پیسے ہیں تو افطار کے لیے پھل اور بچوں کے لیے کچھ پسندیدہ چیزیں بھی لے لی جائیں۔ مگر میں نے سوچا کہ میرا افطار تک گھر پہنچنا مشکل بھی ہے۔ ایسے میں حارث بن عثمان کا خیال آگیا۔ وہ بھی تو آئیں گے۔ کتنی بری بات ہوگی کہ میں گھر میں موجود نہیں ہوں گا۔ بس اسی لمحے میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں گھر ٹیکسی میں جاؤں گا..... اور انشاء اللہ افطار سے خاصا پہلے گھر پہنچ جاؤں گا۔

میں بازار کی طرف نکل لیا۔ میں نے پھل خریدے۔ پھر بچوں کے لیے مکھن، پنیر اور چند دوسری چیزیں خریدیں۔ یہ سامان اٹھائے میں ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا کہ مجھے وہ اندھا فقیر نظر آیا..... اور اس کے ساتھ ہی مجھے وہ اشرفیاں یاد آگئیں۔ میں نے سوچا، اس بھکاری سے زیادہ کوئی کیا غریب ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ یہ امانت اسے سونپ دوں۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔

یہ سوچ کر میں اس اندھے بھکاری کی طرف بڑھ گیا...



میں گھر پہنچا تو بہت افسردہ اور دل گرفتہ تھا۔ پہلے ہی قدم پر مجھے احساس ہوگیا تھا کہ ذمے داری بہت بڑی ہے۔ پہلا تجربہ ہی بے حد ناخوش گوار تھا۔

لیکن گھر پہنچتے ہی بچوں کی خوشی دیکھ کر سب کوفت دور ہوگئی۔ میں ان کی خوشی میں ایسا خوش ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔ پھر جب میں نے تگڑی رقم ناہید کے ہاتھ پر رکھی تو اس کی آنکھوں میں شکر اور خوشی کے آنسو دیکھنا بھی بہت بڑی طمانیت کا سبب تھا۔ "تم انہیں جس طرح چاہو خرچ کرسکتی ہو۔ دکان والے کے پیسے میں دے آیا ہوں" میں نے ناہید سے کہا "اب تو عید ہوجائے گی نا؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

اس شام افطار کے وقت ہمارا دستر خوان اللہ کے فضل و کرم سے بے حد کشادہ تھا مگر ہم سب بے چین تھے اور سب کی بے چینی کا سبب ایک ہی تھا۔ حارث بن عثمان ابھی تک نہیں آئے تھے۔ میں بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ماموں ابھی تک نہیں آئے؟" میرے بڑے بیٹے عبید نے کہا۔

"آجائیں گے بیٹے" ناہید نے اسے تسلی دی۔ مجھے حیرت ہونے لگی۔ انسان کو انسان سے کتنی جلدی انسیت ہوجاتی ہے۔

گھڑی کی سوئیاں حرکت کرتی رہیں۔ اب مجھے لگ رہا تھا کہ حارث نہیں آئیں گے۔ ممکن ہے انہوں نے صرف ایک دن کے لیے ہامی بھری ہو لیکن نہیں، مجھے خوب یاد تھا۔ انہوں نے عید کے دن تک ہمارے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا۔

اب افطار میں صرف ایک منٹ رہ گیا تھا۔ اچانک اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر حارث بن عثمان ہی تھے۔ انہوں نے بلند آواز میں سلام کیا۔ ان کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک تھیلی تھی "معاف کرنا بچو، مجھے دیر ہوگئی لیکن میں تمہارے لیے جلیبیاں لایا ہوں۔ دکان پر رش بہت تھا۔"

"واہ..... ماموں جلیبیاں لائے ہیں" عزیر خوشی سے چلّایا۔

ناہید کچن سے پلیٹ لائی۔ جلیبیاں اس میں رکھ دی گئیں۔ اسی وقت مغرب کی اذان شروع ہوگئی۔ افطار کا وقت ہوگیا تھا۔



میں اور حارث عشا اور تراویح پڑھ کر مسجد سے نکلے۔ چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ بابا عصر نے ہمیں آلیا "ہاں برخوردار آفاق..... میں کیا کہہ رہا تھا؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ ابھی ابھی آئے ہیں بابا عصر!" میں نے بوکھلا کر کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرائے "میں کل کی بات کررہا ہوں۔"

"یہ تو یاد نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے تھے لیکن میں نے وہ سب لکھ لیا ہے۔"

"اسے چھوڑو۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے تم کو پاکستان کی اہمیت کے متعلق بتانا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ نے حق کی نشانیاں چپّے چپّے پر بکھیری ہوئی ہیں اور اس نے اپنی ہدایت سے عقل کو روشنی دی ہے۔ سو خوش نصیبوں کو چاہیے کہ گردوپیش کو دیکھتے رہیں، تجسس سے مشاہدہ کرتے رہیں تاکہ نشانیوں کو دیکھیں اور انہیں سمجھیں۔"

"جی ہاں، یہ میں سمجھ گیا۔"

"سمجھ گئے تو اب دیکھو اور بتاؤ، پاکستان کی اہمیت کیا ہے؟"

"پاکستان کی اہمیت یہ ہے کہ اللہ نے اسے اہمیت دی" میں نے انہی کا کہا ہوا دہرادیا۔

"اور یہ نتیجہ کیسے نکالا ہم نے؟"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ "ہم" کہہ رہے تھے۔

"یہ..... یہ تو آپ ہی بتائیے۔"

"پاکستان کی تخلیق کے لیے اس نے بہت مبارک دن منتخب

کیا۔ ۲۷ رمضان.... شبِ قدر۔ کیا یہ اس کی اہمیت کی دلیل نہیں۔ وہ کوئی اور دن بھی تو ہو سکتا تھا' یہی کیوں؟ وہ رات کہ جس میں قرآن پاک نازل فرمایا گیا۔ اس سے بابرکت کوئی رات ہو سکتی ہے؟"

"جی' بے شک" میں نے پوری سچائی سے کہا۔

"اب اور دلیلیں دو" بابا پھر بولے۔

میں سوچتا رہا۔ ذہن نے اچانک ہی کام کرنا شروع کردیا تھا۔ "پاکستان کا قائم رہنا' آپ کی اس بات کی دلیل ہے" میں نے کہا۔

"وضاحت کرو۔"

"کیا اپنے کیا پرائے' کیا دوست کیا دشمن' کیا محبت کرنے والے کیا نفرت کرنے والے' سبھی اس کے درپے رہے لیکن یہ خدا کے فضل سے قائم ہے اور انشاء اللہ قائم رہے گا۔"

"اس کی بھی وضاحت کرو۔"

اس وقت بابا عصر مجھے کوئی سخت گیر کلاس ٹیچر لگے لیکن میں بھی اس وقت کلاس کا سب سے ہونہار طالب علم بنا ہوا تھا۔ دماغ جیسے روشن ہو رہا تھا "تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کسی فارمولے کے تحت ہوئی تھی اور ہوئی" میں نے گہری سانس لے کر کہا "بظاہر فارمولا یہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی' وہ پاکستان میں شامل ہوں گے لیکن اصل فارمولا کچھ اور تھا اسی لیے بہت سے مسلمانوں کے اکثریتی علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوئے۔ آزاد ریاستوں میں حیدر آباد دکن کو بھارت نے بزور ہڑپ کرلیا اور کشمیر آج تک ایک حل طلب مسئلہ بنا ہوا ہے۔ حالانکہ درحقیقت وہ تنازع ہے ہی نہیں۔ ضرورت صرف رائے شماری کی ہے۔"

"تو یہ بھی بتاؤ کہ تقسیم ہند کس بنیاد پر کی گئی اور تشکیلِ پاکستان کس فارمولے کے تحت ہوئی؟"

"تقسیم ہند اس تصور کے تحت کی گئی کہ بالآخر پاکستان کو ختم ہوجانا یعنی خدانخواستہ بھارت میں دوبارہ ضم ہوجانا ہے۔ تشکیلِ پاکستان کا فارمولا یہ تھا کہ پاکستان کو ان علاقوں سے محروم کردیا جائے جو وسائل سے مالا مال ہیں' جو اس کی طاقت اور استحکام کا سبب بن سکتے ہیں۔ پاکستان کو وہ علاقے دیے جائیں جہاں مسائل کی بھرمار ہو.... اور جو وسائل سے محروم اور پس ماندہ ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ زمین اور رقبے سے قطع نظر بھارت اور پاکستان کے درمیان جو وسائل کی تقسیم ہوئی' وہ سفاکی کی حد تک غیر منصفانہ تھی۔ پاکستان کو جو فوجی ساز و سامان ملا اس کے مطابق پاکستانی فوج کو دنیا کی پس ماندہ ترین فوج ہونا تھا۔ پاکستان میں اقتصادی ڈھانچا سرے سے تھا ہی نہیں۔ صنعت کا وجود ہی نہیں تھا۔ بیشتر بڑے تعلیمی ادارے بھارت میں تھے۔ پھر ستم یہ کہ پاکستان کو جو بہت تھوڑے وسائل ملے' وہ بھی بکھرے ہوئے اور غیر منظم تھے۔ جبکہ بھارت کو جو ملا وہ قائم اور منظم تھا۔ وہاں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر مسلمانوں کی ہجرت نے بوجھ ہلکا کرکے انہیں اور مستحکم کردیا جبکہ یہاں بکھرے ہوئے تنکے تھے' جنہیں جمع کرکے آشیانہ بنانا تھا۔ بھارت سیٹ تھا اور پاکستان اپ سیٹ۔ پٹ سن کی پیداوار مشرقی پاکستان میں ہوتی تھی اور اس کی تمام فیکٹریاں مغربی بنگال میں تھیں یعنی پاکستان مجبور تھا کہ اپنی خام پیداوار کوڑیوں کے مول بھارت کو دے جو اس کے ذریعے مصنوعات بنا کر برآمد کرکے بھاری زرمبادلہ کمائے اور مزید مستحکم ہو۔ مختصر یہ کہ سب کچھ برعکس تھا۔ پاکستان کو ابتری ملی تھی اور بھارت کو استحکام۔ پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک نئی نوزائیدہ مملکت کی حیثیت میں ابھرا تھا۔ جبکہ بھارت دنیا کے نقشے پر ہمیشہ سے موجود ایک بڑا ملک تھا جو بس آزاد ہوا تھا' قائم بہت پہلے سے تھا۔"

"بہت خوب!" بابا عصر نے چلتے چلتے مجھے ستائشی نظروں سے دیکھا "سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ورنہ تم لوگ سب کچھ سمجھ سکتے ہو۔ کیونکہ تمہارے اندر گہرائی میں ہر چیز کی آگہی موجود ہے۔ اچھا' یہ بتاؤ کہ یہ سب کرنے کا مقصد کیا تھا؟"

"اکھنڈ بھارت" میں نے بلا جھجک کہا "ہندو یہ گوارا کرہی نہیں سکتا تھا کہ بھارت کی سرزمین پر پاکستان بنے۔ اسے تو مسلمانوں سے اپنی ذلت کا حساب لینا تھا۔ باہر سے آنے والے مٹھی بھر مسلمان اتنے بڑے ملک پر چھاگئے تھے۔ اتنی بھاری اکثریت پر غالب آگئے تھے۔ انہوں نے صدیوں اس بھاری اکثریت پر حکمرانی کی۔ بھاری اکثریت صدیوں محکوم رہی.... اور وہ

بھی ہنسی خوشی۔ ہندوؤں کے اکابرین نے سمجھ لیا کہ اگر ہندو مسلمان نہ ہوئے ہوتے تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ ان کے انتقام کے منصوبے کا یہ حصہ تھا کہ تمام مسلمانوں کو جو پہلے ہندو تھے' ہندو مت کی طرف واپس لانا ہے..... انہیں شدھی کرکے۔ ذلیل کرکے... اور ذلیل کرتے رہنا ہے۔ انہیں صدیوں کی محکومی کا قرض چکانا تھا۔ لیکن کچھ مصلحتوں کی وجہ سے انہیں تقسیم پر آمادہ ہونا پڑا۔ پاکستان کو انہوں نے زہر کے گھونٹ کی طرح حلق سے اتارا لیکن انہوں نے انسانی عقل کی حد تک اسے جلد از جلد اگلنے کی ہر ممکن تدبیر بھی کرلی تھی۔ ان کے خیال میں یہ نوزائیدہ ملک فاختہ کی طرح تھا جس کی گھات میں وہ شکرے کی طرح تھے۔ بس وہ یہ بھول گئے کہ وہ شکرا نہیں' گِدھ ہیں..... مردار خور گدھ جو زندہ کو شکار کرہی نہیں سکتا۔

"پاکستان کی تشکیل میں ہندوؤں نے اپنی سب عیاریاں آزما ڈالیں۔ ان کا اندازہ تھا کہ یہ مملکت اپنی بے سروسامانی اور ابتری کے سبب سے بہت تھوڑے عرصے میں خود ان کے قدموں میں آگرے گی لیکن وہ جذبے کی اہمیت اور طاقت سے ناواقف تھے۔ پاکستان میں رہنے والے اتنی تیزی سے پاکستانی قوم بنے اور ان میں اتنی شدت سے جذبۂ تعمیر ابھرا کہ دیکھتے ہی دیکھتے تنکے ایک خوب صورت اور پُرسکون آشیانے کی صورت اختیار کرنے لگے۔ ہندو قیادت کو اندازہ ہوگیا کہ یہ مملکت خود زیر ہونے والی نہیں۔ بہرحال تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ ان کے پاس بھاری اور منظم فوجی طاقت تھی۔ انہوں نے سوچا کہ بزور اکھنڈ بھارت بنادیں گے مگر پہلے چیک کرنا ضروری تھا۔ اپنی طاقت اور پاکستان کی کمزوری کی پیمائش کے لیے ان کے پاس آلہ موجود تھا..... کشمیر۔ انہوں نے وہاں جارحیت کی لیکن جو نتیجہ نکلا' اس نے انہیں حیران کردیا۔ ایک مرحلے پر تو ایسی صورتِ حال تھی کہ کشمیر کا مسئلہ ختم ہونے کو تھا چنانچہ بوکھلایا ہوا نہرو بھاگا اور امریکا کی گود میں بیٹھ کر فریاد کرنے لگا۔ امریکا نے اس کے حق میں تصفیہ کرادیا۔ اکھنڈ بھارت کا خواب تو دھرا رہ گیا۔ اپنا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا..."

"بس..... آج کے لیے اتنا کافی ہے" بابا عصر نے کہا "اب مجھے جانا ہے لیکن ایک کام اور ہے۔ اشرفی کے سفر کا ایک مرحلہ میں تمہیں سناؤں گا اور تم اسے لکھو گے۔"

مجھے بہت حیرت ہوئی "میں تو وہ ویسے بھی لکھ سکتا ہوں' میں اس کا مرکزی کردار ہوں۔"

"لیکن بہت کچھ ایسا ہے جو تمہیں بھی معلوم نہیں۔ ویسے بھی اشرفی کا سفرنامہ آخر تک میں ہی بیان کروں گا۔"

"ٹھیک ہے بابا عصر۔"

اس کے بعد بابا عصر بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔ حیرت سے میری آنکھیں پھیلتی گئیں' آخر میں بابا عصر نے کہا "یاد رکھو' سود کا لین دین یہود کی بیماری ہے۔ جبکہ اللہ اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔ مگر اللہ کے سختی سے حکم دینے کے باوجود یہود نے اسے ترک نہیں کیا۔ یہ ان کی معزولی کے اسباب میں سے ایک ہے۔"

"جی۔ میں سمجھ گیا۔"

"اور مسلمانوں کی وضع قطع' ان کا طرزِ زندگی و بود و باش' ان کا کردار' ان کے اعمال..... سب کچھ مسلمانوں کا سا ہونا چاہیے۔ ویسا جیسا اللہ چاہتا ہے۔ ان کو کسی بھی اعتبار سے کفار سے یا یہود و نصاریٰ سے مشابہ نہیں ہونا چاہیے۔ مشابہت پیدا کی تو نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلے گا۔ اچھا..... اب میں چلتا ہوں۔"

میں بابا عصر کو نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ یہ آخری بات بہت اچھی طرح میری سمجھ میں آگئی تھی۔

○☆○

اس رات میں اشرفی کا سفر لکھنے بیٹھا۔ اس بار بھی وہی ہوا۔ میں اپنی اسٹڈی میں بھی تھا اور اس فٹ پاتھ پر بھی۔ بابا عصر کی آواز بھی مجھے سنائی دے رہی تھی اور ایک اور..... بے حد انوکھا تجربہ بھی ہوا۔ میں جیسے اس اندھے فقیر کو آرپار بھی دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی سوچیں' اس کے خیالات پڑھ سکتا تھا۔

میں نے لکھنا شروع کردیا....

○☆○

وہ بس نام کا فقیر تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بھکاری تھا۔ اسے شکایت یہ تھی کہ اس کا نام کوئی ٹھیک سے نہیں لیتا۔ اسے سب فقیرا کہتے تھے حتیٰ کہ گھر میں بیوی بھی اسے او فقیرے کہہ کر بلاتی تھی' فقیرے کو او' پر اور بیوی کے طرزِ تخاطب پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کا تو وہ عادی تھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بھیک مانگنے والے کو آپ جناب کہہ کر لاکھوں میں کوئی ایک ہی مخاطب کرتا ہے اور وہ بے چارہ اپنی ہی عزت کھو بیٹھتا ہے۔ فقیرے کو بس یہ آرزو تھی کہ کوئی اسے..... سن بھئی فقیر حسین..... کہہ کر پکارے لیکن اس سلسلے میں اس کا زور اپنی بیوی پر بھی نہیں چلتا تھا۔

فقیرا ان دنوں کچھ پریشان تھا۔ رمضان گزرا جارہا تھا۔ آج ۲۸ واں روزہ تھا۔ مگر یہ پورا مہینہ بڑا مندا گیا تھا۔ گزشتہ روز اس نے حساب لگایا تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس رمضان میں یومیہ کمائی کا اوسط بمشکل ۱۲۰۰ روپے بنتا تھا۔ جبکہ عام دنوں میں بھی اس کا دھندا کبھی تین ہزار روپے روز سے کم نہیں ہوتا تھا۔ پچھلے رمضان میں تو اس نے دو لاکھ سے اوپر پیٹا تھا۔ مگر اس بار تو حد ہی ہوگئی تھی۔ رمضان کا گراف عام مہینوں سے بھی نیچے آگیا تھا۔ پتا نہیں' کیا ہوتا جارہا ہے اس دور کے مسلمانوں کو۔ فقیرے نے نہایت دکھ سے سوچا۔ اب تو خیرات اور زکوٰۃ سے بھی دور ہوتے جارہے ہیں۔

"کیا حال ہے بے فقیرے؟"

کانسٹیبل مولاداد کی آواز نے اسے چونکادیا۔ اس نے سر اٹھا کر ناپسندیدہ نظروں سے مولاداد کو دیکھا "تو عصر مغرب کے درمیان اپنا چہرہ نہ کرایا کر مجھے" اس نے بہت بدمزگی سے کہا "یہ وہ وقت ہوتا ہے جب تیرے چہرے پر پھٹکار اور نحوست کی حد ہوجاتی ہے۔ ایسے میں تیری صورت دیکھ کر اپنا تو دھندا ہی چوپٹ ہوجاتا ہے۔"

مولا داد نے اس کی بات کا مطلق برا نہیں مانا۔ تھانے میں جانے والے بھتے کے علاوہ بھی وہ اسے روز دس بیس روپے دے دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی حلیمی سے کہا "میں پوچھ رہا ہوں، کیا حال ہے تیرا؟ دھندا کیسا چل رہا ہے فقیرے؟"

"دھندا!" فقیرے نے دل دوز آہ بھر کے کہا "اس بار تو رمضان میں فاقے کر رہا ہوں۔"

مولا داد بدتمیزی سے ہنسنے لگا "واہ.... کیا بات کہی ہے فقیرے۔ رمضان میں فاقے۔ کتنا بدنصیب ہے تو۔ ابے روزہ ہی رکھ لیا کر" پھر اس نے فقیرے کے تیور بدلتے دیکھے تو جلدی سے موضوع بدلا۔ "یہ بتا، تجھے اس وقت میرے چہرے پر پھٹکار کیوں نظر آتی ہے؟"

فقیرے نے اس کے ہاتھ میں موجود شاپنگ بیگ کو نفرت سے دیکھا، جس میں سے دنیا بھر کے پھل نکلے پڑ رہے تھے۔ "یہ جو تو بھتے کے علاوہ افطار وصول کرتا ہے، غریب پھل فروشوں سے تو پھٹکار اور نحوست تو برسے گی ہی۔"

"ایس ایچ او کا حکم ہے، میں کیا کروں۔ اور یہ پھل تو اس سے بھی آگے بڑے بڑے افسروں کو جاتے ہیں" مولا داد نے شرمندگی سے کہا "مجھے تو مشکل سے ایک کھجور اور ایک کیلا ملتا ہے اور کبھی کبھی تو کیلا ملتا ہی نہیں۔"

"اچھا چل، اب آگے بڑھ۔" فقیرے نے اسے ڈپٹا "زیادہ نحوست نہ پھیلا دھندے کے ٹیم۔"

مولا داد ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ فقیرا صدا لگانے ہی والا تھا کہ تیرا اس کے پاس آبیٹھا۔ وہ فقیرے کا بیٹا تھا۔ نام اس کا تنویر تھا لیکن پیار میں اسے تیرا کہا جاتا تھا۔ "تو یہاں کیا کر رہا ہے بیٹے!" فقیرے نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"دھندا نہیں ہے ابا۔ میں بور ہو کر تمہارے پاس چلا آیا۔ بس میں دھکے کھانا اچھا نہیں لگتا۔ تمہارے ساتھ ہی گھر چلوں گا گاڑی میں۔"

فقیرے کا موڈ آف ہو گیا "ابے دھندا نہیں ہے تو کیا ہوا۔ ٹھیے پر بیٹھے گا تو مستقبل بنے گا۔ یوں بھاگنے سے تو دھندا اور خراب ہو گا۔"

"میرا دل نہیں لگتا ابا۔ پتا ہے، دن بھر میں چار سو روپے بھی نہیں ملے۔ اس سے زیادہ تو میں تم سے جیب خرچ لے لیتا تھا" تیرے نے شاکی لہجے میں کہا۔

"اب پتا چلا کہ آپ کمائی اور باپ کمائی میں کتنا فرق ہے" فقیرے نے کہا اور تنقیدی نظروں سے بیٹے کو دیکھا "اور یہ تیرے ہاتھ کو کیا ہوا؟"

تیرا بوکھلا کر اپنے ہاتھ ٹٹولنے لگا "کچھ نہیں ابا، ٹھیک تو ہے۔"

"ابے الو کے پٹھے! یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ یہ ٹھیک کیوں ہے۔ اسے موڑ جلدی سے، ٹنڈا بن فٹافٹ۔"

"ابا، اس وقت میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔" تیرے نے برا مانتے ہوئے کہا "میں آف کر کے آیا ہوں۔"

"دیکھ، ابھی تو اپرنٹس ہے۔ ڈیوٹی پر ہو یا نہ ہو، ڈیوٹی ٹائم تک گیٹ اپ خراب نہ کیا کر" فقیرے نے سمجھایا "اب تو اسی طرح یہاں بیٹھے گا تو میرا دھندا بھی خراب ہو گا۔"

تیرے نے سعادت مندی سے باپ کے بتائے ہوئے طریقے پر ہاتھ کو بل دیا اور ٹنڈا بن گیا۔

فقیرے نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ خوش تھا کہ بیٹے سعادت مند ملے ہیں۔ اس کے تین بیٹے تھے، تعلیم مکمل کرانے کے بعد اس نے تینوں کے لیے ٹھیے خرید کر انہیں دھندے پر بٹھا دیا تھا۔ انہوں نے تھوڑا سا احتجاج کیا تھا کہ اتنی دولت ہوتے ہوئے وہ بھیک کیوں مانگیں۔ اس پر فقیرے نے ڈپٹ کر کہا تھا "یہ دولت بھیک ہی کے دم سے ہے۔"

"مگر اب ہے تو بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟" بڑے بیٹے نے اعتراض کیا۔

"دولت آتی مشکل سے ہے اور جاتی آسانی سے ہے۔ جنہیں کمانا نہیں آتا، وہ تو برسوں کی کمائی ہوئی دولت دنوں میں اڑا دیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ میری زندگی میں ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔"

"لیکن ابا، ہم پڑھے لکھے ہیں" منجھلا بیٹا بولا۔

"بھیک کے پیسوں سے ہی پڑھے ہو" فقیرے نے تیز لہجے میں کہا "اس سے اچھا دھندا نہیں ملے گا تمہیں۔"

"ہم یہ کام نہیں کر سکتے" تینوں بیٹوں نے بیک آواز کہا۔

"تو نہ کرو۔ کل سے جیب خرچ بھی بند اور گھر میں کھانا بھی نہیں پکے گا۔ بھوکے مرو گے تو دماغ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور لڑکوں کا دماغ فوراً ہی ٹھیک ہو گیا۔ لیکن بڑے بیٹے نے کہا۔ "کوئی بات نہیں ابا۔ تمہاری زندگی میں نہ سہی، تمہارے مرنے کے بعد سب کچھ ہمارا ہو گا۔ ہم اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں گے۔"

فقیرا اس کی روک تھام پہلے ہی کر چکا تھا۔ بلکہ وہ تو یہ بھی جانتا تھا کہ لڑکے اس مقصد کے حصول کے لیے اس کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "ایسا نہیں ہو گا۔ میں وصیت نامہ لکھوا چکا ہوں۔ میرے مرنے کے بعد بھی یہ سب کچھ تمہارا نہیں ہو گا۔ ہاں، میری موت کے بعد جو دس سال تک ہر روز بلاناغہ دوپہر بارہ بجے سے رات آٹھ بجے تک یہ دھندا کرے گا، وہ میری دولت کا حق دار ہو گا۔ تم تینوں نے یہ شرط پوری کر دی تو میری تمام دولت تینوں میں تقسیم ہو جائے گی ورنہ شہر بھر کے تمام بھکاریوں میں تقسیم ہو جائے گی۔"

لڑکوں کے سارے کس بل نکل گئے اور وہ تیر کی طرح سیدھے ہو گئے۔ فقیرا جانتا تھا کہ کروڑوں کی دولت چھوڑنے کا حوصلہ کسی میں بھی نہیں۔

"ابا.... مجھے ایک بائیک ہی دلا دو۔"

تیرے کی فرمائش فقیرے کو حال میں واپس لے آئی۔ اس نے بیٹے کو غور سے دیکھا "تو اپنی کمائی سے ہیلی کاپٹر خرید لے بیٹے، اور اس میں دھندے پر آیا کر اور گھر جایا کر۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں

ہو گا" اس نے بے حد شفقت سے کہا "لیکن مجھ سے سائیکل کی امید بھی نہ رکھ۔ اچھا' اب چپ ہو جا' کوئی دیالو آرہا ہے" اس نے آہٹ کی سمت دیکھا تو اسے وہ شخص آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں دو شاپنگ بیگ تھے جن میں پھل اور دوسری چیزیں تھیں۔

فقیرے نے تیزی سے اپنی آنکھوں میں بے نوری کا تاثر ابھارا "اے داتا' اندھے فقیر کو کچھ دے دے۔ دو روز سے بے سحری اور افطار کے ہوں۔"

تیرا دل میں اُش اُش کر اٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ ابا سچا ہے بلکہ یہ انڈر اسٹیٹ مینٹ تھا۔ ابا ۲۸ سحریوں اور ۲۷ افطار سے محروم تھا۔ اس لیے کہ سحری میں وہ اٹھتا نہیں تھا اور افطار کے وقت گھر کے راستے میں ہوتا تھا۔ مگر وہ دعویٰ دو روز کا کر رہا تھا۔ تیرے کا دل بھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ جیب میں جو کچھ ہے' ابا کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دے۔

آنے والا رکا اور اس نے فقیرے کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھ دیا "لو.... آج اچھی طرح افطار کر لینا۔"

"دس آدمیوں کا کنبہ ہے داتا۔ اس میں کیا اچھی طرح افطار ہو گا" فقیرے نے بے حد عاجزی سے کہا۔

آنے والے نے اس بار سو کا نوٹ نکال کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا "بابا.... میں تمہیں کچھ اور بھی دینا چاہتا ہوں" وہ بولا۔

"میں حاضر ہوں دیالو۔ جو بھی دے دو' کم ہے۔"

"کچھ بتانا سمجھانا بھی ہے۔ میں یہاں بیٹھ جاؤں؟"

"بیٹھ جاؤ داتا۔ اللہ کی زمین ہے' میں کون روکنے والا۔ بس یہاں بیٹھ کر دھندا میرا سگا بیٹا بھی نہیں کر سکتا۔"

آنے والا ایک لمحے کو حیران نظر آیا پھر وہ وہیں اکڑوں بیٹھ گیا۔

"میرا نام آفاق ہے۔ دو دن پہلے اللہ کی بڑی عنایت ہوئی مجھ پر۔ مجھے ایک امانت دی گئی اور حکم ہوا کہ وہ کسی امین اور دیانت دار شخص کو پہنچا دوں' جو اسے آگے بڑھا دے۔"

تیرے کا جی چاہا کہ اس شخص کو خبردار کر دے کہ وہ غلط جگہ آگیا ہے۔ لیکن عاق ہو جانے کے ڈر سے چپ رہا۔

"ضرور دو داتا۔"

آفاق نے جیب سے دونوں اشرفیاں نکال کر اس کی طرف بڑھا دیں "ان میں ایک پر تمہارا اختیار ہے' جی چاہے تو رکھ لینا۔"

"دوسری بھی مجھے دے دو نا؟" فقیرے نے گھگیا کر کہا۔

"نہیں۔ وہ اللہ کی امانت ہے اور تمہیں کسی اور امین اور دیانت دار کو سونپنی ہے.... انہی ہدایات کے ساتھ جو میں تمہیں دوں گا...." وہ اسے اشرفیوں کی اہمیت سمجھانے لگا۔

اسی وقت فقیرے کو افضل نظر آگیا' وہ اسی طرف آرہا تھا۔

"ایک منٹ بابو' میں ذرا اس سے بات کرلوں۔ پھر تمہاری سنوں گا" اس نے اشرفیاں لبادے کی جیب میں ڈال لیں۔ افضل نے آکر کچھ نوٹ فقیرے کو دیے۔ فقیرے نے انہیں گنا اور سخت لہجے میں بولا "یہ تو صرف سات سو ہیں۔"

"ہاں بھائی۔ یہ بھی بڑی مشکل سے لایا ہوں۔ بچوں کے کپڑے بھی نہیں بنے اس عید پر" افضل نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ اگلی عید پر بنا لینا" فقیرے نے بے پروائی سے کہا "مگر مجھے تین سو اور دو۔"

"نہیں ہیں نا استاد۔ ہیں ہی نہیں" افضل گڑگڑانے لگا۔

آفاق حیرت سے کبھی اسے دیکھتا تھا اور کبھی فقیرے کو۔

فقیرے نے افضل کا گریبان پکڑ لیا "دیکھ بھئی' ایسے تو میرا دھندا چوپٹ ہو جائے گا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اصل بھلے نہ دے لیکن ہر مہینے سود دینے میں ناغہ نہ کرنا۔ اور تو پہلے ہی مہینے یہ گڑبڑ کر رہا ہے۔ دیکھ تجھ سے تو میں سو پر بیس لے رہا ہوں۔ آج ایک ضرورت مند آیا تھا' پانچ ہزار مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا سو پر پچیس لوں گا۔ وہ راضی ہو گیا۔ میں نے کہا' ضرورت پانچ کی ہے تو سات لینا پڑے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے بتایا کہ سات ہزار پر سود ہوا پونے دو ہزار۔ وہ نکال کر بچیں گے سوا پانچ۔ چاہو تو سوا پانچ لے لو ورنہ ۲۵۰ روپے اگلے مہینے کے سود میں کٹوا دو ابھی سے۔ بہت خوش ہو کر گیا بے چارہ۔ دعائیں دے رہا تھا مجھے۔ پر تم لوگ ایسا کرو گے میرے ساتھ تو دوسرے ضرورت مندوں کا نقصان ہو گا۔ میں انہیں کہاں سے دوں گا۔ میں تو غریب بھکاری ہوں۔ میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ ہے" اس کا لہجہ بدل گیا۔ "نکال تین سو روپے اور۔"

"ابھی تو نہیں ہیں فقیرے بھائی۔ کل کہیں سے کروں گا تو لا کر دوں گا۔"

"بس لے آئیو کل۔ ورنہ گھر آکر بے عزت کروں گا" فقیرے نے گرج کر کہا "بس اب چلا جا۔"

افضل چلا گیا تو فقیرا آفاق کی طرف مڑا' جس کے انداز سے لگتا تھا کہ اسے قے ہونے والی ہے "ہاں تو بابو' تمہاری بات میں سمجھ گیا۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

"میرا نہیں' اللہ کا کام" آفاق نے جلدی سے تصحیح کی "مگر تم تو سود کا کاروبار کرتے ہو؟"

"کاروبار کیا' ضرورت مندوں کے کام آتا ہوں" فقیرے نے عاجزی سے کہا۔

"مگر یہ تو سود ہے۔"

"تو یہاں کون ہے جو سود نہیں لیتا دیتا۔ تم بینک میں پیسہ جمع کراتے ہو تو تمہیں سود ملتا ہے۔ بینک سے قرضہ لیتے ہو تو تمہیں سود دینا پڑتا ہے۔ جاؤ پکڑو سب کو۔ مجھ منگتے کو کیوں پکڑتے ہو۔"

"بینک کی باتیں حکومت والے جانیں۔ میں تو خود کو اور تمہیں دیکھوں گا۔ تمہیں اس لیے کہ اللہ کی امانت تمہیں سونپ رہا ہوں۔"

فقیرے کا موڈ خراب ہونے لگا "یہ سب چھوڑو۔ کام کی بات کرو" اس نے بے رخی سے کہا "یہ بتاؤ' اس اشرفی کی قیمت کتنی ہوگی؟"

"مجھے نہیں معلوم" آفاق نے کہا "لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"کوئی اس کے پانچ سو بھی نہیں دے گا۔ لیکن میں ایک لاکھ بھی دے دوں گا۔ صرف اس لیے کہ نوادرات جمع کرنے کا شوق ہے مجھے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"دیکھو' ایک تو ویسے ہی میری ہوگئی۔ ہے نا؟ اور میں یہ نہیں چاہتا کہ دوسری بھی کسی اور ناقدرے کے پاس جائے۔ میں وہ بھی رکھنا چاہتا ہوں۔"

"تم امین اور دیانت دار ہو ہی نہیں سکتے۔ سود کا کاروبار بھی کرتے ہو" آفاق نے غصے سے کہا۔

"دیکھو' میرے کاروبار سے تمہارا واسطہ نہیں۔ اور بددیانت اور خائن میں ہوں نہیں۔ ہوتا تو دوسری اشرفی بھی یونہی رکھ لیتا۔ کوئی کیا بگاڑ لیتا میرا لیکن اس میں اللہ کا نام ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ دوسری اشرفی ایک لاکھ میں خریدوں گا اور وہ ایک لاکھ روپے اپنے جیسے کسی امین اور دیانت دار کو تھمادوں گا کہ انہیں آگے بڑھادے۔"

"یہ خیانت نہیں ہے تمہارے خیال میں؟" آفاق غصے میں آپے سے باہر ہونے لگا "تمہیں وہ اشرفی آگے بڑھانی ہے۔"

"میں اس کی ناقدری نہیں کرنا چاہتا۔ اور دیکھو' پانچ سو کی چیز میں ایک لاکھ میں خرید رہا ہوں' یہ خیانت ہے؟"

"تم امانت کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ کیسے سمجھو گے' سود کھاتے ہو' اندھے نہیں ہو' ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگتے ہو۔ جھوٹ بے تحاشا بولتے ہو۔ تم تو اس نعمت کے اہل ہی نہیں ہو۔ لاؤ' وہ اشرفیاں مجھے واپس دے دو۔ میں انہیں کسی اچھے دیانت دار شخص کو سونپوں گا۔"

"ارے واہ..... اشرفیاں تو اب تمہیں نہیں مل سکتیں۔"

"میں زبردستی لے لوں گا۔" آفاق نے آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ویسے تو میں تمہارے ایک ہاتھ جڑدوں تو ابھی تمہارا روزہ ٹوٹ جائے گا۔ پھر یہاں میرا جوان اور مجھ سے زیادہ ہٹا کٹا بیٹا بھی بیٹھا ہے لیکن سب سے آسان بات یہ ہے کہ میں شور مچادوں کہ تم اندھے فقیر کو لوٹ رہے ہو۔ میرا بیٹا گواہی دے گا اور لوگ تمہاری چٹنی بنادیں گے۔ پھر پورا تھانہ مجھے جانتا ہے۔ رات بھی حوالات میں گزارنی پڑے گی۔ بہتر یہی ہے کہ ٹھنڈے ٹھنڈے چل دو یہاں سے۔"

آفاق کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ سمجھ گیا کہ بے بس ہوچکا ہے۔ اس کا دل شرم' رنج اور تاسف سے بھر گیا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔

"جا بابو' چلا جا یہاں سے" اندھے فقیر نے کڑک کر کہا "یا پھر میں مچاؤں شور۔"

آفاق گھبرا کر وہاں سے ہٹ آیا۔ اسی وقت اسے ایک ٹیکسی گزرتی نظر آئی۔ اس نے اشارہ دے کر ٹیکسی کو روکا اور اس میں بیٹھ گیا۔ مگر اس کا دل اور روح بوجھل تھے۔ وہ ایک بے حد قیمتی چیز بہت برے آدمی کے پاس چھوڑے جارہا تھا۔

مگر ٹیکسی میں بیٹھ کر جب اسے یہ خیال آیا کہ اس امانت کی حفاظت اللہ کو کرنی ہے۔ نااہل آدمی کے پاس وہ اشرفیاں رکیں گی نہیں' اس کے پاس واپس آجائیں گی' تو اس کا بوجھ قدرے کم ہوگیا لیکن شرمندگی رہ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا.... کوئی مسلمان' کوئی پاکستانی ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

گھر پہنچ کر اس نے بڑی امید کے ساتھ اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ اسے مایوسی ہوئی' اشرفیاں ابھی تک اس کی جیب میں واپس نہیں آئی تھیں۔



تنویر عرف تیرا دیکھ رہا تھا کہ اشرفیاں ملنے کے بعد ابا کی کیفیت کچھ بدل گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فقیرا بہت بے چین اور مضطرب تھا۔ دھندے میں تو اس لمحے کے بعد اس نے دلچسپی لی ہی نہیں۔ وہ تو باربار جیب میں ہاتھ ڈال کر ان اشرفیوں کو چھوتا تھا۔ چہرے کے تاثر سے لگتا تھا کہ انہیں نکال کر دیکھنا چاہتا ہے لیکن اشرفیاں اس نے ایک بار بھی جیب سے نہیں نکالیں۔ جیسے وہ ڈرتا ہو کہ کوئی انہیں چھین لے گا۔

دو ایک راہ گیر اس کے سامنے فٹ پاتھ پر سکّے گراتے ہوئے گئے لیکن اس نے سکّوں کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ورنہ ہمیشہ وہ ان پر یوں جھپٹتا تھا جیسے ان پر اس کے جینے کا انحصار ہو۔ یہ حرص اس کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔

تیرے نے ابا کو اس حال میں.... دھندے سے بے خبر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ موقع مناسب دیکھ کر اس نے اپنا ٹنڈے کا گیٹ اَپ ختم کردیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے ایکٹنگ کرنے والے ہاتھ کو سہلاتا رہا۔ گیٹ اَپ بڑا تکلیف دہ تھا۔ ہاتھ سیدھا کرنے کے بعد بھی پوری طرح سیدھا نہیں ہوتا تھا اور اس میں اینٹھن بھی ہوتی رہتی تھی۔ ڈیوٹی آف کرنے کے بعد سے سونے تک وہ اس ہاتھ کو سہلاتا رہتا تھا۔ کبھی تو اسے ڈر لگنے لگتا تھا کہ اس کا یہ ہاتھ بے کار ہی ہو جائے گا۔

اونچی ایڑیوں کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی تو تیرے نے بے چین ہو کر آہٹ کی سمت دیکھا۔ اس کی نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ وہ دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ لڑکی بے حد حسین تھی اور بے نیازی سے پرس جھلاتی ہوئی اسی طرف چلی آرہی تھی۔ اس کی چال میں دل ربائی تھی۔ تیرا بڑی وارفتگی سے اسے تکتا رہا۔ جانِ من' نظریں تو اٹھاؤ۔ تمہیں تمہارے بے مثال حسن کی قسم' تیرے نے دل میں اسے پکارا۔ لڑکی کے ہر بڑھتے قدم کے ساتھ اس کی پکار کی شدت بڑھتی جارہی تھی۔ پھر شاید وہ شدت اثر کر گئی۔ بہت قریب آکر لڑکی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ مگر وہ دیکھنا غضب ہوگیا۔ وہ اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی بیمار کتا ہو۔ اس کی نگاہوں میں ترحم ابھرا۔ وہ رکی' اس نے پرس کھول کر اس میں سے روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ پھر چند لمحے وہ باری باری فقیرے اور تیرے کو تکتی رہی' جیسے فیصلہ نہیں کر پا رہی ہو کہ نوٹ کسے دیا جائے۔ تیرے نے جلدی سے ابا کی طرف دیکھا مگر وہ اپنے آپ میں اور ان اشرفیوں کے سحر میں گم تھا۔ تیرے نے سکون کی سانس لی۔

بالآخر لڑکی نے فیصلہ کرلیا اور روپے کا نوٹ تیرے کی طرف بڑھایا لیکن تیرے نے نوٹ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا "اس پر اپنے آٹوگراف دے دو مس صاحبہ!" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "بلکہ ایڈریس بھی لکھ دو۔"

وہ سرگوشی پورے لفظوں اور مفہوم کے ساتھ لڑکی تک نہیں پہنچ سکی "کیا کہہ رہے ہو؟" وہ بولی۔

تیرے نے کن انکھیوں سے ابا کو دیکھا اور سرگوشی کا والیوم ذرا بڑھادیا۔ اس کے نتیجے میں اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ اس نے کہا "تم کو جھکنا پڑے گا مس صاحبہ۔ میری آواز اس سے زیادہ نہیں نکل سکتی۔"

لڑکی اس کی طرف جھکی تو تیرے پر قیامت گزر گئی۔ پھر بھی اس نے دل کی بات کہہ ہی دی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو اس نے اضافہ کیا "لیکن یہ نوٹ چھوٹا ہے۔ میں جیب سے سو کا نوٹ نکالتا ہوں۔ ایک طرف آٹوگراف اور دوسری طرف ایڈریس دے دو۔"

"آٹوگراف!" لڑکی نے برہمی میں لپٹی ہوئی حیرت سے دہرایا۔ "اے، تم بھک منگے ہو یا لفنگے؟" اس نے بے حد خراب لہجے میں کہا "مجھے کیا سمجھا ہے تم نے؟"

اس دوران میں تیرا جیب سے سو کا نوٹ نکال چکا تھا۔ لڑکی کا ایک کا نوٹ بھی اس کے ہاتھ میں تھا لیکن لڑکی کے تیور دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔ ابا کے ٹھیے پر گڑبڑ ہوگئی تو ابا عاق ہی کردے گا۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے کہا "آپ.... آپ فلم اسٹار میرا نہیں ہیں؟"

یہ سن کر لڑکی مسکرائی پھر اس کی مسکراہٹ ہوا ہوگئی اور اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا "ایسی میری قسمت کہاں؟" اور یہ کہہ کر وہ سست قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

تیرا اس کے جملے پر غور کرتا رہا۔ کیا واقعی میرا ہونا خوش نصیبی کی بات ہے مگر وہ اس بات پر زیادہ دیر غور نہ کرسکا۔ قسمت پر اسے اپنی قسمت کا خیال آگیا۔ اللہ نے کیسی اچھی شکل وصورت دی تھی اسے۔ کیسا کسرتی جسم تھا اس کا۔ یونیورسٹی میں لڑکیاں اسے پرنس چارمنگ کہتی تھیں۔ دیوانی تھیں اس کی۔ ہائے کیا دن تھے! مگر کیا زندگی ہے کہ وہ کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہو کر ایسی مشقت کررہا ہے...ذلت اٹھارہا ہے۔ بارہ بجے سے دس بجے تک ٹنڈے بن کر بھیک مانگو۔ تف ہے اس زندگی پر۔ سیکڑوں لڑکیاں سامنے سے گزر جائیں لیکن نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اسے۔ ہائے.... یہ تو ہنسنے کھیلنے کے دن تھے' فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے کے تو نہیں اور رمضان میں تو ابا نے ڈبل ڈیوٹی کردی ہے۔ ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے ایک اور ٹھیا لوادیا ہے۔ رات دس بجے سے صبح چار بجے تک وہاں بھیک مانگو۔ تھک کر چُور ہو جاؤ' گھر پہنچ کر بستر پر گر کر بے سدھ ہو جاؤ۔ نیند پوری ہونے سے پہلے اٹھو کہ ڈے شفٹ کا وقت ہورہا ہے۔ لعنت ہے۔

اچانک تیرے کو اپنے ہاتھوں میں نوٹوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے نوٹوں کو دیکھا۔ ایک سو ایک روپے۔ واہ.... کتنا اچھا شگون ہے۔ اس نے خوش ہو کر سوچا۔ ایک سو ایک روپے تو منہ دکھائی میں ملتے ہیں۔ واہ.... لگتا ہے' قسمت کھلنے والی ہے۔ "ابے اولنڈھگ" اسی لمحے اس کے اندر سے کسی نے ڈانٹا۔ منہ دکھائی تو لڑکیوں کی ہوتی ہے' لڑکوں کو سلامی ملتی ہے' تو چلو.... سلامی ہی سہی۔ اس نے سوچا۔ بہرحال' شگون اچھا ہے۔ اُلّو کا پٹھا ہے تو... اندر کی آواز نے پھر ڈانٹا.... ابے یہ کیسی سلامی ہے کہ سلامی کے ایک سو ایک میں سو تیرے اپنے ہیں اور ایک دوسرے کا' ایسی ہوتی ہے سلامی....!

اور اسی لمحے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پوری سلامی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا تو ابا اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا "سالے..... میرے ٹھیے پر تو دھندا نہیں کرسکتا۔" فقیرے نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

"ابا.. یہ میرے اپنے ہیں۔ بھیک میں نہیں ملے" تیرے نے احتجاج کیا۔

"جھوٹ مت بول۔ اپنے ٹھیے پر میں بے خبر کبھی نہیں

ہوتا... خاص طور پر دھندے سے۔"

"ابا.... ایک کا نوٹ لڑکی نے دیا تھا' سو کا میرا اپنا ہے۔"

"یہ جرمانے میں ضبط ہو رہا ہے۔ ٹھیے پر بیٹھ کر یہ سب نہیں کرتے' سمجھا حرام کے تخم۔"

تیرا کہنا چاہتا تھا کہ تخم کا تو نہیں' ہاں پیٹ کا حرامی ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ آپ کی کمائی پر پلا بڑھا ہوں لیکن یہ کہنے میں عاق ہونے کا خطرہ تھا' جس سے بچنے کے لیے وہ بھیک تک مانگنے پر تیار ہو گیا تھا "تو پھر کیا کروں ابا۔ رومانس کے لیے ٹائم ہی نہیں بچتا۔"

"رومانس کو چھوڑ۔ کیریر کی فکر کر۔ رومانس کے لیے تو عمر پڑی ہے۔" فقیرے نے سلامی کے ایک سو ایک بغیر سلام کیے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا "ارے افطار کا ٹائم ہو رہا ہے۔ چل اب گھر چلیں۔"

تیرا فقیرے کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ مارکیٹ کے باہر فقیرے کی ٹویوٹا کھڑی تھی۔ وہاں پہنچ کر فقیرے نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ افطار کا سائرن بجنے ہی والا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا ٹخنوں تک پہنچنے والا لبادہ اتارا۔ اس کے نیچے وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ کوٹ کی جیب سے کنگھا نکال کر اس نے بال سنوارے اور چابی لگا کر کار کا دروازہ کھولا۔ اتنی دیر میں تیرا بھی ٹی شرٹ اور جینز میں برآمد ہو چکا تھا۔

فقیرے نے چند لمحے سوچا' پھر چابی تیرے کی طرف بڑھائی۔ "لے.... آج تو ڈرائیو کر۔ کیا یاد کرے گا۔"

تیرے کو حیرت تو ہوئی مگر اس نے تیزی سے چابی جھپٹ لی۔ ابا کا ڈرائیونگ کا ایسا شوق تھا کہ کسی اور کو ڈرائیو کرنے ہی نہیں دیتا تھا۔

ڈرائیو کرتے ہوئے دو ہی منٹ ہوئے تھے کہ تیرے کو ابا کی عنایت کا سبب معلوم ہو گیا۔ فقیرا اپنی گود میں دونوں اشرفیوں کو رکھے ان سے کھیل رہا تھا۔ تیرے کو پھر وہ خلش ستانے لگی' جسے اس نے فٹ پاتھ پر دبا دیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا "ابا.... ایک بات کہوں' برا تو نہیں مانو گے؟"

"خالی ہاتھ بات کہے گا تو ضرور برا مانوں گا۔"

"ابا.... تم یہ اشرفیاں رکھنے کا خیال دل سے نکال دو۔ تمہیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے پاس سب کچھ تو ہے۔"

"میں انہیں صرف اس لیے رکھ رہا ہوں کہ یہ نادر و نایاب چیزیں ہیں" فقیرے نے خشک لہجے میں کہا۔

"مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ ملک و قوم کی امانت ہیں۔ ہماری نسلوں کا ورثہ ہیں۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔"

"نہیں ابا۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ ہمارے ملک میں خیر و برکت ہو۔ خوش حالی ہو۔ ان اشرفیوں کو تو جلد از جلد قومی خزانے میں پہنچ جانا چاہیے۔ ان کا راستہ کھوٹا مت کرو۔" تیرے کے لہجے میں دردمندی تھی "اس نیک آدمی نے یہی کہا تھا۔"

"وہ نیک کیسے ہو گیا؟" فقیرے نے چیخ کر پوچھا۔

"سوچو ابا۔ جس نے اسے وہ اشرفیاں دیں' اس نے اس سے یہی کچھ کہا ہو گا جو اس نے تم سے کہا۔"

"ہاں تو پھر؟"

"پھر یہ کہ اس نے اپنی اشرفی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ تمہیں دے دی تاکہ تمہارے دل میں بے ایمانی نہیں آئے۔ تمہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

"وہ نیک نہیں۔ بے وقوف تھا' کنگلا تھا۔ سالے نے ایسی چیز دیکھی ہی نہیں ہو گی کبھی۔ بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔ مگر میں نہ بے وقوف ہوں' نہ کنگلا۔"

"تم کچھ بھی کہو ابا۔ وہ سچا پاکستانی اور دیانت دار اور امین مسلمان تھا۔ میں کہتا ہوں' ان پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ کیا اللہ کی امانت میں بھی خیانت کرو گے۔"

"تو یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ اللہ کی امانت ہیں اور وہ کہانی سچی ہے' جو اس نے سنائی تھی۔"

"انہیں غور سے دیکھو.... دل کی آنکھوں سے دیکھو ابا۔ اللہ کا نام اور کلمہ ان کے اوپر نہیں' اندر لکھا ہے۔"

"اسی لیے تو یہ نادر و نایاب ہیں" فقیرے نے زور دے کر کہا۔ "اور صرف اللہ کا نام ہونے کی وجہ سے میں نے ایک لاکھ روپے قیمت لگا دی۔ سوچ تو سہی' ہزار نہیں' پانچ ہزار نہیں' دس ہزار نہیں۔ پورے ایک لاکھ۔ ورنہ میں اسے یونہی رکھ لیتا۔ ہے نا دیانت داری۔ ہے نا امانت داری۔"

"نہیں ابا۔ یہ بدنیتی ہے.... خیانت ہے۔ تمہیں اشرفی آگے

بڑھانے کو کہا گیا ہے' کوئی رتم نہیں۔"

"بس تو چپ کرجا۔ یہ میرا معاملہ ہے' تیرا نہیں۔ اب بولا تو......"

تیرا جانتا تھا کہ اب ابا عاق کردینے کی دھمکی دے گا۔ چپ رہنے میں ہی عافیت تھی۔

سامنے فٹ پاتھ پر کھڑے ایک جوان فقیر نے گاڑی روکنے کے لیے ہاتھ دیا۔ تیرے کو دیکھنے میں دیر ہوگئی۔ گاڑی آگے نکل گئی۔ اس نے جلدی سے بریک لگائے اور گاڑی ریورس کرنے لگا۔

"ابے یہ کیا کررہا ہے؟" فقیرا چلایا۔

"ابا..... نظیر بھائی کو لینا ہے۔"

فقیر پچھلا دروازہ کھول کر فقیرے کے برابر بیٹھ گیا۔ فقیرے نے تیرے سے پوچھا "کہاں ہے جیرا؟"

"میں یہاں ہوں ابا!" برابر بیٹھے ہوئے نظیر نے کہا۔

"کمال ہے۔ میں پہچانا ہی نہیں" فقیرے نے کھسیا کر کہا۔

"ہمیں تو ہمارے ماں باپ بھی نہیں پہچانتے ابا" جیرے نے دردناک لہجے میں کہا "پرسوں اماں میرے ٹھیلے کے سامنے سے گزری۔ میں نے سلام کیا تو اجنبیت سے مجھے دیکھا اور میرے سامنے چونّی پھینک کر آگے بڑھ گئی۔ پہچانا ہی نہیں مجھے۔"

"پہچان کر ہی چونّی دی ہوگی۔ یہ سوچ کر کہ گھر کا مال گھر میں ہی رہے گا" فقیرے نے اسے دلاسا دیا۔ "ورنہ وہ تو اپنا وائرس بھی کسی کو نہیں دیتی۔"

"پہچانا ہوتا تو ہزار نہ دے دیتی مجھے۔ گھر کا مال گھر میں ہی رہنا تھا۔"

"لیکن وہ اپنا مال اپنے کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"یہ کیا ہے ابا؟" جیرے نے فقیرے کی گود میں رکھی اشرفیوں کو دیکھا۔

تیرے نے اسے پوری تفصیل بمع اس معاملے میں اپنی رائے کے سنا ڈالی۔ جیرے کا بھی یہی کہنا تھا کہ ان اشرفیوں کو آگے بڑھادینا چاہیے۔ فقیرے نے اسے بھی عاق کرنے کی دھمکی دے کر خاموش کرادیا۔

کچھ اور آگے جاکر انہوں نے شیدے کو پک کیا۔ وہ فقیرے کے بیٹوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس نے اپنی بیساکھیاں اگلی سیٹ پر رکھیں اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر بغلیں سہلانے لگا "میرا گیٹ اپ بدلو ابا۔ بغل میں سوجن بڑھتے بڑھتے گٹھلیاں بن گئی ہیں۔ لعنت ہو ان بیساکھیوں پر" اس نے شکایت کی۔

"تو ایک جگہ بیٹھا رہا کر۔ لنگڑے زیادہ چلا نہیں کرتے" فقیرے نے مشورہ دیا۔

"بیٹھے بیٹھے ٹانگیں اکڑ جاتی ہیں۔ لگتا ہے' سچ مچ لنگڑا ہوجاؤں گا۔"

"تو کوئی بات نہیں' بیساکھیاں تو موجود ہیں نا۔"

شیدے کو بھی وہ اشرفیاں دیکھ کر تجسس ہوا۔ اسے بھی وہ کہانی سنائی گئی۔ وہ بھی دونوں بھائیوں سے متفق تھا۔ بلکہ اس کے مطالبے میں شدت تھی۔ اسے بھی وہی دھمکی ملی اور وہ بھی چپ ہوگیا۔

گھر پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا "آج نائٹ شفٹ گیارہ بجے ہوگی" فقیرے نے اعلان کیا "گیارہ بجے سے پہلے بازار میں گرمی نہیں آتی۔"

اس پر تینوں لڑکوں نے سکون کا سانس لیا۔ کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کے لیے اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ فقیرا اپنے کمرے میں جاکر اشرفیوں سے کھیلنے لگا۔ ان سے ایک لمحے کے لیے جدا ہونا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

ساڑھے دس بجے اس نے بیٹوں کو تیار ہونے کی ہدایت کی۔ پونے گیارہ بجے وہ باتھ روم میں گیا۔ باہر آیا تو اشرفیاں غائب تھیں' جنہیں وہ بیڈ پر چھوڑ کر گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ یعنی کوئی اندر آ نہیں سکتا تھا اور اندر وہ اکیلا ہی تھا۔

وہ پاگلوں کی طرح اشرفیوں کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ ہوتیں تو ملتیں۔ وہ باہر نکل آیا اور چیخ پکار کرنے لگا۔ لڑکے اس کا خاص ہدف تھے "تم تینوں میری مخالفت کررہے تھے۔ وہ اشرفیاں تمہی نے چرائی ہیں" اس نے دہاڑ کر کہا۔

"لیکن ابا' ہم تو اپنے کمرے سے نکلے ہی نہیں" شیدا بولا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ پانچ منٹ میں اشرفیاں مجھے دے دو۔ ورنہ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ میں تمہیں عاق کردوں گا۔"

لڑکوں نے معقولیت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے بند کمرے میں تو کسی بھی طرح نہیں گھس سکتے تھے لیکن ان اشرفیوں کی گمشدگی نے فقیرے کو پاگل کردیا تھا اور لڑکے اشرفیاں کسی بھی طرح نہیں دے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فقیرے نے بیوی کے سمجھانے کے باوجود تینوں کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا "آج کے بعد مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں" اس نے گرج کر کہا پھر اس نے گیٹ بند کرلیا۔ وہ اتنا اپ سیٹ تھا کہ اس روز وہ نائٹ شفٹ پر بھی نہیں گیا۔

باہر تینوں لڑکے ہکابکا کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے "اب کیا ہوگا بھائی!" تیرے نے فریاد کی۔

اس پر شیدا تن کر کھڑا ہوگیا "اچھا ہی ہوگا انشاء اللہ" اس نے کہا "اچھا ہی ہوا۔ اس ذلت کی زندگی سے نجات مل گئی۔ ہم پڑھے لکھے ہیں' ذہین ہیں۔ عزت کا کام کریں گے۔ عزت سے رہیں گے۔"

"لیکن کہاں رہیں گے؟" جیرے نے سوال اٹھایا۔

شیدے نے چند لمحے سوچا پھر بولا "ابھی تو کسی ہوٹل میں کمرا لیں گے اور کل سے بیک وقت نوکری اور کرائے کے مکان کی تلاش شروع۔"

"لیکن پیسے..."

"بیس بائیس ہزار تو میرے پاس ہیں" شیدے نے کہا۔

"اتنے ہی میرے پاس بھی ہوں گے" جیرا بولا۔

"پندرہ کے قریب میرے پاس ہیں۔"
"بس تو پھر کیا ہے" شیدے نے اعتماد سے کہا "ملکِ خدا تنگ نیست۔ پائے مرالنگ..."
"است بھائی' لنگ است" تیرے نے جلدی سے اس کا جملہ پورا کردیا۔
"نہیں تیرے' پاؤں مرالنگ نیست۔ بیساکھیاں میں اس منحوس بنگلے ہی میں چھوڑ آیا ہوں۔"
وہ تینوں ٹیکسی کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ ان کے قدم پہلی بار خوداعتمادی سے اٹھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نئی' باعزت زندگی کے خواب تھے۔

○☆○

میں نے قلم بند کرکے رکھا اور جو کچھ لکھا تھا' اسے پڑھا۔ اچانک میری کیفیت بہت عجیب ہوگئی۔ مجھے وہ سب کچھ افسانہ لگنے لگا.... حقیقت سے دور۔ وہ مسجد' وہ رات' بابا عصر اور حارث بن عثمان.... پتا نہیں وہ خواب تھا یا فینٹا سی۔ لیکن نہیں' خواب تو وہ نہیں ہوسکتا تھا اور فینٹا سی بھی نہیں۔ میرے اندر کسی نے چپکے سے کہا۔ فینٹا سی کسی ایک ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔ وہ انفرادی ہوتی ہے' اجتماعی نہیں۔ کوئی اس میں دوسروں کو شریک نہیں کرسکتا کیونکہ اپنے تخیل کے بارے میں دوسروں کو بتایا تو جاسکتا ہے لیکن اپنا تخیل دوسروں کو دکھانا ممکن نہیں۔ جبکہ یہاں دوسرے بھی اس میں شامل ہیں' میرے اپنے بیوی بچے!
اور یہ سچ تھا۔ حارث بن عثمان میرے گھر آئے تھے۔ میرے بیوی بچے ان سے ملے تھے۔ میرے بچوں نے دیکھتے ہی انہیں ماموں کہنا شروع کردیا تھا۔ ناہید انہیں بھائی جان کہنے لگی تھی۔ بلکہ انہوں نے رات ہمارے ہاں گزاری تھی۔ ہمارے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر سحری کی تھی.... اور پھر افطار بھی۔ وہ میرا تخیل نہیں تھے۔ اگر وہ فینٹا سی تھی تو اجتماعی تھی۔
میں چونکا۔ مجھے خیال آیا کہ حارث تو اس وقت بھی میرے گھر میں ہیں۔ وہ دوسرے بیڈ روم میں سو رہے ہوں گے۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا گیارہ بجے تھے۔ میری کیفیت عجیب تھی۔ اتنی دلیلوں کے باوجود مجھے وہ سب کچھ حقیقت نہیں لگ رہا تھا۔ میں اٹھا اور دوسرے بیڈ روم کی طرف چل دیا۔ میں اس وقت یقین اور گمان کے درمیان معلق تھا۔ حارث اس کمرے میں سو رہے ہوں گے.... حارث اس کمرے میں نہیں ہوں گے۔ میں ان دو بیانوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے بیڈ روم کا دروازہ کھولا کہ کہیں حارث کی نیند نہ اچٹ جائے۔ اس احتیاط پر مجھے خود ہنسی آگئی۔ گمان نے بڑبڑا کر کہا.... بے وقوف' جو شخص موجود نہیں ہے' اس کی نیند کیسے اچٹے گی۔
دروازہ کھلا۔ حارث بن عثمان نہ صرف کمرے میں موجود تھے بلکہ وہ جاگ بھی رہے تھے۔ ان کی انگلیاں ہاتھ میں موجود تسبیح کے دانوں پر گردش کررہی تھیں۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں دروازہ بند کرنے لگا تو وہ جلدی سے بولے "آؤنا آفاق میاں!"
"میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔
"ایسی کوئی بات نہیں۔ آؤ میاں' کچھ دیر میرے پاس بیٹھو" میں اندر جاکر کرسی پر بیٹھ گیا "سوئے نہیں؟" انہوں نے پوچھا۔
"میں تو بہت دیر سے سوتا ہوں' لکھ رہا تھا کہ آپ کا خیال آگیا۔"
"جو لکھ رہے تھے' اس پر یقین نہیں آرہا ہوگا۔ اس لیے یہاں چلے آئے" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"جی ہاں' یہی بات ہے۔"
"بابا عصر نے جو بتایا تھا' لکھ لیا؟"
"جی ہاں۔"
"تو پھر یقین کچھ دشوار نہیں۔ اپنی جیب دیکھو' اشرفیاں واپس آگئی ہوں گی۔"
مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر چھوئے بغیر ہی مجھے احساس ہوگیا کہ اشرفیاں واپس آچکی تھیں۔ میری جیب بھاری ہورہی تھی۔ میں مضطربانہ اٹھ کھڑا ہوا۔ حارث جلدی سے بولے "بیٹھونا۔"
"پھر آؤں گا۔ آپ کے پاس۔ ابھی تو مجھے کچھ لکھنا ہے۔ ذہن سے نہ نکل جائے۔"
"تب تو ضرور جاؤ۔ لیکن آتے ہوئے بالکل نہ ہچکچانا۔ میں بہت دیر سے سوتا ہوں۔"
میں کمرے سے نکلا اور اسٹڈی میں آگیا۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر میں سوچتا رہا۔ مجھے لکھنا تھا۔ لکھنا تھا کہ ان اشرفیوں کے آتے ہی میں نے خیروبرکت اور اللہ کی تائید دیکھی اور یہ خیروبرکت اور تائید تو اس بدنصیب فقیرے کو بھی نصیب ہوئی' جس کی نیت خراب تھی' جو امانت دار نہیں تھا۔ اس سے بڑھ کر خیروبرکت کیا ہوگی کہ اس کے تین پڑھے لکھے ہونہار جوان بیٹے جنہیں اس نے دولت کی چکاچوند دکھا کر غلط راستے پر ڈال دیا تھا' اس کے سحر سے آزاد ہوچکے تھے۔ وہ اس کی حرام کی دولت چھوڑ کر خودانحصاری کے راستے پر چل پڑے تھے۔ اس عزم کے ساتھ کہ اپنی دنیا آپ بنائیں گے۔ یہ جذبۂ تعمیر' یہ خودداری بھی تو خیر ہے۔
مجھے ان تینوں ان دیکھے لڑکوں پر پیار آنے لگا۔ میں نے صرف تیرے کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ اشرفیاں میں فقیرے کو دے رہا تھا۔ مگر اس وقت وہ ٹنڈے بھکاری کے گیٹ اپ میں تھا۔ نہ جانے عام لباس میں وہ کیسا لگ رہا ہوگا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے تو انہیں دیکھا تھا۔ اشرفی کا سفرنامہ لکھتے وقت۔ اور وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔
میں نے قلم کھولا اور لکھنا شروع کردیا...

○☆○

اگلی صبح ناشتا کرتے ہی میں گھر سے نکل آیا۔ مجھے محسوس

ہو رہا تھا کہ اشرفیاں کسی امانت دار تک پہنچائے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ یہ سوچ کر بھی مجھ پر ہول چڑھ رہا تھا کہ ایک دن تو ضائع ہو ہی چکا ہے۔ اگر یہ اشرفیاں کئی دنوں میں ایک قدم آگے بڑھیں گی تو یہ سفر تو خدانخواستہ دس سال سے بھی زیادہ جاری رہے گا۔ یہ تو بہت بری بات ہوگی۔ میرا بس چلتا تو ایک ہی دن میں یہ سفر پورا کر دیتا۔

یہ بات میرے لیے بوجھ بن گئی۔ جس طرح میں اس روز چل رہا تھا' وہ میرا اسٹائل نہیں تھا۔ میرے قدم بہت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا' ہر طرف کان لگائے چل رہا تھا۔ میرے گھورنے کے احساس پر کئی عورتوں نے مجھے سخت نظروں سے دیکھا۔ لیکن میں اس وقت اپنی ہی دھن میں تھا۔

مجھے بے شمار ایسے افراد ملے جنہیں میں وہ اشرفیاں سونپ سکتا تھا لیکن ذرا سا مشاہدہ کرنے پر مجھے کچھ ایسی باتیں نظر آئیں کہ میری ان پر اعتبار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ اشرفی کسی کو بھی تھما سکتا ہوں' وہ غلط ہاتھ ہوئے تو اشرفی واپس آجائے گی لیکن یہی مجھے گوارا نہیں تھا۔ گزشتہ رات اشرفیوں کی واپسی سے مجھے جو اذیت ہوئی تھی وہ میں دوبارہ اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ مایوسی اور ناامیدی سے میں بچنا چاہتا تھا۔ میں اس پر یقین رکھنا چاہتا تھا کہ معاشرے میں اہلِ ایمان ابھی موجود ہیں اور انہی کی وجہ سے ہم اللہ کے غضب سے بچے ہوئے ہیں۔ پھر اشرفیاں واپس آنے میں وقت بھی ضائع ہوتا تھا۔ جبکہ اس کام کو تیزی کی ضرورت تھی۔

چلتے چلتے دوپہر ہوگئی۔ میری ٹانگیں دکھنے لگیں۔ میں بیٹھ کر لکھنے والا آدمی ہوں۔ چلنے کا موقع ہی کم ملتا ہے اس لیے عادت بھی نہیں رہی ہے۔ تھکن کے ساتھ مجھے مایوسی بھی ہونے لگی کہ اتنے انسانوں کی بھیڑ میں میرا کسی پر دل نہیں ٹھکتا۔ مگر میں نے اس مایوسی کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ میرا عزم تھا اور اللہ سے دعا تھی کہ اشرفیاں اس بار اہل ہاتھوں کو ہی سونپوں گا۔

پھر اچانک میری آنکھیں چمکنے لگیں۔ مجھے گوہرِ مقصود نظر آگیا۔ سامنے سے پاک وطن کا ایک فوجی مجھے آتا نظر آیا تھا۔

فوجی وردی بچپن ہی سے میری کمزوری ہے۔ جب میں بچہ تھا اور کسی بھی فوجی کو دیکھتا تھا تو میرا ننھا سا دل محبت اور خوشی سے لبالب ہو کر چھلکنے لگتا تھا۔ میری آنکھیں بھیگنے لگتی تھیں۔ مجھے عالمِ اسلام کے بڑے بڑے جرنیلوں' مجاہدوں' غازیوں اور شہیدوں کا خیال آجاتا تھا۔ میرے والد میری اس کیفیت کو سمجھتے تھے۔ وہ ساتھ ہوتے ایسے میں تو کہتے..... اس فوجی جوان کو سلیوٹ کیوں نہیں کرتے؟ مگر میں شرمیلا بہت تھا۔ مجھے سلیوٹ کرنا آتا تھا لیکن میں کہہ دیتا کہ مجھے آتا ہی نہیں۔ مگر میرے اندر فوجی وردی پہنے ایک چھوٹا سا بچہ کھٹ سے دونوں ایڑیاں ملا کر بہت زبردست سلیوٹ کرتا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ سلیوٹ میرے سوا کبھی کسی کو نظر نہیں آیا۔

اور فوجی وردی میرے لیے بس فوجی وردی ہے۔ مجھے اب بھی رینک کی سمجھ بوجھ نہیں۔ سچ یہ ہے کہ میں نے بھی رینک کو سمجھنا ہی نہیں چاہا۔ مجھے اس سے غرض نہیں' رینک کوئی بھی ہو' فوج کے ہر جوان سے مجھے عقیدت ہے.... سپاہی سے لے کر جنرل تک سب میرے لیے یکساں طور پر لائقِ احترام اور بے حد محبوب ہیں کیونکہ اپنے اپنے مقام پر' اپنے اپنے انداز میں سب ہمارے وطن کی حفاظت کے لیے سر بکف ہوتے ہیں۔

میں وہیں کھڑا ہو گیا تھا۔ فوجی جوان میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے آہستہ سے کہا "سنئے صاحب' آپ مجھے چند منٹ دے سکتے ہیں؟"

فوجی جوان نے شک و شبے کی نظر سے مجھے دیکھا "کیا بات ہے؟" اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

"آپ سے ایک کام ہے۔" میں نے کہا پھر اس کی پیشانی پر شکنیں پڑتے دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی "کام میرا ذاتی نہیں' پاکستان کے لیے اور دینِ اسلام کے لیے ہے۔"

یہ سنتے ہی فوجی جوان کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ سراپا سپردگی بن گیا۔ چہرے پر نرمی بکھر گئی "پاکستان اور اسلام کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے" اس نے والہانہ انداز میں کہا "شہادت میری مطلوبہ منزل ہے" اتنا کہنے کے بعد اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں لہرانے لگیں "لیکن تم ایسے کون ہو کہ مجھ سے اس طرح کا کوئی کام لینا چاہتے ہو؟"

میں نے جلدی سے اشرفیاں نکالیں اور ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔ وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ میں اسے سب کچھ بتاتا رہا۔ یہ بھی بتا دیا کہ اشرفی واپس آنے میں وقت کا زیاں ہے۔ یہ کام جتنی جلدی مکمل ہو جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔

وہ ایک دم تم سے آپ پر آگیا "آپ فکر نہ کریں۔ میں انشاء اللہ اپنا کام جلد سے جلد نمٹا لوں گا۔ ویسے بھی آج میرا آف ہے۔ میں پورے دن بھی پھر سکتا ہوں۔"

"شکریہ۔"

"شکریہ کیسا۔ یہ تو میرا ذاتی کام ہے۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا' سلام کیا اور اپنے گھر آگیا۔



اس شام چاند نظر نہیں آیا۔ روزے داروں کو پورے تیس روزے رکھنے کی سعادت اور خوشی نصیب ہوئی۔

حسبِ معمول عشا کے بعد میں اور حارث بن عثمان چہل قدمی کر رہے تھے کہ بابا عصر ہم سے آملے "ہاں بھئی' تو کیا بات ہو رہی تھی؟"

مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے یاد تھا' سلسلۂ گفتگو کہاں سے ٹوٹا تھا۔ "ہم ہندوؤں کی پہلی ناکامی کی بات کر رہے تھے" میں نے کہا "ان کا خیال تھا کہ جدوجہد کرتے ہوئے پاکستان کو آسانی سے نگلا جا سکتا ہے لیکن یہ خیالِ خام ثابت ہوا۔"

"بالکل ٹھیک" بابا عصر نے کہا "اصل میں انہیں اس جذبے

کا علم نہیں تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان بے سروسامانوں کو عطا فرمایا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان دنوں دفتروں میں کام ہوتے دیکھا ہے۔ کرسی نہیں ہے تو فرش پر بیٹھ گئے۔ کاغذ اور پنسل تک کی قلت تھی۔ بس ایک جذبۂ تعمیر تھا جو مایوسی سے بچا کر کام کی لگن دیتا تھا۔ ہر جگہ یہی حال تھا اور لوگوں کے چہرے تمتمائے ہوئے رہتے تھے" انہوں نے آہ بھری "اب وہ لوگ کہاں' اب وہ جذبہ کہاں؟ خیر..... یہ تو اللہ کی دین ہے۔ جب چاہے' دے دے۔ تو یوں سمجھ لو کہ ان دنوں پاکستان میں ہر جگہ' چپے چپے پر' گھروں میں' دفتروں میں' فیکٹریوں میں' کھیتوں میں' سڑکوں اور کچے راستوں پر..... غرض ہر جگہ پاکستان کی بقا کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ ہر شخص مجاہد تھا۔ ہر دل کی ایک ہی آواز تھی..... زندہ تو غازی مرے تو شہید۔ ایسی قوم کو کوئی شکست دے سکتا ہے۔"

"آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں کوئی برا تھا ہی نہیں؟" میں نے اعتراض کیا۔

"نہیں۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بدی نہ ہو تو نیکی کی پہچان کیسے ہو۔ اس وقت بھی بے ایمان لوگ موجود تھے اور وہ اپنے مفاد کے لیے کام کر رہے تھے۔ انہیں ملک کی بقا کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ہندوستان میں زمینیں' جاگیریں چھوڑ کر آنے والے ملک کی تعمیر میں مزدور کی طرح مصروف تھے۔ وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھے۔ وہ کچھ نہیں مانگتے تھے۔ ان کا کوئی دعویٰ نہیں تھا جبکہ بے ایمان لوگ جعلی کلیم بھر کر ان مجاہدوں کے حصے کی زمینیں' مکانات' حویلیاں اور جاگیریں حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ یہی تو ہوا۔" بابا عصر نے پھر آہ بھری "لوگ شکایت کرتے ہیں کہ پاکستان میں بڑے چھوٹے اور چھوٹے بڑے ہو گئے۔ عظمت حقیر ہو گئی اور پستی بلندی پر چڑھ بیٹھی۔ لیکن یہ سچ نہیں' اس لیے کہ یہ دنیاوی نقطۂ نظر ہے۔ اللہ کی نظر سے دیکھو تو بڑے اور بڑے ہو گئے۔ چھوٹے اور چھوٹے ہو گئے۔ عظمت کو اور عظمتیں ملیں۔ پستی اور پستی میں چلی گئی۔ یہ معاشرے میں بڑھتی ہوئی مادہ پرستی کا قصور ہے کہ بلندی کو پستی اور پستی کو بلندی سمجھا جانے لگا لیکن اب بھی جو لوگ ایثار و قربانی کا مفہوم اور اس کا اجر سمجھتے ہیں' وہ کبھی محرومی کی شکایت نہیں کرتے کہ آخرت کا اجر سب سے بڑا اجر ہے۔ خیر..... تم اپنی بات جاری رکھو۔"

"ہندوؤں کا زعم اتنا بڑا تھا کہ اس جھٹکے سے دور نہیں ہو سکا۔ پھر حیدر آباد دکن کو ہڑپ کر لینے کے بعد ان کا اعتماد اور بڑھ گیا۔ اب ان کے عزائم اور بڑے تھے۔ اس کے تحت ۶ ستمبر ۶۵ء کو انہوں نے بغیر اعلان کیے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ چند گھنٹے بعد وہ لاہور جیم خانہ میں جشنِ فتح منائیں گے اور جامِ فتح تجویز کریں گے....."

"اللہ نے وعدہ فرمایا کہ جب تک کفر سے لڑو گے تو ہم تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریں گے اور اگر تم پر اچانک' خبردار کیے بغیر کفر حملہ کرے گا تو پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کی جائے گی" بابا عصر نے کہا "اور کراچی میں اَن گنت عینی شاہد موجود ہیں جنھوں نے ایک سبز پوش بزرگ کو دیکھا کہ بھارتی طیاروں سے گرائے جانے والے بم اپنے ہاتھوں میں لے کر سمندر میں اچھال دیتے ہیں۔"

"خود بھارتی فوجیوں نے بھی ایسے بے شمار واقعات بیان کیے اور تقریباً ہر محاذ پر یہی کچھ ہوا" میں نے کہا۔

"شہدا کبھی نہیں مرتے۔ وہ زندہ رہتے ہیں۔ وہ پاکستان کی باطنی' نظر نہ آنے والی فوج ہیں۔ بس یہ یاد رکھو کہ وہ ایمان والوں کے حلیف ہیں۔"

"جی ہاں۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کو منہ کی کھانی پڑی۔ لاہور کی پاک زمین کو تو وہ چھو بھی نہیں سکے۔ الٹا اپنی زمین گنوا بیٹھے۔ چونڈہ کا میدان بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بن گیا۔"

"جانتے بھی ہو کیسے؟" بابا عصر نے گرج کر کہا پھر خود ہی بولے۔ "قوم کا ہر فرد جذبۂ جہاد' جذبۂ ایمان سے سرشار تھا۔ ایسی یکجہتی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی' نہتے شہری ڈنڈے لے لے کر سرحد پر پہنچ گئے تھے۔ ٹینکوں کی یلغار دیکھ کر ان جیالوں نے حساب لگایا کہ ہر فوجی کی زندگی بہت قیمتی ہے..... ایک عام آدمی سے سوگنا' ہزار گنا زیادہ قیمتی۔ کیونکہ وہ دفاعِ پاکستان کی فصیل کی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو' اسے بچایا جائے۔ چنانچہ عام شہری جسم سے بم باندھ کر یلغار کرنے والے ٹینکوں کی پہلی صف میں گھس گئے اور اسے تباہ کر دیا۔ ان ٹینکوں نے پچھلے ٹینکوں کی یلغار روک دی۔ پھر انہیں ناکارہ بنانا مشکل نہیں رہا۔"

"جی ہاں۔ یہ بات میں نے بھی سنی ہے" میں نے کہا۔ مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے پوچھا "ایک بات تو بتائیں' عربوں نے بھی دو جنگیں لڑیں اور وہ تعداد میں یہودیوں سے زیادہ تھے مگر انہیں شکست ہوئی۔ وہ بیت المقدس بھی کھو بیٹھے..... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی تائید انہیں حاصل نہیں تھی' کیوں؟"

"اللہ کی باتیں اللہ جانے۔ لیکن اس کے بندے اس کے احکام کی روشنی میں انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں" بابا عصر نے کہا "میرا خیال ہے کہ عربوں نے کوئی جنگ اللہ کے لیے نہیں لڑی۔ اسلام کے لیے نہیں لڑی۔ لڑتے وقت صرف اللہ پر تکیہ نہیں کیا۔ دوسری طرف اس سے پاکستان کی اہمیت بھی ثابت ہو جاتی ہے' جو تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"لیکن ۷۱ء کی جنگ میں کیا ہوا؟"

"وہی عربوں والا حشر" بابا عصر کے لہجے میں تلخی آ گئی "۶۵ء میں بھارت نے سمجھ لیا کہ میدانِ جنگ میں پاکستان کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے حکمتِ عملی تبدیل کر لی۔ انہوں نے سازشیں کیں۔ پاکستانیوں کے اتفاق کو پارہ پارہ کرنے کے سلسلے میں کام کیا۔ زہریلا پروپیگنڈا کیا۔ نفرت اور تعصب کو ابھارا' جو پہلے ہی موجود تھا۔ غلطیاں تمہاری بھی تھیں۔ بھائیوں کو بھائیوں سے محرومیوں کا گلہ تھا لیکن بااختیار بھائیوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ نہیں سمجھا کہ محرومیوں کا ازالہ نہیں کرو گے تو دشمن انہیں ایکسپلائٹ کر کے ان کی صفوں میں انتشار پیدا کرے گا۔ پھر اس

وقت قیادت بھی بدکاروں اور بے راہ روؤں کے ہاتھوں میں تھی اور اللہ پر تکیہ کرنا تو کجا' اللہ سے مدد بھی نہیں مانگی گئی۔ تم تو امریکا اور چین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ساتویں بحری بیڑے سے آس لگائے بیٹھے تھے۔"

میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا "جی..... یہ سچ ہے۔"

"پھر بھی پاکستان پر ہمیشہ اللہ کا ہاتھ رہا" بابا عصر بولے "ایک کمیونسٹ نے پاکستان میں ایک ہفتہ گزارا تو اللہ پر ایمان لے آیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس ملک کا ہر ہر فرد' وہ صاحبِ اختیار و اقتدار ہو یا عام آدمی ہو' اپنے اپنے طور پر ملک کی جڑیں کاٹ رہا ہے پھر بھی یہ ملک قائم و دائم ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی سپریم طاقت موجود ہے' جو اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ جسے اس کا ختم ہونا منظور نہیں۔ تو یہ طے ہے کہ پاکستان پر اللہ کی نظرِ کرم ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس کی مرضی۔ اس کے ہر کام میں سو حکمتیں ہوتی ہیں۔ وہ بندے کی عقل کو روشنی عطا کرے تو بندہ سمجھ لیتا ہے۔"

"دیکھیں بابا' مسلمانوں نے اسپین کو فتح کرنے کے بعد سات سو سال وہاں حکومت کی۔ مگر اب وہاں ان کا نام و نشان بھی نہیں۔ یادگاریں بھی مٹ گئی ہیں اور مٹتی جا رہی ہیں۔"

"لیکن اس سرزمین..... یعنی برصغیر میں انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ بلکہ اسلام کی آخری فتح میں یہ خطہ انشاء اللہ بہت اہم رول ادا کرے گا۔"

"کیوں؟"

"اسپین کو فتح کر کے اسلامی سلطنت میں توسیع کی گئی لیکن تبلیغ نہیں ہوئی۔ وقت گزرا تو مسلمان لہو و لعب میں پڑ گئے۔ نصرانیوں کے شوق اور مشغلے اپنا لیے گئے۔ پھر سازشیں ہوئیں' مسلمانوں نے غداریاں کیں' اس کا نتیجہ تو یہی نکلنا تھا۔"

"لیکن ہندوستان میں بھی یہی سب کچھ ہوا" میں نے اعتراض کیا۔

"ایک فرق تھا۔ یہاں تبلیغ ہوئی۔ اسلام ہمیشہ اخلاق سے پھیلا ہے۔ تلوار سے نہیں۔ محمد بن قاسم کو یہاں بہت تھوڑی مہلت ملی لیکن اتنے کم وقت میں بھی اس نے اپنے حسنِ سلوک سے دل جیت لیے۔ اسلامی اخوت نے ہندوستان کے مظلوم معاشرے کی مظلوم اکثریت کو پہلی بار احساسِ تحفظ دیا۔ وہ جو کچھ نہیں تھے' انہیں احساس دلایا کہ وہ بھی کچھ بن سکتے ہیں۔ چنانچہ لوگ تیزی سے مسلمان ہونے لگے اور وہ خوف سے نہیں' محبت سے مسلمان ہوئے تھے۔ ان پر اپنی تاریکی بھی کھل گئی تھی اور اسلام کی روشنی بھی۔ پھر وہ اندھیرے میں کیسے رہتے۔

"اب ایک اور اہم بات سنو۔ شاید تم نے اس پر غور نہیں کیا ہوگا" بابا عصر نے کہا "ہر عہد میں اللہ کی طرف سے انسانوں کے لیے ہدایت آتی رہی۔ اللہ پیغمبروں کو بھیجتا رہا۔ یہاں تک حضورؐ کی بعثت کے ساتھ ہی نبوت کا سلسلہ مکمل ہوگیا' دین مکمل ہوگیا۔ شریعت مکمل ہوگئی۔ غور کرو تو بیشتر انبیائے کرامؑ ایک خاص خطے میں اتارے گئے۔ حضورؐ عرب میں تشریف لائے۔ آپؐ رحمتہ اللعالمین تھے۔ چنانچہ اسلام کی روشنی پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اب اس خطے برصغیر کے بارے میں سوچو۔ محمد بن قاسم کے ساتھ یہاں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے بہت سے مسلمان یہیں رہ گئے۔ ان کے کردار اور اخلاق سے متاثر ہو کر ہندو مسلمان ہوتے رہے۔ مگر اللہ نے اس خطے کو اور طرح سے نوازا۔ ختمِ نبوت کے بعد ولایت کا سلسلہ شروع ہوا اور تاریخ اٹھا کر دیکھ لو' تمام ولی کامل یہیں گزرے۔ وہ اس خطے میں دور دراز کا سفر کر کے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ انہوں نے محبت اور سلوک سے دل جیتے اور اسلام کو پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ سب آئے نہیں' بھیجے گئے تھے اور اسی لیے بھیجے گئے تھے۔ اللہ کے حکم اور اس کی مرضی سے آئے تھے۔ ہر ایک کا اپنا مرتبہ اور مقام تھا۔ اپنے اپنے علاقے تھے۔ وہ اس برصغیر کی باطنی حکومت تھی۔ جیسے بادشاہ اپنی مملکت کے مختلف حصوں میں گورنر مقرر کرتے ہیں' ویسے ہی یہ اپنے اپنے علاقے میں مقتدرِ اعلیٰ کے گورنر تھے۔ وہ بغیر فوج کی طاقت کے حکومت کرتے تھے..... دلوں پر۔ وہ لوگوں کو جینا سکھاتے تھے۔ ان کے مزاروں سے آج بھی لاکھوں کروڑوں کو فیض ملتا ہے۔ ہندوستان سے لے کر کشمیر کے دور دراز کے گاؤں دیہاتوں تک یہ روحانی مملکت قائم تھی..... اور آج بھی قائم ہے۔

"اب تم اسپین اور ہندوستان کا فرق سمجھو گے۔ یہاں بھی بادشاہوں نے حکومت کی لیکن یہاں اللہ اور رسولؐ کے عاشق ولیوں نے اسلام کو عام آدمی تک پہنچا دیا۔ اس کی وجہ سے یہاں اسلام درباروں اور اقتدار کے ایوانوں تک محدود نہیں رہا۔ یہاں نسلوں کی تقدیر بدل گئی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عرب کے بعد اسلام سے سب سے زیادہ فائدہ اس خطے کو پہنچا اس لیے کہ یہاں اسلام کو قائم رہنا تھا۔ اس لیے کہ اس خطے کے مسلمانوں کو اسلام کی سربلندی میں فعال کردار ادا کرنا تھا۔ حق و باطل کے معرکے میں انہیں اسلام کا ہراول دستہ ہونا تھا۔ اسی لیے یہاں مسلمانوں کو کبھی ہندوؤں کا زیرِ دست نہیں ہونے دیا گیا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر کبھی حکومت نہیں کی اور جب وہ وقت آیا کہ ہندو صدیوں کی غلامی کا حساب لینے کو تیار ہوئے تو پاکستان بن گیا۔ سرزمین ہنود پر ایک اسلامی مملکت..... اللہ کی قائم کی ہوئی ایسی مملکت کہ جسے اپنے پرائے سرتوڑ کوشش کے باوجود ختم نہیں کر سکے اور کبھی ختم نہیں کر سکیں گے۔ یہ ہے پاکستان کی اہمیت' سمجھ میں آتی ہے؟"

میں حیرت سے سوچ رہا تھا۔ واقعی یہ تو ہے۔ اللہ نے دین کی تبلیغ کا کام اس خطے میں اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں سے لیا۔ انہیں کہاں کہاں سے بھیجا۔ بات تو بالکل واضح تھی "جی..... میں سمجھ گیا لیکن یہ عنایت اسپین پر کیوں نہیں ہوئی؟"

"حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن بندہ اس کا ہو اور کوشش کرے تو سمجھ سکتا ہے۔ اللہ کو وہ لوگ بہت ناپسند ہیں جن تک

ہدایت پہنچی' جن پر اس نے عنایات کیں' جنہیں روشن نشانیاں دکھادی گئیں' جن کے لیے معجزے بھی رونما ہوئے۔ مگر وہ ہدایت پانے کے بعد گمراہی میں پڑگئے۔ جنہیں کتاب دی گئی مگر وہ اللہ کی آیات کا انکار کرنے اور ان کا مذاق اڑانے لگے۔ انہیں کتاب میں نشانیاں بتادی گئیں لیکن جب حضورؐ تشریف لائے تو انہوں نے اپنی گواہی دینے کی ذمے داری سے ہی منہ نہیں موڑا' اللہ کی آیات کو بھی جھٹلانے لگے۔ ان کے لیے اللہ نے فرمایا کہ یہ وہ گمراہ ہیں جن کے لیے آسمان سے فرشتے بھی بھیج دیے جائیں تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ حضورؐ کو بطورِ خاص کوئی معجزہ نہیں عطا ہوا کیونکہ جنہیں اللہ نے ہدایت دی' وہ اس کے باوجود ایمان لے آئے اور یہ ہدایت یافتہ گمراہ' معجزوں کی بھی توجیہہ کرنے لگیں گے۔ اللہ نے فرمادیا کہ ان کا غم نہ کرو۔ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ جسے ہم نے گمراہ کردیا' اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ یہ غفلت میں پڑے رہیں گے۔ یہاں تک کہ مقررہ دن آجائے گا' پھر یہ ایمان لائیں گے مگر اس وقت انہیں قبول نہیں کیا جائے گا۔

"اب اس روشنی میں دیکھو' اسپین میں اہل کتاب تھے۔ وہ بدنصیب اہل کتاب جنہیں ہدایت سے محروم کردیا گیا۔ جن لوگوں کو اللہ نے گمراہ کرکے ان کے حال پر انہیں چھوڑ دیا' وہ کیسے ہدایت پاسکتے ہیں۔ مگر وہ اہل کتاب بھی ہیں' جنہوں نے ہدایت سے منہ نہیں موڑا۔ اللہ نے فرمایا کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو تقویٰ کرتے ہیں۔ جس سے منع کیا گیا' اس سے بچتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے خوش خبری ہے۔"

"مگر اس خطّے..... یعنی برصغیر پر اس عنایت کی وجہ؟"

"اللہ کی مرضی۔ وہ جسے چاہے' ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کردے۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ حضورؐ کو عرب میں کیوں مبعوث فرمایا گیا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اللہ بے حد رحیم و کریم ہے۔ جہاں بہت زیادہ اندھیرا ہو' وہاں وہ روشنی ضرور بھیجتا ہے۔ جہاں روشنی بھیجی گئی اور لوگوں نے اسے اندھیروں میں چھپادیا' وہاں سے وہ منہ پھیرلیتا ہے۔ بعثت سے پہلے کا عرب معاشرہ اس عہد کا سب سے بگڑا ہوا معاشرہ تھا۔ بت پرستی وہاں ہوتی تھی۔ شراب' جوا' جھوٹ' زنا..... کون سا گناہ تھا جو وہاں عام نہیں تھا۔ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑدیا جاتا تھا۔ جہالت کی ایسی تاریکی تھی کہ عقل ان تاریک دیواروں سے سر ٹکراتی پھرتی تھی اور راستہ نہیں ملتا تھا۔ رسالت مآبؐ نے اللہ کی رحمت اور ہدایت سے اور اپنی سیرتِ طیبہ سے بے حد قلیل وقت میں اسے دنیا کا سب سے مہذب اور متمدن معاشرہ بنادیا۔ اسے معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ ہدایت یافتہ گمراہوں کے لیے ایک مثال بھی تھی اور تنبیہہ بھی کہ دیکھو' ہم ایسے کایا پلٹ بھی کرسکتے ہیں لیکن تم نہیں بدلوگے۔ کیونکہ تم نے جانتے بوجھتے انکار کیا۔ سو تم دھتکار دیے گئے۔

"اب ذرا محمد بن قاسم کی آمد سے پہلے کے ہندوستانی معاشرے کا تصور کرو۔ وہاں بھی بت پرستی ہوتی تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں دیوی دیوتاؤں کو کہیں نہیں پوجا گیا۔ یہاں تو زندہ انسانوں کو ان دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھادیا جاتا تھا۔ عورت کا کوئی احترام نہیں تھا۔ وہ صرف استعمال کی چیز تھی' ملکیت تھی' جسے جوئے میں ہارا جاسکتا تھا۔ وہ خوب صورت تھی تو دیوداسی تھی' جسے دیوی دیوتاؤں کے نام پر مذہبی رہنما اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا کر پامال کرتے رہتے تھے۔ یہاں انسانوں میں تفریق تھی۔ بہت بڑی اکثریت ایسی تھی جسے نفرت اور حقارت سے شودر کہا جاتا تھا' جس کے مقابلے میں غلاظت میں لتھڑا ہوا جوتا بھی اہمیت رکھتا تھا۔ یعنی انسان کی بے حرمتی اور اس کی عزتِ نفس کی پامالی ہوتی تھی جو اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ ان تک ہدایت کی روشنی نہیں پہنچی تھی۔ سو اللہ نے رحمت فرمائی اور اپنے نیک بندوں کے ذریعے وہ روشنی بھیج دی۔

"تو سمجھ رہے ہو ناکہ یہ بدترین کفر کی سرزمین تھی۔ یہاں چپّے چپّے پر کفر ہوتا تھا۔ یہاں گائے اپنے پیشاب اور گوبر سمیت متبرک اور مقدس تھی۔ گندگی اور ناپاکی کو پاکیزگی کا درجہ دیا جاتا تھا اور انسان کو شودر بنا کر ناپاک تصور کرلیا گیا تھا۔ ایسا کفر تو کہیں نہیں ہوا۔ یہاں اللہ کی رحمت تو ہونی ہی تھی اور جس دن یہاں اللہ کی رحمت کا ظہور ہوا' اسی دن پاکستان کی داغ بیل پڑگئی تھی۔ یہ الگ بات کہ پاکستان صدیوں بعد ظہور میں آیا۔

"اور اب دیکھو' دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہورہی ہے۔ مگر آج بھی بھارت کی تاریکی کا وہی حال ہے۔ اس خطے کے سوا دنیا میں بت پرستی کہیں نہیں ہوتی۔ سب کچھ بتوں سے مانگا جاتا ہے۔ صدیوں پہلے محمود غزنوی نے سومنات کا بت توڑ کر انہیں لمحۂ فکریہ دیا تھا۔ احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ جو دیوتا اپنا دفاع بھی نہ کرسکے' وہ انہیں کیا دے گا۔ جنہیں اللہ نے ہدایت دی' وہ سمجھ گئے اور ایمان لے آئے' باقی گمراہ رہ گئے۔

"لیکن اب صورتِ حال مختلف ہے۔ کفرستان کے سینے پر اب ایک پاکستان بھی موجود ہے۔ سو یقین کرلو کہ حق و باطل کا آخری معرکہ اسی میدان میں ہوگا۔ باطل کی گردن کو پاکستان کی تلوار ہی کاٹے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بداعمالیوں کے باوجود اللہ نے پاکستان پر ہمیشہ عنایت فرمائی' اسے قائم رکھا اور انشاء اللہ قیامت تک قائم رکھے گا۔ یہ ہے پاکستان کی اہمیت۔ اسے اللہ کی تائید و حمایت حاصل ہے۔ اس کی ظاہری فوج ہی نہیں' باطنی فوج بھی بہت طاقت ور ہے۔ تم تصور نہیں کرسکتے کہ کیسی کیسی عظیم المرتبت ہستیاں اس کی سربلندی کے لیے دعا کرتی ہیں اور جہاد میں شامل ہوتی ہیں۔"

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک طرف ایسی قدر اور اہمیت..... اور دوسری طرف اس کے اپنوں کی ایسی ناقدری' ایسی بے مہری۔ اس کے اپنوں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ کچھ اپنے مفاد کے لیے اور کچھ دشمنوں کی خوشنودی کے لیے اس کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں۔ میرا دل پھٹنے لگا۔

"کاٹنے دو۔ وہ انشاء اللہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے" بابا

عصر نے کہا "طول اور مایوس نہ ہو۔ حوصلہ رکھو۔ اس سے محبت کرو اور اس کی عظمت کے حصول کی کوشش کرتے رہو۔"

"میں کیا اور میری بساط کیا۔ بے عمل ناکارہ۔۔"

"اس کا ایک عام مزدور بھی بے حد اہم ہے، اگر اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے لیے جان دینے کا جذبہ رکھتا ہے۔ خود کو حقیر نہ سمجھو۔ ہاں اپنی اصلاح کرتے رہو۔ صرف اللہ کا خوف دل میں بٹھالو تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"میری سمجھ میں اب بھی نہیں آیا کہ پاکستان سے محبت کی اتنی اہمیت کیوں ہے کہ اس سے محبت کرنے والوں کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے۔"

"اس پر بعد میں بات کریں گے" بابا عصر نے کہا "فی الحال تمہارے لیے اچھی خبر ہے....بڑی خوش خبری۔"

میں ہمہ تن متوجہ ہوگیا "عطا کیجئے۔"

"اشرفی کا سفر شروع ہوگیا ہے" بابا عصر نے بتایا۔

میری آنکھوں میں اس فوجی کی صورت پھر گئی جسے میں نے وہ امانت سونپی تھی۔ میرا یقین سچا نکلا۔ میرا سینہ خوشی اور فخر سے پھول گیا۔ دھڑکنیں اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں۔

"یہی نہیں۔ صرف آدھا دن ہوا ہے اور وہ اشرفیاں اس وقت دس امانت داروں کے ہاتھوں سے گزر چکی ہیں۔" بابا نے مزید کہا۔

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا "اتنی جلدی....؟"

"ہاں۔ تم نے امانت بہت بابرکت مسلمان کے سپرد کی تھی۔ اب تفصیل سن لو" بابا عصر مجھے امانت کے آگے بڑھنے کا حال لمحہ بہ لمحہ سناتے رہے۔ میری آنکھیں بار بار بھیگتی رہیں۔ دل میں امید کی کرنیں پھوٹتی رہیں۔ مایوسی ڈھلنے لگی۔

بابا عصر کے خاموش ہونے پر میں نے کہا "لیکن میں یہ سب کچھ نہیں لکھ سکوں گا۔"

"یہ تو ممکن بھی نہیں ہے" بابا عصر نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا "دیکھو.... یہ تمہاری اشرفیاں تو ہزاروں ہاتھوں سے گزریں گی انشاء اللہ۔ اتنے واقعات تو تم نہیں لکھ سکتے۔ ہاں ان میں چیدہ چیدہ اثر انگیز واقعات ضرور لکھ دینا۔ ایمان داری کے بھی۔ تاکہ لوگوں کو حوصلہ ہو اور بے ایمانی کے بھی تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور پتا چلے کہ بدنصیبی کیا ہوتی ہے۔"

"یہ بھی ممکن نہیں ہے بابا" میں نے عاجزی سے کہا "کہانی بہت طویل ہوجائے گی۔ ان واقعات کے بغیر بھی اسے خاصا طویل ہونا ہے۔ کچھ پڑھنے والوں کو تو بہت بوریت ہوگی۔"

"ہونے دو۔ تمہیں تو اپنا کام کرنا ہے۔ تم اس کی پروا نہ کرو اور دیکھ لینا" انشاء اللہ یہ سب کو پسند آئے گی۔ اسے وہ لوگ بھی پڑھیں گے جنہیں کہانیوں سے دلچسپی نہیں اور یہ انشاء اللہ ان لوگوں تک بھی پہنچے گی جو پڑھنا نہیں جانتے، تم بس اپنا کام کرو۔"

"وہ تو میں کروں گا لیکن واقعات میں زیادہ سے زیادہ دو تین شامل کرسکوں گا۔"

بابا عصر سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھا کر کہا "یہ ممکن نہیں کہ اس کہانی کی اشاعت کے بعد تم یہ واقعات ایک ایک کرکے لکھتے رہو اور لوگوں تک پہنچاتے رہو۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"خیر، دیکھا جائے گا، ہوسکتا ہے کہ قارئین ہی فرمائش کرکے تمہیں اس پر مجبور کردیں، چھوڑو اس بات کو" بابا نے کہا "یہ بتاؤ کہ ایک اشرفی تو تمہارے اختیار میں دی گئی تھی، تم سے یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ تم وہ بھی دے دو۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

میں سہم گیا۔ ان کا انداز اور لہجہ باز پرس کرنے والوں کا سا تھا، "پہلے ایک بات میری سمجھ میں آئی۔ اگر وہ اشرفی مجھے نہ دی جاتی تو شاید ابتدا میں ہی میری نیت خراب ہوجاتی۔ مگر اس اشرفی نے مجھے سہارا دیا۔ یہاں تک کہ میں پختہ ہوگیا۔ پھر میں نے سوچا، دوسروں کا بھی یہی حال ہوگا۔ چنانچہ میں نے وہ بھی آگے بڑھادی۔"

"لیکن تم نے جسے دی، اسے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"بتادیتا تو اس کا اختیار ختم ہوجاتا۔ وہ بھی آزمائش میں پڑ سکتا تھا۔"

بابا پھر مسکرائے "بالکل ٹھیک۔ یہ طے ہے کہ ہر امانت دار یہی سوچے گا اور یہی کرے گا۔ اور یہ بتادوں کہ جو اپنا حصہ رکھنا چاہے گا، وہ دوسری اشرفی کو آگے بھی نہیں بڑھا سکے گا۔ اس کی نیت خراب ہوجائے گی اور وہ سعادت سے محروم ہوجائے گا۔ یہ یونہی ہونا ہے۔ اچھا.....اب میں چلتا ہوں۔"

بابا اوجھل ہوگئے۔ مجھے احساس ہوا کہ ٹانگیں دکھ رہی ہیں۔ شاید اس رات ہم بہت زیادہ چلے تھے۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ بابا نے نہ جانے مجھے کتنی دور چھوڑا ہوگا۔ یعنی ابھی مجھے مزید چلنا ہے لیکن میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو مجھے اطمینان ہوا۔ میں اپنی بلڈنگ کے سامنے کھڑا تھا۔

"آیئے!" میں نے حارث بن عثمان سے کہا۔ ہم دونوں گھر کی طرف چل دیے۔



اس پہلی رات کو ایک مہینہ گزر چکا تھا اور اس دوران میں بہت کچھ ہوچکا تھا۔ حارث بن عثمان نے عید کا دن ہمارے ساتھ گزارا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ بچوں کے اصرار پر بھی نہیں رکے تھے "تم خود سوچو" انہوں نے بے حد لجاجت سے ہمیں سمجھایا تھا۔ "اللہ کی مہمانی کا اعزاز کوئی کیسے چھوڑ سکتا ہے۔"

اس کے بعد کہنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں خود بھی بچوں کو سمجھانے لگا۔

"لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں جب موقع ملے گا، تم سے ملنے آؤں گا۔"

بچے آبدیدہ تھے لیکن انہوں نے صبر کرلیا۔

میں البتہ حارث بن عثمان سے دن میں پانچ بار ملتا تھا اس لیے کہ اللہ کے فضل و کرم سے پنج وقتہ نمازی بن گیا تھا اور اسی مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتا تھا۔ عشا کے بعد ہم چہل قدمی کرتے اور اس دوران میں بابا عصر سے ملاقات ہوتی تھی۔

اللہ کی بڑی عنایت تھی کہ اشرفی کا سفر جاری تھا بلکہ سست بھی نہیں پڑا تھا۔ وہ اشرفیاں اوسطاً ہر روز دس بارہ امانت داروں تک پہنچ رہی تھیں۔

اس عرصے نے مجھے ایسی طمانیت سے نوازا تھا جو میرے لیے بالکل نئی تھی۔ مگر اس روز ۲۰ مارچ ۹۶ء کو میں اچانک فکرمند ہو گیا۔ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میرے کام کرنے کی رفتار بہت سست ہو گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک میں ایک کہانی بھی نہیں لکھ سکا تھا۔

اس روز ناہید میری اسٹڈی میں آئی تو میری گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ میں نظریں چرانے لگا۔ "کیا بات ہے؟ کچھ پریشان ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں.... نہیں" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"یہ ہاں اور نہیں کا کیا مطلب ہے؟"

"میں تمہاری پوچھ گچھ سے ڈر رہا ہوں۔"

"کیسی پوچھ گچھ؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"یہی کہ کہانی کب پوری ہو گی؟"

اس نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا "میں کبھی بلاوجہ پریشان کرتی ہوں تمہیں؟" اس کے لہجے میں بھی ملامت تھی۔

"اسی لیے تو پریشان ہوں میں" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"تم بلاوجہ پریشان کیا کرتیں تو مجھے گھبراہٹ ہوتی ہی نہیں۔ مگر اب تو وجہ ہو گی نا۔"

"کیا مطلب؟"

"وہی.... راشن کا مسئلہ ضرور کھڑا ہو گا۔ ایک مہینے سے اوپر ہو چکا سودا آئے ہوئے" میں نے کہا۔ پھر جلدی سے صفائی پیش کی۔ "اس دوسرے کام کی وجہ سے بھی فرق پڑا ہے۔"

"دوسرے کام کو کچھ نہ کہیں" اس نے بے حد غصے سے کہا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا "کیسا خیروبرکت والا کام ہے۔ یہ تو ساری عمر کرتے رہیں، عافیت میں رہیں گے ہم سب۔"

میں گھبرایا کہ وہ طنز کر رہی ہے "طنز کر رہی ہو؟"

"نہیں۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ میں عورت ہوں۔ یہ بات تم سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ ایسی برکت، دیکھنا تو کجا، میں نے سنی بھی نہیں۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتی اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ تم اسی دوسرے کام کو عمر بھر کرتے رہو، کبھی ترک نہ کرو۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"کچن میں چل کر دیکھو تو سمجھ میں آجائے گا۔ آٹے دال، چاول گھی اور سب چیزوں کو دیکھو تو لگے گا کہ سودا آئے صرف تین دن ہوئے ہیں۔ کوئی چیز چوتھائی بھی خرچ نہیں ہوئی ہے۔"

میں نے کچن میں جا کر دیکھا، وہ ٹھیک کہہ رہی تھی "حیرت ہے" حالانکہ اس مہینے مہمانوں کا بھی تانتا بندھا رہا ہے" میں حیرت سے بڑبڑایا۔

"اسی کو خیروبرکت کہتے ہیں۔"

اب میری طمانیت کی کوئی حد نہیں تھی۔ میں اسٹڈی میں آیا اور بیٹھ کر سکون سے لکھنے لگا۔



۹۶ء رخصت ہوتے ہوتے پرانی حکومت کو بھی رخصت کرا گیا۔ اشرفیوں کا سفر جاری تھا۔ بابا عصر نے اسمبلی ٹوٹنے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "یہ بھی خیروبرکت اور اللہ کی تائید کا ثبوت ہے۔ اشرفیوں کا سفر جو جاری ہے" پھر وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ اس کے بعد اچانک انہوں نے کہا "ایک بات یاد رکھنا۔ کوئی بھی اس ملک کو طویل عرصے تک نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"لیکن یہاں امریکا کی تائید کے بغیر کوئی حکومت نہیں کر سکتا" میں بولا۔

"کفر مت بکو" بابا نے مجھے بری طرح ڈانٹا "برا اور ظالم حکمران، رعایا کے برے اعمال کی وجہ سے ان پر مسلط کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کا قہر ہے۔ اب یہ اسی مسبب الاسباب کی مرضی کہ سبب امریکا کو بنادے یا کسی اور کو۔"

۹۷ء آیا اور اپنے ساتھ نئی حکومت لایا۔ لیکن نئے حکمراں نیم دلی سے کام کر رہے تھے اور اس طرح مختلف سمتوں میں دوڑ رہے تھے جیسے ان کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا ہو اور انہیں کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا ہو۔

اشرفیوں کا سفر جاری تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے اس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

پھر ایک رات بابا عصر سے پاکستان کی محبت پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ اسلام کتنی تیزی سے پھیلا۔ دیکھتے ہی دیکھتے، آدھی دنیا پر چھا گیا۔"

"جی ہاں۔" میں نے کہا "وہ بھی معجزہ لگتا ہے لیکن اس کا پاکستان کی محبت سے کیا تعلق ہے؟"

"تم سنا اور سمجھا کرو۔ بعض باتوں کا تعلق بہت..... بہت پیچھے سے ہوتا ہے۔ انہیں سمجھے بغیر سامنے کی بات سمجھ میں نہیں آتی" انہوں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔"

"اللہ نے دکھا دیا کہ اس کی مرضی ہو تو پوری دنیا پر اسلام کو غلبہ پانے میں ذرا دیر بھی نہیں لگے گی۔ مگر اس کی مصلحت، اس کی حکمتیں اور اس کی مرضی کچھ اور ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اگر وہ چاہتا تو سب ایک امت کے ہو جاتے لیکن وہ لوگ بھی تھے، جنہیں ان کے اعمال کے سبب اس نے گمراہ کر دیا۔ جن کے دلوں میں بیماری ڈال دی گئی، جن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ جو جاننے کے باوجود حق کا انکار کرتے رہے، وہ ایمان والوں کے لیے شیطان بن گئے۔

انہیں بہکانے کی کوششیں کرتے رہے۔ انہوں نے ترغیب اور لالچ کے ذریعے' طاقت کے ذریعے ایمان والوں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں' انہیں بہکایا۔ وہ مومنوں کی آزمائش تھے اور ہیں۔ اس آزمائش سے ایمان کے ساتھ گزرنے کا صلہ جنت ہے۔ بہک جانے والوں کے لیے گمراہی ہے اور دوزخ کا عذاب۔ یہ کفر و ایمان کی جنگ ہے جو قیامت تک جاری رہے گی۔

"سو کافر تو اپنی جگہ تھے ہی' اس جنگ کے نتیجے میں مشرک اور منافق بھی پیدا ہوئے۔ طرح طرح کے فتنوں نے جنم لیا۔ بے ایمانوں نے ایمان بیچے اور غداریاں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام کے ہر موڑ پر زوال اور شکست کے پیچھے کسی غدار کا چہرہ نظر آتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ منافق مسلمانوں کے سوا کسی امت میں نہیں ہوئے۔ ہر امت میں انکار کرنے والے بھی گزرے اور شرک کرنے والے بھی لیکن منافق نہیں۔ منافق جو بزدل ہوتے ہیں۔ اوپر سے ایمان والے بنتے ہیں اور اندر انکار کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ چھپ چھپ کے سازشیں کرتے اور شورشیں برپا کرتے ہیں۔ لیکن سوچو تو' منافقوں اور غداروں کا وجود اس امر کی دلیل ہے کہ اسلام دینِ برحق ہے۔ کیونکہ حق اٹل ہوتا ہے۔ اس کو کھلم کھلا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ یہ بے بسی باطل کو سازشیں کرنے' نقب لگانے اور چھپ کر وار کرنے پر مجبور کرتی ہے اور حق کبھی باطل کے ساتھ ایسا نہیں کرتا۔ اس لیے کہ وہ طاقت ور ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ باطل کمزور ہے۔ وہ ہمیشہ للکارتا ہے کہ حق پر آجاؤ ورنہ تمہیں طاقت سے زیر کیا جائے گا۔"

بابا عصر کی یہ دلیل میرے دل میں اتر گئی۔ مجھے افسوس ہوا' خود پر شرم آئی کہ ایسی روشن دلیل بھی ہمیں نظر نہیں آتی۔

"منافق سب سے خطرناک ہے اس لیے کہ اسلام سلامتی کا دین ہے" بابا عصر کہہ رہے تھے "اسلام کسی کلمہ پڑھنے والے کو رد نہیں کرتا۔ خواہ اس کا عمل اسے منافق ثابت کر رہا ہو۔ چنانچہ اپنے خیال کے مطابق منافق کو بڑی سہولت حاصل ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اللہ نے اسے یہ سہولت دے کر اتمام حجت کر دیا۔ اس سے بڑی کوئی قوت کفر کو نہیں مل سکتی کہ ایک منافق مومنوں کی صف میں گھسا' ان کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن جاننے کے باوجود اس سے صرف محتاط رہا جاتا ہے۔ اسے رد نہیں کیا جاتا۔ اسے ختم نہیں کیا جاتا۔ صرف اس لیے کہ بظاہر وہ کلمہ گو ہے۔ یہ ہے اسلام کی شان اور طاقت اور اس کے باوجود وہ ایمان والوں کو گمراہ نہیں کر پاتا تو یہ دلیل ہے اسلام کے دینِ برحق ہونے کی۔ اور یہی اللہ کو منظور تھا۔"

"سبحان اللہ!" میں نے بے ساختہ کہا۔

"سو منافقوں نے کفار اور مشرکوں کے ساتھ مل کر ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ مسلمانوں کے اتحاد کو نقصان پہنچایا۔ کمزور ایمان والوں کو گمراہ کیا۔ عصبیتوں کو فروغ دیا۔ عرب اور عجم کے درمیان نفاق ڈالا۔ اخوت کے تصور کو مجروح کیا۔ ہوسِ اقتدار ابھاری۔ غدار تلاش کئے اور انہیں سازشوں پر اکسایا۔ ظاہری طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو اسلام قیامت تک دنیا پر چھایا رہتا۔ مگر قرآن کو سمجھ کر سوچو تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سب اللہ کی تدبیر کا حصہ ہے۔ ایمان کی آزمائش تو سخت ہوتی ہی ہے کہ اس کا اجر اجرِ عظیم ہے۔ اسے تو باطل کے تمام حربوں کا مقابلہ کر کے استقامت پر رہنا ہے۔ حق کو تعداد' اسلحے اور طاقت میں کم ہونا ہے اور باطل کو زیادہ۔ اس کے بعد وہ باطل پر غالب آئے گا' تبھی تو حق ہوگا۔ لہٰذا اللہ نے باطل کو ہر ممکن طاقت دی' رعایت بھی دی (حالانکہ وہ اس کے لیے سزا ہے... گمراہی میں حد سے گزر جانا) تاکہ اس کے باوجود وہ شکست کا مزہ چکھے اور بدترین بے بسی میں مبتلا ہو۔

"ایک اور زاویے سے دیکھو۔ اگر اسلام پوری دنیا پر چھا جاتا تو لطف کیا رہتا۔ لطف اور سنسنی تو خیر اور شر کی اس جنگ سے ہے۔ جنت اور جہنم کی اہمیت بھی اسی سے ہے۔ اسی لیے تو اللہ نے شیطان کو ڈھیل دی۔ یوم حساب تک کی مہلت بخشی جبکہ شیطان کا کہنا تھا کہ جتنے بھی بندے تیرے راستے پر ہوں گے' میں انہیں بہکاؤں گا اور دیکھ لینا کہ ان میں سے بیشتر گمراہ ہو جائیں گے۔ اللہ نے مہلت دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ ان بہک جانے' گمراہ ہو جانے والوں سے دوزخ کو بھر دے گا اور ثابت قدم رہنے والوں کے لیے جنت ہوگی۔ یعنی فیصلہ اسی وقت ہو گیا تھا کہ نیکی' راستی اللہ کی طرف سے آسان اور شیطان کی وجہ سے بہت دشوار ہوگی۔ جبکہ بدی تو ہے ہی آسان۔ کیونکہ نفس تو ہر بشر کے ساتھ ہے۔ بدی سے روکنے والی طاقت صرف ایمان اور تقویٰ میں ہے۔

"خیر... نتیجہ دیکھو۔ عصبیتیں پھیلیں۔ اسلامی بھائی چارے کے اصول سے انحراف ہوا۔ انتشار پیدا ہوا۔ اتحاد پارہ پارہ ہوا۔ اس کا جو نتیجہ نکلا' وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے اور تم دیکھ بھی رہے ہو۔ مسلمان دھتکاری ہوئی بے گھر اور آوارہ گرد قوم کے ہاتھوں زیر ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں جو استہزا کی حد کو پہنچی ہوئی سرکشی اور اللہ کی نافرمانیوں اور اپنی بے عملی' بزدلی اور میدانِ جنگ سے منہ موڑنے کی وجہ سے راندۂ درگاہ کیے گئے تھے۔ کیسی توہین' کیسی ذلت ہے یہ۔ لیکن ذلت پانے والوں کو شاید اس کا احساس بھی نہیں۔ عرب اور عجم کی باہمی آویزشوں اور نفرتوں نے انہیں نااہل بنا دیا۔ اب عالم اسلام کی سرداری کے لیے کون بچا۔ پاکستان' جو بہت پہلے منتخب کر لیا گیا تھا۔

"یہ ہے پاکستان کی اہمیت۔ اس سرزمین کو اللہ نے خاص اسلام کے لیے منتخب فرمایا۔ یہ وہ واحد ملک ہے جو دین کے نام پر' دین کی خاطر وجود میں آیا۔ یہ نام بے شک کسی نے سوچا' مگر میں کہتا ہوں کہ یہ آسمانوں پر طے ہوا اور اس کے بعد اسے تجویز کرنے والے پر القا کیا گیا۔ یہ ایک مبارک شب کی مبارک ساعتوں میں وجود میں آیا۔ یہ امر آپ اللہ کی تائید اور اس کے مبارک ہونے کا ثبوت ہے۔

"اب کوئی اس ملک سے محبت کرتا ہے' اسے اپنی جان سے بھی زیادہ اہم سمجھتا ہے تو درحقیقت وہ دین سے ہی محبت کر رہا ہے

نا۔ اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کر رہا ہے نا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی محبت بہت بڑا وصف شمار ہوتا ہے اور پاکستان کی ابتدائی نسل کو پاکستان سے عشق تھا اس لیے کہ انہوں نے پاکستان بنتے دیکھا تھا۔ قربانیاں جو دی گئیں' ان کے سامنے تھیں۔ وہ پاکستان کی اہمیت کو بھی سمجھتے تھے۔ بعد میں آنے والی نسلوں کو وہ محبت گھٹی میں پلائی جانی چاہیے تھی۔ جو کچھ ابتدا میں دیا جائے' وہ دیرپا ہوتا ہے۔ شخصیت بننے کے بعد وہ تاثیر نہیں رہتی۔ خرابی یہ ہوئی کہ سیاست نے اپنا کردار ادا نہیں کیا۔ اقتدار والے صرف اپنے اقتدار کی فکر میں رہے۔ نسلوں کی تعمیر کی فکر کسی نے نہیں کی۔ یہ ایک نظریاتی ملک تھا۔ یہاں نظام تعلیم کو خاص طور پر اس نظریے کے تحت استوار کرنا چاہیے تھا۔ یہاں ایک لازمی مضمون ہونا تھا.... پاکستان...ابتدا سے آخر تک۔ مگر یہاں مذہبی جماعتیں اپنے عقیدے کی بنیاد پر الیکشن لڑتی رہیں اور دوسرے سیاست داں امپورٹیڈ نظریات کو استعمال کرتے رہے۔ پاکستان سے محبت کا پرچار کسی نے نہیں کیا۔ کہیں ووٹ لینے کے لیے اسلام کا نام استعمال ہوا تو کہیں ترقی پسندی کا' سوشلزم کا۔ اور اسے بھی اپنے قول و فعل میں تضاد کے ذریعے بدنام اور ناکام کر دیا گیا۔ یہ دہرا نقصان ہوا' لوگ ہر چیز سے بیزار ہو گئے۔

"مذہبی جماعتیں کہتی ہیں کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا۔ یہاں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیے۔ میں کہتا ہوں' اس کام کے لیے تمہاری بھی ضرورت نہیں.... کم از کم سیاسی انداز میں۔ ارے یہ تو ہونا ہے۔ اس ملک میں اسلام کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہے' جو ٹل نہیں سکتی۔ پاکستان کو غیر اہم کیوں کہتے ہو۔ جبکہ اللہ نے اسے اہمیت دی ہے۔ پاکستان سے محبت کرو تو دین سے محبت کرو گے۔ پاکستان ہے تو اس خطے میں دین ہے' ورنہ یہ کفرستان ہے۔ پاکستان ہے تو ہم آزاد مسلمان ہیں ورنہ خدانخواستہ ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے۔ پاکستان سے محبت کرو گے تو یہ اسلام سے محبت بھی ہو گی اور اسلام کی خدمت بھی۔ مگر ان میں بیشتر تو وہ ہیں' جنہوں نے پاکستان کی مخالفت کی...."

"اس لیے کہ قائداعظم کوئی مذہبی آدمی نہیں تھے۔ اور ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا جا رہا تھا" میں نے کہا۔

"اللہ کی مرضی۔ وہ جسے چاہے سعادت عطا کر دے" بابا عصر بولے "دنیا اسباب کا کارخانہ ہے۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ انگریز بھی مسلمانوں سے ڈرتا تھا۔ انہیں آزاد رہ کر پنپنے اور طاقت پکڑنے کا موقع کیسے دیتا۔ اس کے نزدیک ہندو ناقابلِ اعتبار تھے لیکن مسلمان بہت خطرناک۔ محمد علی جناح ہی ایک ایسے شخص تھے جو ظاہر میں اس کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ انگریز کو قدرے بے ضرر لگتے تھے۔ بھئی اللہ جس سے جو کام لینا چاہے' لے لیتا ہے۔

"بنیادی چیز پاکستان سے محبت ہے۔ اس سے محبت کرو۔ اس کے لیے اپنے مفاد ترک کر کے محنت کرو۔ اسے ناقابلِ تسخیر بناؤ۔ یہ دین کا قلعہ ہے۔ یہاں کبھی کوئی اور نظام نہیں آ سکتا۔ اب عمل کے لحاظ سے ہی دیکھ لو۔ اسلام کا نام لینے والے اس کے نام پر کلمہ گو بھائیوں کو کاٹ ڈالتے ہیں۔ مغربی نظام کے حامی سیاست داں' خود غرض' مفاد پرست اور لٹیرے ہیں۔ پاکستان سے محبت کرنے والا نسبتاً بہتر ہے۔ اس میں تعصب ضرور ہے مگر وہ بھی سیاست دانوں کے ایکسپلائٹیشن کا نتیجہ ہے۔ اس کی ایک وجہ پاکستان سے محبت کا نامکمل ہونا ہے۔ پاکستان کو اللہ کی طرف سے نعمت سمجھو' اس کی اہمیت سمجھو۔ ہندوؤں کی غلامی کا تصور کرو تو ہر پاکستانی ہر پاکستانی سے محبت کرے گا۔ یکجہتی کی فضا پیدا ہو گی۔ میں صرف ایک بات کہتا ہوں۔ اسلام متحد کرتا ہے' منتشر نہیں۔ سب سے بڑی ضرورت اتحاد ہے۔ سب سے اہم پاکستان ہے۔ اس کی حفاظت خود اللہ فرما رہا ہے۔ اس کا قیام بھی معجزہ اور اس کا قائم رہنا بھی معجزہ۔"

میں دم بخود تھا۔ حارث بن عثمان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"تم لوگوں کو تو دنیا کے تمام مظلوم مسلمانوں کے آنسو پونچھنے ہیں۔ پہلے ایک دوسرے سے محبت تو کر لو۔ ایک دوسرے کے لیے آنسوؤں کا سامان کرنے کے بجائے ایک دوسرے کے آنسو پونچھنا تو سیکھ لو۔"

"اب شاید تمہاری سمجھ میں پاکستان سے محبت کی اہمیت آ گئی ہو گی" بابا عصر نے کہا "اب آج کے اشرفیوں کے سفر کی روداد سنو..."

○☆○

اس رات بابا عصر نے جو واقعات سنائے' ان میں سے ایک کے بارے میں' میں نے فیصلہ کیا کہ اسے ضرور لکھوں گا۔

گھر پہنچ کر میں نے قلم کھولا اور پیڈ اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اسی لمحے بابا عصر کی آواز میرے کانوں میں گونجی اور اس کے ساتھ ہی منظر تبدیل ہو گیا۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ میرا قلم پیڈ پر رواں تھا۔

○☆○

وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ دور دور تک سب کچھ بہت روشن تو نہیں' البتہ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو نہ دیکھ پاتے۔ یہی وجہ تھی کہ زرینہ کو الجھن ہو رہی تھی۔ اس رات برکت بہت الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ زرینہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ برکت کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات رہ رہ کر بدل رہے تھے۔ ابھی وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا ہوتا۔ ایک پل میں اس کی آنکھوں میں محبت کی جگہ ایک عجیب سی حسرت لے لیتی۔ اور اگلے ہی لمحے ان میں نفرت دہکنے لگتی۔ وہ دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگتا۔ اور اس کے بعد پھر اچانک وہی محبت کا لمحہ آ جاتا۔

"برکت' تم مجھے پاپا سے مانگ کر تو دیکھو" بالآخر زرینہ نے چپ توڑی۔

"تم اس کا انجام جانتی تو ہو جیناں" برکت نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"ہاں، جانتی ہوں" زرینہ نے آہ بھر کے کہا "اسی لیے تو کہتی ہوں کہ کہیں بھاگ چلیں۔ خدا کی قسم، میں تمہارے ساتھ جھونپڑی میں بھی خوش رہوں گی، پر تم مانتے نہیں۔"

"کیسے مان لوں۔ چوہدری جی کی زمین بہت بڑی ہے اور ان کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ ان کی زمینوں سے باہر بھی بہت دور تک جاتے ہیں۔ ان کے کتوں کے دانت اور پنجے بہت تیز ہیں اور انسان کا گوشت انہیں سب سے زیادہ پسند ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟" زرینہ نے جھرجھری لے کر کہا۔

"مسئلہ یہی ہے کہ تم کچھ بھی نہیں جانتیں" برکت نے ذرا چڑ کر کہا "ہم ابھی پوری جان سے بھاگنا شروع کردیں، سورج نکلنے تک بھاگتے رہیں۔ پھر دن بھر بھی بھاگتے رہیں تو سورج تمہارے پاپا چوہدری صاحب کی زمینوں میں ہی غروب ہوگا۔ پھر فرض کرلو، ہم ان کی زمینوں سے دور نکل جائیں، کہیں کوئی جھونپڑی بنا کر رہنا شروع کردیں تو بھی کسی دن چوہدری جی کا اَن دیکھا ہاتھ ہمیں دبوچ لے گا۔ تم حویلی میں بند کردی جاؤ گی اور مجھے زندہ چوہدری صاحب کے خونخوار کتوں کے سامنے ڈال دیا جائے گا۔" برکت نے گہری سانس لی اور قدرے بلند آواز میں بولا "خدا کی قسم، میں مرنے سے نہیں ڈرتا مگر کتوں کی غذا بننے میں بے عزتی کا احساس ہوتا ہے۔ موت ملے تو شہادت کی ملے۔"

"تو کیا سچ مچ پاپا کے پاس ایسے کتے ہیں؟" زرینہ نے سہم کر پوچھا۔

"ہاں، وہ پھٹے ہوئے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں چھوڑتے۔"

زرینہ کانپنے لگی "مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔"

"تمہیں تو بہت کچھ معلوم نہیں ہے" برکت نے کہا اور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

زرینہ کو اس کی نگاہوں سے خوف آنے لگا۔ وہ نگاہیں اس کے لیے نئی تھیں۔ وہ جیسے اسے بے لباس کیے دے رہی تھیں اور اس کے اَدھ کھلے ہونٹوں سے اس کے چمکدار دانت جھانک رہے تھے۔ وہ بہت سفاک لگ رہا تھا، جیسے وہ کوئی بھیڑیا ہو "ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟" زرینہ نے گھبرا کر کہا "مجھے ڈر لگ رہا ہے تم سے۔"

ایک دم ان نگاہوں کا تاثر بدل گیا "میں کیسا ہی لگوں۔ تم مت ڈرا کرو مجھ سے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

"مگر ایسے کیوں دیکھتے ہو؟"

"انسان ہوں نا۔"

"میری سمجھ میں آج تمہاری باتیں نہیں آرہی ہیں" زرینہ منمنائی۔ اسے برکت سے چھپ چھپ کر ملتے ہوئے چھ مہینے ہوگئے تھے۔ برکت نے کبھی اسے ایسے ویسے چھوا تک نہیں تھا۔ مگر آج کسی کسی لمحے اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اسے بھنبھوڑ ڈالے گا۔ یوں تو وہ خود چاہتی تھی کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں ایسے بھینچے کہ اس کی سانسیں رک جائیں لیکن محبت سے..... ان نظروں کے ساتھ نہیں، یہ تو کوئی اور چیز ہے "تمہیں ہوا کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جیناں، آج ہم آخری بار مل رہے ہیں" برکت نے دھماکا کیا۔ "اس کے بعد کبھی نہیں ملیں گے۔"

زرینہ بھونچکی ہوگئی "کیوں بھئی؟"

"اس لیے کہ میں یہاں نہیں ہوں گا۔"

"کیوں؟ کہاں جاؤ گے؟"

"شاید مر جاؤں۔ یا پھر فوج میں بھرتی ہوجاؤں۔"

"کیا ہوگیا ہے تمہیں؟" زرینہ پریشان ہوگئی۔

"چوہدری جی نے ناجو کو حویلی میں طلب کیا ہے" برکت پھٹ پڑا۔

"تمہاری بہن کو؟" اس کی آنکھوں میں اثبات دیکھ کر زرینہ بولی "کیوں؟ حویلی میں کام کرنے کے لیے؟"

برکت نے اس زور سے ہونٹ دانتوں سے دبائے کہ خون نکل آیا "نہیں..... اپنے نفس کے کتے کے آگے ڈالنے کے لیے۔"

زرینہ کی سمجھ میں پہلے تو کچھ بھی نہیں آیا۔ سمجھ میں آیا تو اسے یقین نہیں آیا "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ناجو کوئی پہلی لڑکی نہیں ہے اس جاگیر کی، نہ آخری ہے جسے یہ حکم ملا ہو۔ اس جیسی سیکڑوں جاچکی ہیں تمہاری حویلی میں۔ تم نے اپنی پوری حویلی دیکھی ہی کب ہے" برکت نے تلخ لہجے میں کہا۔

زرینہ پانی پانی ہوگئی۔

"چوہدری کا حکم ہے کہ ناجو سورج نکلنے سے پہلے خود حویلی پہنچ جائے۔ ورنہ اس کے بندے اسے اٹھالے جائیں گے زبردستی۔"

اس بار زرینہ کی سمجھ میں بہت کچھ آگیا۔ وہ برکت کی نظروں کا مفہوم بھی سمجھ گئی اور جو اس نے پوچھا تھا کہ مجھے ایسے کیوں دیکھتے ہو اور اس نے جواب میں کہا تھا، انسان ہوں نا..... تو اس کا مطلب بھی وہ سمجھ گئی۔ اس نے جان لیا کہ اس وقت برکت کے اندر کیسا طوفان اٹھ رہا ہے۔ برکت کو خیال آیا ہوگا کہ اس رات کی تنہائی میں وہ اپنی بہن کے لٹنے سے پہلے اسے لوٹ سکتا ہے۔ پیشگی بدلہ لے سکتا ہے اور یہ عین انصاف ہوگا۔ یہ سب سوچ کر ایک لمحے کے لیے اس کا بدن کانپا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ پُرسکون ہوگئی "میں حاضر ہوں برکت۔ اگر مجھ سے تمہیں کچھ سکون مل سکتا ہے تو ضرور حاصل کرلو۔" وہ بولی۔

برکت شرمندہ نظر آنے لگا "یہ خیال آیا تھا مجھے..... پر میں ایسے کر تو نہیں سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں جیناں۔"

زرینہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں محبت ہی محبت تھی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "اب تم کیا کرو گے؟"

"یہ پوچھو کہ میں کیا کرنا چاہتا تھا" برکت نے کہا پھر خود ہی جواب دیا "میں نے سوچا تھا کہ ناجو کو حویلی جانے سے تو میں نہیں روک سکوں گا۔ چوہدری سے کبھی کوئی اپنی بہن یا بیٹی بلکہ بیوی کو بھی نہیں بچاسکا۔ پر میں مزاحمت کروں گا، جان دے دوں گا، بے غیرتی قبول نہیں کروں گا۔ پر رب کو یہ منظور نہیں ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"میں نے سوچا، تم سے آخری بار مل لوں۔ یہاں آرہا تھا کہ راستے میں ایک مسافر مل گیا۔ اس نے مجھے ایسی امانت دے دی جسے پہنچائے بغیر میں مرنا بھی نہیں چاہتا اور اسے امانت دار تک پہنچانے میں نہ جانے کتنا وقت لگے اور اس کے بعد میں مزاحمت کی موت تو نہیں، ہاں حرام موت مرسکتا ہوں۔ راستے میں، مَیں نے سوچا اس سے اچھا ہے کہ شہادت کی آرزو کروں۔ فوج میں بھرتی ہوجاؤں اور کبھی گاؤں واپس نہ آؤں۔ بتاؤ، میں کیا کروں؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

زرینہ نے اس کے آنسو اپنی انگلی سے پونچھے اور پھر اپنی انگلیوں کو چوم لیا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگالیا "میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتی برکت۔ اتنی محبت کرتی ہوں تم سے۔ پر بہتر یہی ہے کہ تم ناجو کو بچاتے ہوئے مرجاؤ۔ تمہارے بعد میں بھی جان دے دوں گی، یہی پاپا کی سزا ہوگی۔"

"پر اب میں ایسا نہیں کرسکتا..... اس امانت کی وجہ سے۔ یہ تو وطن کی امانت ہے نا۔ اس سے میں کیسے منہ موڑوں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ مجھے اپنے وطن سے اتنا پیار ہے۔ یہ مٹی مجھے اپنی عزت آبرو اور جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ اس کے لیے میں ذلت اٹھاکر بھی جی سکتا ہوں۔"

زرینہ کو تجسس ہوا "دکھاؤ تو کیا ہے؟" اس نے کہا۔

برکت نے اشرفیاں نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ چوہدری کے آدمی اس پر قیامت کی طرح ٹوٹ پڑے۔



چوہدری مہردین کے وہ چاروں آدمی اصل میں برکت کے گھر کے پہرے پر تھے۔ یہ چوہدری کا اصول تھا کہ جس گھر میں بلاوا بھجوادیتا، مقررہ وقت تک اس گھر پر نظر رکھی جاتی تھی۔ یہ محض احتیاط تھی کیونکہ بھاگنے کی ہمت تو کسی کو نہیں ہوتی تھی مگر چوہدری اپنے شکار کو کھونے کا قائل نہیں تھا۔ وہ یہ خطرہ مول لیتا ہی نہیں تھا کہ اس کی مطلوبہ لڑکی کو نکالنے کا کوئی موقع متاثرہ خاندان کو ملے۔ ایک بار بھی ایسا ہوتا تو اس کی ناک ہمیشہ کے لیے نیچی ہوجاتی اور چوہدری مہردین کو اپنی ناک بہت عزیز تھی۔

رات کے پہرے پر اصغر، نادر، آکا اور عاقل تھے۔ ولایت کا گھر الگ تھلگ تھا۔ ادھر اُدھر بس کھیت ہی کھیت تھے۔ چوہدری کا حکم پہنچنے کے ساتھ ہی پہرا ڈال دیا گیا تھا۔ وہ چاروں بے فکر تھے۔ مگر آدھی رات کے بعد برکت کے گھر سے انہوں نے کسی کو نکلتے دیکھا۔ چاندنی کی وجہ سے انہیں پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی، وہ ولایت کا بیٹا برکت تھا۔

اصغر سب سے سینئر ہونے کے ناتے انچارج تھا۔ آکا نے اس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ کیا برکت کو روکا جائے۔ اصغر نے نفی میں سرہلادیا۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بلاوجہ ہنگامہ کرنے سے فائدہ۔ لیکن خود اصغر کو بھی تجسس تھا کہ اس وقت برکت کہاں جارہا ہے۔ پھر اس نے سوچا، ممکن ہے، رفع حاجت کے لیے جارہا ہو۔ اصغر آکا کو پسند نہیں کرتا تھا۔ آکا میں وحشت بہت تھی۔ مارپیٹ اس کا شوق تھا۔ چوہدری کا آدمی تھا اس لیے اس کا شوق پورا ہوتا رہتا تھا۔ خون بہانے میں اسے خاص لطف آتا تھا۔

ایک بجے پہرا دینے کے لیے دوسری ٹولی آگئی۔ اصغر نے چلتے چلتے آنے والوں کو ہدایات دیں "پانچ بجے تک ناجو باہر آجائے تو خاموشی سے اس پر نظر رکھنا۔ اسے حویلی کے سوا کہیں نہیں جانا ہے۔ اِدھر اُدھر جاتی نظر آئے تو اٹھالینا اور حویلی لے آنا۔"

"اور وہ باہر نہیں آئے تو؟"

اصغر نے سوال کرنے والے کو ملامتی نظروں سے دیکھا۔ "اوئے تم کب سے ہو چوہدری جی کے پاس۔ اتنا بھی نہیں معلوم" اس کے لہجے میں بھی ملامت تھی۔ "اوئے پانچ بجے تک لڑکی باہر نہ آئے تو گھر میں گھس کر اٹھالینا اسے۔ آئی تمہیں سمجھ کہ نہیں؟"

اس کے بعد وہ چاروں حویلی کی طرف چل دیے۔ حویلی سے کچھ دور کھیت کے باہر سے گزرتے ہوئے انہیں کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ بولنے والا سرگوشی میں بول رہا تھا لیکن اتنے گہرے سناٹے میں تو آدمی سوچے بھی تو وہ سنائی دینے لگتا ہے۔ پھر نسوانی آواز بھی سنائی دی تو وہ رک گئے اور چوکنے پن سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اس کے بعد وہ آوازوں کی سمت چلنے لگے۔ اچانک ٹالی کے درخت کے نیچے انہیں وہ دونوں بیٹھے نظر آگئے۔

برکت پر ٹوٹ پڑنے والوں میں آکا سب سے آگے تھا۔ زرینہ برکت کو بچانے کی کوشش کررہی تھی۔ اصغر نے اس کے دونوں ہاتھ جکڑلیے۔ اس وقت اس کی عجیب کیفیت ہورہی تھی۔ زرینہ پر کب سے اس کی نظر تھی لیکن چوہدری صاحب کی دھی کو وہ کن انکھیوں سے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہاتھ جکڑنے کے بعد اس نے زرینہ کو بے بس کرنے کے بہانے لپٹالیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے نصیب کو کوس رہا تھا۔ اس وقت وہ اکیلا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ زرینہ سے اپنی خاموشی کی قیمت وصول کرسکتا تھا اور سلسلہ چل نکلے تو پھر وہ کب رکتا ہے۔ مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ یہاں تو تین مسٹنڈے اور تھے۔ اس جھنجلاہٹ نے اس کی گرفت سخت کردی۔

"تمہاری یہ جرأت کہ مجھ کو ہاتھ لگاؤ" زرینہ نے نفرت سے کہا۔ وہ چوہدری کی بیٹی تھی اور اسے جکڑنے والا چوہدری کا غلام۔

"آپ کا فیصلہ چوہدری صاحب کریں گے۔ آپ بس گھر چلو" اصغر نے بوجھل آواز میں کہا۔

زرینہ نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ اس بہانے اصغر کو کچھ اور قربت کا موقع مل گیا۔ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا "نہ بی بی، ایسے نہیں کرتے" اس نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن..... لیکن یہ اسے مارڈالیں گے..... برکت کو....." زرینہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔

اس پر اصغر کو کچھ ہوش آیا۔ واقعی..... وہ برکت کو بری طرح ماررہے تھے اور ان میں آکا بھی تھا جو شوقیہ بندے کو مار بھی سکتا

تھا۔ اس نے انہیں ڈانٹا "اوئے.... مارنا نہیں ہے۔ بس پکڑ کر حویلی لے چلنا ہے۔ روکو ہاتھ۔"

حسبِ توقع احتجاج بھی آکے نے ہی کیا "لیکن بھا' اس نے چوہدری جی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے" اس نے لذت لیتے ہوئے کہا۔

"تو یہ چوہدری جی کا مجرم ہے" اصغر بولا "اور ان کے مجرم ان تک پہنچنے سے پہلے مرجائیں تو اسے لانے والے بھی زندہ نہیں بچتے۔"

عاقل اور نادر کے ہاتھ فوراً رک گئے لیکن آکا نے چھوڑتے چھوڑتے بھی اپنی کچھ تسلی کرلی۔ اس وقت تک برکت نڈھال ہوچکا تھا۔

برکت کی جان چھوٹی تو زرینہ کو اپنا ہوش آیا۔ اصغر نے اسے عجیب انداز میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ شرم سے نڈھال ہوگئی۔ اسے غصہ بھی شدید آیا "چھوڑو مجھے۔ ہاتھ نہ لگانا" اس نے اصغر کو ڈانٹا۔ اصغر نے بادلِ ناخواستہ اسے چھوڑدیا۔

وہ سب حویلی کی طرف چل دیے۔ حویلی کے قریب پہنچ کر اصغر رک گیا۔ اس نے عاقل سے کہا "بی بی کا وہاں اس طرح جانا چوہدری جی کو پسند نہیں ہوگا۔ تم جاکر انہیں بتاؤ۔"

وہ تینوں برکت کو لے کر چلے گئے۔ اصغر زرینہ کو لے کر وہیں رک گیا۔



چوہدری کو جگانا کارے دارد تھا۔ بڑی مشکل سے اسے اٹھایا گیا لیکن اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ بہرحال وہ اس بڑے ہال نما بیٹھک کی طرف چل دیا جسے وہ دربار کہتا تھا۔ وہاں اسے اپنے تین خاص بندے نظر آئے لیکن برکت کو دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا "اس نے مزاحمت کی تو مجھے جگانا کیوں ضروری تھا؟" وہ عاقل پر برس پڑا۔

"یہ بات نہیں ہے چوہدری جی!" عاقل نے اسے کان میں اصل صورتِ حال بتائی۔ چوہدری کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے سب سے پہلے حویلی کے پہرے دار کو اِدھر اُدھر کیا تاکہ زرینہ کو رازداری کے ساتھ گھر میں لایا جاسکے۔ اس کے بعد وہ دربار میں آیا۔ اس بار اصغر بھی اس کے ساتھ تھا۔

چوہدری اپنی چوکی پر بیٹھ گیا "اب بتاؤ' کیا بات ہے؟" اس نے کڑے لہجے میں کہا۔

"سرکار' میں تو اسے جان سے ماردیتا پر آپ کے لیے چھوڑ دیا" آکا بولا "یہ سرکار وہاں بی بی کے ساتھ...."

"بس....." چوہدری ہاتھ اٹھا کر دہاڑا "میں سمجھ گیا۔ میرے بھوکے کتے بدنصیب ہیں کہ انہیں صرف چار زبانیں ملیں گی۔"

یہ سن کر وہ چاروں کانپنے لگے "چوہدری جی! آپ تو جانتے ہیں کہ ہم آپ کے بندے ہیں" اصغر گڑگڑایا۔

"اسی لیے تو زندہ چھوڑ رہا ہوں" چوہدری نے سفاکی سے کہا۔

"شکر کرو کہ جاہل ہو ورنہ ہاتھ بھی کٹوانے پڑتے۔"

"پر چوہدری صاحب' بات پھیلنے کے ڈر سے ہی تو میں پیچھے رک گیا تھا" اصغر نے صفائی پیش کی۔

چوہدری کے چہرے پر نرمی نظر آئی "وہ تو ٹھیک ہے پر زبان کبھی پھسل بھی جاتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہوگا سرکار۔ ہم آپ کے وفادار ہیں۔"

چوہدری چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "ٹھیک ہے۔ پر یاد رکھنا' زبان کھولنے والے کی نسل ہی ختم کردوں گا میں۔"

"آپ بے فکر رہیں چوہدری جی!" وہ چاروں بیک آواز بولے۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم تینوں جاؤ' بس اصغر یہاں رکے گا۔"

ان تینوں کے جانے کے بعد چوہدری نے اصغر سے کہا "اب ذرا اسے میرے قریب تو لا۔"

اصغر برکت کو دھکیلتا ہوا چوہدری کے نزدیک لے گیا۔ چوہدری نے برکت کو نفرت سے گھورا "اتنی بڑی جرأت!"

صدیوں کا محکوم لرز اٹھا "چوہدری جی' خدا کی قسم میں نے کبھی جیناں کو چھوا بھی نہیں' ہم بس ملتے رہے ہیں۔"

چوہدری آپے سے باہر ہوگیا۔ غلام آقا زادی کا نام اتنی بے تکلفی سے لے رہا تھا "تجھے نہیں معلوم۔ تیرا اسے اتفاقاً دیکھ لینا بھی بہت بڑا جرم ہوتا۔"

"اور آپ گاؤں کی بہو بیٹیوں کو حویلی بلوا سکتے ہو؟" محکوم تڑپ کر بولا۔

"ہماری بات اور ہے..."

"تم خدا تو نہیں ہو چوہدری" اس بار برکت نے بڑی نفرت سے کہا۔

اس سے پہلے کہ چوہدری کچھ کہتا' وفادار اصغر نے برکت کے پوری قوت سے لات رسید کی "اوئے.... زبان لڑاتے ہو چوہدری جی سے۔"

برکت چوہدری کے قدموں میں پہلو کے بل گرا لیکن چوہدری کی نظریں اس کے وجود پر نہیں' قالین پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور حرص و طمع گلے مل رہی تھیں۔

قالین پر دو بہت چمک دار اشرفیاں پڑی تھیں۔ وہ برکت کی جیب سے گری تھیں۔ چوہدری نے جھک کر انہیں اٹھالیا۔ ہاتھ میں اشرفیاں لیتے ہی وہ حیران ہوا۔ اشرفیاں اس کے اندازے سے بہت زیادہ بھاری تھیں۔ پھر اسے اور حیرت ہوئی۔ وہ قالین پر پڑی تھیں اور اس نے انہیں بالکل صاف دیکھا تھا۔ ان پر کچھ لکھا نہیں تھا مگر اب ان پر اللہ لکھا نظر آرہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دوسری طرف کلمہ لکھا تھا۔

چوہدری کچھ خوف زدہ ہوگیا لیکن پھر تجسس خوف پر حاوی آگیا۔ اس نے سوچا' ممکن ہے مجھے نظر کا دھوکا ہوا ہو۔ سوتے سے اٹھا ہوں نا' اب وہ لالچ کے تحت ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ سونے کی ہیں۔ پر سونا اتنا زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ

جانتا تھا کہ وہ بہت قیمتی ہیں۔ وہ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ حروف اوپر لکھے ہوئے نہیں تھے، وہ اشرفیوں کے اندر کئی رنگوں سے ابھرے ہوئے تھے اور ان سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر اشرفیوں کا وزن بھی گواہی دیتا تھا کہ اندر یقیناً قیمتی جواہرات کی تحریر ہے اور شعاعوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہیرے، زمرد، نیلم اور یاقوت بہت نایاب قسم کے ہیں۔ یہ کروڑوں کا..... بلکہ شاید اربوں کا مال ہو۔

چوہدری اپنی عزت، جیناں کو بھی بھول گیا۔ ان اشرفیوں کے سوا اسے کسی بات کا خیال نہیں تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس کنگلے برکت کو یہ کہاں سے مل گئیں۔ اس نے برکت کو کڑی نظروں سے دیکھا "تو تو چور بھی ہے" وہ بولا "یہ کہاں سے چرا کر لایا ہے؟"

"میں چور نہیں ہوں چوہدری، یہ مجھے کسی نے امانت دی ہے۔"

"کیسی امانت؟"

برکت اسے تفصیل بتانے لگا۔ چوہدری غور سے سنتا رہا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ برکت سچ بول رہا ہے پھر اسے یہ بھی یاد آیا کہ فرش پر پڑی تھیں تو وہ عام سی اشرفیاں تھیں، جن کے اندر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ برکت سب کچھ بتا چکا تو وہ بولا "تو یہ ایک اشرفی تیری ہے اور دوسری تو کسی امانت دار کو دے گا؟"

"جی نہیں۔ میں دونوں آگے بڑھادوں گا" برکت نے کہا اور پھر اس کی وجہ بتائی۔

"یہ اور بھی اچھا ہے" چوہدری نے خوش ہو کر کہا "تو یہ اشرفیاں مجھے دے دے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ میں تمہیں نہیں دوں گا چوہدری!"

چوہدری کی نرمی اور اس کا تحمل حیرت انگیز تھا "او جھلے، میں بے ایمان نہیں ہوں۔ ایک رکھوں گا، دوسری آگے بڑھادوں گا۔"

"نہیں چوہدری۔ یہ پاکستان کی ہیں، پاکستان کے لیے اہم ہیں۔ یہ میں تمہیں کیوں دوں؟"

"اوئے پاکستان ہمارا ہے۔ ہم پاکستان کے ہیں" چوہدری نے سینہ تان کر کہا۔

"اسی کا تو افسوس ہے" برکت نے نفرت سے کہا "یہ میں تمہیں نہیں دوں گا۔"

"دیکھ، یہ تو ہیں ہی میرے قبضے میں۔ میں زبردستی بھی لے سکتا ہوں۔ بس ان کا ہی احترام کر رہا ہوں۔ ان میں اللہ کا نام اور کلمہ لکھا ہوا ہے نا، اس لیے۔ تو یہ مجھے ہنسی خوشی دے دے۔"

بات معقول تھی، برکت نے سوچا..... چوہدری بھی خوفِ خدا والا ہے لیکن اگلے ہی لمحے اس کے اندر کسی نے اسے سمجھایا کہ یہ خوفِ خدا نہیں، سزا کا خوف ہے۔ چوہدری ڈرتا ہے کہ اللہ ناراض ہوا تو سب کچھ چھین لے گا اور پھر وہ ایک اشرفی رکھے گا تو دوسری کا لالچ بھی کرے گا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ میں تمہیں اپنی خوشی سے کبھی نہیں دوں گا۔"

"دیکھ برکتے، اس کے بدلے میں تجھے زندگی بخش دوں گا۔ بس تو یہاں سے چلے جانا اور کبھی واپس نہ آنا۔"

"زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ ہے چوہدری!"

چوہدری سوچتا رہا۔ وہ اشرفیاں کرامت والی چیز بھی تھیں اور بہت قیمتی بھی تھیں۔ ڈرنے کی بات یہ تھی کہ ان میں اللہ اور کلمہ لکھا ہوا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا، اس معاملے میں زبردستی اچھی نہیں۔ کوئی بہت بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بالآخر اس نے نرم لہجے میں کہا "ناجو تیری بہن ہے نا؟"

برکت کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے بھی چھوڑ دوں گا۔ کبھی اس کے متعلق سوچوں گا بھی نہیں۔ تو یہ اشرفیاں مجھے سونپ دے۔ مجھے امانت دار بنادے ان کا۔"

برکت کے لیے وہ بہت بڑی ترغیب تھی۔ ایک لمحے کو..... صرف ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ ہاں کہہ دے۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ شرمندہ ہو گیا۔ یہ تو وطن سے غداری ہوگی۔ لیکن نہیں، اس نے سوچا۔ ایک سہولت تو ہے۔ چوہدری بے ایمان ہوا تو اشرفیاں میرے پاس واپس آجائیں گی۔ اس میں نقصان کا تو کوئی پہلو ہے بھی نہیں۔ بہن کی عزت بھی بچ جائے گی۔ وہ ہاں کہنے ہی والا تھا کہ اس کے اندر ایک آواز ابھری، مگر یہ سوچ کہ اس سے پہلے تو ہی بے ایمان ثابت ہو جائے گا۔ تو ان اشرفیوں کی قیمت جو وصول کر رہا ہے۔ تو پاکستان کی عزت، خود انحصاری اور استحکام اور دین کی سربلندی کی علامت اشرفیوں کو چوہدری جیسے بدکار، بے ایمان اور خائن آدمی کو سونپ کر ان کی بے حرمتی کرنا چاہتا ہے..... اور وہ بھی اپنی غرض کے لیے۔ نہیں برکت، بہن کی عزت ملک کی عزت سے بڑی نہیں۔

"میں یہ تمہیں دے ہی نہیں سکتا چوہدری!" برکت نے سر اٹھا کر، چوہدری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

مگر چوہدری ڈر اور خوف کے باوجود ان اشرفیوں سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا اور وہ زبردستی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا "سن..... جو زمینیں تیرے زیرِ کاشت ہیں، وہ میں تیرے نام کردوں گا، بس تو راضی ہو جا۔"

"چوہدری..... میں رشوت لینے والا نہیں ہوں۔"

چوہدری پھر سوچنے لگا۔ اس کے شاطر سیاسی ذہن نے اسے سمجھایا کہ اس کے پاس ترپ کا اِکّا ہے..... آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ ایک سیاسی نظیر بھی قائم ہو جائے گی۔ الیکشن جیتنا بھی آسان ہو جائے گا۔ مگر یہ پتا کھیلنے میں اس کی انا برکت کے پیروں تلے کچل جاتی۔ پھر بھی غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ فائدہ توہین کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔ سیاسی فائدے کے علاوہ کروڑوں اربوں کی وہ اشرفیاں بھی اسے مل رہی ہیں۔ اس نے کہا "برکتے میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک اشرفی صحیح امانت دار کو پہنچاؤں گا۔ دیکھ، میں ملک و قوم کو نقصان کیسے پہنچا سکتا ہوں۔ اور سن، میں تجھے اپنا داماد بنانے کو بھی تیار ہوں۔ میں جیناں کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دوں گا۔"

یہ سن کر اصغر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے سوچا' چوہدری جی پاگل ہو گئے ہیں۔ جو چیز اختیار میں ہے' اسے مانگ رہے ہیں۔ اس کی بڑھ چڑھ کر قیمت لگا رہے ہیں۔

ادھر برکت بھی بھونچکا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چوہدری اس حد تک بڑھ جائے گا۔ ایک لمحے کو اس کا دل یوں دھڑکا جیسے ناچ اٹھا ہو۔ اسے جیناں سے بہت محبت تھی اور وہ اسے ناقابل حصول سمجھتا تھا اور اب وہ اسے مل رہی تھی۔ زمین آسمان مل رہے تھے مگر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ جیناں کا حصول بہن کی عزت سے بڑھ کر تو نہیں ہے اور جس بات کے لیے وہ لڑ رہا ہے' وہ بہن کی عزت سے بھی بڑی ہے۔ وطن کے استحکام اور دین کی سربلندی کے معاملے میں وہ ایمان دار ہو کر بھی بے ایمان بن جائے' یہ تو خسارے کا سودا ہے۔ اس نے مستحکم لہجے میں کہا ''نہیں چوہدری' یہ اشرفیاں میں کسی قیمت پر تمہیں نہیں سونپوں گا۔''

چوہدری کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ترپ کا اکا بھی رائگاں ہو گیا تھا۔ اب اسے فیصلہ کرنا تھا۔ اس نے اشرفیوں پر نظر ڈالی اور فیصلہ ہو گیا۔ اشرفیوں کا لالچ ڈر اور خوف پر حاوی ہو گیا۔ اس نے بے حد نفرت سے برکت کو دیکھا۔ ''میں تو تجھے آزما رہا تھا۔ اشرفیاں تو میرے پاس ہی ہیں' مجھے تیری اجازت کی ضرورت نہیں'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا ''اور تو نے ثابت کر دیا کہ تو بہت ڈھیٹ اور اڑیل ہے۔ اب میں تجھے ایسی موت دوں گا جس کا تو نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا'' پھر وہ اصغر کی طرف مڑا ''اصغر' اسے لے جا کر بند کر دے اور ہاں' ناجو آجائے تو اسے بنا سنوار کر میرے کمرے میں لے آنا.... اور اسے بھی ہاتھ پاؤں باندھ کر لے آنا۔ اسے میں ایک بہت خوب صورت تماشا دکھاؤں گا.... مفت.... بغیر ٹکٹ کے'' یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔

بستر پر لیٹ کر چوہدری اشرفیوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ اسی عالم میں اسے نیند آ گئی۔



صبح اصغر نے برکت کو بندی خانے سے نکالا تو دھوپ نکل چکی تھی۔ اصغر نے اس کے پاؤں کھولے اور بولا ''چل اوئے' اب مفت میں زندہ ناچ گانے والی انگلش فلم دیکھنے کے لیے تیار ہو جا'' برکت کے تیور بدلتے دیکھ کر اس نے ریوالور لہرایا ''کوئی گڑبڑ مت کرنا۔ مجھے تجھ سے کوئی محبت نہیں ہے اور ٹانگوں پر گولی چلانے سے چوہدری صاحب بھی نہیں روکتے۔''

برکت کا خون کھول رہا تھا۔ وہ یقیناً بھڑ جاتا لیکن اسے اپنے دونوں فیصلے یاد تھے۔ سب سے پہلے تو اسے اشرفیوں کی فکر کرنی تھی کیونکہ بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے باوجود وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اشرفیاں اس کے پاس واپس آ چکی ہیں۔ گویا اشرفیاں سونپنے والے نے جو کچھ کہا تھا' درست تھا اور اسے جلد از جلد انہیں آگے بڑھانا تھا۔ دوسرے یہ کہ اسے حرام موت سے بچنا تھا اور شہادت کی آرزو میں جینا تھا۔

''چل آگے بڑھ'' اصغر نے اسے دھکا دیا۔

اچانک برکت خوف زدہ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا دکھانے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ اس کی روح تک کانپ گئی۔ ''اے اللہ' میری مدد فرما'' اس نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھاتے ہوئے سرگوشی کی لیکن اب ایک قدم اٹھانا بھی اسے دوبھر لگ رہا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ پھانسی کے مجرم پھانسی کے گھاٹ تک کیسے جاتے ہوں گے۔

اصغر کا رخ حویلی کے اس حصے کی طرف تھا جو اصل حویلی سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ وہاں مہمان خانہ تھا۔ اس طرف جانے کی اجازت صرف چوہدری کے خاص ملازموں کو تھی یا پھر اسے جسے چوہدری صاحب بلائیں۔ وہ چوہدری کا عشرت کدہ تھا۔

چوہدری برکت کا فیصلہ کرنے کے بعد حویلی کے زنان خانے میں جانے کے بجائے اپنی مہمان خانے والی خواب گاہ میں چلا آیا تھا۔ اس وقت وہ جاگ چکا تھا لیکن متورم آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ وہ مسہری پر نیم دراز تھا۔ سہمی ہوئی ناجو بھی مسہری پر سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ چوہدری اسے بھوکی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اسی لمحے اصغر برکت کو لے کر خواب گاہ میں داخل ہوا ''لے آیا چوہدری جی!'' اس نے اعلان کیا۔

''کرسی پر بٹھا کر اس کے پاؤں بھی باندھ دے'' چوہدری نے حکم دیا۔ اصغر برکت کے پاؤں باندھ چکا تو چوہدری نے کہا ''اب باہر بیٹھ جا۔ جب تک میں نہ بلاؤں' کسی کو اندر نہ آنے دینا۔''

اصغر باہر چلا گیا۔ ناجو نے بھائی کو سامنے پا کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا تھا۔ برکت نے بڑی عاجزی سے کہا ''چوہدری' خدا کا خوف کر۔''

چوہدری نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں ''ایسا پھل دار تو میں نے کوئی درخت بھی نہیں دیکھا برکتے!'' وہ بولا۔ پھر ناجو کی طرف مڑا ''ان کپڑوں میں تو بہت اچھی لگتی ہے۔ پر میں جانتا ہوں' ان کے بغیر تو تجھ پر نگاہ بھی نہیں ٹھہرے گی۔''

ناجو یوں تھرتھرائی جیسے اس کی روح جسم سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔

''دیکھا برکتے' اشرفیاں بھی میری' تیری بہن بھی میری۔ اور تجھے کیا ملا؟ یہ ہے ضد کا انجام'' چوہدری نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے سو کر اٹھنے کے بعد اشرفیوں کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ اس نے اشرفیاں نکالنے کے لیے بغیر دیکھے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے دلدوز چیخ نکلی اور اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا تکیے کے نیچے والا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ مسلسل چیخے جا رہا تھا۔

چوہدری نے جھٹکے سے ہاتھ کھینچا تھا تو تکیہ الٹ گیا تھا۔ برکت نے حیرت سے دیکھا۔ تکیے کے نیچے دو سیاہ بچھو موجود تھے۔ یہ منظر ناجو نے دیکھا جو پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔ ان بچھوؤں کو دیکھ کر تو وہ بے ہوش ہی ہو گئی۔ برکت نے بے تابی سے زور لگایا لیکن رسی کی بندشیں بہت سخت تھیں۔ وہ بے بسی سے دیکھتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ

بچھو کہیں ناجو کو ڈنک نہ ماردیں۔ ایسے سیاہ اور بڑے بچھو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ اسے بہت زہریلے لگ رہے تھے۔
چیختے ہوئے چوہدری نے بھی حیرت سے ان بچھوؤں کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اشرفیاں کہاں گئیں..... اور یہ بچھو کہاں سے آگئے۔ پھر اذیت نے اسے سوچنے سمجھنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بچھو اس کے جسم پر چڑھ گئے اور بار بار اس کے جسم کے مختلف حصوں پر ڈنک مارتے رہے۔ ہر بار چوہدری کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلتی۔ زہر ایسا تھا کہ اس کا چہرہ تک سیاہی مائل نیلا ہوگیا تھا۔
گھبرایا ہوا اصغر کمرے میں داخل ہوا تو یہ منظر دیکھ کر گھبرایا۔
"ارے.... ڈاکٹر کو لا..... جلدی سے..." اذیت سے چیختے ہوئے چوہدری نے حکم دیا۔ اصغر الٹے پاؤں کمرے سے نکلا۔ "یہ.... ان بچھوؤں کو.... تو ماردے" چوہدری نے پھر پکارا لیکن یا تو اصغر نے سنا نہیں یا وہ بچھو اسے بہت خوفناک لگے۔ وہ کمرے سے نکلا چلا گیا۔
بچھو ڈنک مارتے رہے۔ پھر بے ہوش ناجو کے پاس سے گزر کر نیچے چلے گئے۔ برکت حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور چوہدری اب یوں چلا رہا تھا جیسے اس کے جسم میں جہنم کی آگ دہک رہی ہو۔
"ارے.... میں مرا..... ہائے ربا..... ربا.... مجھے بچالے..."
اچانک چوہدری خاموش ہوگیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پائنتی کی سمت دیکھنے لگا۔ وہاں اسے ایک نورانی چہرے والی ہستی نظر آرہی تھی "آپ.... آپ میری مدد کریں نا...." وہ گڑگڑایا۔
"آیا تو میں تمہاری مدد کرنے ہی تھا لیکن تم نے تو کچھ بچایا ہی نہیں۔"
"کچھ کریں...." چوہدری اور گڑگڑایا۔
"کوئی حصہ تم نے ایسا پاک چھوڑا ہی نہیں کہ تمہاری جان نکال سکوں اے ناپاک آدمی۔"
"تت.... تو.... تو.... آ.... آپ...."
"ہاں۔ میں موت کا فرشتہ ہوں۔"
"مم.... مجھے.... آپ.... کی..... ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر.... مجھے.... بچا.... لے.... گا۔"
"تمہارا وقت پورا ہوچکا ہے" موت کے فرشتے نے کہا "اب تمہیں کوئی نہیں بچاسکتا۔ ڈاکٹر کی دوا تمہاری اذیت اور بڑھادے گی۔ تم خود موت مانگنے لگوگے۔"
برکت حیران تھا کہ چوہدری کس سے باتیں کررہا ہے۔ اسے کمرے میں اور کوئی نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ چوہدری اب یوں لرز رہا تھا جیسے جسم اس کے قابو میں نہ ہو۔ اس کی چیخیں بہت دردناک تھیں لیکن اب اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اس سے چیخا بھی نہیں جارہا تھا۔ شاید اس لیے اس کی تشنج کی کیفیت اور شدید ہوگئی تھی۔
اصغر ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ ڈاکٹر نے چوہدری کو ایک نظر دیکھتے ہی مایوسی سے سرہلایا "زہر پوری طرح اثر کرچکا ہے۔ بہت مشکل ہے" اس نے کہا "میں انجکشن لگارہا ہوں مگر بہتر یہی ہے کہ اسپتال لے جاؤ۔ حالانکہ میرے خیال میں یہ بچیں گے پھر بھی نہیں۔"

ڈاکٹر انجکشن لگاکر چلاگیا مگر چوہدری کی اذیت اور بڑھ گئی۔
اس نے موت کے فرشتے سے کہا "میں سمجھ گیا۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تم میری جان نکال لو نا" وہ گڑگڑانے لگا۔
اس بار اصغر کو یقین ہوگیا کہ چوہدری پاگل ہوگیا ہے۔ وہ ہوا سے باتیں کررہا تھا۔
فرشتے نے کہا "کیسے نکالوں، کوئی راستہ بناؤ۔ ایسے تو میں تمہیں نجات نہیں دے سکتا۔"
"کک.... کیسے.... بب.... بناؤں.... راستہ؟"
"یہ نزع کا وقت ہے۔ توبہ اب قبول نہیں ہوسکتی۔ نیکی تم کر نہیں سکتے کہ توفیق کا دروازہ بھی بند ہوگیا ہے" فرشتے نے کہا۔ "اب زبان سے کچھ کرو، جو کرنا چاہیے۔ تب راستہ بنے گا۔ کچھ ہاتھوں کو بھی کام میں لاؤ۔"
"کیا.... کک.... کروں؟"
"یہ تو تمہیں ہی سوچنا ہے" فرشتے نے بے رخی سے کہا۔
چوہدری سوچتا اور اِدھراُدھر دیکھتا رہا۔ اس کی نظر برکت پر..... اور پھر ناجو پر پڑی۔ اس نے اصغر کو حکم دیا کہ برکت کو کھول دے "اور میری اس..... بیٹی کو ہوش میں لا" یہ کہتے ہوئے اسے یہ خوش آئند احساس ہوا کہ یہ سب کچھ کہتے ہوئے اس کی اذیت یک لخت موقوف ہوگئی تھی لیکن خاموش ہوتے ہی اذیت پھر لوٹ آئی، وہ چیخنے لگا۔
اصغر ہچکچایا کہ پاگل چوہدری کی بات مانے یا نہ مانے۔ کیا پتا، ہوش میں آنے کے بعد وہ اسی بات پر اس کی کھال میں بھس بھروادے "اس.... غر.... سنتا نہیں ہے" چوہدری نے گرجنے کی کوشش کی۔
اصغر کو تعمیل کرنا ہی پڑی۔ برکت کے ہاتھ پاؤں کھول کر وہ ناجو کی طرف بڑھا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔
چوہدری نے برکت سے کہا "برکتے..... میں ہل بھی نہیں سکتا۔ تو یہ سمجھ لے کہ میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کردے۔"
برکت کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، وہ بولا "چوہدری، اللہ تجھے معاف کرے، میں نے تجھے معاف کیا۔"
چوہدری نے مظلومیت سے فرشتے کی طرف دیکھا "اب میری مشکل آسان کردو۔"
"ابھی بات بنی نہیں" فرشتے نے کہا "کچھ اور کوشش کرو۔"
چوہدری سوچتا رہا۔ ناجو ہوش میں آگئی تھی۔ چوہدری نے اصغر سے کہا کہ وہ زنان خانے سے گھر کے تمام افراد کو بلالائے۔ پھر وہ ناجو سے گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ "میری بیٹی، مجھے معاف کردے۔"
فرشتے نے کہا "کیا بس یہی دو ہیں جن سے تونے ظلم کیا ہے؟"
چوہدری پوری جان سے کانپ گیا۔ ظلم کی کہانی تو بہت بڑی تھی۔ گھر گھر پھیلی ہوئی تھی "مم.... میں.... سس.... سب سے.... معافی مانگ لوں گا۔"
اتنے میں گھر کے لوگ آگئے۔ اس کی بیوی، بیٹی زرینہ اور

اکلوتا بیٹا منصور۔ اور رشتے دار بھی۔ وہ ان سب سے معافی مانگنے لگا پھر اس نے اصغر سے کہا "سب آدمیوں کو ایک کام پر لگادو۔ میری جاگیر میں جتنے گھر ہیں' تمہیں ہر جگہ جاکر معافی مانگنی ہے۔ کہنا' میں اس قابل ہوتا تو خود آتا۔ خدا کے نام پر' مجھے معاف کردیں۔"

اس کے گھر والے اور رشتے دار رو رہے تھے۔ چوہدری کا چہرہ اور پورا جسم سیاہ ہوچکا تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ اب چوہدری بچے گا نہیں۔

"اب تو میری مشکل آسان کردو" چوہدری نے فرشتے سے التجا کی۔

"ابھی بات نہیں بنی۔ تم نے برکت سے کچھ وعدہ کیا تھا؟"

"ہاں۔ میں پورا کردوں گا۔ بات پکی کردوں گا۔ تم اب مجھے موت دے دو۔"

"ایسے نہیں۔ اپنے معاملات خود نمٹا کر جاسکتے ہو تم' ایسے نہیں۔"

چوہدری نے اپنی بیوی سے کہا "میں جیناں کی شادی برکت سے کررہا ہوں" وہ بیٹے کی طرف مڑا "منصور' جلدی سے قاضی کو بلا۔ جلدی کر۔ فوراً نکاح پڑھوادے میرے بیٹے!" وہ فرشتے کی طرف مڑا "اب تو ٹھیک ہے؟"

"اور وصیت..."

"وہ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔"

"وارث کسے بنایا ہے؟"

"اپنے بیٹے منصور کو۔ سب جائداد زمین اسی کے نام کردی ہے۔"

"کیوں؟ زمین کس کی ہے؟" فرشتے نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میری ہے۔"

"کیسے؟"

"میرے پرکھوں سے چلی آرہی ہے' باپ سے مجھے ملی۔"

"غلط ہے۔ سب غلط" فرشتے نے تیکھے لہجے میں کہا "تمہارے پرکھوں کو انگریزوں نے دی تھی نا۔ جانتے ہو کیوں' غداری اور غلامی کے صلے میں۔ اور کیا تم نہیں جانتے کہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ جسے چاہے' وارث بنادے اور وارث سرکش اور نافرمان ہو تو اللہ زمین اس سے چھین کر کسی اور کو وارث بنادیتا ہے۔"

"تو میری زمین...."

"یہ نہ کہو۔ کہو اللہ کی زمین۔ یہ اسی کی ہونی چاہیے جو اس پر محنت کرے۔"

"ٹھیک ہے' جو جس زمین پر فصل اگارہا ہے' اب وہی اس کا مالک ہوگا۔"

"وصیت نامہ لکھواؤ اور اس پر دستخط کرو' یوں ہاتھوں سے راستہ بنے گا۔"

چوہدری نے اپنے وکیل کو اور اپنے تمام مزارعوں کو طلب کرلیا۔ اسی دوران میں قاضی صاحب آچکے تھے۔ انہوں نے برکت اور زرینہ کا نکاح پڑھادیا۔

دوپہر تک تمام کام مکمل ہوگئے۔ وصیت نامے پر دستخط ہوگئے۔ اس کے بعد ہی چوہدری کی جان نکلی۔

چوہدری کی تدفین کے بعد برکت نے دوسرے مزارعوں کو جو اب زمین دار بن چکے تھے' وہ اشرفیاں دکھائیں اور ان کے بارے میں بتایا اور کہا "اب تم سب پر اللہ کی رحمت ہوچکی ہے۔ ان اشرفیوں کی خیروبرکت کا یہ ثبوت ہے کہ ظلم مٹ گیا اور ہم سب کو وہ کچھ مل گیا جس کا ہم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ اب سوچو کہ ان اشرفیوں کے قومی خزانے میں پہنچنے کے بعد انشاء اللہ ملک میں کیا کچھ ہوگا۔ میرا بس چلے تو انہیں آج ہی ان کی آخری منزل پر پہنچادوں۔ مگر ہم صرف اتنا کرسکتے ہیں کہ کل کے مزارع اور آج کے ہم زمین داران اشرفیوں کو جلد از جلد یہ جاگیر پار کرا کے آگے بڑھادیں۔ پہلے مرحلے میں مَیں یہ اشرفیاں چاچا کریم کو سونپتا ہوں۔"

چاچا کریم نے اشرفیوں کو چوما' آنکھوں سے لگایا اور اپنے پڑوسی عطا محمد کی طرف بڑھادیں۔

کیسی ناقابلِ یقین بات ہے کہ رات ہونے تک اشرفیوں کی امانت ایک ہزار سے زائد ہاتھوں سے گزر چکی تھی۔



میں نے قلم بند کرکے رکھا اور اپنے لکھے ہوئے کو پڑھنے لگا۔ اسے پڑھ کر میرا وجود عجیب طمانیت اور خوشی سے بھر گیا۔ میں ان اشرفیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

اشرفیوں کے اس سفر کو شروع ہوئے ڈیڑھ سال سے اوپر ہوچکا تھا۔ اس سفر کی ہر کہانی بابا عصر نے مجھے سنائی تھی۔ میں ہزاروں کہانیاں سن چکا تھا مگر انہیں لکھ نہیں سکتا تھا۔ لکھتا تو لاکھوں صفحے ہوجاتے۔ کچھ باتیں ہر کہانی میں مشترک تھیں۔ ایک تو یہ کہ کسی امانت دار نے اپنے حصے کی اشرفی نہیں رکھی تھی۔ دوسری یہ کہ ہر امانت دار ضرورت مند تھا۔ ہر ایک کی ضرورت بڑی تھی۔ مگر ملک وقوم کی محبت میں اور اس کے مفاد میں ان میں سے ہر ایک نے اپنی ضرورت کو پسِ پشت ڈال دیا۔ پھر بے ایمان بھی تھے..... اور وہ سب ایک جیسے تھے۔ ان کے دل میں کسی ضرورت کی وجہ سے بے ایمانی نہیں آتی تھی' ہوس انہیں مجبور کردیتی تھی اور ایک مشترکہ بات یہ تھی کہ اشرفی جہاں بھی گئی تھی' وہاں خیروبرکت چھوڑ آئی تھی۔

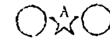
ایک اور بات سامنے آئی تھی۔ بے ایمانوں کو وہ اشرفیاں اپنی خواہش' اپنی ہوس کے مطابق نظر آتی تھیں۔ ان میں بعض تو ایسے بدنصیب تھے کہ انہیں ان میں نہ اللہ کا نام لکھا نظر آیا' نہ کلمہ طیبہ۔ کسی کو وہ بہت قیمتی دھات کی ڈلیاں لگیں۔ کسی کو ان میں ہیرے جواہرات نظر آئے۔ اور سب کے ہوس ناک ردِعمل بھی مختلف اور عجیب تھے۔ کسی نے انہیں سینت کر رکھنا چاہا' کسی نے ہیرے جواہرات نکالنے کے لیے انہیں توڑنے کی کوشش کرڈالی۔

کوئی اثاثہ فروخت کرنے کے لیے جوہری کے پاس پہنچ گیا اور کوئی کسی ملک کے سفارت خانے۔ قصہ مختصر یہ کہ عجیب عجیب کہانیاں، عجیب عجیب پہلو سامنے آتے تھے۔

آج کے واقعے نے مجھے جس وجہ سے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ وہ بے حد پہلو دار تھا۔ اس بار اشرفیوں کی خیروبرکت نے بہت بڑھ کر اجتماعی رخ اختیار کیا تھا۔ اس بار بدترین ظلم اپنے انجام کو پہنچا تھا اور بے شمار لوگوں کو ظلم سے نجات ملی تھی۔ یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ اللہ کی پکڑ کے سامنے طاقت ور سے طاقت ور انسان کتنا بے بس اور حقیر ہوتا ہے۔ اس بدنصیبی کا بھی پتا چلا تھا کہ توبہ اور توفیق کے دروازے بند ہونے سے پہلے انسان اللہ سے رجوع نہ کرے تو ایسی عظیم رحمت اور کرم سے بھی محروم رہ جاتا ہے جو برسہا برس کے گناہ گار کو توبہ کے ایک سچے لمحے میں بخش دیتی ہے، دھو کر پاک کردیتی ہے۔ اور یہ عبرت ناک بات بھی سامنے آئی تھی کہ گناہ گار کی موت کتنی دشوار اور اذیت ناک ہوتی ہے۔

بہرکیف اس سفرنامے نے مجھے بہت پُرامید کردیا۔ مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ بے برکتی اور بدحالی کی طویل رات ختم ہونے کو ہے اور میرے وطن کے افق پر خیروبرکت، استحکام، خودانحصاری اور اللہ کی تائید کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔

بس مجھے اس صبح کا انتظار تھا..... اور پوری قوم کو اس کے لیے اللہ سے دعا کرنی تھی۔



۲۷ رمضان ۱۴۱۸ھ کو اشرفیوں کے سفر کو دو سال ہوچکے تھے۔ اب ہمارے معمول میں فرق پڑگیا تھا۔ بابا عصر سے اب ملاقات ہر روز نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اب اس میں باقاعدگی بھی نہیں رہی تھی۔ کبھی وہ تین چار دن بعد مل جاتے اور کبھی دو ہفتے ہوجاتے اور ملاقات نہ ہوتی۔ بہرحال جب بھی وہ ملتے، اتنے دنوں کے اشرفیوں کے سفر کی تمام روداد وہ مجھ تک پہنچادیتے۔ البتہ میرا معمول اب بھی وہی تھا۔ عشا کے بعد چہل قدمی کی عادت ہوگئی تھی۔

..... مئی ۹۸ء کو بھارت نے ایٹمی دھماکا کردیا۔ اس کے اگلے روز بابا عصر سے ملاقات ہوئی۔ ہمارے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس روز میں جس سے بھی ملا تھا، اس سے یہی گفتگو ہوئی تھی۔ پاکستان کو دھماکا کرنا چاہیے یا نہیں۔ تقریباً پوری قوم اس پر متفق تھی کہ پاکستان کو دھماکا کرنا چاہیے۔ معمولی سی اقلیت اس سے اختلاف بھی کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پاکستان کی معیشت بہت ابتر حال میں ہے۔ اسے بہتر بنانا چاہیے۔ ملک اور قوم کی خوش حالی کی فکر کرنی چاہیے۔ یہاں لوگوں کو یہ میسر نہیں اور وہ میسر نہیں۔ پینے کا صاف پانی تک تو ہے نہیں۔ علاج معالجے کی سہولت سے لوگ محروم ہیں۔ تعلیم تک دشوار ہے لوگوں کے لیے۔ ایسے میں ایٹمی دھماکا کرنا۔ اس کے بعد امداد بند اور ملک اقتصادی طور پر پوری طرح تباہ.....

"یہ سب کچھ تو حکومتوں نے کرنا ہی نہیں چاہا" میں نے ایک دوست کی یہ دلیل سن کر تبصرہ کیا تھا "ورنہ یہ ناممکن تو نہیں ہے۔"

"اور تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے ایٹمی دھماکا نہ کرنا کوئی جادوئی چراغ ہے کہ جس کے زور پر یہ سب کچھ ہوجائے گا" میرے ایک اور جذباتی دوست نے دھماکے کے خلاف دلیل دینے والے دوست کو منہ توڑ جواب دیا تھا۔

اور ایک ٹھنڈے دماغ والے دوست نے کہا "میاں..... ملک پہلی چیز ہے۔ خدانخواستہ وہی نہیں رہا تو کیا خوش حالی اور کیا بدحالی۔ اور کیسی محرومی اور پس ماندگی۔"

میں نے یہ سب کچھ بابا عصر کو سنایا، وہ سہلا کر بولے "اس وقت بھارت میں حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، وہ بہت کٹر اور متعصب ہیں۔ یاد رکھو، ایسے لوگ بزدل بھی ہوتے ہیں۔ وہ بم گرانے میں ایک لمحے کو بھی نہیں ہچکچائیں گے۔ پاکستان کے لیے دھماکا ناگزیر ہے..... اور ہو کر رہے گا۔"

"لیکن بابا، ہمارے یہاں تو احکامات باہر سے آتے ہیں..... وہاں سے جہاں انہیں دبا کر رکھنے کی ترکیبیں سوچی جاتی ہیں، ہماری بہتری نہیں" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اللہ سب سے بڑا تدبیر کرنے والا ہے۔ وہ جس سے جو چاہتا ہے، کرالیتا ہے" بابا عصر نے نہایت اطمینان سے کہا "وہ دشمنانِ اسلام کے دل میں مسلمانوں کی دہشت بھی بٹھا سکتا ہے۔ وہ انہیں مسلمانوں کی طرف سے بے پروائی میں مبتلا کرکے غفلت میں بھی ڈال سکتا ہے۔ وہ ان کے دل میں یہ خیال بھی ڈال سکتا ہے کہ پاکستان کو ایٹمی دھماکے کے بعد اقتصادی پابندیوں اور قرضوں کی ادائیگی کی بلیک میلنگ کے ذریعے زیادہ آسانی سے زیر بھی کیا جاسکتا ہے" انہوں نے گہری سانس لی اور چند لمحے کے توقف کے بعد بولے "اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ پاکستان میں کوئی مردِ مومن، کوئی مردِ آہن ہی موجود ہو جو ملک و قوم کی ضرورت کے سامنے کسی کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ تم فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہوجائے گا انشاء اللہ۔"

"انشاء اللہ" میں نے بے حد خلوص سے کہا۔

بھارتی دھماکے کے بعد کے وہ دن عجیب تھے۔ ہر شخص مضطرب تھا۔ لیکن ایٹم بم کا خوف کسی کو بھی نہیں تھا۔ البتہ پاکستان کے دھماکے کی آرزو سبھی کو تھی۔ ایک عام آدمی بھی یہ بات سمجھ رہا تھا کہ بھارت کو پاکستان پر بم گرانے سے صرف ایک بات روک سکتی ہے..... پاکستان کی طرف سے جوابی ایٹم بم کا خطرہ۔ ادھر غیر ملکی ذرائع ابلاغ مسلسل خبریں دے رہے تھے کہ پاکستان پوری طرح تیار ہے اور کسی بھی وقت ایٹمی دھماکا کرسکتا ہے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ کا بھی یہی کہنا تھا کہ ایٹمی دھماکا کسی بھی وقت ہوسکتا ہے۔

پھر ۲۸ مئی کو پوری قوم نے سکون کا سانس لیا۔ پاکستان نے ایٹمی دھماکے کردیے تھے۔ ملک بھر میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ شکر کے نوافل ادا کیے گئے۔ قومی یکجہتی اور اتحاد کا وہ مظاہرہ دیکھنے

میں آیا تو صرف ۶۵ء کی جنگ کے دوران میں دیکھا گیا تھا۔

اس روز بابا عصر سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے چلتے چلتے چہک کر کہا ”دیکھی پاکستان کی اہمیت۔ اب تو سمجھ میں آگیا۔“

میں نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”اب بتاؤ‘ عالم اسلام کے تحفظ اور اس کی قیادت کا منصب کسے ملا؟ پاکستان کو.... اب مظلوم مسلمانوں کی داد رسی پاکستان کے سوا کون کرسکتا ہے۔ کوئی کسی اسلامی ملک کو ایٹم بم کی دھمکی دے کر بلیک میل کر سکتا ہے‘ انشاء اللہ کبھی نہیں.... ہرگز نہیں۔“

”جی ہاں... یہ تو ہے۔“

”اور اس بم کو کیا نام دیا جارہا ہے‘ جانتے ہو؟“

”جی ہاں۔ اسلامی بم۔“

”ہاں۔ یہ بھی اسلامی بم ہے۔ کیونکہ یہ ٹیکنالوجی مسلمانوں کے پاس پہنچ گئی ہے۔ پاکستان ایک جست لگا کر دنیا کی ممتاز اقوام کی صف میں جاکھڑا ہوا ہے۔“

”لیکن بہرحال ہم پس ماندہ اور ترقی پذیر...“

”پس ماندگی کو چھوڑو۔ بقا پہلی چیز ہے۔ جو یہ راگ گا رہے ہیں‘ انہیں گانے دو۔ جان ہے تو جہان ہے۔ پاکستان ہے تو ہم آزاد ہیں۔ ہم آزاد ہیں تو سب کچھ ہے۔ خدانخواستہ ہم غلام ہو گئے تو خوش حالی کس کام کی۔ پاکستان نظریاتی ملک ہے۔ اس کا دفاع سب سے اہم ہے۔“

”لیکن بابا.... ایٹم بم بہرحال اچھی چیز نہیں۔“

”اسے کوئی اچھا نہیں کہتا لیکن جن کے پاس یہ ہے‘ وہ اسے ضائع کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ کیسی برائی ہے‘ جسے سب برا بھی کہتے ہیں اور سینے سے لگا کر بھی رکھتے ہیں“ بابا عصر نے جوش سے کہا ”لیکن میں اسے اچھا نہیں کہتا۔ یہ انسانیت کا قاتل بم ہے۔ اللہ نے کہا کہ بلاجواز‘ بغیر کسی قصور کے اگر ایک انسان بھی قتل کردیا جائے تو یہ قتل انسانیت ہے۔ یہ بم تو جہاں بھی گرایا جائے گا‘ وہاں لاکھوں کروڑوں بے قصور انسان ختم ہو جائیں گے۔ خواہ کوئی بھی گرائے‘ کہیں بھی گرائے۔ خواہ پاکستان بھارت کے کسی شہر پر بم گرائے‘ وہ بھی لاکھوں کروڑوں بار پوری انسانیت کو قتل کرنے کے مترادف ہوگا۔“

”لیکن... گیہوں کے ساتھ گھن تو پستا ہی ہے۔“

”مگر یہ تو گھن کے ساتھ گیہوں پسنے والی بات ہے“ بابا عصر نے تیز لہجے میں کہا ”اسلام نے ہمیشہ نہتے شہریوں کو تحفظ دیا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے۔ بلکہ لڑنے والے بھی ہتھیار ڈال دیں تو ان کا قتل بھی جائز نہیں۔ اور سنو‘ یہ جو بلا تفریق ختم کردینے کی بات ہے تو یہ صرف اللہ کے قہر کو زیبا ہے۔ کسی انسان‘ کسی قوم کے لیے یہ جائز نہیں۔“

”تب تو یہ غلط ہے۔“

”میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ بم پاکستان کی ضرورت تھی۔ اس کے ذریعے پاکستان نے بھارت کو خبردار کردیا کہ وہ جارحیت سے باز رہے۔ ورنہ ایک ایٹم بم کا جواب دو سے دیا جائے گا اور یہ پیغام بھارت تک پہنچ گیا۔ اب بھارت انشاء اللہ یہ غلطی نہیں کرے گا اور انشاء اللہ پاکستان کو یہ بم استعمال کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑے گی۔“

”اس کا مطلب ہے‘ امن قائم ہو جائے گا“ میں نے کہا۔

”بات یہ نہیں۔ دراصل میں بہت تیز چل رہا ہوں“ بابا عصر نے کہا۔ مجھے ان کی یہ بات بے ربط لگی۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا ”ٹیکنالوجی بہت آگے چلی گئی ہے“ انہوں نے مزید کہا ”لہٰذا جنگ کے فارمولے بھی بدل گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بہترین دفاع حملہ کرنے میں ہے اور یہ ایٹم بم یا ایسے ہی دوسرے بم ہلاکت خیز ہیں۔ یہ دفاع نہیں کرسکتے۔ حملہ کرسکتے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ایٹم بم ہمارا دفاع کرے گا۔ سوچو تو کسی نے تمہارے شہر پر ایٹم بم گرا دیا اور تم نے ان کے دو شہروں پر ایٹمی حملہ کردیا۔ یہ دفاع تو نہیں ہوا۔ تم اپنے شہریوں کا دفاع تو نہیں کرسکے۔

”تو اب نیا فارمولا بنے گا۔ کہا جائے گا کہ بہترین حملہ اپنا دفاع کرنے میں ہے۔ اور دفاع یہ ہے کہ جو تمہاری طرف ہلاکت بھیجے‘ تم وہ ہلاکت اسی کو لوٹا دو۔ اسی کی طرف بھیج دو تاکہ وہ خود اپنی بنائی ہوئی موت کا مزہ چکھے۔ دفاع یہ ہے کہ اپنی سرحدوں‘ زمینی‘ بحری اور فضائی سرحدوں کو ناقابل تسخیر بنالو۔ کوئی ہلاکت بردار چیز اس سرحد کو پار نہ کرسکے۔ اس سے ٹکرا کر اپنے ہی خالق کی طرف لوٹ جائے۔ یوں تمہارے شہری بھی محفوظ۔ اور دشمن کا بھی اپنی تباہی کے سلسلے میں تم پر کوئی دعویٰ نہیں۔ کیونکہ اس نے اپنا ہی کیا دھرا بھگتا ہوگا۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات۔ اب نئی ٹیکنالوجی کے تحت اپنا دفاعی نظام مرتب اور منظم کرنے کا وقت ہے اور انشاء اللہ یہ کام سب سے پہلے پاکستان کرے گا کیونکہ اسلام بے قصور لوگوں کو مٹانے سے روکتا ہے۔“

”لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟“

”جو اب ہو رہا ہے‘ پہلے اسے بھی ناممکن سمجھا جاتا تھا“ بابا عصر نے کہا ”بات اتنی سی ہے کہ کسی نے ایٹمی اسلحہ اٹھائے ہوئے ایک میزائل کو تمہاری طرف روانہ کیا۔ آنے والے وقت میں انشاء اللہ یہ بڑی بات نہیں ہوگی کہ اسے بھیجنے والے کی حد میں ہی فنا کردیا جائے۔ یہ بھی ناممکن نہیں ہوگا کہ وہ آپ کی سرحد پار نہ کرسکے۔ بس سائنس دانوں کو اپنی سوچ کا رخ تبدیل کرنا ہوگا۔ اس کے بعد محنت اور لگن سے کام.... اور اللہ کی تائید سب ٹھیک کردے گی۔ دیکھ لینا‘ انشاء اللہ سب سے پہلے یہ نظام پاکستان بنائے گا۔ اب سوچو تو‘ اس کے بعد کیا ہوگا۔ حملہ کرنے والا اپنے ہی ہاتھوں تباہ ہو کر منہ کی کھائے گا اور جنگ ہار جائے گا اور دفاع کرنے والا بغیر ہتھیار اٹھائے‘ بغیر لڑے جنگ جیت جائے گا۔“

”کاش ایسا ہی ہو۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا.... اور پاکستان میں ہوگا“ بابا عصر نے نہایت اعتماد سے کہا ”اور اب میں کہتا ہوں کہ اللہ نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنایا ہے تو تم اسے محاورے کے طور پر لیتے ہو مگر اس

وقت یہ لفظی و لغوی معنوں میں اسلام کا قلعہ ہو گا.... مسلمانوں کے مکمل تحفظ کی علامت۔"

میرا دل امید اور جوش سے بھر گیا "تو اب سب ٹھیک ہے..."

"نہیں۔ اندر مجھے سازشی لوگ بیٹھے غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر جڑیں کاٹتے‘ سازشیں کرتے نظر آ رہے ہیں۔ وہ ملک کو قرضے کی عدم ادائیگی اور مزید قرضوں اور امداد کے عوض بیچ دینا چاہتے ہیں۔ وہ وزیر اعظم سے جڑے بیٹھے ہیں۔ وہ ناکام ہوں گے انشاء اللہ۔ لیکن قوم کے مصائب ضرور بڑھا دیں گے۔ اب ہر دن ایمان کی آزمائش کا ہو گا۔ کم زور ایمان والوں کو ۹۹ء تک کا عرصہ بہت سخت لگے گا۔ کہیں کہیں ایمان بیچنے کی نوبت بھی آ جائے گی۔ ہاں‘ ایمان والے اس سے آسانی سے گزر جائیں گے اور انشاء اللہ ۲۰۰۰ء سے سب ٹھیک ہونے لگے گا۔ اس وقت قوم کو چاہیے کہ دعا اور عمل دونوں میں کمی نہیں چھوڑے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھے۔ ملک انشاء اللہ سلامت رہے گا لیکن افراد کے لیے خطرۂ ایمان سخت ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ سعادت والے وقت میں مٹھی بھر اہلِ ایمان میں شامل ہونے کے لیے اچھے عمل کرے اور اللہ سے ڈرتا رہے۔"

مجھے جھرجھری آ گئی "اے اللہ.... تو مجھ کمزور کی مدد فرما کہ میں ایمان میں کمزور ہوں" میں نے دل کی گہرائی سے دعا کی۔

"میرا اس ملک کی عورتوں کے لیے ایک پیغام ہے" بابا عصر نے کہا "وہ بھول گئی ہیں کہ اللہ نے..... اسلام نے انہیں بڑا مقام دیا ہے‘ بڑی اہمیت دی ہے۔ ان کے ذمے ایک بہت بڑا کام ہے۔ انہیں بیٹوں کو دودھ سے‘ ممتا بھری آغوش سے‘ اپنی محبت سے اللہ کا خوف‘ جذبۂ جہاد‘ سیرتِ رسول کریمؐ کے اتباع کا شوق اور دین کی محبت کی نہایت طاقتور تلقین سونپنی ہے۔ انہیں بیٹیوں کو نسلوں کی تربیت کرنے کی تربیت دینی ہے۔ مغرب کی تقلید میں وہ اپنے مقام اور اپنی اہمیت کو بھول بیٹھی ہیں۔ انہیں یاد نہیں رہا کہ وہ قوم کی اصل معمار ہیں۔ مومن اور مجاہد ماں کی گود میں بنتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ کسی قوم کا حال سمجھنے کے لیے اس کے درمیان وقت گزارنے اور مشاہدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس قوم کی ماؤں کو دیکھ لو۔ ان سے تمہیں قوم کا حال معلوم ہو جائے گا۔

"اور میں قوم کے جوانوں سے کہتا ہوں کہ مایوسی ذہنوں سے جھٹک دو۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہارے پاس بہت بڑی سعادت کے ایک عہد میں داخل ہونے کا قوی امکان موجود ہے۔ سب کچھ بھول کر خود کو اس کے لیے تیار کرو۔ اپنے اندر جذبۂ جہاد ابھارو۔ جہاد بہت آسان ہے۔ چاہو تو اپنے ہر کام کو جہاد بنا لو۔ گفتگو بھی جہاد ہو سکتی ہے‘ تمہارا ہر قدم جہاد ہو سکتا ہے۔ جسم کی ہر حرکت جہاد ہو سکتی ہے۔ اگر وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہو۔ تم قلم سے جہاد کرو‘ سرنج سے جہاد کرو‘ ترازو سے جہاد کرو‘ کدال پھاوڑے سے جہاد کرو۔ جہاد کے لیے اسلحہ ضروری نہیں۔ ہر شخص اپنی جگہ رہتے ہوئے جہاد کر سکتا ہے۔ تمہارا قول و فعل‘ تمہارا ہر عمل اگر نفرت‘ تعصب‘ جہالت‘ غرض ہر برائی کے خاتمے کی نیت لیے ہوئے ہو تو نتائج سے قطع نظر تمہاری پوری زندگی کو انشاء اللہ مکمل جہاد کا درجہ حاصل ہو گا اور موت شہادت ہو گی۔ یاد رکھو‘ یہ دنیا اور اس کی تمام آسائشیں اور نعمتیں محض آزمائش کے لیے ہیں۔ یہاں سے تم صرف اپنے اعمال لے کر جاؤ گے‘ جن پر ابدی زندگی کا فیصلہ ہو گا۔ سو ابدی زندگی کی نعمتوں پر نظر رکھو اور اس کے عذاب سے.... جہنم سے ڈرتے رہو۔ تم یہاں بھی سرخرو ہو گے اور آخرت میں بھی۔"

میں بابا عصر کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہانپ گیا تھا۔

"آپ اتنا تیز کیوں چلتے ہیں؟" میں نے شکایتاً کہا۔

"ابھی تو مجھے اور تیز چلنا ہے۔ میرے ساتھ چلنا سیکھو" بابا عصر نے بے پروائی سے کہا "اب اشرفیوں کے سفر کا احوال سنو...."



اس روز بابا عصر نے جو مجھے سفرنامے سنائے تھے‘ ان میں ایک مجھے بہت اچھا لگا۔ میرا جی چاہا کہ اسے لکھوں۔ میں اسے لکھنے کے لیے بیٹھا تو ہمیشہ کی طرح کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا۔ میں ایک منظر میں تھا اور وہ منظر تحرک سے بھرپور تھا۔

میں لکھنے لگا....



کبریٰ نے سر اٹھا کر سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی عمر ۲۵ سال ہے۔ لیکن دیکھنے میں وہ اس سے زیادہ کا لگتا تھا اور وہ اسے بمشکل واجبی شکل و صورت کا لگتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا۔ گفتگو بھی وہ سڑک چھاپ کرتا تھا۔ رہنے کو اس کے پاس بھی ایک کچا مکان تھا۔ ہاں اس کے مکان سے بہتر تھا اور اس میں سامانِ ضرورت بھی اس کے اپنے گھر سے زیادہ تھا۔ بس ایک اچھی بات تھی.... وہ یہ کہ وہ برسرِ روزگار تھا۔ ایک ٹیکسٹائل مل میں مزدوری کرتا تھا۔ ایک لگی بندھی تنخواہ ہر مہینے گھر لاتا تھا۔

کبریٰ کی نگاہوں میں اپنی بیٹی صغریٰ کی صورت پھر گئی۔ صغریٰ کو اللہ نے ایسا حسن و جمال عطا کیا تھا کہ پیوند لگے معمولی کپڑوں میں بھی وہ بدلی سے جھانکتے چاند سے زیادہ حسین لگتی تھی مگر اس کا حسن کبریٰ کے لیے اور مصیبت بن گیا تھا۔ وہ تنہا عورت کیسے اس کی حفاظت کر سکتی تھی۔ لڑکی یتیم ہو‘ بے سہارا ہو اور پھر چندے آفتاب چندے ماہتاب بھی ہو تو اس سے شادی کون کرنا چاہتا ہے۔ اس کے حق میں سب بھیڑیے بن جاتے ہیں۔ بس موقع ملے اور چیر پھاڑ کر رکھ دیں۔ محض اسی وجہ سے کبریٰ نے امجد کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ورنہ وہ کسی طرح صغریٰ کے جوڑ کا نہیں تھا۔ مگر وہ صغریٰ سے شادی کر کے اسے عزت سے رکھ تو سکتا تھا۔ یہ بہت بڑی خوبی تھی۔ پھر بھی کبریٰ تصور میں ان دونوں کو ساتھ دیکھتی تو اس کے دل پر گھونسا سا لگتا لیکن وہ یہ سوچ کر صبر کر لیتی کہ نصیب لکھنے والا جانے۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے چاچی؟"

کبریٰ کو امجد کی آواز نے چونکا دیا۔ اس نے پہلو بدلا پھر وہی سوال، سانپ کی طرح پھن کاڑھے آکھڑا ہوا تھا "کیا سوچوں؟ جو بس میں نہیں، اس کے لیے کیسے ہاں کردوں؟"

"سوچ لو چاچی!" امجد کے لہجے میں دھمکی تھی "دیکھونا، میں کہتا ہوں تم مجھے کچھ نہ دو، کچھ بھی نہیں۔ پر موٹر سائیکل میری ضرورت ہے اور میں نئی بھی نہیں مانگتا، پرانی ہی لادو۔"

"میرے بس میں ہوتا تو نئی دلادیتی لیکن تو کہتا ہے کہ پرانی بھی تیس ہزار سے کم میں نہیں ملے گی۔"

"ہاں چاچی۔ یوں تو دس میں بھی مل جائے پر میں دیکھنے کے لیے نہیں، آنے جانے کے لیے موٹر سائیکل چاہتا ہوں۔ اس پر آوں جاوں گا تو پیسے بچیں گے۔ گھر میں ہی کام آئیں گے۔"

"لیکن میں تیس ہزار کہاں سے لاوں؟"

"تو بیٹی کی شادی ایسے ہی کردوگی؟" امجد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "شادی میں روکڑا تو چاہیے ہوتا ہے چاچی۔ جس کے پاس نہیں ہوتا وہ بھی قرض ادھار کرلیتا ہے۔"

"مجھے کون قرض دے گا بیٹے!" کبریٰ نے لجاجت سے کہا۔

"دینے کے لیے تو سیکڑوں تیار ہوں گے، تم لینے والی تو بنو" امجد نے بے ہودگی سے کہا۔

کبریٰ کے دل پر چوٹ لگی۔ یہ بات امجد کئی بار کہہ چکا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اسے سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس وقت اسے یہ سن کر غصہ آگیا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ صغریٰ چائے لے کر آگئی۔ کبریٰ نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بات ٹل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بات آگے بڑھی تو یہ رشتہ ہی ختم ہوجائے گا اور یہ وہ چاہتی نہیں تھی۔

صغریٰ نے چائے کی پیالی امجد کو دی جو اسے گرسنہ نگاہوں سے دیکھے جارہا تھا۔ صغریٰ نے ماں کو چائے کی پیالی تھمائی اور جلدی سے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

امجد نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا "واہ بڑی گرم ہے.... بم ہے چاچی بم!"

کبریٰ جانتی تھی کہ امجد چائے پر تبصرہ نہیں کررہا ہے۔ وہ اس کی نظریں پہچانتی بھی تھی اور اسے بری بھی لگتی تھیں مگر مجبوری تھی۔ وہ اس کی آخری امید بھی تو تھا۔

"یہ صغریٰ جلدی بھاگ جاتی ہے چاچی۔ اسے کہو، کبھی بیٹھا کرے میرے پاس۔ باتیں کیا کرے اور تم بھی کبھی ادھر ادھر ٹہل جایا کرو" امجد نے بدتمیزی سے کہا۔

"صبر کرلے بیٹا۔ بس پندرہ دن کی تو بات ہے۔ پھر وہ تیری ہی ہوجائے گی" یہ کہتے کہتے کبریٰ اداس ہوگئی۔

امجد پھر اسی ٹریک پر چلا گیا "دیکھو چاچی، میں کھلی بات کرتا ہوں۔ موٹر سائیکل کے بغیر میں شادی کرنے والا نہیں۔ تم کچھ بھی کرو، مجھے تیس ہزار کرکے دو۔"

کبریٰ خاموش رہی۔ کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔

امجد پیالی خالی کرکے اٹھ کھڑا ہوا "تمہارے پاس کل تک کی مہلت ہے چاچی!" اس نے کہا "سوچو اور فیصلہ کرو۔ میرے پاس ایک اچھا رشتہ ہے۔ وہ نئی موٹر سائیکل بھی دیں گے اور ٹی وی اور ٹیپ ریکارڈر بھی۔ لڑکی صغریٰ جیسی تو نہیں پر مجھے خوب صورتی کو چاٹنا ہے کیا" یہ کہہ کر وہ سلام کیے بغیر چلا گیا۔

کبریٰ وہیں بیٹھی سوچتی رہی۔ چائے ٹھنڈی ہوگئی۔ اس نے اس کا ایک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے۔ وہ تو بس یہ سوچے جارہی تھی کہ اس کے پاس پیٹ کاٹ کر بچائے ہوئے صرف دس ہزار روپے ہیں۔ اس نے سوچا تھا، اس میں سے کچھ برات کے کھانے میں خرچ کرے گی اور کچھ چیزیں لے آئے گی جہیز کے لیے۔ مگر یہ موٹر سائیکل!

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ صغریٰ اس کے پاس آکھڑی ہوئی ہے۔

"چائے ٹھنڈی ہوگئی اماں۔ لاؤ گرم کرلاوں۔"

کبریٰ نے چونک کر اسے دیکھا "رہنے دے۔ میں تو پیتی ہی ٹھنڈی کرکے ہوں۔"

صغریٰ وہیں بیٹھ گئی "اماں.... یہ امجد بھائی مجھے اچھے نہیں لگتے" وہ آہستہ سے بولی۔

"کوئی بات نہیں، شادی ہوگی تو اچھا لگنے لگے گا۔" کبریٰ نے کہا "اور دیکھ، شکل صورت اللہ بناتا ہے، اسے نہ برا کہتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں۔"

"میں شکل صورت کو نہیں کہتی اماں۔ وہ مجھے بہت خراب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور اماں، میں بتادوں وہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔"

کبریٰ نے اسے بہت غور سے دیکھا "وہ جیسا بھی ہے، ہماری آخری امید ہے۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"اماں، تم مجھے بوجھ سمجھ کر مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہو" صغریٰ نے شکایتاً کہا "اب میں میٹرک کرچکی ہوں۔ بوجھ نہیں ہوں، نوکری کرسکتی ہوں۔"

"میں تجھے کبھی نوکری نہیں کرنے دوں گی۔ تجھے نہیں پتا، یہ دنیا بہت بری ہے..... خاص طور پر خوب صورت لڑکیوں کے لیے۔ اور یہ بھی نہیں کہ تو میرے لیے بوجھ ہے۔ بس شادی ضروری ہے۔ کسی کا نام جڑ جائے تو مضبوطی آجاتی ہے۔ ایک سہارا مل جاتا ہے۔ اس کے بغیر لڑکی کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتی ہے، جسے لوٹنے کے لیے سب دوڑ پڑتے ہیں۔"

"لیکن اماں، تم نے بھی تو بے سہارے زندگی گزاردی۔ خود کو بھی سنبھال کر رکھا اور مجھے بھی۔"

"اللہ کا آسرا تھا بٹی۔ ورنہ جیسے گزری ہے، میرا دل ہی جانتا ہے" کبریٰ نے آہ بھر کے کہا "یہ دنیا بھوکے بھیڑیوں سے بھری پڑی ہے اور ایسے بھی ہیں جو روپ بدل کر آتے ہیں۔ میں تو پل صراط سے گزری ہوں بٹی۔ تجھے اس سے نہیں گزارنا چاہتی" پھر کبریٰ نے بٹی کو اپنے چند ایسے واقعات سنائے، جو اس نے کسی کو نہیں سنائے تھے اور وہ صغریٰ کو تو مر کر بھی نہ سناتی مگر وہ اسے احساس

دلانا چاہتی تھی کہ امجد جیسا بھی ہے' اس کے لیے سائبان ہوگا۔ اس نے امجد کے لیے صغریٰ کی ناپسندیدگی بھانپ لی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ بیٹی ازدواجی زندگی کا آغاز اس ناپسندیدگی کو ساتھ لے کر کرے۔ ایسے میں ساری زندگی روتے روتے ناخوشی ہی گزر جاتی ہے۔ وہ بیٹی کو سمجھوتوں کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ یہ سمجھانا چاہتی تھی کہ زندگی میں سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں اور وہ ہنسی خوشی کر لیے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

اس کا نتیجہ مثبت نکلا۔ صغریٰ سمجھ گئی کہ دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کبریٰ نے سکون کی سانس لی۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کی بیٹی امجد کو اپنا پسندیدہ مرد مان لے گی۔ اس کے سپنے دیکھنے لگے گی۔ اس کی آنکھوں میں تو ابھی سے سپنوں کے رنگ نظر آنے لگے تھے۔

مگر خود کبریٰ کے تصور میں موٹر سائیکل در آئی جو وہ امجد کو لے کر نہیں دے سکتی تھی۔ مگر امجد نے اس کی شرط لگا دی تھی۔

صغریٰ نے جو ماں کا رنگ بدلتے دیکھا تو پریشان ہوگئی "کیا ہوگیا اماں؟"

کبریٰ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ سن کر صغریٰ پریشان ہوئی۔ کبریٰ نے سمجھ لیا کہ اس کا اندازہ درست تھا۔ بیٹی نے اپنی سوچ بدل لی ہے اور ذہنی طور پر امجد کو قبول کر لیا ہے۔ اسے افسوس ہوا کہ تبدیلی کے ساتھ ہی اسے عدم تحفظ کا احساس بھی ملا۔

"تو اب کیا ہوگا اماں؟" صغریٰ کے لہجے میں خوف تھا۔ ماں کے سنائے ہوئے واقعات نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اب وہ بے سہارا نہیں رہنا چاہتی تھی۔

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" کبریٰ نے اسے دلاسا دیا۔

"اور جو نہ ہوا تو؟"

"ایک بات کہوں" کبریٰ نے بیٹی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تو اکھڑی اکھڑی رہتی ہے۔ امجد کے سامنے بھی کم ہی آتی ہے۔ ذرا خود کو بدل کے تو دیکھ۔ اس کے پاس بیٹھ۔ محبت سے بات کر۔ پیار سے سمجھا تو وہ مان بھی جائے گا۔ تیری بات تو کوئی مرد ٹال ہی نہیں سکتا۔ اتنی پیاری ہے تو" یہ کہتے کہتے کبریٰ کو بے غیرتی کا احساس ستانے لگا۔ امجد کی نظربازی سے وہ بے خبر تو نہیں تھی۔ لیکن اس نے اس احساس کو دبا لیا۔ اس پر ضرورت اور مصلحت کا پردہ ڈال دیا۔

"اچھا اماں' کوشش کروں گی" صغریٰ نے آہستہ سے کہا۔ اب وہ اس بات کی اہمیت کو سمجھ گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب امجد کو نظر انداز نہیں کرے گی۔

"شاباش بیٹی!" کبریٰ نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

ذرا دیر بعد صغریٰ نے کہا "اماں..... کاکا کے ہاں سے مونگ کی دال لے آؤ ۔۔۔ چینی بھی ختم ہونے والی ہے۔"

"اچھا بیٹی!"

○☆○

وہ محلے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ کاکا زبان کا میٹھا اور دل کا اس سے بھی اچھا تھا۔ تمام وقت دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے کی کوشش میں گھلتا رہتا تھا۔ اور دکھ درد بہت تھے۔ اس لیے کہ اس کی دکان اس محلے کا..... اس کے اپنے گھر کا ایک حصہ تھی۔ سو محلے کے دکھ درد سے کون بے خبر رہ سکتا ہے۔

دکان کافی چلتی تھی۔ اللہ کی رحمت تھی اس پر۔ دوسرے محلوں کے لوگ بھی اس کے پاس سودا لینے آتے تھے۔ کچھ اس میں اس کی نیکی اور ایمان داری کا بھی دخل تھا۔ وہ تول کا سچا تھا۔ کبھی ڈنڈی نہیں مارتا تھا۔ پھر اس دور میں بھی وہ بیچ آٹے میں نمک کے برابر منافع لیتا تھا اور نمک وہ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے بہت کم کھاتا تھا۔ اس لیے اس کا منافع اور کم ہو جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہ آدمی کے اپنے دکھ درد کم نہیں ہوتے۔ ایسے میں وہ دوسروں کے دکھ اور تکلیفیں بھی محسوس کرنے لگے تو بلڈ پریشر تو ہائی ہوتا ہی ہے۔ مختصر یہ کہ علاقے میں وہ ایسی دکان تھی' جہاں ہر چیز دوسری دکانوں سے سستی ملتی تھی' ایسے میں دکان داری تو بڑھتی ہی ہے۔

لیکن اتنی دکان داری کے باوجود کاکا کا ہاتھ تنگ ہی رہتا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ ہر ایک کو ادھار نہیں دیتا تھا مگر جن کے حالات سے وہ واقف تھا' ان سے تو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اور آڑا وقت تو کسی پر بھی آ سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی وہ منع نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ اسے قرض وصول کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کے لیے تو یاددہانی بھی آسان نہیں تھی' اصرار تو وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بے مروتی اس کی فطرت میں تھی ہی نہیں۔

کاکا خوش قسمت بھی تھا۔ اللہ نے اسے تین سعادت مند بیٹے دیے تھے اور وہ تینوں برسرِ روزگار تھے۔ پھر کاکا طبعاً درویش تھا۔ اس کا اپنا کوئی خرچ تھا ہی نہیں۔ چائے' پان' سگریٹ سے وہ بے نیاز تھا۔ تین وقت کی روٹی گھر سے مل جاتی تھی۔ کپڑوں سے اسے غرض نہیں تھی۔ عید بقرعید پر بیٹے زبردستی کپڑے بنا دیتے تھے۔ ورنہ اسے اس کی بھی پروا نہیں تھی۔ اس کے باوجود اکثر مہینے میں ایک دو بار اسے بیٹوں سے مدد لینی پڑ جاتی تھی۔ وجہ سادہ سی تھی۔ آٹے میں ہائی بلڈ پریشر کے مریض کی ضرورت جتنے نمک کا منافع تو ادھار کھانے والوں کی نذر ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اصل رقم کا کچھ حصہ بھی ہر ماہ پھنس جاتا تھا اور جن سے وہ ہول سیل پر مال لیتا تھا' وہ ایک خاص مدت بعد تقاضا کرنے لگتے تھے۔ ان کا حساب صاف نہ کرتا تو مال ملنا بند ہو جاتا۔ ایسے میں بیٹے ہی اس کی مدد کرتے۔ وہ نہ ہوتے تو دکان بہت پہلے بند ہو چکی ہوتی۔

کاکا ایک ایسا خوش نصیب انسان تھا' جس کی اپنی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ مگر وہ دوسروں سے زیادہ پریشان رہتا تھا۔ وہ دوسروں کی پریشانیوں کا خیال کر کے بھی پریشان ہوتا اور پھر انہیں ادھار دے کر خود بھی پریشان ہو جاتا۔

اس وقت بھی کاکا پریشان تھا۔ صابن کی گاڑی والا کہہ کر گیا تھا کہ کل اسے ہر حال میں پیسے چاہئیں۔ گویا اب پھر کسی بیٹے سے مدد مانگنی تھی۔

اچانک اسے کبریٰ دکان کی طرف آتی دکھائی دی۔ کبریٰ پر اسے بڑا پیار آتا تھا۔ بیس سال کی عمر میں وہ بیوہ بھی ہوئی اور بیٹی کی ماں بھی بنی۔ اور اب اس کی بیٹی بھی بیس سال کی ہو گئی تھی۔ کاکا نے کبریٰ کا حسن و جمال بھی دیکھا تھا۔ وہ لاکھوں میں نہیں، کروڑوں میں ایک تھی۔ اس حسن پر مستزاد بھری جوانی۔ ایسے میں بیوگی کے بیس بے داغ سال گزارنا بہت بڑا جہاد تھا جو کبریٰ نے کیا تھا۔ کیسی کیسی آزمائشوں سے گزری تھی وہ۔ کیسی کیسی ترغیب سے بچی تھی، کاکا خود اس کا گواہ تھا۔ وہ تو اب بھی ایسی تھی کہ مرد اسے دیکھ کر آہیں بھرنے لگیں۔ مگر اس نے خود کو پتھر کر لیا تھا۔ اسی لیے کاکا پیار سے زیادہ اس کا احترام کرتا تھا۔

کبریٰ نے آکر اسے سلام کیا اور بولی "کاکا..... آدھا کلو مونگ کی دال دے دو۔"

کاکا دال تولنے لگا "بیٹی..... صابن بھی لے جا پھر پتا نہیں، دکان پر رہے نہ رہے" وہ بولا۔ اسے پریشانی تھی کہ وہ کل صابن والے کو پیسے نہیں دے سکے گا۔

کبریٰ بھی ناتجربہ کار نہیں تھی۔ اس بات کا مطلب سمجھتی تھی۔ "کاکا..... میرا حساب تو کافی لمبا ہو گیا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں..... کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں" کاکا نے جلدی سے کہا۔

"پھر بھی بتا تو دو۔"

"سات سو سے کم ہی ہے" کاکا نے کہا پھر پوچھا "صغریٰ کی شادی کب کر رہی ہے تو؟"

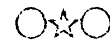
"عید کے دسویں دن کا ارادہ ہے۔ دعا کرو کاکا، اللہ نصیب اچھے کرے میری بچی کے۔"

"دعا تو کرتا ہی ہوں، فکر بھی کرتا ہوں بیٹی۔ دیکھ کوئی ضرورت ہو تو تکلف نہ کرنا، سب سے پہلے مجھے بتانا۔"

کبریٰ شرمندہ ہوئی..... اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "تم اتنے اچھے ہو کاکا۔ اور میں اتنی بری ہوں کہ پیسے ہوتے ہوئے بھی تمہارا حساب صاف نہیں کر رہی ہوں۔"

"تو میں نے تجھ سے تقاضا تو نہیں کیا" کاکا بولا "کیا میں سمجھتا نہیں ہوں، شادی کے گھر میں تو لاکھ بھی ہو تو کم ہے۔ لے یہ صابن بھی لے جا۔"

کبریٰ کاکا کی دکان سے اپنے گھر تک روتی ہوئی آئی.....



افطار کا وقت قریب تھا۔ صغریٰ پریشان تھی کہ اماں ابھی تک پھل لے کر نہیں آئی۔ پھر اسے امجد کا خیال آیا اور اس کا دل عجیب طرح دھڑکنے لگا۔ واجبی سے بھی کم شکل صورت کا امجد اس کے لیے ایک خاص اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اور یہ سوچ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں کہ آج وہ اس کے قریب بیٹھے گی۔

دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اماں کے چہرے پر ایسی خوشی اور آنکھوں میں ایسی چمک اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے غور سے اماں کے ہاتھوں کو دیکھا اور مایوس ہو گئی۔ اماں پھل نہیں لائی تھی۔ مگر اس کی مٹھی بند تھی "اماں..... پھل نہیں لائیں؟"

"لوٹ پڑی ہوئی ہے بیٹی۔ پھل بہت منگا ہے۔ چھوڑ..... ہم پکوڑوں سے افطار کر لیں گے۔"

صغریٰ نے مزید شکوہ نہیں کیا۔ اس سب کی وہ بچپن سے عادی تھی۔ پتا نہیں کیوں، جو چیز بھی اچھی لگے، وہ مہنگی ہی ہوتی ہے۔ اس نے سوچا، مگر فوراً ہی اس سوچ کو جھٹک دیا "پر اماں، پھل مہنگے ہونے پر تم اتنی خوش کیوں ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ بات نہیں پگلی!" کبریٰ نے کہا اور بند مٹھی اس کے سامنے کھول دی۔

صغریٰ سانس لینا بھی بھول گئی۔ وہ مبہوت ہو کر ان اشرفیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے جھپٹ کر ماں کی ہتھیلی پر سے انہیں اٹھایا اور بولی "اللہ..... کتنی حسین ہیں یہ۔ یہ کیا چیز ہے اماں؟"

"ظاہر میں تو اشرفیاں ہیں لیکن اصل میں اللہ کی رحمت اور خیر و برکت ہیں۔ ہم بے حیثیت لوگوں کو عزت اور اعتبار ملا ہے ان سے۔"

صغریٰ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اشرفیوں پر ایک طرف اللہ اور دوسری طرف کلمہ لکھا تھا "یہ تو بہت..... بہت زیادہ قیمتی ہیں اماں!" وہ بولی۔ چند لمحے وہ سوچتی رہی پھر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں "اماں..... ان کے بندے بن جائیں تو مجھ پر کیسے لگیں گے؟"

"نہیں بیٹی۔ ایسا سوچنا بھی نہیں" کبریٰ نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "یہ تو امانت ہیں۔"

"تمہیں ملیں کہاں سے؟"

"میں بازار سے آ رہی تھی کہ ایک شخص نے مجھے روک کر یہ تھما دیں اور بولا....." کبریٰ اس شخص کی باتیں من و عن دہراتی رہی۔ صغریٰ کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں۔

"میری سمجھ میں تو نہیں آتی یہ بات" کبریٰ کے خاموش ہونے پر صغریٰ نے کہا "پاکستان کی خوش حالی اور استحکام سے ان کا کیا واسطہ.....؟"

"اللہ کی باتیں ایسی آسانی سے کب سمجھ میں آتی ہیں۔ اپنے بھید وہی جانے۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ قرآن پاک ہدایت نامہ ہے۔ کروڑوں انسان اسے پڑھتے ہیں لیکن سمجھ میں کتنوں کی آتا ہے۔ یہ بات سمجھنے کی نہیں، بس ماننے اور عمل کرنے کی ہے۔"

"لیکن اماں، یہ بہت قیمتی ہیں۔ موٹر سائیکل کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔ بہت سارے پیسے مل سکتے ہیں ہمیں۔"

"جہنم میں گئی موٹر سائیکل" کبریٰ کو طرارہ آ گیا "ان کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں۔"

صغریٰ نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ اس نے کبھی اس سے اتنی سختی سے بات نہیں کی تھی "اتنا ناراض کیوں ہو رہی ہو اماں۔ میں دونوں کے لیے تو نہیں کہہ رہی ہوں مگر دینے والے نے کہا تھا کہ تم

چاہو تو ان میں سے ایک رکھ سکتی ہو اور اس ایک سے ہمارے سب دلدّر دور ہو سکتے ہیں۔"

"مگر میں یہ بھی نہیں رکھوں گی۔ جسے دوں گی' دونوں ہی دوں گی۔ اس کا ایمان کیوں خطرے میں ڈالوں۔"

"یہ تو زبردستی کی بات ہے اماں!" صغریٰ نے منہ پھلا کر کہا۔

"دیکھ بیٹی۔ دینے والے نے مجھ سے کہا' چاہو تو ایک تم رکھ لینا۔ وہ یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ ایک تمہاری ہے۔ مگر اس نے نہیں کہا۔ کہتا تو میں رکھ لیتی۔ لیکن اس نے مجھے بس اختیار دیا.... چاہو تو...."

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"دیکھ۔ اسے بھی کسی نے یہی کہہ کر دونوں اشرفیاں دی ہوں گی۔ اس بھلے آدمی نے بھی ایک اپنے لیے نہیں رکھی۔ دونوں میری طرف بڑھا دیں اور یہ سلسلہ نہ جانے کہاں سے یونہی چلا آرہا ہوگا۔ میں کیوں اس کے خلاف کروں؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔ ہم اتنے غریب ہیں...."

"لیکن اللہ کا شکر ہے کہ عزت سے جی رہے ہیں۔ کبھی ایک وقت کا فاقہ بھی نہیں ہوا" کبریٰ نے تیز لہجے میں کہا پھر نرمی سے بیٹی کو سمجھایا "بیٹی پاکستان ہے تو سب کچھ ہے۔ پاکستان کا فائدہ ہم سب کا فائدہ۔ اس کی خوش حالی ہماری خوش حالی۔ اس کی برکت ہماری برکت۔ ہم لالچ میں پڑ کر اپنے چھوٹے سے فائدے کے لیے پاکستان کا بڑا نقصان کیوں کریں جو کروڑوں پاکستانیوں کا نقصان ہوگا۔ پھر دینے والے نے کہا کہ یہ اپنی منزل پر پہنچ کر دین اسلام کی سربلندی لائیں گی۔ تو میں دین کا کام بھی خراب کروں۔ تو غور سے اللہ کا نام اور یہ کلمہ دیکھ۔ یہ حرف تجھے کچھ کہتے محسوس نہیں ہوتے۔ مجھ سے تو یہ صاف کہہ رہے تھے.... تم کمزور نہ پڑنا کبریٰ.... ورنہ بہت نقصان ہوگا۔"

صغریٰ کچھ کچھ قائل ہوگئی تھی۔ اس نے اللہ کے نام اور کلمے کو غور سے دیکھا۔ انہوں نے اس سے کچھ کہا تو نہیں لیکن انہیں نظریں جما کر دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کا دل بھر آیا۔ پوری طرح قائل نہ ہونے کے باوجود اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو اماں!" یہ کہہ کر اس نے اشرفیاں ماں کو دے دیں۔

اسی لمحے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ افطار کا وقت ہوگیا تھا۔



دونوں ماں بیٹی کمرے میں تھیں۔ کبریٰ نے کہا "بیٹی' امجد آئے تو اس کے پاس بیٹھ کر طریقے سے اسے سمجھانے کی کوشش کرنا۔ تو ہی اسے سمجھا سکتی ہے۔ میرا پوچھے تو کہہ دینا نماز پڑھ رہی ہیں۔"

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ صغریٰ لپک کر گئی۔ کبریٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی سانسیں بھی دعا بن گئیں۔

صغریٰ نے امجد کو صحن میں چارپائی پر بٹھایا اور خود ذرا فاصلے سے بیٹھ گئی "اماں تو نماز پڑھ رہی ہیں" وہ بولی۔

امجد بڑی خباثت سے مسکرایا "آج پہلی بار میں صحیح وقت پر آیا ہوں" پھر اس نے بہت غور سے صغریٰ کو دیکھا اور شک آمیز لہجے میں بولا "پہلے تو تو جھلکی بھی نہیں مارتی تھی۔ آج بڑی مہربان ہو رہی ہے' خیر تو ہے؟"

"اماں ہوتی تھیں نا اور مجھے شرم بھی آتی ہے۔"

امجد اسے غور سے دیکھتا رہا "ویسے تو ہے بڑی بم چیز۔ میں کیا ہوں' تجھے دیکھ کر تو فرشتوں کے دل بے ایمان ہو جائیں۔"

صغریٰ کو وہ تعریف بہت بری لگی مگر اس نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ سمجھوتا کرنا سیکھ رہی تھی۔

"ذرا قریب تو آ۔ اتنی دور کیوں بیٹھی ہے؟" امجد نے فرمائش کی۔

صغریٰ کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اس کے قریب ہوگئی۔

امجد نے صغریٰ کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے اسے سہلانے لگا۔ صغریٰ کو وہ لمس بہت برا لگا لیکن اسے ڈر تھا کہ وہ کچھ کہے گی تو امجد ناراض ہو جائے گا اور اماں کا کہنا تھا کہ وہ ان کی آخری امید ہے۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی بلکہ اسے تو اس کو موٹر سائیکل سے دستبردار ہونے پر رضامند کرنا تھا۔

ادھر کمرے میں کبریٰ ان کی آوازوں پر کان لگائے تھی۔ اس کی دروازے پر آکر انہیں دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اٹھی اور دروازے کی طرف چل دی۔

صغریٰ اپنے خیالوں سے چونکی۔ امجد کا ہاتھ حرکت کرتے کرتے اس کے ہاتھ سے گزر کر بازو تک پہنچ چکا تھا اور اب کندھے پر پہنچنے والا تھا۔ وہ پوری جان سے لرز گئی۔ "یہ.... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

اتنی دیر میں امجد اس کے کندھے پکڑ چکا تھا۔ اس نے کھینچ کر صغریٰ کو سینے سے لگانے کی کوشش کی "کیوں.... تم پر میرا اتنا حق بھی نہیں" اس نے بدمعاشی سے کہا۔

"شادی سے پہلے تو یہ حق نہیں ہوتا" صغریٰ نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ اسے خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھی "بے صبرے نہ بنو۔"

"میں اس لیے بے صبرا بن رہا ہوں کہ شادی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ میں بچہ نہیں ہوں' سب سمجھتا ہوں۔ چاچی نے تجھے اس لیے میرے پاس بھیجا ہے ناکہ تو مجھے لبھا کر موٹر سائیکل کا خیال دل سے نکالنے پر راضی کرے۔ پر ایسا ہوگا نہیں۔ میں موٹر سائیکل کے بغیر نہیں مانوں گا" اور امجد کے جبر میں اور شدت آگئی۔

کبریٰ نے دروازے سے یہ سب دیکھا اور تڑپ کر باہر نکل آئی "بیٹی.... تو جا کر چائے بنا" اس نے نرم لہجے میں صغریٰ سے کہا۔ صغریٰ کے جانے کے بعد وہ امجد کے سامنے بیٹھ گئی "تو

ضد چھوڑ دے امجد۔ دیکھ' وہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں تیری ضد کیسے پوری کروں؟"

"یہ ضد میں نہیں چھوڑوں گا کیونکہ تم پوری کرسکتی ہو۔"

"کیسے؟ میں سچ کہہ رہی ہوں....."

"وہ رمضان تم پر مرتا ہے۔ تمہاری ہر شرط پوری کرنے کے لیے تیار ہے۔ تم اس سے شادی کرلو۔ صغریٰ کے جانے کے بعد اکیلی بھی نہیں رہوگی اور مجھے بھی موٹر سائیکل مل جائے گی۔"

"وہ اڈا چلانے والا رمضان...؟" کبریٰ نے حقارت سے کہا۔

"وہ اس کا کاروبار ہے اور شادی کوئی بری بات نہیں۔"

"لعنت ہو ایسے کاروبار پر..... اور ایسی شادی پر۔ پہلے جو تین کی تھیں اس نے' ان کا کیا ہوا۔ انہیں بھی کاروبار میں جھونک دیا بدبخت نے۔ میں اس سے شادی کرلوں۔"

"نہ کرو۔ تمہاری مرضی' کرلو تو دھن میں کھیلوگی۔ نہیں کروگی تو بیٹی کا بوجھ بھی لیے بیٹھی رہوگی۔"

"مجھے شادی کرنی ہوتی تو پہلے ہی کرلیتی جب جوان بھی تھی اور خوب صورت بھی" کبریٰ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"جوان تم اب بھی ہو..... اور خوب صورتی میں تو صغریٰ سے بھی آگے ہو چاچی" امجد نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے ایسے بات مت کر۔ دیکھ مان جا' میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں" کبریٰ کو خیال ہی نہیں رہا کہ اشرفیاں اس کی مٹھی میں دبی ہیں۔ اشرفیاں نیچے گریں۔ اس نے جھپٹ کر انہیں اٹھالیا لیکن امجد انہیں دیکھ چکا تھا۔ "یہ..... یہ کیا ہیں؟"

کبریٰ کو کہانی پھر دہرانی پڑی "یہ تو بیڑا پار کرسکتی ہیں اپنا" امجد نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ امانت ہیں' میری نہیں" کبریٰ نے اسے سمجھایا لیکن اسے سمجھانا صغریٰ کے مقابلے میں بہت بڑا کام تھا اور ناممکن بھی... وہ بھی دلیل دے رہا تھا کہ ایک تو اس کی اپنی ہے اور وہ اسے قائل بھی نہیں کرسکتی تھی۔

"اس کے زور پر تو تم مجھے کار بھی دلاسکتی ہو چاچی!"

"میں نے کہا نا' یہ میری نہیں۔"

امجد نے مسئلے کا آسان حل ڈھونڈ نکالا "چلو..... ایسا کرو چاچی۔ یہ مجھے دے دو۔ پھر میں کچھ بھی نہیں مانگوں گا اور صغریٰ سے شادی بھی کرلوں گا۔"

"یہ میں تمہیں نہیں دے سکتی۔"

"کیوں نہیں دے سکتیں" امجد نے حیرت سے کہا "تمہیں آگے تو بڑھانی ہی ہیں۔ مجھے دے دو۔ تمہیں موٹر سائیکل کی فکر سے نجات بھی مل جائے گی اور بیٹی کی شادی بھی ہو جائے گی۔"

"یہ کسی نیک اور ایمان دار آدمی کو دینی ہیں۔"

"تمہارے داماد سے بڑھ کر نیک اور ایمان دار کون ہوگا" امجد کے لہجے میں دھمکی تھی۔

"نہیں۔ یہ میں تجھے نہیں دے سکتی..... نہ ہی دوں گی" کبریٰ کے لہجے میں جانے کیسے قطعیت آگئی۔

امجد اٹھ کھڑا ہوا "بس تو شادی کی بات ختم سمجھو۔"

"ٹھیک ہے' اللہ کی مرضی!" کبریٰ نے آہ بھر کر کہا اور آسمان کو تکنے لگی۔

جاتا ہوا امجد دروازے پر رکا "تم مجھے موٹر سائیکل دے سکتی تھیں۔ ایک اور بھی صورت تھی تمہاری شادی کے سوا" اس نے زہریلے لہجے میں کہا "صغریٰ کو تو صرف ایک رات میں نئی موٹر سائیکل بھی مل سکتی تھی اور میں اسے پھر بھی قبول کرلیتا۔ ایک رات سے فرق کیا پڑتا ہے۔"

کبریٰ کا ضبط جواب دے گیا "چلا جا بے غیرت!" وہ چلّائی۔

"جارہا ہوں مگر حسین بیٹی وبال بنے گی' عزت لٹے گی تو میں تمہیں یاد آؤں گا" یہ کہہ کر امجد چلا گیا۔

کچن کے دروازے پر کھڑی صغریٰ کے دل میں اس کی آخری بات کھب گئی۔ وہ وبال بنے گی..... اس کی عزت لٹے گی! یہ اماں نے کیا کیا؟



وہ بڑی سوگوار رات تھی!

دونوں ایک پل کے لیے بھی نہ سوسکیں۔ اپنے اپنے پلنگ پر کروٹیں بدلتی رہیں۔ مگر انہوں نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ بیٹی کو حجاب روکتا تھا اور ماں کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔

لیکن سحری کے بعد صغریٰ سے نہ رہا گیا "اماں' تم نے برا کیا" اس نے آہستہ سے کہا "اشرفیاں انہیں دے دیتیں۔"

"ایسے ذلیل' نیچ بدکار کے ہاتھ میں وہ پاک امانت دے دیتی" کبریٰ بھڑک گئی۔

"وہ بے ایمان ہوتے تو اشرفیاں تمہارے پاس واپس آجاتیں' نقصان کیا تھا اس میں۔"

"جانتے بوجھتے غلط آدمی کو امانت سونپنے کی گناہ گار بن جاتی۔ اپنی غرض کے لیے وہ ایک بے ایمان آدمی کو دے دیتی.... یہ سوچ کر انہیں واپس تو آنا ہی ہے تو یہ بے ایمانی نہیں ہوتی۔ میں خود بھی بے ایمان ہو جاتی۔ سعادت سے محروم ہو جاتی۔ پھر تو وہ اشرفیاں میرے پاس بھی نہیں ٹھہرتیں۔"

"لیکن اماں' اب کیا ہوگا؟"

"تو فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا ٹھیک ہو جائے گا اماں۔ تمہی تو کہتی تھیں کہ وہ ہماری آخری امید ہے۔"

"غلط کہتی تھی میں۔ امید تو بس اللہ سے رکھنی چاہیے۔ اسی کے سہارے تو بیوگی کے بیس سال گزارے ہیں میں نے۔"

"مگر اماں' میرا کیا ہوگا۔ تم نے تو ڈرا دیا ہے مجھے۔"

"سب بھول جا۔ آدمی آدمی سے لو لگائے گا تو ڈرے گا ہی۔ اللہ سے لو لگالے تو کوئی ڈر نہیں رہتا۔ میں تو نڈر ہوگئی' تو بھی ہو جا۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔"

"لیکن اماں، امجد بھائی مجھے تحفظ دے سکتے تھے۔"

"وہ صرف رب دے سکتا ہے اور اس لفنگے کو بھائی نہ کہنا کبھی۔ یاد نہیں، اس بے غیرت نے کیا کہا تھا۔"

صغریٰ کو یاد آیا تو اس کا دل برا ہو گیا۔ امجد واقعی بے غیرت تھا۔ وہ تو بعد میں بھی اسے پچھتاتا رہتا۔ اچھا تو وہ صغریٰ کو لگتا ہی نہیں تھا۔ مگر اب تو اس سے نفرت محسوس ہونے لگی "ٹھیک ہے اماں، وہ واقعی برا تھا..... لیکن..."

"بس... جو ہونا ہے، ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ تو بھی میری طرح کی زندگی گزارے گی۔ پر زندگی تو گزر ہی جاتی ہے بیٹی۔ نہ گھبرا۔ آخرت میں بڑا اجر ملے گا انشاء اللہ۔"

اور نہ جانے کیسے صغریٰ کو قرار آگیا۔ چند لمحے بعد اس نے پوچھا "اور اشرفیوں کا کیا کرو گی اماں؟"

"ان کا بھی سوچ لیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔"

○☆○

کاکا نے اشرفیوں کو عقیدت سے دیکھا، چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ کبریٰ کی پوری بات سننے کے بعد کہا "تجھے اللہ نے بڑائی دی ہے بیٹی۔ تو فکر نہ کر۔ میں انہیں ایک ایسے شخص کو سونپوں گا کہ ان کے تو انشاء اللہ پر لگ جائیں گے۔ بہت تیز سفر کریں گی یہ۔"

"شکریہ کاکا۔ تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔"

"شکریہ کیسا بیٹی۔ تو نے اپنا فرض پورا کیا۔ میں اپنا کروں گا" کاکا کہتے کہتے رکا اور پھر جھجک جھجک کر بولا "ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانے گی؟ تو میرے ادھار کو اب بھول ہی جا۔"

"نہیں کاکا۔ تم مجھے اس کا صلہ دے رہے ہو۔"

"یہ بات نہیں۔ تو نے مجھے سعادت دلوا کر احسان کیا ہے۔"

"کیسا احسان کاکا!" کبریٰ نے کانوں کو ہاتھ لگایا "یہ تو اللہ کی دین ہے..... میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی" پھر اس نے پلو سے کھول کر ہزار کا نوٹ کاکا کی طرف بڑھایا "پچھلے حساب صاف کر کے باقی پیشگی رکھ لو" کاکا کی آنکھوں میں حیرت دیکھ کر اس نے وضاحت کی "کہا تھا نا کہ پیسے ہوتے ہوئے نہیں دے رہی ہوں۔ دس ہزار روپے صغریٰ کی شادی کے لیے رکھے تھے۔"

"تو...؟"

"اللہ کا حکم نہیں ہے تو پھر قرض کیوں نہ اتار دوں۔ جب وہ چاہے گا، بہتری کرے گا" یہ کہہ کر کبریٰ تیزی سے چل دی۔ ورنہ مزید وضاحت کرنی پڑتی۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ ایک عجیب سی بے فکری اس پر طاری ہو گئی تھی اور اپنا آپ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

چلتے چلتے اس کے ذہن میں عجیب سوچ ابھری اور اس نے فیصلہ بھی کر لیا۔ آج وہ مرغی پکوائے گی۔ پھل خریدے گی، چاہے کتنے ہی مہنگے ہوں۔ صغریٰ خوش ہو گی اور یہی نہیں، وہ عید کی خریداری بھی ڈھنگ سے کرے گی۔ عید کے دن بھی اچھا کھانا پکے گا اس کے گھر میں...

○☆○

عید کے روز پڑوسن رشیدہ ملنے آئی۔ وہ رشتے کراتی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے کبریٰ سے پوچھا "صغریٰ کو کب نمٹا رہی ہو، عید کے دسویں دن نا..؟"

"نہیں۔ وہ بات ہی ختم ہو گئی" کبریٰ نے کہا لیکن رشیدہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ مچلتی دیکھ کر اسے غصہ آگیا "میری بیٹی کا رشتہ ٹوٹنے پر تمہیں خوشی ہو رہی ہے؟"

"بات ہی خوشی کی ہے" رشیدہ نے ڈھٹائی سے کہا پھر کبریٰ کے تیور بگڑتے دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی "اب تمہاری بیٹی کا ایسا رشتہ کراؤں گی کہ تم نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا۔"

"سچ؟" کبریٰ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"سامنے والی پکی بستی میں شیخ صاحب رہتے ہیں۔ بہت بڑا بنگلا ہے ان کا۔ کئی تو کارخانے ہیں۔ انہوں نے تمہاری صغریٰ کو دیکھا اور اس پر ریجھ گئے۔ اکلوتا بیٹا ہے ان کا۔ خوب صورت، پڑھا لکھا، کوئی کمی نہیں۔ مجھ سے بات کی، میرے منہ سے نکل گیا کہ اس کی تو بات پکی ہو چکی ہے۔ اب شادی ہونے والی ہے۔ سچی بات ہے بہن، میں کہہ کر پچھتائی۔ وہ ایک دم بجھ گئے۔ میں نے کہا بھی کہ پھر بھی کوشش کرتی ہوں۔ بولے نہیں، میں پیسے کے زور پر کسی کی خوشی خراب نہیں کر سکتا۔ رہنے دو، ہمارے نصیب میں نہیں۔ پر بچی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔"

"بہت ہی نیک آدمی ہوں گے" کبریٰ نے کہا۔

"پنج وقتہ نمازی ہیں۔ پانچ سال پہلے بیوی فوت ہو گئی تھی پھر شادی نہیں کی۔"

"تو اب...؟"

"آج ہی جا کر انہیں بتاؤں گی، کل انہیں لے آؤں گی۔ مگر مجھے تو لگتا ہے کہ وہ آج ہی دوڑے آئیں گے" رشیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رکو تو سہی۔ منہ تو میٹھا کر لو۔ کل رات مٹھائی لائی تھی میں۔"

"منہ تو ضرور میٹھا کروں گی مگر رکوں گی نہیں۔ میں تو ابھی جاؤں گی شیخ صاحب کے پاس۔"

○☆○

وہ عید کا دن سب سے بڑی خوشی کا دن بن گیا!

لیکن کبریٰ مخمصے میں تھی۔ اتنے بڑے لوگ! اسے رہ رہ کر فکر ستاتی کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہو گی۔ لڑکے میں کوئی نقص نہ ہو۔ پیسے والے ہیں تو میری بچی کو حقیر نہ سمجھیں ساری زندگی۔ آخر انہیں ہم غریب کیسے بھا گئے۔ ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہے۔

مگر پھر اس کے اندر ایک آواز ابھری 'اللہ کی عنایت صاف شفاف اور بے داغ ہوتی ہے' اور اس کے دل کو قرار آگیا۔

شیخ صاحب شام کو ہی آگئے۔ انہیں دیکھتے ہی کبریٰ کے سب واہمے دور ہو گئے۔ شیخ صاحب کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا۔ خوبرو

خوش گفتار! ایسے داماد کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے دل سے صدائے شکر بلند ہوئی۔

"میں ذیشان کو بھی ساتھ لے آیا تاکہ تم بھی اسے دیکھ لو۔ ممکن ہے، تمہیں بعد میں پسند نہ آئے" شیخ صاحب نے کہا۔

"یہ تو لاکھوں میں ایک ہیں جناب!" کبریٰ نے عاجزی سے کہا۔

"برا نہ مانو تو بیٹی صغریٰ کو بھی بلالو بہن۔ یہ دونوں بھی ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔ زندگی تو انہیں گزارنی ہے۔"

وہ دونوں ساتھ کھڑے ہوئے تو چاند سورج کی جوڑی بن گئی۔

"دیکھو بہن، تمہاری بیٹی اتنی انمول ہے، اور میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مجھے اس بیٹی کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ میں عید کے دسویں دن مختصر سی برات لاؤں گا۔ منظور ہے؟"

"جی شیخ....."

"بھائی صاحب کہو نا، میں نے تمہیں بہن کہا ہے۔"

"جی بھائی صاحب، مجھے منظور ہے" کبریٰ نے دل میں کہا.... دل و جان سے۔

"بس تو بات پکی ہوگئی۔ ذیشان، لو بیٹے.... صغریٰ بیٹی کو یہ انگوٹھی پہنادو" شیخ صاحب نے بیٹے کی طرف مخملی کیس بڑھایا۔

اور وہ انگوٹھی ایسی حسین تھی کہ اسے دیکھ کر کبریٰ کو متبرک اشرفیاں یاد آگئیں۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

جاتے جاتے شیخ صاحب نے بے حد عاجزی سے کہا "میں تم سے کچھ اور بھی مانگنا چاہتا ہوں بہن!"

کبریٰ نے حیرت سے انہیں دیکھا "جی.... میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

"جو دے سکتی ہو، وہ مانگوں گا۔ بس مایوس نہ کرنا۔ دیکھو میں نے تمہیں بہن کہا اور خود کو تمہارا بھائی سمجھ لیا۔ صغریٰ کی رخصتی کے بعد تمہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں اور پھر ذیشان کی ماں کے بعد میرا گھر بھی سونا اور بد نظمی کا شکار ہے۔ کوئی خیال رکھنے والا.... انتظام کرنے والا نہیں۔ میری بہن، تم اسے سنبھال سکتی ہو۔ صغریٰ تو بہت چھوٹی ہے۔"

"لیکن بھائی صاحب....."

"بھائی صاحب کہتی ہو تو بات بھی مانو گی، ٹھیک ہے نا۔"

کبریٰ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے "ٹھیک ہے بھائی صاحب۔ آپ جب مجھے لینے آئیں گے، میں آپ کے ساتھ چلی چلوں گی۔"

"جیتی رہو بہن!" شیخ صاحب نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ لوگ چلے گئے۔ کبریٰ ہی نہیں، صغریٰ بھی حیران تھی۔ چند گھنٹوں میں ایسی کایا پلٹ بھی ہو سکتی ہے؟ نئی، خوب صورت، بابرکت اور خوش حال زندگی ان کے لیے اپنی بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔

○☆○

میں یہ سب کچھ لکھنے کے بعد دیر تک ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ اللہ کی رحمت، تائید اور خیر و برکت کیسی ہوتی ہے، یہ میں دیکھ چکا تھا لیکن اس واقعے نے میرے دل کے تاروں کو جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔ ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا۔ کوئی ایسے مہربان، رحم والے اور کریم رب کا شکر ادا کر سکتا ہے؟

پھر میرے ذہن میں اس سوال کا جواب ابھرا "کیوں نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن شکر کا حق کوئی ادا نہیں کر سکتا۔"

○☆○

وہ ۳۰ جون ۹۸ء کی رات تھی۔ مجھے بابا عصر سے ملتے ہوئے تقریباً ڈھائی سال ہو چکے تھے۔ اس رات میں نے بابا عصر کے چہرے پر طمانیت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی جو میرے لیے بالکل نئی چیز تھی "آج آپ بہت خوش ہیں بابا!" میں نے ان سے پوچھا۔

"ہاں۔ آج کام کا..... کہانی کا ایک مرحلہ مکمل ہو رہا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ایک مرحلے سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"آگے کیا ہوگا، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ کون سعادت پائے گا اور کس کو ذلت اور رسوائی ملے گی، یہ اسے ہی خبر ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا تو وہ بولے "اس سے زیادہ میں سمجھا نہیں سکتا۔ بس جو بھی ہے، سب کے سامنے آجائے گا۔ تم بھی دیکھ لوگے۔ ہمیں تو بس اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ہم نے اپنا اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے دیا ہے اور اس پر ہمیں اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔"

"جی.... بے شک" میں نے دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اب تم جاؤ لیکن یاد رکھو، صبح چار بجے اپنے گھر سے نکل آنا۔ میں تمہیں ساتھ لے لوں گا، کہیں چلنا ہے۔"

"صبح چار بجے!" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی تمہارے کام کی تکمیل ہوگی۔ بس اب جاؤ۔"

مگر اس سے پہلے کہ میں پلٹتا، ہمیشہ کی طرح وہ خود ہی تیزی سے چلتے لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

میں گھر پہنچا تو گیارہ بجے تھے۔ میں نے گھڑی میں ساڑھے تین بجے کا الارم لگایا اور سونے کے لیے لیٹ گیا لیکن میری آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ یہ تصور بہت خوش آئند تھا کہ ڈھائی سال پہلے شروع ہونے والا اہم ترین کام مکمل ہونے والا ہے۔ یہ سب اللہ کا فضل و کرم تھا اور اللہ کے فضل و کرم کے سبب سے تھا۔ میرا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے مجھے یہ سعادت عطا فرمائی اور اسے میرے لیے آسان بھی کیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس دوران میں میری زندگی بدل گئی۔

مجھے تجسس بھی تھا کہ اس کہانی کا اختتام کیا ہوتا ہے۔ میں

کہانی لکھنے والا پروفیشنل ہوں۔ مگر اس کہانی کا انجام، اس کا وائنڈ اپ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایسی عجیب حقیقت تو میں نے کہانی میں بھی کبھی نہیں لکھی تھی۔

قصہ مختصر یہ کہ اس رات نیند میری آنکھوں کے قریب بھی نہیں پھٹکی اور کمال یہ ہوا کہ اس بیداری نے مجھے مضمحل بھی نہیں کیا۔ میں تازہ دم تھا۔

سوا تین بجے میں بستر سے اٹھ گیا۔ میں نے گھڑی کا الارم بند کردیا۔ باتھ روم سے غسل کرکے میں باہر آیا اور میں نے شکر کے نوافل ادا کیے۔ اب ہر لمحہ میرا تجسس بڑھتا جارہا تھا۔ جسم میں دوڑنے والی سنسنی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی۔ میں بے چین اور مضطرب تھا لیکن اس بے چینی اور اضطراب میں بے سکونی نہیں تھی، طمانیت اور سکون تھا۔

پونے چار بجے میں گھر سے نکل آیا۔ بلڈنگ کے چوکی دار نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ لیکن کچھ کہے سنے بغیر میرے لیے گیٹ کھول دیا۔ میں باہر نکل آیا۔ صبح کی خوش گوار ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی لیکن بری نہیں لگ رہی تھی۔ میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔

اچانک جیسے کسی ہوا کے لطیف جھونکے نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ میں پلٹ کر دیکھنا چاہتا تھا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مجھے برابر سے بابا عصر گزرتے نظر آئے اور اگلے ہی ثانیے وہ مجھ سے آگے نکل گئے "چلو..... قدم بڑھاؤنا۔ کھڑے کیوں ہو؟" انہوں نے کہا۔

ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ میں چل رہا ہوتا تھا مگر انہیں ٹھہرا ہوا لگتا تھا.....شاید اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے۔ بہر حال میں تیز قدموں سے ان کے پیچھے چل دیا۔ میرا تجسس سے برا حال تھا۔ اچانک میری نظر بابا عصر کے ہاتھ پر پڑی۔ ان کے ہاتھ میں ایک بے حد خوب صورت اور کافی بڑا رومال تھا۔ اس میں کوئی چیز بندھی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے وہ پوٹلی جیسا لگ رہا تھا۔ اس کی وجہ سے میرے تجسس کو استفسار کا راستہ مل گیا "بابا..... یہ آپ کے ہاتھوں میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے چلتے چلتے سر گھما کر مجھے دیکھا "اس میں وہ نورانی اشرفیاں ہیں جن کے سفر میں تم شریک رہے ہو۔ جن کا سفرنامہ تم لکھتے رہے ہو۔"

میں نے بے یقینی سے اس رومال کو دیکھا "دو اشرفیاں تو نہیں لگتیں یہ" میں نے کہا "یہ پوٹلی اتنی بڑی کیوں لگ رہی ہے؟"

"میں نے کب کہا کہ یہ دو اشرفیاں ہیں" بابا عصر تیکھے لہجے میں بولے "یہ بہت ساری اشرفیاں ہیں" انہوں نے کہا اور چلتے چلتے ہی رومال کھول کر مجھے دکھایا۔

میں نے دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ واقعی بہت ساری اشرفیاں تھیں۔ میں انہیں گن بھی نہیں سکتا تھا..... اور سب ایک جیسی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے وہ رات یاد آگئی جب میری کایا پلٹ ہوئی تھی۔ "یہ اتنی بہت سی کیسے ہوگئیں؟"

بابا عصر نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں کوئی نادان بچہ ہوں۔ "کراچی پاکستان نہیں۔ نہ ہی یہ پاکستان کا واحد شہر ہے۔ خیروبرکت کا یہ سفر ہر بڑے چھوٹے شہر میں شروع ہوا تھا اور یہ پاکستان کے چھوٹے سے چھوٹے گاؤں تک پہنچی ہیں۔ اللہ خود کسی کو خیر سے محروم نہیں کرتا، وہ بڑا کریم ہے۔"

"اوہ، تو یہ بات ہے" بات کچھ میری سمجھ میں آنے لگی۔ میں نے سوچا، یہ بات تو مجھے خود ہی سمجھ لینی چاہیے تھی "مگر یہ سب آپ کے پاس...؟"

وہ پھر مسکرائے "آخری مرحلے کی تکمیل سے پہلے انہیں میرے پاس اکٹھا ہونا تھا۔"

"تو اب کیا ہوگا؟"

"خود ہی دیکھ لینا۔ اب انہیں آخری ہاتھوں میں جانا ہے.... آخری آدمی کے پاس۔ دعا کرو کہ وہ آخری آدمی ہی ثابت ہو" آخری بات کہتے کہتے ان کے لہجے میں تشویش در آئی "اگر وہ اہل، امین اور دیانت دار ثابت ہوا تو یہ اشرفیاں قومی خزانے میں پہنچ جائیں گی۔ پھر یہاں ایک نیا دور شروع ہوگا۔ پاکستان کے استحکام اور اسلام کی سربلندی کا دور۔ کفر و باطل کی ہزیمت کا دور۔ جہاد فی سبیل اللہ کا دور۔ شہادت کے اعزاز تقسیم ہوں گے" ان کا لہجہ خواب ناک ہوگیا۔

"اور اگر خدانخواستہ وہ آخری آدمی اہل، امین اور دیانت دار ثابت نہ ہوا تو...؟"

"پھر وہ بدنصیب ثابت ہوگا۔ اپنی دنیا اور آخرت ایک ساتھ گنوا دے گا" بابا عصر نے افسردگی سے کہا۔

تجسس مجھے بے صبرا بنائے دے رہا تھا۔ مجھے آخری آدمی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس وقت مجھے یہ تجسس بھی نہیں تھا کہ یہ آخری آدمی کون ہے۔ میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے.... یہ بتائیں کہ پھر ہوگا کیا؟"

"اشرفیاں واپس میرے پاس آجائیں گی" بابا عصر نے دل گرفتہ لہجے میں کہا "پھر اس کے متبادل کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر تو اشرفیاں قومی خزانے میں نہیں پہنچ سکتیں۔"

"اور اگر خدانخواستہ وہ متبادل بھی اہل، امین اور دیانت دار نہ ہوا تو؟"

"اللہ نہ کرے۔ لیکن ایسا ہوا تو انتظار اور طویل ہوجائے گا" بابا کے لہجے میں گھبراہٹ تھی "لیکن مجھے امید ہے.... اور اللہ سے میری دعا ہے کہ ایسا نہ ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ اس موجودہ آخری آدمی نے یہ اعزاز گنوا دیا تو اس کی جگہ لینے والا انشاء اللہ تمام اہلیتوں اور سعادتوں سے مالا مال ہوگا۔ کیونکہ معرکے کا وقت بہت قریب ہے۔ آگے اللہ کی مرضی، وہی جانے۔"

نہ جانے کیوں میں بھی اداس ہوگیا۔ ڈھائی سال میں تو یہ مرحلہ طے ہوا تھا اور اس دوران میں قومی معیشت تباہی کے دہانے تک پہنچ گئی تھی۔ ملک دیوالیا ہونے کے قریب تھا۔ یہ خیال ہی روح فرسا تھا کہ خدانخواستہ ابھی اور دیر لگ سکتی ہے۔

"دل چھوٹا نہ کرو" بابا عصر نے مجھے دلاسا دیا "حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، مایوسی کفر ہے۔ اللہ مسبب الاسباب بھی ہے اور قادرِ مطلق بھی۔"

اب مجھے اس پر حیرت نہیں ہوتی تھی کہ بابا عصر میری سوچیں پڑھ لیتے ہیں۔ میں چلتا رہا۔ اچانک میرے دل میں خواہش ابھری کہ میں ان متبرک اشرفیوں کو اٹھا کر چلوں۔ میں نے یہ بات بابا عصر سے کی۔ وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگے پھر بولے "یہ بہت زیادہ ہیں، تم اٹھا نہیں سکو گے۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ وہ اتنا سا تو رومال تھا۔ اشرفیاں یقیناً بہت زیادہ تھیں۔ لیکن اتنی بھی نہیں کہ میں اٹھا نہ سکوں "میں اٹھالوں گا" میں نے کہا۔

انہوں نے بڑی احتیاط سے وہ پوٹلی مجھے دی مگر اسے تھامتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ جتنی بڑی نظر آرہی ہے، درحقیقت اس سے بہت بڑی ہے اور ان اشرفیوں کا بوجھ! اسے لے کر ایک قدم چلنا تو درکنار، میں سیدھا کھڑا بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ میری ٹانگیں کانپنے لگیں اور پوٹلی ہاتھ سے چھوٹنے لگی۔

بابا عصر نے بڑی پھرتی سے اسے تھام لیا "یہ بڑی بھاری امانت ہے" انہوں نے وضاحت کی "ہزاروں مل کر اٹھائیں تو بھی یہ آسان بوجھ نہیں۔"

میں انہیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ اتنا بوجھ لے کر بھی اتنے تیز قدموں سے چل رہے تھے۔ جبکہ میں نے اس پوٹلی کو پوری طرح تھاما بھی نہیں تھا تو مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ جیسے میں بھاری سامان سے لدے ہوئے کسی ٹرک کو ہلانے کی ناکام کوشش کررہا ہوں۔

ہم چلتے رہے۔ اچانک میرے تجسس نے رخ بدلا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے پوچھ لیا "یہ آخری آدمی کون ہے؟"

"خود دیکھ لینا، اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہم اس وقت ایک پختہ سڑک پر چل رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ گردوپیش مجھے بے حد اجنبی سا لگ رہا تھا اور پھر صبح کی اس ہلکی روشنی میں، میں نے جو کچھ دیکھا، اس نے مجھے حیران کردیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

یادگارِ پاکستان کے مینار نے میرے ہوش اڑادیے تھے۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا مگر وہ خواب یا میرا تصور ہرگز نہیں تھا۔ "بابا..... یہ....."

"ہاں۔ ہم لاہور میں ہیں۔"

"لیکن یہ کیسے..... ہم تو کراچی میں تھے؟"

"اللہ کے بھید وہی جانے۔ اس میں تجسس نہ کرو۔ جیسے آئے ہو، ویسے ہی واپس بھی پہنچ جاؤ گے۔"

اب ہم شاید کسی بہت بڑے باغ میں تھے۔ ہمارے قدموں کے نیچے سبزہ تھا۔ اجالا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو دور مجھے ایک بڑا آہنی گیٹ نظر آیا۔ وہاں دس بارہ مسلح پہرے دار بھی تھے۔ مجھے لگا کہ وہ کسی بڑے اور اہم عہدے دار کی رہائش گاہ ہے۔ شکر ہے کہ ہم اس کے باہر اور اس سے خاصا دور تھے۔ ورنہ پہرے داروں کے سامنے جواب دہی مشکل ہوجاتی۔ مگر اسی لمحے بابا عصر کے قدم گیٹ کی سمت اٹھنے لگے "اس طرف کیوں جارہے ہیں؟" میں نے فریاد کی "دیکھتے نہیں، وہ کسی بڑے آدمی کی رہائش گاہ ہے۔"

"وہ کیوں کہہ رہے ہو؟" بابا عصر نے مجھے ڈانٹا "رہائش گاہ میں تو ہم موجود ہیں۔ یہ جہاں ہم چل رہے ہیں، یہ اس گیٹ کے اندر کا حصہ ہے، باہر کا نہیں۔"

میں نے سر گھما کر دیکھا تو اقامتی عمارت نظر آئی۔ میری تو گھگی بندھ گئی "مروادیا آپ نے۔ گارڈ تو دیکھتے ہی گولی ماردیں گے ہمیں" میں نے بلبلا کر کہا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ہم آخری آدمی سے ملنے آئے ہیں" بابا عصر کا لہجہ پُرسکون تھا۔

مگر میں بری طرح دہل گیا تھا۔ اسی لمحے گیٹ کھلا اور ایک کار اندر آتی دکھائی دی۔ گیٹ پھر بند کردیا گیا۔

کار جس وقت جہاں رکی، اسی وقت ہم بھی وہاں پہنچے تھے۔ کار کا دروازہ کھول کر جو شخص باہر آیا، اسے دیکھ کر میں تو سناٹے میں آگیا لیکن بابا عصر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

کار سے اترنے والا شخص اسلامی جمہوریہ پاکستان کا وزیراعظم تھا!



وقت جیسے ٹھہر گیا تھا!

وزیراعظم کے لیے بھی وہ شاک تھا۔ دو مداخلت کار سخت سیکیورٹی کے باوجود ان کے گھر میں موجود تھے۔ وہ حیرت اور تشویش سے ہمیں دیکھ رہے تھے بلکہ ہمیں نہیں مجھے کہیے۔ سفید سن بابا عصر انہیں خطرناک نہیں لگ رہے تھے البتہ مجھے دیکھ کر وہ یہ سوچ رہے تھے کہ میرے عزائم خطرناک تو نہیں۔

لیکن مجھے ان پر فخر محسوس ہوا۔ اس صورتِ حال نے انہیں PANIC میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ وہ تشویش زدہ ضرور تھے لیکن پریشان نظر نہیں آرہے تھے۔ کار میں وہ اکیلے تھے۔ خود ہی ڈرائیو کرکے لائے تھے۔

پھر خاموشی ہماری طرف سے ہی ٹوٹی۔ میں نے اور بابا عصر نے انہیں بیک وقت سلام کیا۔ ان کے چہرے سے پریشانی کا سایہ ہٹ گیا۔ اب وہ شرمندہ نظر آرہے تھے۔ شاید اس بات پر کہ انہوں نے سلام کرنے میں پہل کیوں نہیں کی۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا پھر بولے "آپ لوگ کون ہیں؟ اور یہاں کیسے گھس آئے ہیں؟"

"اللہ کی مرضی پر چلنے والے تو کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں" بابا عصر نے کہا "کون روک سکتا ہے انہیں۔"

وزیراعظم نے گیٹ کی طرف سر گھمایا۔ شاید وہ سیکیورٹی والوں کو آواز دینا چاہتے تھے مگر بابا نے انہیں روک دیا "اس وقت وہ اندھے اور بہرے ہیں۔ نہ ہماری باتیں سن سکتے ہیں، نہ ہمیں دیکھ

سکتے ہیں۔ اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے سیکیورٹی زون میں ہو۔"

وزیراعظم حیران نظر آئے "لیکن کیوں؟"

"میں اللہ کی ایک امانت لایا ہوں تمہارے لیے لیکن مجھے کچھ ہدایات بھی دینی ہیں اور تم سے باز پرس کر کے تمہیں تنبیہ بھی کرنی ہے۔"

اب میں بھی حیران تھا کہ کہانی یہاں کہاں پہنچ گئی۔ ادھر وزیراعظم کے چہرے پر تردّد کا سایہ ابھرا۔

"باز پرس سے ڈرتے ہو..... یا ہتک کا احساس ہو رہا ہے" بابا عصر نے تیز لہجے میں پوچھا۔ وزیراعظم نے کوئی جواب نہیں دیا "کیا تم نہیں جانتے کہ اسلامی مملکت کے سربراہ سے تو ایک عام شہری بھی جواب طلب کر سکتا ہے..... اور وہ جواب دے کر اسے مطمئن بھی کرتا ہے۔ کیا تمہیں یہ احساس نہیں کہ یہ اقتدار تمہارے پاس اللہ کی امانت ہے اور اس کی جواب دہی اتنی سخت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ جیسی ہستی کو خوف کے مارے نیند نہیں آتی تھی۔"

وزیراعظم کے چہرے پر نرمی اور آنکھوں میں روشنی بکھر گئی۔ "جی.....میں جانتا ہوں۔ مجھے احساس ہے" انہوں نے آہستہ سے کہا "آپ باز پرس ضرور کریں مجھ سے۔"

"مطمئن تو تم ایسے ہو کہ کوئی متقی بھی نہیں ہوتا" بابا عصر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ وزیراعظم کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن وہ کچھ بولے نہیں۔ بابا عصر چند لمحے ان کی آنکھوں میں دیکھتے رہے، پھر بولے۔ "کشکول تم نے توڑ دیا، بہت اچھا کیا۔ مگر یہ کیا کہ اپنے دامن کو ہی بھکاری کی جھولی بنا کر بیٹھ گئے۔"

وزیراعظم کا چہرہ پھر تمتمایا "میرے محترم بزرگ، آپ کو اندر کا حال نہیں معلوم۔"

"بے شک، مجھے نہیں معلوم لیکن اللہ اقتدار کے ایوانوں کے اندر کا حال بھی جانتا ہے اور اسے تمہارے اور تمہارے رفقا کے اندر کا بھی سب معلوم ہے۔"

وزیراعظم کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ لرزش واضح طور پر نظر آئی تھی "جی بے شک۔ یہ تو ہمارا ایمان ہے۔"

"لیکن اسے بھول کر بے ایمان ہو جاتے ہو۔ ورنہ اس کی نافرمانی کرتے ہوئے خوف سے مر جاؤ۔ پتا ہے، جس اقتدار کی آرزو میں تم سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہو، تقویٰ کرنے والے اس کے ملنے کے امکان سے بھی تھر تھر کانپتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں میرے بزرگ۔ میں بہت گناہ گار آدمی ہوں۔"

"یہ کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا" بابا عصر نے سخت لہجے میں کہا "یہ کیا کہ گنہگاری کا اعلان کرتے رہو اور اسی دوران میں ڈھٹائی سے گناہ بھی کیے جاؤ" اچانک ان کا لہجہ نرم ہو گیا "اللہ کا شکر ادا کرو۔ یہ اس کی عنایت ہے کہ یہاں دنیا میں اس کے حکم سے میں کھڑا تم سے جواب طلب کر رہا ہوں۔ ذرا سوچو، سوا نیزے کی بلندی پر تپتے سورج کے نیچے حشر کی دھوپ میں اعمال نامہ ہاتھ میں لیے جواب دہی کے مرحلے سے گزرو گے تو کیا حال ہو گا تمہارا۔

وہاں نہ توبہ کا موقع ہو گا، نہ ہی مال و دولت دے کر جان چھڑا سکو گے۔"

وزیراعظم تھر تھر کانپنے لگے۔ ان کے کپکپاتے ہونٹوں پر شاید استغفار تھا "خزانہ خالی ہے۔ اور ایٹمی دھماکا ناگزیر تھا..." انہوں نے لرزتی آواز میں کہا۔

"عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ اللہ نیتوں کا حال جانتا ہے۔ اسی لیے جزا و سزا کا اختیار صرف اسی کے پاس ہے۔ دھماکا کیسے ہوا، کس نے کرایا، وہ سب جانتا ہے" بابا عصر نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "وہ جس نے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے ہاتھوں لاڈ پیار سے کرائی، وہ دھماکا دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں بھی کرا سکتا ہے۔ رہی تمہاری خزانے والی بات تو خزانہ تو برسوں سے خالی چل رہا ہے لیکن مقتدرین کے صرفِ تعیشات میں تو کمی نہیں ہوئی بلکہ زیادتی ہی ہوئی۔ بڑی بڑی کاریں، ذاتی استعمال کے لیے ہوائی جہاز، محلوں کی آرائش، پُرتکلف ضیافتیں۔ یہ سب دیکھ کر کوئی مان سکتا ہے کہ خزانہ خالی ہے۔ اور اب ایٹمی دھماکے کی بات کرو۔ وہ ملک و قوم کی ضرورت تھا یا حکومت کی؟"

"سب جانتے ہیں کہ وہ ملک و قوم کی ضرورت تھا۔" وزیراعظم نے دبے لفظوں میں کہا۔

"لیکن تمہارے نزدیک وہ حکومت کی ضرورت تھا، یہ تو کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ تباہ معیشت، خالی خزانے اور اپنی اور اپنے پچھلوں کی بداعمالیوں اور بے ایمانیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے بھی تو تمہیں اس دھماکے کی ضرورت تھی۔ ملک اور قوم کو تو بونس میں فائدہ ہوا اس لیے ہوا کہ یہ اللہ کی مرضی تھی۔ حکومت کو یہ فائدہ ہوا کہ پہلے وہ اقتصادی دیوالیے پن کا اعلان نہیں کر سکتی تھی، اب کر رہی ہے۔ اب تم تمام بدعنوانیاں اور بے ایمانیاں..... اپنی بھی اور اپنے سے پہلوں کی بھی..... بین الاقوامی اقتصادی پابندیوں کے کھاتے میں ڈال کر بری الذمہ ہو جاؤ گے۔"

وزیراعظم کی پیشانی پر شکنیں ابھریں لیکن ان کا تحمل قابلِ رشک تھا۔

"یہ بتاؤ کہ دھماکے کے اعلان کے وقت تو تم بہت پُرامید تھے۔ تمہیں اقتصادی پابندیوں کی بھی پروا نہیں تھی۔ تم کہہ رہے تھے کہ ہنگامی منصوبہ تیار ہے۔ انقلابی تبدیلیاں آئیں گی اور ہم انشاء اللہ پہلے سے زیادہ خوش حال اور طاقت ور بن کر ابھریں گے۔ تو اتنے سے دنوں میں اب کیا ہو گیا؟"

"دیکھیں، ہم نے خود انحصاری کی اسکیم شروع کی..."

"اور وہ بہت کامیاب ہوئی" بابا عصر نے ان کی بات کاٹ دی۔ "ملک و قوم سے محبت کرنے والوں نے فاقہ کر کے بھی اس میں کم از کم سو روپے دیے۔ صاحبِ حیثیت لوگوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا" بابا کہتے کہتے رکے۔ ان کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری "تم نے اس اسکیم میں خود کیا دیا؟"

وزیراعظم کا چہرہ پھر تمتما اٹھا "اس کی تشہیر کرنے کی کم ظرفی میں نہیں کر سکتا" انہوں نے قدرے بدمزگی سے کہا۔

”حالانکہ اس کی تشہیر ضروری ہے۔ تمہاری قربانی‘ تمہاری شمولیت لوگوں کے جذبوں کو مہمیز کرے گی اور تمہاری کابینہ میں بھی تو بڑے صاحبِ ثروت لوگ موجود ہیں۔ کچھ پچھلے چند برسوں میں صاحبِ ثروت بن گئے ہیں‘ انہوں نے اس اسکیم میں کچھ دیا؟“

”دیا ہوگا لیکن میں ان کا ذمے دار نہیں۔“

”کیا بکتے ہو؟“ بابا عصر کو جلال آگیا ”میں اللہ کے آئین کو درمیان میں نہیں لاتا۔ لیکن جس آئین کے تحت تم وزیراعظم بنے ہو‘ اسی کے تحت وزیراعظم اپنی کابینہ کے ہر فعل کے لیے جواب دہ ہوتا ہے۔ ان کے تو کرپشن کے جواب دہ بھی تم ہو‘ یہاں بھی اور حشر کے روز بھی۔“

وزیراعظم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”اب میں تمہیں اسکیم میں صاحبِ اقتدار لوگوں کے عطیات کی تشہیر کی افادیت بتاؤں“ بابا عصر کا لہجہ نرم ہوگیا ”اللہ نے فرمایا کہ عمل کے اجر کا انحصار نیت پر ہے۔ اب سوچو کہ ایک طالب علم ہے‘ جس نے اپنا دل مار کر‘ اپنی خواہشوں سے محرومی کے بدلے کچھ رقم جمع کی۔ فرض کرلو.. ڈیڑھ سو روپے اور اس میں سے سو روپے اس نے تمہارے خود انحصاری فنڈ میں دے دیے۔ یہ ہوا کل رقم کا تقریباً ۶۷ فیصد۔ اور کسی کے پاس دس کروڑ روپے ہیں اور اس نے فنڈ میں دس لاکھ روپے دیے۔ یہ کل رقم کا صرف ایک فیصد ہے۔ یعنی دنیاوی اعتبار سے وہ طالب علم اس کروڑپتی کے مقابلے میں ۶۷ گنا عظیم ہے۔ اب اللہ کے حساب سے سوچو‘ جو سب کچھ جانتا ہے۔ نیت بھی اور اندر کی بات بھی۔ آخرت میں اس طالب علم کی ان ضرورتوں کا حساب ہوگا‘ جو سو روپے کے اس عطیے کی وجہ سے پوری نہ ہوسکیں۔ محرومی دے گئیں اسے۔ اور وہاں اس کروڑپتی کا بھی حساب ہوگا جس کی کوئی خواہش تشنۂ تکمیل نہیں۔ کوئی ضرورت پوری ہونے سے نہیں رہتی۔ اور اس کے پاس دس کروڑ روپے بے مصرف پڑے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ ماہانہ آمدنی کے وسائل بھی ہیں۔ ایسے میں اس کے دس لاکھ کی وقعت صفر سے نیچے تو ہوسکتی ہے‘ اوپر نہیں ہوسکتی۔ یعنی ہم حساب نہیں لگاسکتے کہ آخرت میں اس طالب علم اور اس کروڑپتی کے عطیوں کے درمیان کتنے ہزار یا کتنے لاکھ گنے کا فرق ہوگا۔“

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے کبھی اس زاویے سے سوچا ہی نہیں تھا۔

”میرے بزرگ‘ گستاخی معاف“ وزیراعظم چند لمحے سوچنے کے بعد بولے ”ہمیں تو پیسے کی ضرورت ہے.... زیادہ سے زیادہ۔ سیدھی سی بات ہے کہ ان سو روپوں کے مقابلے میں وہ دس لاکھ ہماری زیادہ مدد کریں گے۔“

”تم غلطی پر ہو۔“ بابا عصر مسکرائے ”شیطان کی دی ہوئی افراط اللہ کی عطاکردہ برکت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کبھی تعداد یعنی افراط پر زور نہیں دیا۔ نیکی ہمیشہ گنتی میں کم اور وزن اور تاثیر میں بیش ہوتی ہے۔ کافروں نے اپنی کثیر تعداد کے باوجود گنتی کے مومنوں سے ہمیشہ شکست کھائی۔ ہاں‘ افراط اللہ کی دی ہوئی ہو تو آزمائش ہوتی ہے۔ آدمی اللہ کی راہ میں خسّت اور تنگی کرے تو اس کے مال میں بے برکتی بھی آتی ہے اور وہ اس کے لیے وبال بھی بن جاتا ہے۔ حق حلال کے سو روپے کو حقیر سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔“

وزیراعظم کے چہرے پر شرمندگی تحریر تھی ”آپ درست فرماتے ہیں“ انہوں نے بے حد احترام سے کہا۔

”اب یہ بتاؤ کہ جب تم نے دھماکے سے پہلے تمام نتائج پر غور کرکے مکمل منصوبہ بندی کرلی تھی تو اب یہ بار بار کی تبدیلیاں کیسی‘ جو قوم کو بے یقینی کے عذاب میں مبتلا کررہی ہیں۔“

وزیراعظم چند لمحے سوچتے رہے‘ پھر بولے ”میرے مشیروں اور منصوبہ سازوں سے کہیں چوک ہوگئی۔ مگر انشاء اللہ ہم قابو پالیں گے۔“

”چوک ہوگئی“ بابا عصر نے حقارت سے کہا ”انہوں نے تو حکومت کا اعتبار ہی ختم کردیا۔ حکومت کو خیانت کار اور احسان فراموش بنادیا۔ پاکستانیوں میں کتنی ہی خرابیاں سہی‘ پاکستان کی ضرورت کا سن کر سب لبیک کہتے ہیں۔ وہ جو ملک سے باہر پردیس میں بیٹھے ہیں‘ انہیں پاکستان سے دوسروں سے زیادہ محبت ہے۔ تم نے جب انہیں مدد کے لیے پکارا‘ انہوں نے دل کھول کر مدد کی۔ تم نے دولت ملک میں واپس لانے کی اپیل کی‘ وہ لے آئے۔ اور اب حکومت ان کی تمام جمع پونجی کھاگئی۔ ان کے پاس ڈالر کے بجائے یہ نڈھال اور تھکا ماندہ روپیہ ہے‘ جس کا حکومت کے قول کی طرح اب کوئی اعتبار نہیں۔ یہ سب کچھ پہلے کبھی کسی حکومت نے نہیں کیا۔ اپنی ضامن کی حیثیت ہی کھودی۔“

”پہلے کسی حکومت پر یہ وقت بھی نہیں آیا میرے محترم بزرگ!“ وزیراعظم نے آہستہ سے کہا ”اور لوگوں کی امانت والا زرِمبادلہ ہم سے پہلے والے استعمال کرتے رہے ہیں۔“

”یہ کوئی جواز نہیں برائی کا۔ اور تم کو تو یہ جواب دہی بھی کرنی ہے کہ جنہوں نے ایسا کیا‘ وہ قومی مجرم ہیں۔ انہیں کیا سزا دی تم نے۔ جو قومی دولت لوٹ کر باہر لے جاتے اور معیشت کو کھوکھلا کرتے رہے‘ ان کے خلاف کیا کارروائی ہورہی ہے؟“

”ان کے خلاف شواہد اکٹھے کیے جارہے ہیں‘ مقدمے قائم ہورہے ہیں۔“

”اور جنہیں باہر کی عدالتیں مجرم قرار دے رہی ہیں؟“

”وہ عدالتی عمل سے گزر رہے ہیں۔“

”اس سے ملک و قوم کو کیا فائدہ ہوگا؟“ بابا عصر نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وزیراعظم نے انہیں غور سے دیکھا ”آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟“

”انصاف ہونا چاہیے اور انصاف صرف سزا دینا نہیں۔ جو لوٹا گیا ہو‘ اسے اس کا مال بھی واپس ملنا چاہیے“ بابا عصر نے سخت لہجے میں کہا ”اور یہاں ملک و قوم کی دولت لوٹی گئی ہے۔ اسے بدنامی دی گئی ہے۔ اسے تنگ دستی اور محرومیاں دی گئی ہیں۔ لہٰذا

جو دولت لوٹ کر باہر لے جائی گئی ہے' وہ واپس لاؤ۔ مجرموں کی سزا قید یا موت نہیں' زندگی ہے۔ ان کے پاس یہاں بھی بہت دولت ہے۔ اسے ضبط کر کے قومی خزانے میں لے جاؤ۔ ان سے ان کی زمینیں' جاگیریں اور محل چھین لو۔ انہیں سخت نگرانی میں رکھو اور ملک سے باہر نہ جانے دو۔ ان سے کہو کہ یہاں عام لوگوں کی طرح نوکری کریں' کہیں چار ہزار روپے ماہانہ پر کلرکی کریں۔ کرائے کے مکان میں رہیں اور ذرا عام آدمی کی طرح زندگی گزاریں۔ ایک دو دن نہیں' مہینے نہیں' پوری زندگی۔ پھر انہیں معلوم ہو کہ پانی بھی کتنی بڑی نعمت ہے اور بھوک غریبوں کے معدے میں کس طرح ڈنک مارتی ہے اور دس روپے کی کسی چیز کی فرمائش رد ہونے پر بچوں کی آنکھوں میں آنے والے آنسو ماں باپ کی آنکھوں کی بینائی کیسے چاٹتے ہیں۔ تمہاری سزائے قید تو غریبوں کی زندگی کے مقابلے میں اتنی پُرتعیش ہے کہ اگر تم عوام سے اس کا وعدہ کرو تو وہ سب کے سب مجرم بن کر تمہاری جیلوں میں پہنچ جائیں۔ آرام دہ بستر' ٹی وی' مفت کا بہترین کھانا' اخبار اور مانگنے پر ائرکنڈیشنر..... ہونہہ اسے تم سزا کہتے ہو۔ انہیں سزا نہیں' غریبوں کی زندگی دو۔ یہی انصاف ہے۔ اور سنو' یہ سزا بلا تفریق ہر لٹیرے کو دو..... اس کو بھی جو سب کچھ ہوتے ہوئے واپس نہ کرنے کے ارادے سے بینکوں سے قرضے لے کر ملک کو لوٹتا رہا ہے۔ خواہ وہ تمہاری طرف کا ہو' خواہ ان کی طرف کا۔ ان سب کو یکساں طور پر مثالِ عبرت بنا دو۔"

بابا عصر کے لہجے کا جوش ہر لفظ کے ساتھ بڑھتا گیا تھا اور وزیراعظم کے چہرے کا رنگ اڑتا جا رہا تھا "یہ میں کیسے کر سکتا ہوں؟" انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتے۔ اقتدارِ اعلیٰ اللہ کا ہے۔ اقتدار کی امانت تمہارے پاس ہے۔ طاقت اور اختیار ہے تمہارے پاس۔ بس ایک کمی ہے' وہ پوری کر دو۔ اپنا سب کچھ قوم کو دے دو۔ کسی چھوٹے سے عام مکان میں رہو۔ جس رقم میں ایک عام آدمی زندگی گزارتا ہے' اسی میں تم بھی گزارہ کرو۔ یوں تمہیں زندگی سے اور اس سے متعلق ان بہت سی چیزوں سے آگہی ہو گی جنہیں تم صرف لفظوں کی شکل میں سمجھتے ہو' عملاً جانتے نہیں۔ پھر تم لوگوں سے پاکستان کے لیے ایثار اور قربانی کا مطالبہ کرو گے تو اس قربانی اور ایثار کی قیمت بھی سمجھو گے۔ اسلام میں حکمرانی کا اصول ہے کہ لوگوں سے جو کچھ کرواتا ہے' خود کر کے دکھاؤ۔ پھر دیکھو' کیا ہوتا ہے۔ سالوں میں نہیں' مہینوں میں ملک و قوم کی قسمت بدل جائے گی۔ اسلام کے ظہور کے موقع پر اصول کے تحت کام کیا گیا تھا۔ تو انسانی تاریخ کا بدترین معاشرہ صرف چند برسوں میں مہذب ترین ہو گیا تھا۔ یہی نہیں' اس کی روشنی مزید چند برسوں میں آدھی دنیا تک پہنچ گئی تھی۔ مثالیں تو تمہارے سامنے ہر طرح کی موجود ہیں۔ چاہو تو اچھی مثالیں منتخب کر لو اور چاہو تو بری' پہلے قربانی تو دو۔"

"میں اس کے لیے تیار ہوں" وزیراعظم نے بڑے اعتماد سے کہا "میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا..."

"وہ کسی کی لکھی ہوئی تقریر تھی جو کوئی بھی کر سکتا ہے" بابا عصر نے ان کی بات کاٹ دی۔ "جب تم عام بستیوں میں عام لوگوں کے درمیان انہی کی طرح زندگی گزارو گے تو کسی تقریر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سب کو خود بخود صرف معلوم نہیں ہو گا' یقین بھی ہو جائے گا۔"

"آپ نے میری بات نہیں سنی" وزیراعظم نے شکایتی لہجے میں کہا "میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے' وہ بہت سے لوگوں کا ملا جلا ہے۔ اس پر مکمل اختیار ایک سربراہ کا ہے۔"

"آدمی کے پاس ارادہ اور عزم ہو' نیت درست ہو تو کوئی مسئلہ ایسا نہیں' جس کا حل نہ ہو" بابا عصر نے بے حد اطمینان سے کہا "پہلے مرحلے میں تم اپنے حصے سے دستبرداری کا اعلان کر دو۔ پھر وزیراعظم کی حیثیت سے ہدایت کر دو کہ قرضوں کی وصولی کے سلسلے میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے' پھر تم عام لوگوں کے درمیان پہنچ جاؤ۔ وہ تنخواہ لو' جو اس ملک میں عام ہے۔"

"لیکن میرے بیوی بچے جس طرزِ زندگی کے عادی..."

بابا عصر نے پھر ان کی بات کاٹ دی "اگر کوئی اور آ کر تم سے یہ سب چھین لے تو تم اور تمہارے بیوی بچے کیا کریں گے۔ مریں گے تو نہیں نا۔ ویسے ہی جئیں گے جیسے میں تمہیں رضاکارانہ طور پر جینے کو کہہ رہا ہوں اور تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ یہ اللہ کی راہ ہے۔ بڑی سعادت ہے۔ اس راہ میں بیوی بچے رکاوٹ بنیں تو انہیں چھوڑ دو۔ تم اکیلے محلوں سے اتر کر جھونپڑی میں آ جاؤ۔ مثالوں سے آنکھیں چرانے کے بجائے مثالیں قائم کرنا سیکھو۔ تمہارے لوگ تم سے عشق کرنے لگیں گے۔ تمہیں وہ طاقت حاصل ہو گی' جو آئینی ترمیمات اور من پسند آرڈی نینس بھی تمہیں نہیں دے سکتے۔"

"جی.... یہ میں کر سکتا ہوں" وزیراعظم نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"پھر تم قومی مجرموں کو میری مجوزہ سزا دو....."

"یہ تو نہیں ہو سکتا محترم بزرگ۔ ملکی قانون اس کی اجازت نہیں دیتے۔"

"اپنی مثال قائم کرنے کے بعد تم یہ سب کچھ کر سکتے ہو۔ عوامی طاقت تمہارے ساتھ ہو گی اور قانون کیا ہے.... وہ بھی آدمی کا بنایا ہوا ہے۔ اپنی غرض کے لیے تم آرڈی نینس جاری کر دیتے ہو۔ آئین میں ترمیم کرا کے قانون منسوخ کر دیتے ہو۔ نئے قانون بھی بنا لیتے ہو' ایک اچھے کام کے لیے ایسا نہیں کر سکتے؟"

مگر اب وزیراعظم بے حد پُراعتماد نظر آ رہے تھے "آپ سمجھ نہیں رہے ہیں میرے محترم بزرگ۔ اس کے لیے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہے..."

"تو کیا ہوا' وہ تمہارے پاس موجود ہے۔"

"لیکن اس طرح کے کسی قانون کے لیے وہ میرا ساتھ نہیں دیں گے' وہ مجھے ہی فارغ کر دیں گے۔"

"اسی لیے نا کہ وہ سب بھی ایسے ہی ہیں اور وہ سب تمہارے منتخب کردہ ہیں اور تمہاری کابینہ اس کریم کی بھی کریم ہے۔ ہے نا۔

تو تم نے انہیں ٹکٹ کیوں دیے۔ وزارتیں کیوں دیں؟ کیا تمہارے خیال میں خدانخواستہ اس ملک میں اہلِ ایمان کا کال پڑ گیا ہے؟"

"یہ سیاسی مجبوریاں ہیں میرے بزرگ!"

"مغربی سیاست کی ہوں گی۔ اسلامی سیاست کچھ اور چیز ہے۔ خیر تم یہ رکاوٹ بھی دور کرسکتے ہو۔ ان سب سے پیچھا چھڑالو"

"یہ ممکن نہیں ہے جناب۔ البتہ وہ مجھ سے پیچھا چھڑالیں گے۔"

"مشورہ میں دیتا ہوں' عمل کرنا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ تم اپنا محل چھوڑ کر غریبوں کے درمیان پہنچ جاؤ..."

"میرا ارادہ یہی تھا محترم۔ لیکن سیکیورٹی کے ایسے مسائل سامنے آئے..."

"کیا کفر بکتے ہو" بابا عصر نے دہاڑ کر کہا۔ ان کا چہرہ تمتما اٹھا تھا "تمہیں یاد نہیں کہ اسلامی تاریخ کے چار بہترین اور مثالی خلفا میں سے تین نے شہادت پائی۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ مسجد میں شہید کیے گئے۔ ان سے زیادہ اہم کون ہوسکتا ہے اور موت تو وہ حقیقت ہے کہ صرف اللہ کے حکم سے آتی ہے اور جب وقت ہو تو سات آہنی پردوں میں چھپا ہوا آدمی بھی اس سے نہیں بچ سکتا۔ اب یہاں کتنی سیکیورٹی ہے تمہاری۔ لیکن ہم یہاں تمہارے روبرو کھڑے ہیں اور تمہاری حفاظت کرنے والوں کو پتا بھی نہیں۔ ہم تو ہدایت لے کر آئے ہیں' موت لے کر آئے ہوتے تو تم اس وقت کہاں ہوتے۔ بتاؤ' اور بات آگے بڑھنے سے پہلے سن لو کہ روشن مثالیں یاد رکھو۔ تم مجرموں کو سزا دینے سے گھبراتے ہو کہ اس پر سیاسی انتقام کا الزام لگے گا۔ تمہیں نہیں ڈرنا چاہیے اس سیاسی بلیک میلنگ سے۔ کیونکہ مجرم قومی مجرم بھی ہیں اور اللہ کے مجرم بھی۔ یاد رکھو' ایک خلیفہ' وقت نے اپنے بیٹے کو کس شان سے سزائے موت دی تھی۔ ڈر تھا کہ جلاد کوڑے مارنے میں رعایت سے کام لے گا تو آپ نے خود کوڑے مارے۔ انصاف کے ایک سے زیادہ معیار کبھی نہیں ہوتے۔ یاد رکھو کہ ایک بے حد وسیع و عریض سلطنت کا خلیفہ اپنے گھر میں روشنی کے لیے خزانے سے تیل بھی نہیں لیتا تھا۔ دو بادشاہ تو اس ہندوستان میں بھی ایسے گزرے ہیں جو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے اپنے ہاتھ سے قرآن پاک لکھنے کی مزدوری کرتے تھے۔ اور تم لوگ ہو کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خزانے پر بوجھ بنتے ہو۔ کہتے ہو' پاکستان مقروض ہے۔ یہ تو بتاؤ' جو قرضہ آتا رہا' وہ گیا کہاں؟ عوام کو کچھ ملا؟ کوئی فائدہ پہنچا؟ سب اقتدار و اختیار والوں نے مل بانٹ کر کھالیا۔ عوام کو دیا کچھ نہیں۔ ہمیشہ ان سے مانگتے رہو۔ ڈرو اس وقت سے' جب اللہ تم لوگوں سے حساب لے گا اور تمہارے پاس ادائیگی کے لیے اعمال کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ بہتر ہے' یہیں اپنا اپنا حساب کرو۔ پھر تلافی کرو اور توبہ کرو۔ اقتدار کا شوق بہت آسان ہے۔ اقتدار کے بوجھ کا تمہیں اندازہ نہیں۔ انصاف کو کھیل نہ بناؤ۔ چور تمہاری پارٹی کا ہو یا مخالف پارٹی کا' وہ اوّل و آخر چور ہے۔ اسے سزا دو' انصاف کرو۔ ورنہ اللہ کے انصاف کے منتظر رہو۔ مگر تم نہیں جانتے کہ...

یہ صاف ہو گا۔ جانتے ہوتے تو تم اس سے ڈرتے۔ دیانت دار لوگوں کو پچھلے دس سال کے حسابات کی جانچ پڑتال پر پورے اختیار کے ساتھ مامور کرو اور صاف شفاف گوشوارے قوم کے سامنے رکھ دو۔ اپنا بھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردو۔ تم کہتے ہو، تم اپنی کابینہ کے اراکین کے ذمے دار نہیں اور حضرت عمرؓ کو نیند نہیں آتی تھی..... اس خوف سے کہ اس وسیع و عریض سلطنت میں کوئی کتا بھی بھوکا سوگیا تو اللہ آپ سے جواب طلبی کرے گا۔ یاد رکھو، تم سربراہ ہو۔ کسی کے جرم سے چشم پوشی کروگے تو وہ جرم تمہارا بھی ہو جائے گا۔" بابا عصر کہتے کہتے رکے اور ایک گہری سانس لے کر پھر گویا ہوئے "ہاں، میں کہہ رہا تھا کہ اپنا سب کچھ قوم کے لیے ترک کردو۔ یہ پوری قوم تمہاری جان نثار بن جائے گی۔ پھر تم یہ کرسی اسمبلی توڑدو۔ دوبارہ عوام کے پاس جاؤ۔ اہل، امین، دیانت دار اور سچے افراد کو ٹکٹ دو۔ پاکستان سے محبت کرنے والے عام لوگوں کو آگے لاؤ اور ذمے داریاں سونپو۔ اعتبار کماؤ گے تو لوگ نام نہیں دیکھیں گے۔ تمہارے نشان کو ووٹ دیں گے۔ پھر تم نیک نیتی سے اقدامات کرو۔ انصاف کرو۔ پرانی غلطیاں مت دہراؤ۔ اب تاریخ کے صفحات میں تمہارا نام رقم ہو کر رہے گا۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اسے کون سا رنگ دیتے ہو۔"

وزیر اعظم کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھایا "میں اقتدار ہی نہ چھوڑ دوں؟" انہوں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"اب یہ تمہارے اختیار میں نہیں۔ یاد نہیں، ابھی کچھ ہی عرصے پہلے تم بزرگوں کے، اللہ کے محبوب بندوں کے پاؤں پکڑ کر چوکھٹ میں گر گر کر یہ وزارتی کررہے تھے..... گڑگڑا رہے تھے کہ تمہیں ایک موقع اور چاہیے۔ تم نے کیا، کیا کہا تھا، بھول گئے؟ کیا وعدے کیے تھے اللہ سے.... اللہ کو گواہ بنا کر، یاد نہیں۔ اور تمہیں واضح طور پر بتادیا گیا تھا کہ موقع ملے گا اور وہ آخری ہوگا۔ اگر تم سچے ہوئے تو اس عہد کے رہنماؤں میں تمہیں وہ مقام ملے گا جو شاید ہی کسی کو ملا ہو۔ اور اگر تم جھوٹے ہوئے تو بڑی ذلت اور رسوائی سے جاؤ گے۔ اب تم خود سے نہیں جاسکتے۔"

"جی ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔"

"تمہاری خوبیاں اور خامیاں اللہ جانتا ہے مگر تمہاری ایک بہت بڑی خوبی مجھے بھی نظر آتی ہے" بابا عصر کے لہجے میں اس بار شفقت تھی "اور وہ یہ ہے کہ تم پاکستان سے بے حد محبت کرتے ہو۔ اب معلوم نہیں کہ مجھے محبت کرتے ہو کہنا چاہیے یا محبت کرتے تھے کہنا چاہیے۔"

وزیر اعظم کی آنکھوں میں آنسو آگئے "میرے محترم بزرگ، میری لغزشیں، میرے گناہ اپنی جگہ۔ اللہ گواہ ہے کہ پاکستان سے مجھے عشق ہے۔"

"عمل سے ثابت کرو نا۔"

"ہمہ وقت یہی کوشش کرتا ہوں مگر رفقا کے غلط مشوروں سے مار کھا جاتا ہوں۔"

"اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ اچھی صحبت میں اٹھو بیٹھو" بابا عصر نے محبت بھرے لہجے میں کہا "بہرحال تم نہیں جانتے کہ تمہیں کتنی بڑی سعادت مل رہی ہے۔ اسے نہ گنواؤ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ یہ بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور متقی ہیں.... یعنی اس سے ڈرتے ہیں۔ اور تنبیہہ ہے ان لوگوں کے لیے جو غلط راستے پر ہیں اور دل سے ایمان نہیں لائے۔ تمہارے پاس جو ہدایت آئی ہے اگر تم اچھے ہو تو وہ تمہارے لیے بشارت ہے اور تم برے ہو تو تمہارے لیے تنبیہہ ہے۔ دونوں مبارک ہیں۔ تنبیہہ بھی مبارک ہے کہ تمہیں ایک اور موقع مل رہا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ اور بشارت پانے والے خوش نصیبوں میں شامل ہوجاؤ۔"

وزیر اعظم نے آسمان کی طرف سر اٹھایا، جیسے اللہ سے دعا کررہے ہوں یا رہنمائی اور استقامت طلب کررہے ہوں۔ پھر انہوں نے نظریں جھکائیں اور دھیرے سے بولے "اللہ کا شکر ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھ پر عنایت فرمائی۔ انشاء اللہ اس بار میں سعادت سے محروم نہیں ہوں گا۔ بے شک عزت اور ذلت اسی کے اختیار میں ہے" پھر انہوں نے نظریں اٹھائیں "آپ نے ابتدا میں فرمایا تھا کہ آپ اللہ کی ایک امانت لائے ہیں میرے لیے۔"

بابا عصر نے رومال کی پوٹلی ان کے سامنے کھول دی "یہ تمہیں قومی خزانے میں پہنچانی ہیں۔"

"اتنا سا کام؟"

"یہ بہت بڑا کام ہے۔ اگر تم متقی، امین، سچے اور دیانت دار ہوئے تو یہ کام کرسکوگے ورنہ نہیں" بابا عصر نے کہا۔ پھر انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ وہ اشرفیاں کتنے مرحلوں سے گزر کر آئی ہیں۔ "اس سے اندازہ کرو کہ یہاں کیسے ایمان دار، متقی اور اسلام اور پاکستان سے محبت کرنے والے موجود ہیں" بابا نے کہا "یہ حقیقت تمہیں خود اعتمادی دے گی، قوم پر اعتماد بھی دے گی اور تم آئندہ صالح رفقا کا انتخاب بھی کرسکوگے۔"

وزیر اعظم یہ سب کچھ حیرت سے سن رہے تھے، ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

"یاد رکھنا، یہ اشرفیاں لاکھوں ہاتھوں سے گزریں لیکن کسی ایک امین نے بھی اپنے حصے کی اشرفی خود نہیں رکھی۔ وہ بھی آگے بڑھادی۔"

"مجھے فخر ہے اپنی قوم پر۔"

"کوشش کرو کہ تمہاری قوم بھی تم پر فخر کرے۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا" وزیر اعظم نے کہا پھر بولے "میں انہیں ہاتھوں میں لے کر دیکھ سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں، تم ان کے امین ہو۔ تمہیں ان کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔"

وزیر اعظم نے ایک اشرفی اٹھائی۔ انہوں نے حروف پر انگلی پھیری پھر اشرفی کو پلٹ کر دیکھا۔ کلمہ طیبہ کے حروف کو بھی عقیدت سے چھوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے

لگے۔ وہ اتنا روئے کہ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر انہوں نے اس اشرفی کو چوما اور آنکھوں سے لگالیا۔

"یہ اشرفیاں قومی خزانے میں پہنچادو۔ لوٹی ہوئی دولت واپس لو۔ لوگوں کا اعتماد اور اعتبار اپنے اوپر بحال کرو۔ خود کو امین، سچا اور دیانت دار ثابت کرو۔ پھر خیروبرکت دیکھو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ انشاء اللہ کیسے اچھے دور کا آغاز ہوگا۔ تم کفر کے خلاف جہاد کروگے۔ غازی یا شہید ہوگے۔ فتح یاب ہوگے اور ہر طرف اسلام کا بول بالا ہوگا۔ آخرت میں سرخروئی ملے گی۔"

"انشاء اللہ" وزیراعظم نے بے حد خلوص سے کہا۔ لیکن اگلے ہی لمحے ان کے چہرے پر مایوسی کا سایہ لہرایا "لیکن حضرت، یہاں بہت برا حال ہے۔ خزانہ خالی ہے، امداد بند ہوچکی ہے...."

"اسے امداد نہ سمجھو۔ دشمنوں کی امداد بھی ضرر رساں ہوتی ہے۔"

"اور حضرت، قومی معیشت قرض کے بوجھ تلے دبی سسک رہی ہے.... دم توڑ رہی ہے۔"

"غم نہ کرو۔ تم نے افراط دیکھی ہے، خیروبرکت نہیں۔ اللہ کی تائید سے واقف نہیں ہو۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ جو کچھ زمینوں میں ہے اور آسمانوں میں ہے، صرف وہی جانتا ہے۔ اس کی عنایت ہوگی تو انشاء اللہ جو زمینیں فصلیں نہیں اگلتیں، وہ سونا اور قیمتی دھاتیں، ہیرے اور جواہرات، تیل اور گیس اگلنے لگیں گی۔ تم اللہ پر ایمان رکھ کر جستجو تو کرو۔ لو اب اپنی امانت سنبھالو۔"

مجھے اپنا تجربہ یاد آیا۔ میں نے کہنا چاہا کہ وزیراعظم یہ بھاری بوجھ نہیں اٹھا سکیں گے لیکن جیسے کسی نے میرے ہونٹ سی دیے۔ اور اگلے ہی لمحے یہ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ وزیراعظم نے اس پوٹلی کو بہت آسانی سے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا" بابا عصر نے وزیراعظم سے کہا "اگر خدانخواستہ تم اہل ثابت نہیں ہوئے تو اس قوم کا عرصہ ابتلا اور طویل ہوجائے گا۔ پھر یہ کام تمہارے پیش رو کو کرنا ہوگا۔ لیکن تم ذاتی طور پر زیادہ بڑے نقصان میں رہوگے۔ تم دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی محروم رہ جاؤگے اللہ کے انعام سے۔ جو ہونا ہے، وہ تو ہوکر رہے گا اور اللہ کی مرضی نہیں ٹلتی۔ وہ جس سے جو کام چاہے، لے سکتا ہے۔ یہ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تمہیں یہ سعادت مل رہی ہے۔"

"میں یاد رکھوں گا میرے محترم بزرگ!" وزیراعظم نے بے حد احترام سے کہا۔

"اب ہم چلتے ہیں۔ اللہ تمہیں ہمت، استقامت اور سرخروئی عطا فرمائے۔ فی امان اللہ۔"

"فی امان اللہ۔"

میں بابا عصر کے ساتھ گیٹ کی مخالف سمت چلنے لگا۔ اچانک عقب سے ہمیں وزیراعظم نے پکارا۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا "آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا محترم بزرگ!" وزیراعظم نے ہماری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ آفاق ہے.... کہانیاں لکھتا ہے" بابا عصر نے کہا "اور میں وہ ہوں، جس کی قسم کھا کر اللہ رب العزت نے فرمایا کہ بے شک انسان خسارے میں ہے۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے.... اور جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

میں حیران رہ گیا مگر مجھ سے زیادہ حیران وزیراعظم تھے۔ بلکہ وہ تو ہل کر رہ گئے تھے۔ ہم پلٹے اور چل دیے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وزیراعظم اسی جگہ کھڑے تھے۔ وہ کبھی اپنے ہاتھ میں موجود رومال کو دیکھتے تھے اور کبھی بابا عصر کو۔ اس دوران میں کئی بار انہوں نے سر جھٹکا۔

میں نے بابا عصر سے کہا "تو آپ...."

"ہاں۔ کم از کم تمہیں تو پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا" وہ بولے۔ "کتنے اشارے تھے تمہارے سامنے۔ میں کبھی رکتا نہیں، ہمیشہ چلتا رہتا ہوں۔ میری اپنی رفتار ہے۔ میرے ساتھ چلنے والے وہ لوگ فائدے میں رہتے ہیں، جنہیں ان کے اوصاف کی وجہ سے اللہ نے خسارے والوں سے مستثنیٰ کیا ہے۔"

"لیکن ابھی کچھ دیر پہلے آپ رکے ہوئے تھے؟" میں نے اعتراض کیا۔

"تو بھی کچھ رک گیا تھا نا۔ اس وقت کوئی ہمارے درمیان مداخلت نہیں کرسکتا تھا۔"

یہ بات درست تھی۔ مجھے اس کا احساس ہوا تھا۔

"میں اپنے بارے میں کہہ رہا تھا" بابا عصر پھر گویا ہوئے "جو مجھ سے نظریں چرائیں، میری شکایت کرتے رہیں، رونا روتے رہیں،

میں ان لوگوں کے لیے سخت ہوں اور میں نے پہلی ملاقات میں ہی تمہیں بتایا تھا کہ جو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں، میں ان کے لیے نرم ہو جاتا ہوں۔"

"جی ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ واقعی مجھے آپ کو اسی وقت پہچان لینا چاہیے تھا" میں نے شرمندگی سے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے کہا "مجھے ایک اور بات پر حیرت ہے۔ وہ پوٹلی تو بہت بھاری تھی۔ میں تو اسے ہلا بھی نہیں سکتا تھا، وزیراعظم نے وہ کیسے اٹھالی؟"

بابا عصر مسکرائے "اللہ جب کسی کو کوئی بوجھ دیتا ہے تو اس کے لیے طاقت اور ظرف بھی عطا فرماتا ہے۔ وہ بوجھ تمہارے وزیراعظم کا تھا سو انہوں نے اٹھالیا۔ تمہارا نہیں تھا، تم سے اٹھایا نہیں گیا۔"

چند لمحے بعد میں نے پوچھا "بابا.... ہم کراچی کب پہنچیں گے؟"

"کراچی؟ تو اس وقت ہم کہاں ہیں؟" بابا نے حیرت سے کہا۔

"جی....!" میں نے سر گھما کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ میں کراچی میں ہی نہیں، اپنے گھر کے بہت نزدیک تھا۔ سامنے وہ بلڈنگ نظر آ رہی تھی جس میں میرا فلیٹ تھا۔

"اب میں چلتا ہوں" بابا عصر نے کہا۔

"رات کو ملاقات ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"اب شاید ہم کبھی نہ ملیں" انہوں نے کہا۔ اتنی دیر میں وہ بہت دور جا چکے تھے۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں گھر جانے کے بجائے مسجد کی طرف چل دیا۔ فجر پڑھنے کے بعد میں گھر آیا۔ نیند اب بھی نہیں آ رہی تھی۔ میں لکھنے بیٹھ گیا۔ شاید نیند اس لیے رکی ہوئی تھی کہ میں وہ سب کچھ لکھ لوں، جو اب خود بھی، مجھے خواب سا لگتا ہے۔ وہ سب لکھنے کے بعد مجھے نیند آ گئی، میں سو گیا۔



ایک مہینہ گزر گیا۔ یہ اگست کا مہینہ ہے۔ میں متجسس بھی ہوں اور بے چین بھی۔ میں روز اسلام اور پاکستان کی عظمت اور سربلندی کے خواب دیکھتا ہوں لیکن جاگنے کے بعد مجھے زوال اور ابتری کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر طرف خوف، بے یقینی اور انتشار ہے۔ میں مایوس ہونے لگتا ہوں۔ ایسے میں میرے اندر ایک پُراعتماد آواز ابھرتی ہے۔ مایوسی کفر ہے۔ جو اللہ کو منظور ہے، ہو کر رہے گا۔ ٹل نہیں سکتا۔ کب ہوگا، یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بس تم دعا کرتے رہو۔ ہر گزرتے دن کی امید آنے والے دن کو سونپتے رہو۔ سو میں یہی کرتا ہوں۔

مجھے تجسس ہے۔ نہ جانے وہ اشرفیاں قومی خزانے میں پہنچیں یا نہیں۔ بابا عصر نے کہا تھا کہ اگر آخری آدمی نااہل ثابت ہوا تو اشرفیاں ان کے پاس واپس آ جائیں گی۔ پھر وہ انہیں اگلے آخری آدمی کے سپرد کر دیں گے، عرصۂ ابتلا ذرا طویل ہو جائے گا۔

میں عشا کے بعد ہر روز اس امید پر ٹہلتا ہوں کہ شاید بابا عصر سے ملاقات ہو جائے۔ ان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اشرفیاں ان کے پاس پہنچی ہیں یا نہیں۔ لیکن ان سے ملاقات نہیں ہوتی۔ کل میں حارث بن عثمان کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے بھی بابا عصر کو کہیں نہیں دیکھا "تم اتنے پریشان کیوں ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے اپنی پریشانی بتا دی۔

وہ مسکرائے "اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم نے اپنا کام کر دیا۔ اللہ مسبب الاسباب ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن کب؟"

"جب اس کی مرضی ہوگی" حارث نے دوٹوک جواب دیا۔ ان کی انگلی آسمان کی طرف اٹھ گئی۔

"میں کیا کروں؟ بے حد مضطرب ہوں۔"

"اپنا کام کرتے رہو۔" حارث بن عثمان نے کہا "ہر پاکستانی کو پیغام پہنچا دو کہ سب کچھ بھول کر اللہ کی رسی تھام لے۔ محنت اور دیانت کو اپنائے۔ اللہ کے خوف کو دل میں بسائے۔ اللہ پر توکل کرے۔ اس سے خیر و برکت مانگے.... اپنے لیے بھی اور اس محبوب وطن پاکستان کے لیے بھی۔ اپنے عمل اور کردار سے خود کو تیار کرتا رہے تاکہ وقت آئے تو وہ سعادت مندوں میں سے ہو نہ کہ سرکشوں اور نافرمانوں میں سے۔ کہہ دو کہ اللہ کے عطا کردہ اس پاک وطن کے مفاد کو جان سے عزیز جانو۔ پریشانیوں سے نہ گھبراؤ۔ تمہیں غلام بنانے کا خواب دیکھنے والے کامیاب نہیں ہوں گے۔ اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ یہ رات سدا رہنے والی نہیں۔ اس سے گھبرا کر ان تیرہ بختوں میں شامل نہ ہو جانا، جو اس رات کا حصہ بننے والے ہیں۔ جنہیں ظلمتوں میں کھو جانا ہے۔ اللہ کی عبودیت، رسول کریمؐ کی سیرت پاک کی پیروی، دین کی پاس داری، استغفار کی تسبیح اور قوم اور وطن کی سچی محبت کا زادِ راہ لے کر اس روشن صبح کا صبر کے ساتھ انتظار کرو، جو اللہ کے حکم سے بالآخر آنی ہے۔ تب تمہارے لیے اجر ہی اجر ہوگا۔ اللہ کا انعام ہوگا۔"

میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور اللہ سے تائید طلب کرتا ہوں۔ اللہ آپ سب پاکستانیوں کو.... اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو سلامتی اور خیر و برکت سے نوازے۔ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ اللہ ہم سب کو سیدھا راستہ دکھائے اور گمراہی سے نکالے۔ اللہ ہمیں جذبۂ جہاد سے نوازے۔ اللہ اسی لمحے سے ہماری زندگی میں وہ انقلاب لائے، جو ہدایت آفریں ہو۔ جو ہمیں صرف اس کا مطیع و فرماں بردار بنا دے، آمین۔

مگر میں اب بھی یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر خدانخواستہ وہ اشرفیاں ابھی تک قومی خزانے میں نہیں پہنچی ہیں تو کب پہنچیں گی.... اور یہ سعادت کسے ملے گی؟





ملک میں در آنے والے ایک موذی مرض ایڈز کا احوال جس کی تباہ کاریاں ایٹمی جنگ سے زیادہ ہیں

ایک گمبھیر مسئلہ جس سے صحیح طور پر نمٹنے میں ہی ہماری آیندہ نسلوں کی بقا مضمر ہے

اچھوت

علیم الحق حقی

فطرت کے وضع کردہ اصولوں کی خلاف ورزی تباہی کا سبب ہے۔ ان اصولوں کے تحت زندگی گزارنے میں ہی آدمی کی بھلائی ہے۔ فطرت سے اختلاف کرنے والے... اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے آخرکار قدرت کی سخت گرفت میں آجاتے ہیں۔ ایسے میں اپنے اعمال کی پاداش کو قدرت کی بے رحمی اور ظلم کا نام دینے والے یہ نظرانداز کردیتے ہیں کہ قدرت انسانیت کی فلاح چاہتی ہے نہ کہ تباہی!
اس داستان کا مرکزی کردار ان قوانین سے آگاہ بھی تھا اور ان پر عمل پیرا بھی لیکن ایک روز اسے ان گناہوں کا سزاوار ٹھہرادیا گیا جو اس کے خیال میں اس نے نہیں کیے تھے۔ اس موذی مرض کے شکنجے میں تھا جس کا دوسرا نام ایڈز یا موت ہے۔ ایک الزام، ایک گالی کی صورت یہ مرض اس کے احساسِ بے گناہی کو لاحق تھا... لیکن اسے بے عزتی کی موت قبول تھی نہ اچھوت بن کر زندہ رہنا۔ اس کے پاس مہلتِ حیات کم تھی اور فرصتِ غم بالکل نہیں۔ ناکردہ گناہوں کی سزا نے اسے دنیا سے انتقام لینے کی راہ پر ڈال دیا۔ مگر فطرت نے اپنے اسیروں کو کب گمراہ اور بے آسرا چھوڑا ہے۔ وہ اس وقت بھی ان کی رہنمائی کرتی ہے جب وہ مایوسی اور ناامیدی کے اندھیروں میں گھر کر اپنی راہ سے ہٹ رہے ہوتے ہیں اور اس میں بھلا کیا شک ہے کہ پارسائی کے صلے میں بدکاری کی سزا جھیلنے والے بھی اگر لغزشوں سے بچتے رہیں تو آزمائش سے سرخرو گزر سکتے ہیں۔



بشیر کو وہ گاہک اچھا نہیں لگا تھا!

وہ طارق روڈ کی ایک اعلیٰ درجے کی باربر شاپ تھی.... ائرکنڈیشنڈ۔ وہاں صرف متمول لوگ ہی آتے تھے۔ کیونکہ وہاں خدمات کی اجرت بہت زیادہ وصول کی جاتی تھی۔ اس کے باوجود گاہک کاریگر کو بھاری ٹپ بھی دیتے تھے۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ کوئی کنگلا وہاں گھس آئے اور بال بنوانے یا شیو کرانے کے بعد اُجرت پر ناک بھوں چڑھائے اور ٹپ دیئے بغیر چلتا بنے۔ زیادہ تر تو گلے بندھے گاہک ہی ہوتے تھے۔ مگر بشیر جانتا تھا کہ ہر آنے والے کو معزز سمجھنا اور اسے سر کہہ کر بات کرنا ضروری ہے۔ وہ بہت اچھا کاریگر تھا۔ اسی لیے وہاں کام کر رہا تھا۔ ٹپ بہت اچھی ملتی تھی۔ آمدنی کافی تھی لیکن کسی گاہک کی شکایت پر اچھے سے اچھے کاریگر کو نکالا جاسکتا تھا۔ اچھے کاریگروں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن اچھے گاہک بہت اہم تھے۔

یہ گاہک عام سی شلوار قمیص پہنے تھا۔ اُس کی گھنی داڑھی بہت بے ترتیب تھی، دکان میں داخل ہوتے وقت وہ نروس تھا۔ لگتا تھا خود اعتمادی اسے چھو کر نہیں گزری ہے۔ وہ آکر کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ بدقسمتی سے اِس وقت صرف بشیر ہی فارغ تھا۔ چنانچہ اسے مودبانہ انداز میں کہنا پڑا "اس کرسی پر تشریف لے آئیں سر۔"

گاہک اُس کی بتائی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا "مجھے بال چھوٹے کرانے ہیں۔ بہت چھوٹے۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"بہت بہتر سر۔"

بشیر نے صاف ستھری چادر لپیٹی اور اس کے بال تراشنے میں مصروف ہوگیا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ائرکنڈیشنڈ ماحول میں بھی اس شخص کو پسینہ کیوں آرہا ہے۔ یقینی طور پر وہ بہت نروس تھا۔ شاید اس لیے کہ پہلی بار ایسی کسی دکان میں بال ترشوا رہا تھا۔

بشیر اپنا کام کرتا رہا۔ وہ اتنا ماہر تھا کہ بے دھیانی میں بھی کبھی اُس کا ہاتھ نہیں بہکتا تھا۔ مگر جو کچھ ہوا، وہ جانتا تھا کہ اِس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ قینچی سے کانوں کے اوپر کے بال ٹھیک کر رہا تھا۔ اس کام میں قینچی کی نوکیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اچانک گاہک نے یوں سر جھٹکا، جیسے جسم کے کسی حساس حصے پر مکھی بیٹھ گئی ہو۔ حالانکہ دکان میں مکھی کا کوئی کام نہیں تھا۔ قینچی اس وقت گدی کی طرف نیچے کا سفر کر رہی تھی۔ اس کی نوکیں نرم گوشت میں دھنس گئیں۔ سرخ خون کی ایک چھوٹی سی بوند ابھر آئی اور بتدریج بڑی ہونے لگی۔ بشیر کا چہرہ فق ہوگیا۔ اسے ڈر تھا کہ گاہک اس پر برسے گا۔ پھر دکان کا مالک آئے گا اور.....

وہ سحر زدہ سا خون کی اس بڑی ہوتی بوند کو دیکھتا رہا۔ اس کے لیے یہ ناقابل یقین تھا کہ اُس کے ہاتھوں.....

"کوئی بات نہیں۔ غلطی میری ہی تھی۔"

بشیر نے چونک کر گاہک کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں کی کیفیت مختلف تھی۔ وہ بے حد سرد لگ رہی تھیں

"سوری سر" بشیر نے کہا۔

"میں نے کہا نا، غلطی میری تھی۔ کبھی کبھی میں اپنی جھرجھری پر قابو نہیں رکھ پاتا ہوں۔ تم ایسا کرو، یہاں آفٹر شیو لوشن لگا دو۔"

"ضرور سر" یہ کہہ کر بشیر نے آفٹر شیو لوشن کی شیشی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں ہاتھوں کے لمس سے حتی الامکان بچتا ہوں۔" گاہک نے اسے پھر چونکا دیا "لوشن ہاتھ سے نہیں لگانا۔ کوئی اسپرے لوشن نہیں ہے تمہارے پاس؟"

اُس لمحے بشیر اس گاہک کے بارے میں رائے بدلنے پر مجبور ہوگیا۔ اب گاہک کے لہجے میں خود اعتمادی بلکہ سختی تھی اور لگتا تھا کہ وہ ایسی ہی دکانوں میں بال ترشواتا رہا ہے۔

"کیوں نہیں سر ابھی لیجئے۔" بشیر نے کہا۔ اب اس کا لہجہ اعتماد سے محروم تھا اور وہ نروس ہوگیا تھا۔

اُس نے دوسری شیشی اٹھا کر اس کے زخم پر لوشن لگایا اور دوبارہ سوری کہا۔ گاہک اس بار خاموش رہا۔ بشیر اب جلد از جلد اسے نمٹا دینا چاہتا تھا۔ وہ انداز میں عجلت لائے بغیر ہاتھ چلاتا رہا۔ مگر آخری مرحلے میں پھر گڑبڑ ہوگئی۔ اس بار وہ گدی کے نیچے کے بال استرے سے صاف کر رہا تھا کہ گاہک کا جھرجھری کا مرض پھر عود کر آیا۔ اس بار بھی کٹ خاصا گہرا تھا۔ لیکن گاہک کے انداز سے لگتا تھا کہ اسے پتا بھی نہیں چلا ہے۔ بشیر نے پف کی مدد سے پاؤڈر لگایا اور برش سے پاؤڈر اور بال جھاڑ دیئے۔ پف پر خون کا داغ لگ گیا تھا۔

"خط بنوائیں گے سر؟" بشیر نے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن داڑھی چھوٹی نہ کرنا۔"

"بہت بہتر جناب۔"

"اور ہاں، یہ نصف بلیڈ والا استرا استعمال نہ کرنا۔" گاہک نے کہا "مجھے وہی پرانا پھل والا استرا پسند ہے۔"

بشیر کو حیرت نہیں ہوئی۔ اکثر ایسے گاہک آتے تھے، جو پھل والے استرے سے شیو کراتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ نیا استرا جس میں ہر بار نیا نصف بلیڈ لگا دیا جاتا تھا، اسے بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اسے بہت ہلکا لگتا تھا۔

"جی بہتر سر۔"

"اور اس بار میرے گلے پر مشقِ ستم نہ کر بیٹھنا۔" گاہک نے شگفتگی سے کہا لیکن اس کے لہجے میں سنگینی تھی۔

اس بار بشیر سچ مچ نروس ہوگیا۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ کام کے دوران کبھی اُس کے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہوئی ہو، مگر اس وقت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بار گھاؤ اس کی ہی غلطی سے لگا۔ اس کا ہی ہاتھ بہکا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی۔ نروس کیوں ہو؟" گاہک نے سخت لہجے میں کہا۔

"سوری سر۔ یقین کریں، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔" بشیر گھگیانے لگا۔

"چلو خیر۔۔۔ لیکن اس بار وہ لوشن نہ لگانا۔ اس کی خوشبو مجھے اچھی نہیں لگی ہے۔ اور ہاں۔۔۔ لوشن ہاتھ سے نہ لگانا۔"

بشیر اسے ہر قیمت پر خوش کرنا چاہتا تھا۔ وہ الماری میں سے ایک اور لوشن نکال لایا۔

یہ کام مکمل ہوا تو گاہک نے کہا "اب تم میرے بال دھو ڈالو اور پھر کلر لگا دینا۔۔۔ لائٹ براؤن۔"

بشیر کٹنگ کے دوران دیکھ چکا تھا کہ گاہک کے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہیں لیکن اسے رنگ کے انتخاب پر حیرت ہوئی کیونکہ اس کے بالوں کی قدرتی رنگت سیاہ تھی۔ تاہم اس نے اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

بشیر کو ٹپ کی مطلق امید نہ تھی۔ اُس نے شیمپو سے بال دھوئے۔ پھر کلر کیا۔ اس کے بعد گاہک کو ایک میگزین تھما کر بال خشک ہونے کے وقفے میں اس نے ایک اور گاہک کو نمٹایا۔ پھر آخری بار بال دھو دیئے۔

اس گاہک پر اس نے ڈیڑھ گھنٹا صرف کیا تھا اور بے سود۔ گاہک کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے اُس کی طرف آیا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ گاہک نے اس کے ہاتھ میں دس روپے کے چند نوٹ تھمائے تو وہ حیران رہ گیا۔

"میں اچھا کام کرنے والوں کی قدر کرتا ہوں۔" گاہک نے مسکراتے ہوئے کہا "اور تم اچھے کاریگر ہو۔"

بشیر نے اُس کے باہر نکلتے ہی اطمینان کی سانس لی اور نوٹوں کو دیکھا۔ وہ چالیس روپے تھے۔۔۔ یعنی پچیس فیصد ٹپ!

○☆○

باربر شاپ سے نکلنے کے بعد اُس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ نہیں رہی تھی!

اسے اپنا نام، اپنی شخصیت بدلنے میں ڈیڑھ ماہ لگا تھا۔ ڈیڑھ ماہ پہلے تک وہ کروڑپتی صنعت کار عاصم قریشی تھا۔ مگر اب وہ مرشد حسین تھا، جسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کا چہرہ اب کلین شیو نہیں تھا بلکہ مونچھوں اور گھنی داڑھی کے حصار میں آ گیا تھا۔ پیچھے جانے والے بالوں میں اب مانگ نکلی ہوئی تھی اور وہ انہیں دونوں جانب سنگھا کرتا تھا۔ اس کے نتیجے میں پیشانی پہلے جیسی کشادہ نہیں لگتی تھی۔ بالوں کی رنگت بھی اس نے تبدیل کر لی تھی۔ بال وہ پہلے بھی رنگواتا تھا اس لیے کہ صرف بیس سال کی عمر میں اس کا آدھا سر سفید ہو چکا تھا۔ مگر پہلے وہ اُن پر سیاہ رنگ کراتا تھا جو اس کے بالوں کا قدرتی رنگ تھا۔ اب اس نے بالوں کو لائٹ براؤن رنگت دے دی تھی۔ اس کی وجاہت اور خوب روئی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ شاید وہ پہلے سے زیادہ وجیہہ اور خوب رو لگ رہا تھا۔ اس کی عمر اڑتیس سال تھی۔ دیکھنے میں وہ تیس بتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ مگر پچھلے دو ماہ میں اس کے چہرے پر لکیروں نے جالے بُن دیئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس پر گزری ہی کچھ ایسی تھی۔

اسے گھر سے نکلے دو ماہ ہو چکے تھے۔ فوزیہ اور بالخصوص بچے اسے رہ رہ کر یاد آتے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اُن کے لیے مر چکا ہے۔ ان بدنصیبوں کی بہتری اسی میں تھی کہ وہ باپ کے زندہ ہوتے یتیم ہو جائیں۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی معاشرے کی نظروں میں مجرم تھا۔ اور یہ اسے گوارا نہیں تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے انگشت نمائی کا باعث بنے۔ اس لیے وہ چپکے سے ان کی دنیا سے نکل آیا تھا۔

اور اب اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ اس کا وجود انتقام کی آگ میں پھنک رہا تھا۔

○☆○

روزنامہ سویرا کا رپورٹر وحید نجمی پاک لیب میں ڈاکٹر نجیب کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ نجیب اور وہ پرانے دوست تھے۔ انٹر تک دونوں ساتھ ہی پڑھے تھے۔ پھر ان کی راہیں جدا ہو گئی تھیں لیکن اُن کا ایک دوسرے سے رابطہ نہیں ٹوٹا تھا۔ ان میں سب سے بڑی قدر مشترک دردمندی اور انسان دوستی تھی۔ دونوں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس سلسلے میں کام کرتے تھے۔ دونوں کی اپنے اپنے میدان میں ایک ساکھ تھی۔

"کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟" نجمی نے نجیب سے پوچھا۔

"ہاں پریشان تو ہوں۔"

نجمی نے محسوس کیا کہ نجیب کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس نے گفتگو کا رخ بدل دیا "اور سناؤ میرے مشورے پر عمل درآمد کے بعد سے اب تک کوئی پروگریس بھی ہوئی ہے یا نہیں؟"

"اسی سلسلے میں تو پریشان ہوں۔" نجیب نے گہری سانس لے کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ایک کیس سامنے آیا تھا۔ ایک ایسا شخص جو مستقل ہماری خدمات حاصل کرتا ہے۔" نجیب نے کہا "وہ باقاعدگی سے کولسٹرول اور شوگر چیک کراتا ہے۔"

نجمی سنبھل کر بیٹھ گیا "تو پھر؟"

"وہ رپورٹ لینے آیا تو میں نے اسے بلوا لیا۔ میں نے بڑی نرمی اور ہمدردی سے اسے سمجھایا۔ وہ حیرت انگیز طور پر پُرسکون رہا۔ بس اس نے ایک بار اتنا کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر۔ میں نے اسے ایک ہفتے بعد بلایا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" نجمی نے پوچھا۔

"دو ماہ سے زیادہ ہو گئے۔"

"اور تم نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا۔"

"تم بھول رہے ہو بھائی کہ تم ایک مصروف صحافی ہو۔" نجیب

نے تیکھے لہجے میں کہا "اس عرصے میں تم وزیر اعظم کے ساتھ بیرون ملک سفر کرتے رہے ہو۔"

"اوہ سوری! مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ خیر' پھر کیا ہوا؟"

"وہ ایک ہفتے بعد آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوا۔ اُس کے انداز میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔ اُس نے جاتے وقت کہا تھا..... مجھے یقین ہے ڈاکٹر کہ ایسی کوئی بات میرے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے کسی سے۔ ایک ہفتے بعد وہ نہیں آیا تو میں نے اس کے گھر فون کیا۔ اس کی بیوی سے پتا چلا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں امریکا گیا ہے۔ ایک ماہ بعد واپس آئے گا۔ میں اُس کیس کو پہلے ہی محکمہ صحت کے حوالے کرچکا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اُسے ان کے پاس بھیج دوں۔"

"تو پھر؟"

"اب اُس کا سراغ ہی نہیں مل رہا ہے۔ میں نے ایک ماہ انتظار کیا۔ پھر دوبارہ فون کیا اُس کے گھر۔ اس بار اُس کی بیوی پریشان تھی۔ وہ شوہر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کراچکی تھی۔ اس بات کو تقریباً ایک ماہ ہوچکا ہے۔ پولیس بھی اُس کی تلاش میں ناکام رہی ہے۔"

"پولیس مجرموں کو تلاش نہیں کرپاتی' جن کی تعداد بہرحال شرفا کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ وہ کسی شریف آدمی کو کیا تلاش کرے گی۔" نجمی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بہرحال محکمہ صحت والوں کا نزلہ مجھ پر گر رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کو خود ہینڈل کرنے کی بجائے صرف انہیں مطلع کردینا چاہیے تھا۔ وہ خود دیکھ لیتے' اس معاملے کو۔"

"کیا دیکھ لیتے' ہوتا پھر بھی یہی۔"

"اس ملک میں تو پتلی گردن ہی ڈھونڈی جاتی ہے نا۔ مجھے سختی سے ہدایت کی گئی ہے کہ آئندہ اس معاملے میں' میں صرف مخبر کا رول ادا کروں۔"

"تو یہ ہے تمہاری پریشانی کا سبب۔" نجمی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"یہ ایسا ہے جیسے کوئی پاگل کتا بھرے شہر میں آزاد پھر رہا ہو۔ اب وہ جسے بھی کاٹے گا اُس کی موت اور اس کے گھرانے کی تباہی کا ذمے دار میں ہوں گا۔"

"بھائی وہ کتا نہیں' انسان ہے۔" نجمی نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" نجیب نے شرمندگی سے کہا "یہ میں نے محکمہ صحت والوں کے الفاظ دہرائے تھے۔"

"ویسے تمہارا اندازہ کیا ہے۔ تمہارا مریض کیا سوچ کر بھاگا ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" نجیب نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا "میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جس وقت اُس نے کہا کہ یہ ناممکن ہے' اس کے لہجے میں وہ اعتماد تھا' جو ایک صاف ستھری زندگی گزارنے والے ہی کا ہوسکتا ہے۔ اُس کے لہجے میں اعتماد ہی نہیں چیلنج بھی تھا۔ بعد میں اس نے میری بات پر غور کیا ہوگا تو اس پر نجانے کیا گزری ہوگی۔ وہ بہرحال بہت بڑا دھچکا تھا اُس کے لیے۔ لیکن ہم کسی کے ردعمل کا درست اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بہرکیف مجھے اس وقت یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ غائب ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے اس کا نام پتا بتاؤ۔" نجمی نے کہا۔

"تم جانتے ہو کہ کچھ پیشہ ورانہ اخلاقی ضابطے بھی ہوتے ہیں۔ میں کسی مریض کو ایکسپوز نہیں کرسکتا۔ اس کی بیماری کا راز....."

"قومی ذمے داری ہر اخلاقی ضابطے سے بڑی ہوتی ہے۔ کیا تمہیں صورت حال کی سنگینی کا اندازہ نہیں؟"

"اندازہ تو ہے لیکن......"

"تمہیں اندازہ نہیں ہے۔" نجمی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "تصور تو کرو کہ اس کے نتائج کہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسے تلاش کرنا ضروری ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" ڈاکٹر نجیب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن میں نہیں چاہتا کہ اُس کا نام اچھالا جائے۔"

"میں صرف اسے تلاش کروں گا۔ یہ میرے لیے محض اسٹوری نہیں ہے۔"



کبھی کا عاصم قریشی اور حال کا مرشد حسین بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گھر سے نکلنے کے بعد سے اب تک وہ ایک بار بھی بھرپور نیند نہیں لے سکا تھا۔ زہریلی سوچوں نے اس کے پورے وجود کو تلخ کرکے رکھ دیا تھا۔

اُس دن' اُس وقت اور اُس بھیانک لمحے کو وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا جس نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ اب اس بات کو دو ماہ سے اوپر ہوچکے تھے۔ وہ اُس روز اپنے خون کے ٹیسٹ کی رپورٹ لینے پاک لیب گیا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر رسید دی تو کلرک نے کہا "سر' آپ کی رپورٹ ڈاکٹر نجیب کے پاس ہے۔ آپ ان سے مل لیں۔"

اُس کا دل دھڑک اٹھا "خیریت تو ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے سر۔ وہ آپ کو کوئی مشورہ دینا چاہتے ہیں۔" کلرک نے بے حد خلوص سے کہا۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ وہ برسوں سے باقاعدگی سے خون ٹیسٹ کرارہا تھا۔ محض احتیاطاً تاکہ شوگر اور کولسٹرول نہ بڑھنے پائے۔ وہ جانتا تھا کہ صحت کی بہت اہمیت ہے۔ صحت نہ ہو تو دولت بھی بے کار ہے۔ مگر اب اُس کا دل اندیشوں کے بوجھ سے لرز رہا تھا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ ضرور کوئی گڑبڑ تھی.... شوگر یا کولسٹرول۔ اور اس میں اضافہ اتنا ہوگا کہ ڈاکٹر نجیب نے اسے مشورہ دینا ضروری سمجھا۔

اُس نے دھڑکتے دل سے ڈاکٹر نجیب کے دفتر کے دروازے پر دستک دی "پلیز کم ان" اندر سے ڈاکٹر کی آواز آئی۔

وہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تشریف رکھیے قریشی صاحب۔"

وہ بیٹھ گیا اور مستفسرانہ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھتا رہا۔ ان چند لمحوں کی خاموشی بہت سنگین تھی۔ ڈاکٹر کے انداز میں بھی ہچکچاہٹ تھی اور عاصم..... وہ اُس سے کچھ پوچھتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ نجانے کیا سامنے آئے۔

آخرکار ڈاکٹر کی خاموشی ٹوٹی "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو زحمت دی لیکن یہ ضروری تھا۔"

عاصم خاموش رہا۔ وہ خود کو بُری خبر کے لیے تیار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر کی شاید سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بُری خبر کیسے سنائے۔ شاید اسی لیے اس نے بلا تمہید دھما کا کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں سختی اور لہجے میں درشتی تھی "قریشی صاحب' آئی ایم سوری لیکن آپ کے خون میں ایچ آئی وی پاز۔یٹو ملا ہے۔"

چند لمحے تو عاصم کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بلکہ اس نے سکون کی سانس بھی لی۔ وہ تو ڈر رہا تھا کہ یہ شوگر کا یا دل کا کوئی سنگین معاملہ ہوگا لیکن پرسکون ہوتے ہی بات اُس کی سمجھ میں آگئی اور اسے زبردست شاک لگا۔ چند لمحے تو اس کی آواز ہی نہیں نکلی۔ پھر اس نے ہکلاتے ہوئے کہا "آپ کا مطلب ہے ایڈز.....؟"

ڈاکٹر نجیب نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی "آئی ایم ریئلی سوری قریشی صاحب' لیکن یہ حقیقت ہے۔"

عاصم کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ لیکن کسی نامعلوم حِس نے اسے بتادیا تھا کہ اسے شدید ردعمل ظاہر کرنے سے بچنا ہوگا اور وہ حِس بے حد قوی تھی۔ ذہن میں طوفان برپا ہونے کے باوجود وہ سوچ سکتا تھا کہ اسے تنہائی میں سکون سے اس پر غور کرنا..... سوچنا ہوگا۔ قبل از وقت ردعمل تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔ چنانچہ وہ چہرے کو بے تاثر رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا رہا۔

اُس نے عجیب سی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ڈاکٹر نظریں جھکائے بیٹھا تھا جیسے خود کو چور محسوس کررہا ہو۔ اس حقیقت نے عاصم کو اور پُراعتماد بنادیا۔ اسے یہاں محض چند منٹ ایک رول پلے کرنا تھا اور وہ بھی نظریں جھکائے ہوئے مدافعت پر مائل ڈاکٹر کے سامنے۔ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں تھا۔

"ڈاکٹر صاحب" اس نے پکارا۔

ڈاکٹر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو اس نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر....." پھر وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اسے اوور ری ایکٹ بھی نہیں کرنا ہے اور اپنی صفائی بھی پیش نہیں کرنی ہے اس لیے کہ ڈاکٹر کیا' دنیا کا کوئی شخص بھی اُس کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ چنانچہ یہ بے سود ہے۔ یہ دکھ وہ صلیب ہے جو اسے تنہا اپنے کندھوں پر اٹھانی ہے۔ اس نے بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں پریقین لہجے میں دہرایا "یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر کی آنکھوں میں ہمدردی اور تفہیم کی چمک ابھری جیسے وہ اس پانچ لفظی بلیغ جملے کے تمام معانی اور مفاہیم کو سمجھ چکا ہو "یہ ہر اعتبار سے ممکن ہے قریشی صاحب۔" اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا "اس کی بے شمار صورتیں ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس میں آدمی کا قصور ہو۔"

عاصم بھی جانتا تھا کہ ڈاکٹر درست کہہ رہا ہے "تو پھر؟" اس نے پوچھا۔

"آپ اگلے ہفتے میرے پاس آئیں۔ اس دوران میں اور اچھی طرح چیک کرلوں گا۔" ڈاکٹر جانتا تھا کہ یہ دوبارہ چیک کرنا محض طفل تسلی ہے۔

"میں ضرور آؤں گا ڈاکٹر صاحب۔" عاصم نے اٹھتے ہوئے کہا "اس یقین کے ساتھ کہ آپ مجھے خوش خبری سنائیں گے کہ یہ محض ایک تکنیکی غلطی کا نتیجہ تھا۔"

ڈاکٹر سے ہاتھ ملا کر وہ کمرے سے نکل آیا۔ باہر آکر اسے احساس ہوا کہ اس نے خون کی رپورٹ تو لی ہی نہیں۔ پھر اس نے کندھے جھٹک دیئے۔ اب کولسٹرول اور شوگر کی کیا اہمیت رہ گئی تھی!

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ تین بجنے والے تھے۔ آفس جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھانے سے پہلے موبائل فون پر اپنی سیکریٹری سے رابطہ کیا "رعنا... میں آج دفتر نہیں آسکوں گا۔ کوئی ضروری ملاقات یا مصروفیت تو نہیں؟" اس نے پوچھا۔ رعنا نے نفی میں جواب دیا تو اس نے رابطہ منقطع کیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

سوال یہ تھا کہ وہ کہاں جائے۔ اسے تنہائی کی ضرورت تھی' جہاں وہ سکون سے بیٹھ کر سوچ سکے۔ آخرکار اس نے گاڑی کا رخ کلفٹن کی طرف موڑ دیا۔ اولڈ کلفٹن تو عام حالات میں بھی سنسان رہتا تھا اور اس وقت تو شام بھی نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی پارک کرکے وہ ساحل کی طرف چل دیا۔ دھوپ بہت ناگوار تھی لیکن اس وقت وہ ہر چیز سے بے نیاز تھا۔

وہ ساحل کی نرم ریت پر ٹہلتا رہا۔ اپنی سوچوں اور اپنے ذہن کو مرتکز کرنا کارے دارد تھا۔ خیالات مختلف جہتوں میں دوڑ رہے تھے لیکن اسے ایک فیصلہ کرنا تھا۔ لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ اُس کے لیے ذہن کو یکسو کرنا ضروری تھا۔

فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ اپنے جیتے جی اپنی بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرنا کوئی مذاق نہیں تھا لیکن اس کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جس گناہ گار معاشرے میں جی رہا تھا اس

سے خوب واقف تھا۔ یہاں برسوں سے یہ رسم چلی تھی کہ اپنا قد بڑھانے کی زحمت کوئی نہیں کرتا تھا۔ گرنے والوں کو لاشوں کی طرح ایک دوسرے پر رکھ کر ان پر چڑھ کر خود کو اونچا کیا جاتا۔ کوئی خود نہ گرتا تو لوگ تاک میں لگے رہتے کہ اڑنگا لگادیں یا دھکا دے دیں۔ کسی کا گناہ سامنے آجاتا تو گناہ گاروں کی جیسے عید ہو جاتی۔ سب اپنے اپنے تمام گناہوں کی سزا بھی اسے دینے کی کوشش کرتے۔

اور اب اس دور میں خدا کے قہر کی وجہ سے گناہ گاروں کی نقاب کشائی عام ہو گئی تھی۔ گناہ گاروں کی نفسیات بھی عجیب ہوتی ہے۔ عام قسم کے گناہ گار حد درجہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ وہ صاحب اختیار ہوتے ہیں کچھ اس لیے کہ ان کے پاس دولت کی طاقت ہوتی ہے اور کچھ اس لیے کہ انہیں ابھی بہت عرصے زندہ رہنے کا یقین ہوتا ہے۔ وہ چڑھتے سورج جیسے گناہ کی بھی تردید کرتے ہیں۔ بلکہ الزام لگانے والوں پر بھی جوابی حملے شروع کر دیتے ہیں۔ جرم کی صحت قبول کرنا تو دور کی بات ہے' وہ اپنے خداداد اختیار اور اقتدار سے دست بردار ہونا بھی قبول نہیں کرتے' جو ان پر اخلاقاً واجب ہوتا ہے۔ مگر مسئلہ تو یہی ہے کہ یہ معاشرہ اخلاقی انحطاط کی آخری حدوں کو پہنچ چکا ہے۔

مگر وہ گناہ گار جسے یہ علم ہو جائے کہ موت اس پر حملہ آور ہو چکی ہے اور اب وہ دنوں' ہفتوں' مہینوں یا چند برسوں کا مہمان ہے' وہ تو جیتے جی مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ ساری ڈھٹائی' تمام تاویلیں اور جوابی الزامات دوسروں کی عیوب کشائی' سب کچھ زندگی کے یقین سے وابستہ ہوتا ہے۔ حالانکہ زندگی کا یقین تو صحت مند آدمی کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔ مگر یہاں بات شاید موت کے یقین کی ہے۔ یقینی موت سامنے ہو تو ہر چیز اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔ آدمی جان لیتا ہے کہ عمر بھر جس کے احکامات کی خلاف ورزی کرتا رہا' جس سے نظریں چراتا رہا' اب اسے بہرحال اس کا سامنا کرنا ہے۔ تب اس کے پاس صرف پشیمانی اور خوف رہ جاتا ہے۔ اپنے خالق' اپنے رب کا سامنا کرنے کے تصور سے اس پر لرزہ طاری رہتا ہے۔

اب یہاں معاشرے کے مزاج کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ اکڑ کر' آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تردید جرم پیش کرتا' تاویلات گھڑتا اور جوابی حملے کرتا ہوا طاقت ور گناہ گار محترم ہی رہتا ہے اور وہ جو گناہ کی پاداش میں جیتے جی مٹی کا ڈھیر بن گیا ہو' اسے پورا معاشرہ ملامت اور طعنوں کی پھونکوں سے بکھیر دینے پر تل جاتا ہے۔ اسے اچھوت بنا کر رکھ دیا جاتا ہے جیسے وہ قبل از مسیح کا کوڑھی ہو۔

اور پھر کوئی ایسا شخص جو بے گناہ ہو لیکن سزا اسے گناہ گاروں کی مل رہی ہو۔ ایسے شخص کا کیا حشر ہوگا۔ وہ تو دہرے کرب میں زندگی گزارے گا۔ ایک تو ناکردہ گناہ کی سزا کا کرب اور دوسرے یہ کرب کہ کوئی اُس کی بے گناہی تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ اچھوت بن کر رہے گا' زمانہ قبل از مسیح کے کوڑھی کی طرح۔ اور یہاں تو اس کے ساتھ اس کی بے گناہ بیوی اور معصوم بچے بھی اچھوت بن کر رہ جائیں گے...

عاصم نے جھرجھری لی اور اس کے خیالات کی ڈور ٹوٹ گئی۔ وہ اس وقت اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ موجوں کا شور بن کر اُس نے چونک کر دیکھا تب اسے یاد آیا کہ وہ ساحل کی ریت پر چلتے ہوئے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ رک گیا تھا۔ یہ آخری خیال بے حد روح فرسا تھا۔ فوزیہ' پانچ سالہ سلیم اور تین سالہ ملیحہ...... ان کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ لیکن بے قصور تو وہ خود بھی تھا۔ یہ الگ بات کہ اُس کے اور اُس کے خدا کے سوا کوئی یہ بات نہیں جانتا تھا۔ اس بار خدا کا خیال آتے ہی اس کا وجود غصّے سے کانپنے لگا "کیوں دی ہے تو نے مجھے یہ سزا؟" وہ آسمان کی طرف منہ کر کے چلایا "جبکہ میں اس سزا کا مستحق نہیں تھا۔ یہ کیسا انصاف ہے؟"

مگر اوپر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ بکتا جھکتا رہا۔ آخر تھک ہار کر خاموش ہو گیا.... نڈھال!

بھڑاس کسی حد تک نکل چکی تھی۔ اب وہ نسبتاً پرسکون انداز میں سوچ رہا تھا۔ بیوی بچوں کی خاطر اسے جیتے جی مرجانا تھا۔ اس میں ان کی بھی بہتری تھی اور خود اس کی بھی۔ وہ عزت سے مرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ حق خدا نے اُس سے چھین لیا تھا۔ پھر بھی اسے کوشش کرنا تھی۔ اور کوشش میں کامیابی کا امکان بھی تھا۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ بچوں کے مستقبل کو وہ بہ آسانی محفوظ کر سکتا تھا۔ اس طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے مشن کی طرف توجہ دینا تھی۔ اب جتنی بھی زندگی رہ گئی تھی اس میں اسے یہی ایک کام کرنا تھا جس کا مقصد تھا انتقام۔

"دنیا نے جس بھی شکل میں اور جس بھی روپ میں۔ جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں" وہ ساحر کے شعر کو تصرف کے ساتھ گنگناتا رہا۔ وہ ساحل پر ٹہلتے ہوئے اپنے منصوبے کی نوک پلک درست کرتا رہا۔ شام ہوئی تو وہ گھر میں آخری رات گزارنے کے لیے چل دیا۔

گھر پہنچ کر اس نے فوزیہ کو بتایا کہ وہ بزنس کے سلسلے میں اگلے روز امریکا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ فوزیہ جانتی تھی کہ جب سے اس کے سر میں امریکا میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا سودا سمایا ہے' وہ اچانک ہی امریکا کا رخ کرتا ہے۔

اُس رات وہ ایک پل بھی نہیں سویا۔ سلیم اور ملیحہ کو خود سے لپٹائے ہوئے وہ رات بھر جاگتا رہا۔ وہ اپنے جگر گوشوں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والا تھا۔ لیکن وہ شدید خواہش کے باوجود انہیں پیار کرنے کی جرات نہ کر سکا۔ اپنے بچوں کے معاملے میں آدمی کتنا محتاط ہو جاتا ہے۔

وہ عاصم قریشی کی آخری رات تھی۔

اور اب اسے اپنے مشن کا آغاز کیے تقریباً بیس دن ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی اب تک کی کارگزاری کے بارے میں سوچا اور اس کے نتائج کا تصور کیا۔ اس کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ ایک لمحے کو مچلی۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ چونک کر اٹھ بیٹھا "یہ کیا کر رہا ہوں میں۔ یہ تو ٹھیک نہیں" وہ لرزیدہ آواز میں بڑبڑایا۔

اور جیسے جیسے وہ سوچتا گیا یہ خیال زور پکڑتا گیا کہ وہ غلطی پر ہے۔ واقعی' اس نے اس انداز میں تو سوچا ہی نہیں تھا۔ سوچتا بھی کیسے۔ اس کا ذہن' اس کی سوچیں.... سب کچھ تو مسخ ہو چکا تھا۔ جس شخص پر اتنی بڑی قیامت گزری ہو وہ بھلا سوچنے کے قابل رہ سکتا ہے۔ اس نے تو خدا سے بھی بغاوت کر دی تھی۔ مگر اس وقت اس کی یہ رہنمائی خدا نے ہی کی تھی۔

اب وہ سوچنا چاہتا تھا لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ ایسے نہیں' سکون سے۔ اس نے خود کو تلقین کی۔ یہ نیند سے محروم دماغ ٹھیک طرح سے نہیں سوچ سکتا۔ تمہیں ایک اچھی نیند لے کر خود کو تازہ دم کرنا ہوگا ورنہ تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔ بے بسی سے مرنے کے سوا۔

اس نے دراز کھول کر ویلیم کی پانچ ملی گرام کی دو ٹکیاں نکالیں' اٹھ کر کولر سے پانی لیا اور دونوں ٹکیاں حلق سے اتار لیں۔ گھر سے نکلنے کے بعد سے اب تک نیند کی دوا اس کے لیے بے اثر ثابت ہوئی تھی لیکن اس وقت نیند کی ضرورت کا جواز بہت مضبوط تھا۔ وہ خود سے اپیلیں کرتا رہا۔ آخر کار اسے نیند آ گئی۔



وحید نجمی سب سے پہلے کلفٹن تھانے کے ایس ایچ او انسپکٹر شہاب سے ملا۔ وہاں سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ سنسنی خیز تھیں۔ یہ بات طے تھی کہ عاصم قریشی سرے سے امریکا نہیں گیا تھا۔

"ہمارے ہاں رپورٹ ایک ماہ بعد درج کرائی گئی تھی۔" انسپکٹر شہاب نے بتایا "اس کی بیوی مطمئن تھی کہ وہ امریکا گیا ہوا ہے۔ جب وہ واپس نہیں آیا تو اسے تشویش ہوئی۔ تب وہ ہمارے پاس آئی۔ ہم نے سب سے پہلے ائرپورٹ کا ریکارڈ چیک کیا۔ لیکن پاکستان سے باہر جانے والوں میں اُس کا نام نہیں تھا۔"

"پھر؟" نجمی نے پوچھا۔

"ہم نے معمول کے مطابق کارروائی شروع کی۔ اس کی بیوی سے پوچھ گچھ کی۔ پھر اس کی سیکریٹری سے۔ سیکریٹری نے بتایا کہ عاصم قریشی نے سختی سے اسے ہدایت کی تھی کہ اُس کے بارے میں کوئی بھی پوچھے تو یہی بتایا جائے کہ وہ امریکا گیا ہوا ہے۔"

"کوئی وجہ نہیں بتائی تھی اُس نے؟"

"سیکریٹری صرف احکامات کی تعمیل کرتی ہے' وجہ نہیں پوچھتی" انسپکٹر نے خشک لہجے میں کہا "اور اس ہدایت سے اس کی بیوی بھی مستثنیٰ نہیں تھی۔"

"سوال یہ ہے کہ سیکریٹری کو اس راز میں شریک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"ضرورت تھی" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "اسے اپنی ملیں فروخت کرنا تھیں۔ سودا مکمل ہو گیا تو اس نے سیکریٹری کو بتایا کہ اب وہ امریکا جا رہا ہے۔"

"لیکن امریکا وہ پھر بھی نہیں گیا؟" نجمی نے کہا۔ ملوں کی فروخت کے تذکرے پر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا "ایک بات بتاؤ' کیا اس نے اپنی تمام ملیں فروخت کر دیں؟"

"ملیں ہی نہیں' اپنے رہائشی بنگلے کو چھوڑ کر تمام اثاثے۔ ان میں زرعی زمین بھی تھی جہاں کپاس کی کاشت ہوتی تھی۔"

"تو یہ تو لمبا سودا ہوا۔"

"ہاں میری اطلاع کے مطابق ۹۰ کروڑ کی ڈیل تھی۔"

"۹۰ کروڑ" نجمی نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکوڑے "اتنی جلدی اتنی تگڑی پارٹی مل جانا حیرت انگیز بات ہے۔"

"یہ پورا معاملہ ایک ہفتے میں نمٹ گیا تھا۔" انسپکٹر نے کہا "وجہ یہ ہے کہ پارٹی پہلے سے لگی ہوئی تھی۔ غیر ملکی پارٹی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کا گروپ ہے۔"

"اور یہ سودا......"

"ہر اعتبار سے قانونی ہے۔ اب قریشی انڈسٹریز کے منتظم اعلیٰ مسٹر ڈیوڈ میلکم ہیں۔ حکومت بھی ان سے ہر ممکن تعاون کر رہی ہے۔ ڈیڈ کی تصدیق حکومت پاکستان نے کی ہے۔ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو کہ حکومت غیر ملکی سرمایہ کاروں کی کس طرح حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔"

نجمی نے سر کو تفہیمی جنبش دی "لیکن انسپکٹر' ۹۰ کروڑ کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔" اس نے کہا "تم نے یہ معلوم کیا کہ ادائیگی کس طرح سے ہوئی۔"

"کوشش کی تھی میں نے۔ لیکن مسٹر ڈیوڈ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہیں اور میں ان پر زور نہیں ڈال سکتا تھا۔"

نجمی اس کی پوزیشن سمجھتا تھا۔ یہ معاملہ انسپکٹر کے بس کا نہیں تھا "تم نے یہ معلوم کیا کہ سودا مکمل ہونے تک عاصم قریشی کہاں مقیم رہا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ ایک ہفتے انٹرکان میں رہا تھا۔"

"اور اس کے بعد؟"

انسپکٹر نے کندھے جھٹک دیئے "اس کے بعد شاید وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔"

"اب یہ بتاؤ کہ اس کیس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

انسپکٹر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا "میرا خیال ہے' وہ کسی

منصوبے کے تحت غائب ہوا ہے لیکن یہ ناممکن نہیں کہ وہ خطرات میں گھر گیا ہو۔ وہ بہت دولت مند آدمی ہے اور تم جانتے ہو کہ آج کل شہر کا ماحول کیسا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کرسکے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس وقت وہ زندہ ہو۔"

مجی نے دل میں کہا۔۔۔ ہاں' اس کی زندگی کی تو کوئی ضمانت نہیں "تمہارے خیال میں وہ غائب کیوں ہوا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"وہ امریکا سیٹل ہونے کے چکر میں تھا۔ ہوسکتا ہے اس نے بیوی اور بچوں کے دم چھلوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ ڈراما کیا ہو۔ وہ جوان آدمی ہے۔ دولت کی بھی کمی نہیں۔ امریکا میں کھل کھیلنا چاہتا ہوگا۔"

"ممکن ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں انسپکٹر۔" مجی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اتنے سوال تم نے پوچھے۔ اب ایک سوال میں بھی پوچھوں تم سے۔"

مجی جاتے جاتے پلٹا "ضرور پوچھو۔"

"تم اس کیس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"

"موٹی آسامی بڑی خبر ہوتی ہے۔" مجی نے آنکھ مارتے ہوئے کہا "ویسے بھی اس کی گمشدگی کا معمّا بڑی سنسنی خیز کہانی ہے۔ اچھا۔۔۔ خدا حافظ۔"



وہ بارہ گھنٹے سویا تھا!

دو مہینے سے نیند کو ترسا ہوا انسان نیند آجائے تو ایسے ہی سوتا ہے۔ اٹھا تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ بھوک کا بھی احساس نہیں تھا۔ چولہے پر چائے کا پانی رکھ کر وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں سے نکلا تو پانی تیار تھا۔ اُس نے چائے بنائی۔ ایک پیالی لے کر اس نے باقی چائے تھرموس میں بھری اور تھرموس اور پیالی لے کر بیڈ روم میں چلا آیا۔ چائے کی ایک پیالی سے تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے تھرموس سے دوسری پیالی بھری۔ دوسری پیالی پینے کے بعد وہ خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور آنکھیں موند لیں۔ اب وہ سکون سے سوچ سکتا تھا۔ حقائق اس کے سامنے تھے۔ اسے اُن کا تجزیہ کرکے ان سے نتائج اخذ کرنا تھے اور پھر اپنا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

پہلی اور سنگین ترین حقیقت یہ تھی کہ وہ ایڈز کا مریض تھا۔

اس حقیقت پر سوچتے ہوئے اسے اپنا ذہن منتشر ہوتا محسوس ہوا مگر اس بار اُس نے جلد ہی اس انتشار پر قابو پالیا۔ پریشان ہونے سے یہ حقیقت بدل تو نہیں سکتی تھی۔ اِس حقیقت کو پوری طرح قبول کرلینے ہی میں عافیت تھی۔

دوسری حقیقت یہ تھی کہ عیاشی اور جنسی بے راہ روی سے اس کا کبھی دور کا بھی واسطہ نہیں رہا تھا۔

اس حقیقت پر سوچتے ہوئے اسے اپنی غلط سوچ کا احساس ہوا۔ وہ ایڈز کے مریضوں کو قابلِ نفرت سمجھتا تھا۔ اُس کا طرزِ عمل جیسی کرنی ویسی بھرنی والا ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک وہ بدترین گناہ گار تھے جو کسی ہمدردی کے مستحق نہیں تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ ان میں سے کوئی بے گناہ بھی ہوسکتا ہے۔ بلکہ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ گناہ گار بھی اس سلوک کے مستحق نہیں ہوتے۔ آخرت کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن جنہیں دنیا میں بھی اللہ کی طرف سے سزا مل گئی ہو' انسانوں کو ان کے ساتھ بدسلوکی کا کوئی حق نہیں۔ وہ جن کے مقدر میں اذیت بھری موت لکھ دی گئی' ان کی دل جوئی کرنی چاہیے' کم از کم انہیں اچھوت بنا کر تو نہیں رکھنا چاہیے۔ لواحقین کو۔۔۔۔ بلکہ معاشرے کو ان کی موت آسان بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس حال میں تو انسان اتنا نازک ہوجاتا ہوگا کہ ملامت کی ایک نگاہ سے اس کا دل چھلنی ہوجائے۔ اسے ایک واقعہ یاد آیا جو ایک انگریزی روزنامے میں شائع ہوا تھا۔ ایک ڈاکٹر کے علم میں ایڈز کا ایک کیس آیا تھا۔ مریض غریب آدمی تھا۔ خون بیچنا اس کا پیشہ تھا۔ جب اسے علم ہوا کہ وہ اس موذی مرض میں مبتلا ہے تو ڈاکٹر کی تسلی اور دل جوئی بھی اسے سہارا نہ دے سکی۔ وہ انتقام کی باتیں کرنے لگا پھر ایک دن وہ غائب ہوگیا۔ ڈاکٹر نے اسے خطرناک قرار دیا۔ کیونکہ اب اس شخص کا ایک ہی مقصد ہوسکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ایڈز میں مبتلا کرکے معاشرے سے انتقام لینا۔ لاقانونیت کے پروردہ اس معاشرے میں یہ کام بہت ہی آسان تھا۔ خون خریدنے والے اب بھی ایک سرنج پچاسوں افراد پر استعمال کرنے سے تائب نہیں ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے اس شخص کے لیے ایڈز کیریئر کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ لیکن عاصم کو خبر پڑھنے کے بعد کی اپنی سوچ یاد تھی اس کے خیال میں وہ انسان نہیں' پاگل کتا تھا' جو بے سوچے سمجھے دوسروں کو کاٹ کر موت سونپنے کے لیے نکلا تھا۔

اب وہ اس شخص کو سمجھ سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ خود بھی اس جیسا ہوگیا تھا۔ اسے بھی کسی پاگل کتے نے کاٹ کر موت کے جراثیم سونپ دیئے تھے۔ اُس وقت اس نے نہیں سوچا تھا مگر اب وہ سوچ سکتا تھا کہ شاید وہ شخص بے قصور ہوگا۔ بغیر کوئی گناہ یا آوارگی کیے وہ اس مرض میں مبتلا ہوا ہوگا۔ ایسے کسی شخص کا ردِعمل اتنا تند و شدید ہوسکتا ہے' جسے احساس ہو کہ اس کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے۔ وہی انتقام لینے کی سوچ سکتا ہے۔ خود اس نے بھی تو یہی سوچا تھا اور اس پر عمل بھی شروع کردیا تھا۔ گناہ گار آدمی تو یہ معلوم ہونے پر گناہ کے بے کراں بوجھ تلے دب کر رہ جائے گا۔ وہ تو سہم جائے گا۔

اب اسے اپنا ردِّعمل اور خدا سے اپنی خفگی یاد آئی۔ اسے غلطی کا۔۔۔ توبہ کی ضرورت کا احساس ہونے لگا۔ بنیادی طور پر اس کے سوچنے کا انداز ہی غلط تھا اور ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے

اب درست کرلیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ ایڈز خدا کا قہر ہے۔ اس اعتبار سے یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس کا شکار ہو سکتا ہے اُس کا ردعمل اسی لیے اتنا شدید تھا۔ اسے زعم پارسائی جو تھا۔ مواقع حاصل ہونے کے باوجود وہ اس معاملے میں کبھی نہیں بہکا تھا۔ لہٰذا وہ اس سزا کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اس ایک گناہ سے محفوظ سہی لیکن ہر گناہ سے محفوظ ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔ جبکہ وہ جانتا تھا کہ پیغمبروں اور ولیوں کو چھوڑ کر کوئی نیک سے نیک عام انسان صرف اپنے اعمال کے بل پر بخشش نہیں پا سکتا۔ صرف اللہ کی رحمت کے زور پر ہی آخرت سنورتی ہے۔ وہ خدا کے متعلق بے انصافی کا خیال دل میں لایا۔ حالانکہ وہ کبھی بے انصافی نہیں کرتا۔ بلکہ اُس سے تو انصاف نہیں، رحم طلب کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ سب کچھ جاننے والا، آدمی کے پل پل سے واقف اگر انصاف کرے گا تو دنیا میں کون ایسا ہوگا، جو مجرم ثابت ہونے سے بچ جائے گا۔

پھر ایک اور زاویہ بھی تھا۔ معاشرے کی خرابی سے فرد بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی معاشرہ اللہ تعالیٰ کے قہر کی زد میں آتا ہے تو اس میں بچتا تو کوئی بھی نہیں۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ اسے یاد آیا اس نے کسی کتاب میں یا اخبار کے کالم میں پڑھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی معاشرے کو تباہ کرنے کا حکم دیا۔ جبریل امینؑ اس کام کے لیے گئے لیکن لوٹ آئے۔ عرض کیا کہ خداوند کریم، وہاں ایک ایسا بندہ بھی ہے جو عابد و زاہد ہے، نیک ہے۔ اس میں تو وہ بھی ہلاک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم میرے حکم پر عمل کرو۔ وہ عبادت گزار بھی گناہ گار ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے میرے احکامات کی کھلی خلاف ورزی ہوتی رہی اور اس نے آواز تک نہ اٹھائی۔ چنانچہ وہ بستی تباہ کر دی گئی۔ تو یہ ایک حوالہ یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ معاشرے کی ذمے داری فرد پر بھی عائد ہوتی ہے۔ معاشرے میں کوئی برائی فروغ پانے لگے تو اس کے ہر فرد پر اس برائی کے خلاف حسب حیثیت جہاد فرض ہوتا ہے۔ طاقت ور ہو تو اس پر فرض ہے کہ وہ اس برائی کو بہ جبر روکے، سختی سے ٹوکے۔ کمزور ہو تو اس کے خلاف زبان سے جہاد کرے۔ بہت زیادہ کمزور ہو اور کسی طرح کے احتجاج کے قابل نہ ہو تو اپنے عمل سے اس کی مذمت کرے اور اس برائی میں ملوث لوگوں سے نفرت کرے، ان کا بائیکاٹ کرے، ان سے قطع تعلق کرلے۔ اس میں یہ نکتہ بھی ہے کہ برائی کا آغاز ہمیشہ چھوٹے پیمانے پر ہوتا ہے اور اکثریت جو کہ بڑی طاقت ہوتی ہے، ابتدا ہی میں اس کا خاتمہ کردینے کی قدرت رکھتی ہے۔ ہر جرم پہلے ڈھکے چھپے ہوتا ہے لیکن جب اکثریت اس پر احتجاج نہیں کرتی تو یہ اس کی توثیق کے مترادف ہوتا ہے۔ پھر مجرموں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ وہی سب کچھ کھلے بندوں ہونے لگتا ہے یوں اکثریت اس میں ملوث ہو جاتی ہے پھر جرم، جرم اور گناہ، گناہ نہیں رہتا۔ تو اس کی بڑی ذمے دار تو اکثریت ہی ہوئی نا۔ اسی لیے قہر سب کے لیے یکساں ہوتا ہے۔

اب جو اُس نے سوچا تو خود کو کم گناہ گار نہیں پایا۔ مادیت کے اس دور میں رشوت لینے والے کی عزت کی جاتی ہے کہ وہ دولت مند ہوتا ہے اور رزق حلال کمانے والا غریب بے عزت ہوتا ہے تو یہ تو برائی کی عزت ہوئی نا۔ اور یہ سب کچھ وہ خود بھی کرتا رہا تھا۔ وہ دولت کے اعتبار سے بہت طاقت ور تھا۔ پھر وہ کیوں بُروں کی عزت کرتا اور اچھوں کو نظرانداز کرتا رہا۔ اس نے برائیوں میں ملوث لوگوں سے نفرت نہیں کی۔ ان کا بائیکاٹ نہیں کیا۔ یقیناً وہ بھی مجرم ہے اس کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں ہوئی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اُس پر لرزہ چڑھ گیا۔ اس وقت اس کے جسم کا رواں رواں توبہ کر رہا تھا۔

اور جو رویہ اس کا تھا وہی پورے معاشرے کا تھا۔ دنیاوی قانون کے معاملے میں بھی لوگ مجرم سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ ہاں.... سزا ہونے کے بعد..... سزا کاٹنے کے بعد وہ ان کے لیے قابل نفرت ٹھہرتا تھا۔ اور اب سماوی قانون کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ نفرت گناہ گار سے نہیں، سزا یافتہ سے کی جاتی تھی۔ شاید جرم بے وقوفی کی پاداش میں... کہ اس نے خود پر جرم ثابت کیوں ہونے دیا۔ استغفراللہ!

تیسری حقیقت یہ تھی کہ نااہل، خود غرض اور بددیانت حکمراں سب سے بڑے مجرم تھے!

حکمرانوں کی باقی کمزوریاں ایک طرف، ایڈز کے معاملے میں ان کی مجرمانہ غفلت ناقابل معافی تھی۔ ایڈز کے متعلق لوگوں کو کچھ بتایا ہی نہیں گیا، عملی اقدامات تو دور کی بات تھی۔ یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی کہ ہر شخص کا خون لے کر تجزیہ کرایا جائے یوں ایڈز کے مریضوں کی درست اور حتمی تعداد سامنے آجاتی۔ پھر انہیں اسپتالوں میں داخل کردیا جاتا تاکہ وہ نہ اچھوت بنیں اور نہ اس کو پھیلانے کا سبب بنیں۔ یہ قانون بنایا جا سکتا تھا کہ اگر کوئی ایک سرنج ایک سے زیادہ افراد پر استعمال کرنے کا مجرم پایا گیا تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ تمام پرائیویٹ بلڈ بینکوں کو غیر قانونی قرار دے کر بند کیا جا سکتا تھا۔ لوگوں کو یہ آگہی دینے کی کوشش کی جاتی کہ دین فطرت اسلام نے فطری تقاضوں کو اخلاقی ضابطوں کا پابند کیا ہے اور اتنی سختی سے کہ ان کی خلاف ورزی پر سخت ترین سزا رکھی گئی ہے تو صرف اس لیے کہ اس میں انسانوں کی بہتری ہے۔ ہونا تو یہ کچھ چاہیے تھا لیکن ہو کچھ اور رہا تھا۔ ایڈز کے مریضوں کی تعداد چھپائی جارہی تھی۔ یہ افواہ عام تھی کہ ایڈز کے مریضوں کو علاج کے نام پر ختم کردیا جاتا ہے.... قانونی قتل! سب سے بڑی بات یہ کہ "احتیاط ہی آپ کا واحد بچاؤ ہے ایڈز کے خلاف" کی تشہیر ترغیبی انداز میں کی جارہی تھی۔ بدکاری ترک کرنے کی تنبیہہ کی بجائے لوگوں کو اس سلسلے میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے مشورے دیے جارہے تھے۔

مختصر یہ کہ مراعات یافتہ طبقے کے لوگ بد ترین مجرم تھے۔ وہ بد ترین سزاؤں کے مستحق تھے!

اور وہ انتقام لینے نکلا تھا تو کن لوگوں سے۔ اپنے جیسے لوگوں سے، نائی کے استرے، قینچی، آفٹر شیو لوشن اور پاؤڈر پف کی زد میں کون آتا؟ اسی جیسا کوئی انسان، جو انکشاف ہونے پر ڈاکٹر سے کہتا یہ کیسے ممکن ہے ڈاکٹر؟ میں نے تو بے حد صاف ستھری زندگی گزاری ہے۔ احتیاطی تدابیر کے سائے میں بدکاری کرنے والا کوئی شخص اس کے انتقام کی لپیٹ میں نہیں آسکتا تھا۔

تو گویا اُس کی اپروچ ہی غلط تھی!

اور اب اسے تجزیہ کرنا اور اپنا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

اس نے سوچا ممکن ہے خدا اس سے کوئی کام لینا چاہتا ہو۔ ورنہ وہ جس کیفیت میں تھا اس سے نکلنا ناممکن ہی تھا۔ مگر اسے ہوش آگیا تھا اور وہ ہوش مندوں کی طرح سوچنے کے قابل ہوگیا تھا۔ اب اسے کوئی ڈر، کوئی خوف نہیں تھا۔ موت ایک ناگزیر حقیقت تھی۔ اب جتنی مہلت خدا اسے عنایت فرمائے۔

بہت غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے دو مختلف سمتوں میں کام کرنا ہوگا۔ ایک عام اور کمزور لوگوں کی ناکردہ گناہوں کے عذاب سے بچنے میں مدد اور دوسرے بدکار لوگوں کو جلد از جلد ان کے انجام تک پہنچانے میں تعاون۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ دونوں خاکوں میں جزئیات کا رنگ بھرنے میں مصروف ہوگیا۔

وسائل یعنی دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی مگر اسے دونوں کاموں کے لیے دو قابل اعتماد ساتھیوں کی ضرورت تھی۔

ایک فیلڈ کے لیے تو اس کے پاس آدمی موجود تھا۔ بابر امریکا میں تعلیم مکمل کرچکا تھا۔ فون پر اس سے بات ہوئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ تقسیم اسناد کی تقریب کے فوراً بعد وہ وطن واپس آئے گا۔ عاصم نے اسے بتادیا تھا کہ اسے کہاں پہنچنا اور کس نام کے آدمی سے ملاقات کرنی ہوگی۔ بابر پر وہ مکمل اعتماد کرسکتا تھا۔ اپنے مطلب کے دوسرے آدمی کی تلاش کچھ مشکل نہیں تھی۔

اب بس اسے پُرسکون رہ کر بابر کا انتظار کرنا تھا۔

○☆○

وحید نجمی کو فوزیہ قریشی سے وقت لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ شاید اپنے شوہر کی گمشدگی کے معاملے میں میڈیا کے موثر ہونے پر یقین رکھتی تھی۔ اسے امید تھی کہ اخبارات اس سلسلے میں بے حد معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔

نجمی کی منزل کلفٹن کے علاقے میں چھ کمروں کا ایک لگژری فلیٹ تھا۔ گیٹ پر اسے روکا گیا۔ سیکیورٹی گارڈ نے اس کے اخبار کا شناختی کارڈ دیکھا پھر انٹر کام پر کسی سے رابطہ کیا "مسز قریشی، نجمی صاحب تشریف لے آئے ہیں۔" چند لمحے وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر بولا "جی بہتر" وہ نجمی کی طرف مڑا "آپ چھوٹے گیٹ پر آئیں۔ میں اسے کھول رہا ہوں۔"

نجمی چھوٹے گیٹ کی طرف گیا جو اسی لمحے کھول دیا گیا

"آٹھویں منزل، فلیٹ نمبر سی ۸۴" گارڈ نے کہا۔ "لفٹ موجود ہے۔"

وسیع و عریض لابی میں لفٹ موجود تھی۔ آٹھویں منزل پر اتر کر اس نے فلیٹ سی ۸۴ کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ نجمی کو اسے دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ آواز سن کر اس نے اندازہ قائم کیا تھا کہ فوزیہ قریشی کوئی تھکی ہوئی، مضمحل سی، ادھیڑ عمری کی حدوں کو چھوتی ہوئی عورت ہوگی۔ لیکن وہ اس کے اندازے سے کہیں کم عمر تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ دو ڈھائی ماہ کی پریشانی اس پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اس کے باوجود وہ خوب صورت اور ترو تازہ لگ رہی تھی۔ عمر اس کی تیس سے زیادہ ہرگز نہیں تھی لیکن چہرے پر آنکھوں کے نیچے کچھ تازہ لکیریں نظر آرہی تھیں۔

"آیئے نجمی صاحب، اندر آجایئے۔" اُس کی آواز بھی بے حد مترنم تھی۔

نجمی اندر چلا گیا۔ وہ ایک بہت کشادہ ڈرائنگ روم تھا جس کا فرنیچر اور آرائش دیدنی تھی۔ امارت سے زیادہ وہ سلیقے اور خوش ذوقی کی مظہر تھی۔ فوزیہ کے اشارے پر وہ ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ فوزیہ اس کے سامنے بیٹھ گئی "کیا پئیں گے آپ؟ دیکھئے تکلف نہ کیجئے گا۔"

"کافی پلوادیں۔"

"ثمینہ...." فوزیہ نے اندر کسی کو آواز دی "کافی لے آؤ" پھر وہ نجمی کی طرف متوجہ ہوئی "میں آپ کی آمد پر شکر گزار ہوں آپ کی۔"

نجمی کو حیرت ہوئی "شکر گزار تو مجھے ہونا چاہیے۔"

"چلیں، یہ شکر گزاری دو طرفہ سہی۔ حرج کیا ہے اس میں۔"

"کوئی حرج نہیں۔ بہرحال آپ کے خلوص کا شکریہ۔"

"خلوص" وہ تلخی سے ہنسی "آج کل جس کیفیت سے میں گزر رہی ہوں، اس میں اپنے اور اپنے بچوں کے سوا کسی سے خلوص نہیں برت سکتی میں۔ آپ اس صاف گوئی پر برا نہ مانیے گا۔ میں عام طور پر جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتی۔ اس وقت مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ بہت اچھے صحافی ہیں۔ انوسٹی گیشن آپ کی فیلڈ ہے۔ بااثر حلقوں تک آپ کی رسائی ہے۔ آپ میری مدد کرسکتے ہیں۔"

نجمی کو وہ عورت بے حد مختلف، بے حد بھلی لگی۔ وہ عام دولت مندوں کی طرح بے نیازی ظاہر کرکے کام نکلوانے کی قائل معلوم نہیں ہوتی تھی۔ پھر اسے اُس پر ترس آنے لگا۔ بے چاری کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا شوہر کس طوفان میں گھرا ہوا ہے اور کس انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کی صاف گوئی مجھے بہت اچھی لگی بیگم قریشی۔ میں ہر خدمت کے لیے

حاضر ہوں۔ لیکن فی الحال تو مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"
فوزیہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک خوب صورت لڑکی کافی کی ٹرے لے آئی۔ اس کی عمر ۲۴ سال سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔ وہ نہ صرف بلا کی حسین تھی بلکہ اس کے انداز میں بے حد وقار بھی تھا۔ اس نے کافی کی پیالی پہلے نجمی اور پھر فوزیہ کے سامنے رکھی اور بغیر ایک لفظ کہے اندر چلی گئی۔
کافی کا گھونٹ لینے کے بعد نجمی نے مستفسرانہ نظروں سے فوزیہ کو دیکھا۔
"یہ ثمینہ ہے۔ ہمارے بچوں کی گورنس۔" فوزیہ نے بتایا "بہت پیاری لڑکی ہے چار سال سے ہمارے ساتھ ہے۔ اب تو مجھے سہیلی سی، بہن سی لگتی ہے۔ بچے بہت مانوس ہیں اس سے۔ اس وقت یہ نہ ہوتی تو......" فوزیہ نے بات نامکمل چھوڑ دی اور ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔
وحید نجمی یونہی ایک کامیاب تفتیشی رپورٹر نہیں بن گیا تھا۔ اُس نے کم عمری میں ہی سیکھ لیا تھا کہ انسان کے منہ سے نکلا ہوا ہر جملہ، ہر لفظ اُس کے بارے میں بہت کچھ بتا دیتا ہے۔ پھر اس نے غور سے سننے اور نہایت تیزی سے نتائج اخذ کرنے کی مشق بھی کی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ فوزیہ اپنے گمشدہ شوہر سے بہت محبت کرتی ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ اس نے بچوں کا تذکرہ "ہمارے بچے" کہہ کر کیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ خواہ اس کا شوہر اس کا اہل نہ ہو لیکن یہ طے تھا کہ اسے اپنے شوہر پر اندھا اعتماد ہے ورنہ وہ اتنی خوب صورت اور اپنے سے کم عمر لڑکی کو گھر میں نہ رکھتی۔ ایک تفتیشی رپورٹر ہونے کی حیثیت سے یہ بھی نجمی کا مزاج تھا کہ وہ ہر چیز، ہر بات اور ہر شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ تا آنکہ وہ پوری طرح درست ثابت نہ ہو جائے۔
فوزیہ نے اسے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی "تو آپ عاصم کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟"
"جی ہاں۔ میں آپ سے بہت کچھ پوچھوں گا۔ بشرطیکہ آپ بُرا نہ مانیں۔"
"جو جی چاہے پوچھیں۔ میں بُرا نہیں مانوں گی۔ کسی سے مدد یونہی تو نہیں مل سکتی۔ اور میں تو غرض مند ہوں۔"
نجمی نے چونک کر اسے دیکھا لیکن نہ اس کے لہجے میں کوئی کاٹ تھی، نہ چہرے پر بدمزگی کا سایہ۔ وہ بس حقیقت پسند ثابت ہو رہی تھی "شکریہ بیگم قریشی" اس نے گہری سانس لے کر کہا "پہلے مجھے یہ بتائیں کہ یہ ثمینہ آپ کا انتخاب ہے یا قریشی صاحب کا؟"
ایک لمحے کو فوزیہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔ نجمی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن فوزیہ نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا "آپ یقیناً بہت اچھے انوسٹی گیٹر اور صحافی ہیں۔" آخر کار وہ بولی "یہ سوال نیچرل ہے۔ ایک گمشدہ شخص کی بیوی سے کیا جانے والا پہلا سوال۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں اور عاصم فیصلے مل کر کرتے تھے۔ ثمینہ میرا انتخاب تھی لیکن عاصم نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ ہم دونوں اس بات کے قائل تھے کہ بچوں کی گورنس میں خوش اطواری، خوش گفتاری اور خوب صورتی... سبھی کچھ ہونا چاہیے۔"
"ثمینہ یہیں رہتی ہے؟"
"ہاں۔ اس کے ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے۔ خالہ نے پالا پوسا۔ اسے ہمارے ہاں آئے پانچ چھ مہینے ہوئے تھے کہ اس کی خالہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب یہی اس کا گھر ہے۔"
"آپ کے خیال میں عاصم اس اعتماد کے اہل ہیں؟ میرا مطلب سمجھ رہی ہے نا آپ؟"
فوزیہ کی آنکھوں میں برہمی چمکی "خوب سمجھ رہی ہوں۔ آپ اہلیت کا پوچھتے ہیں۔ عاصم پر اعتماد کے سوا کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔"
"اچھا..... اب شروع سے بتائیں۔ وہ گھر سے یہ کہہ کر نکلے کہ امریکا جا رہے ہیں۔"
"جی ہاں اور انہوں نے کہا تھا کہ واپسی میں ایک ماہ لگ جائے گا۔ ایک ماہ گزر چکا تو مجھے پریشانی ہوئی۔ میں نے سفارت خانے سے رابطہ کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ عاصم کو ویزا جاری ہی نہیں کیا گیا۔ امریکا میں پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ کیا گیا۔ وہاں سے بھی نفی میں جواب ملا۔ پھر میں نے گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی۔ مگر اب تک....."
نجمی نے اس کی بات کاٹ دی "آپ کے خیال میں یہ کس نوعیت کا کیس ہے؟"
"میں.... میری تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے۔" فوزیہ بے بسی سے بولی "عاصم امریکا نہیں گئے۔ کم از کم اصلی نام سے تو نہیں گئے۔ انہوں نے اپنے تمام اثاثے فروخت کر دیے۔ ۹۰ کروڑ کی غیر معمولی رقم ہے ان کے پاس۔ میں بس یہ دعا ہی کرتی رہتی ہوں کہ اللہ انہیں اپنی امان میں رکھے۔"
"آپ سے کوئی ان بن تو نہیں.....؟"
"نہیں۔"
"آثار بتاتے ہیں کہ وہ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے تحت آپ کو اور بچوں کو چھوڑ گئے ہیں۔ کیوں؟"
"مجھے تو اس پر یقین نہیں آتا۔ اس کا کوئی جواز ہی موجود نہیں۔"
"کوئی عورت؟"
"آپ انہیں بالکل نہیں جانتے نجمی صاحب۔" فوزیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے کہہ دیتے۔ اور میں شرع کے مطابق ان کے حق میں کبھی مداخلت نہ کرتی۔ بلکہ میں ان کے ساتھ پورا تعاون کرتی۔"

"روانگی سے پہلے آپ نے کوئی غیر معمولی بات محسوس کی تھی ان میں؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ لگتا تھا تصور میں جب کچھ دہرا کر دیکھ رہی ہے "وہ کچھ چپ چپ تھے اس رات" آخر کار اس نے کہا "اور سوتے وقت دونوں بچوں کو لپٹائے رہے تھے۔ صبح انہیں دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ رات سو نہیں سکے ہیں۔ اب یہی یاد مجھے لرزا دیتی ہے۔ یعنی وہ جانتے تھے کہ وہ بچوں سے جدا ہو رہے ہیں۔ وہ سوچ سمجھ کر ہمیں چھوڑ کر گئے ہیں۔"

"یوں غائب ہونے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں۔" نجمی نے کہا "پھر آپ کا کیا خیال ہے کہ کیا ہوا ہوگا۔"

"سوچتی ہوں تو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔" فوزیہ بولی "لیکن یہ خیال مجھے ہمیشہ آتا ہے کہ ممکن ہے ان پر کسی گروہ کا دباؤ ہو۔ دولت ہتھیانے کے لئے..... اور خدانخواستہ....." وہ کہتے کہتے رک گئی "دیکھیں نا..... آج کل تو اس طرح کی کارروائیاں عام ہو گئی ہیں۔" اب اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"اور یہ امکان بھی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے' آزادانہ کسی اور انداز کی زندگی گزارنے گئے ہوں۔" نجمی نے خیال آرائی کی۔

فوزیہ کی بھویں تن گئیں "آپ جلدی میں تو نہیں ہیں نجمی صاحب؟"

"جی نہیں۔"

"تو آیئے میرے ساتھ۔"

وہ اسے ڈرائنگ روم کے اندر والے دروازے سے گزار کر ایک راہ داری میں لے گئی۔ اس بار وہ جس کمرے میں داخل ہوئے' اس نے نجمی کو حیران کر دیا۔ وہ ہر اعتبار سے مکمل ایک وڈیو روم تھا۔ کونے میں ٹرالی پر ٹی وی اور وی سی آر رکھا تھا۔ شوکیس میں ایک وڈیو کیمرا رکھا تھا۔ دیواروں پر شیلف تھے جن میں وڈیو کیسٹ سلیقے سے رکھے تھے۔ وہ پوری وڈیو لائبریری تھی۔ وہاں چار شیلف تھے تین بڑے اور ایک چھوٹا۔ دو میں اردو فلمیں تھیں ایک میں انگریزی..... اور چھوٹے شیلف میں چٹ لگی تھی..... پرسنل۔

"عاصم کو وڈیو کا خبط ہے۔" فوزیہ نے بتایا "وہ خود بھی شوٹ کرتے رہتے ہیں۔ بچوں کا ہر یادگار لمحہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔"

وہ پرسنل کیسٹ والے شیلف کی طرف بڑھ گئی۔ شیلف سے ایک کیسٹ نکال کر وہ ٹرالی کی طرف بڑھی۔ اس نے کئی سوئچ دبائے کمرا روشن ہو گیا۔

"ارے' آپ کھڑے کیوں ہیں۔" اس نے نجمی کو کھڑے دیکھ کر کہا "بیٹھئے نا" نجمی بیٹھ گیا۔

کیسٹ وی سی آر میں لگا کر وہ خود بھی ایک آرام کرسی میں آبیٹھی۔ ٹی وی آن تھا۔ اسکرین پر مکھیاں سی اڑتی نظر آرہی تھیں۔ کیسٹ ری وائنڈ ہو رہا تھا۔ چند ہی لمحے بعد وی سی آر پر پلے روشن ہوا اور اگلے ہی لمحے ٹی وی اسکرین پر دو خوب صورت اور من موہنے بچے نظر آئے۔

نجمی محو ہو کر دیکھتا رہا۔

انسانی نفسیات کو سمجھنا وحید نجمی کے لیے فطرت ثانیہ کی حیثیت رکھتا تھا اور جو کچھ اسکرین پر اسے نظر آرہا تھا وہ براہ راست دل کو چھو رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹے خوش حال گھرانے کی ننھی منی معصوم سی خوشیاں تھیں۔ معصوم اور بے ساختہ خوشیاں۔ یہ بات واضح تھی کہ عاصم اپنی بیوی اور بچوں کو والہانہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت ہی محبت ہوتی تھی۔ وہ آنکھیں چھلک رہی ہوتی تھیں۔

وہ کوشش کے باوجود اس محبت کو جھوٹ اور کھوٹ قرار نہ دے سکا۔ وہ ایک کروڑ پتی کی چھوٹی سی زمینی جنت تھی جس کا منظر منہ سے بول رہا تھا کہ اس جنت کو دولت کا کوئی چشمہ زندگی نہیں دے رہا ہے۔ وہ ایک مکمل جنت تھی۔ اور بچوں پر جان چھڑکنے والا اور بیوی سے والہانہ محبت کرنے والا وہ شخص ایڈز کا مریض تھا... ایڈز کا! یہ کیسی انہونی ہے۔

"یہ ہے آپ کے سوال کا جواب۔" فوزیہ نے اسے چونکا دیا "یہ ہے میرے شوہر کا طرز زندگی۔ اور میں پوری دیانت داری سے محسوس کرتی ہوں کہ وہ اس سے مطمئن تھے۔ اب یہ آپ سوچیں کہ ممکن ہے وہ کسی اور انداز کی زندگی گزارنے نکل کھڑے ہوئے ہوں۔"

نجمی اسے بغور دیکھتا رہا۔ اس کے لہجے میں اب بھی طنز نہیں تھا "اس کیسٹ نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔" وہ بولا۔

"اب اسے آف کر دوں؟"

"جی شکریہ۔"

وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں آبیٹھے "اور کافی پئیں گے؟" فوزیہ نے اس سے پوچھا۔

"سچ پوچھیں تو مجھے ضرورت محسوس ہو رہی ہے کافی کی۔"

فوزیہ اندر چلی گئی۔ نجمی بیٹھا سوچتا رہا۔ ایڈز کا مریض اور اس طرح کا بیک گراؤنڈ۔ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اسے ڈاکٹر نجیب کی بات بھی یاد تھی۔ عاصم قریشی نے اس سے بے حد یقین سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا اور بیک گراؤنڈ تائید کر رہا تھا کہ عاصم اپنے یقین میں سچا ہی ہوگا۔

فوزیہ پھر واپس آگئی تھی "کافی ابھی آرہی ہے۔" اس نے کہا "اور بھی کچھ پوچھنا ہے تو بے تکلفی سے پوچھیں۔"

"بس ایک اہم بات اور۔ مجھے اپنے شوہر کے کردار کے بارے میں بتایئے۔"

فوزیہ' ثمینہ کے ٹرے رکھ کر جانے تک خاموش رہی۔ پھر اس نے کافی کی پیالی نجمی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "وہ بہت اچھے شوہر' بہت اچھے باپ اور بہت اچھے انسان ہیں۔ خامیوں سے پاک

تو کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن عاصم میں خوبیاں بہت زیادہ ہیں۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں۔" نجمی نے دھیرے سے کہا "وہ کروڑ پتی ہیں۔ دولت مندوں کے کچھ شوق بھی ہوتے ہیں۔ اونچی سوسائٹی میں انہیں معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ میرا مطلب ہے عورتیں وغیرہ۔"

فوزیہ کا چہرہ تمتما اٹھا تھا تاہم اس نے حیرت انگیز طور پر خود پر قابو رکھا "مجھے عاصم پر فخر ہے۔" اس نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "وہ لفظ عصمت اور اس کی پاکیزگی کو عورتوں تک محدود نہیں رکھتے۔ کوئی کسی کے لیے ایسی قسم نہیں کھا سکتا۔ لیکن میں عاصم کے کردار کی قسم کھا سکتی ہوں۔"

نجمی پھر حیران رہ گیا۔ یہ کس قسم کا شخص تھا۔ اس دنیا کا آدمی تو نہیں لگتا تھا "اچھا' آپ مجھے ان کے کسی قریبی دوست کا نام بتائیں۔" اس نے کہا "کوئی ایسا شخص جس سے وہ بہت قریب ہوں۔"

"ان کے ایک ایسے دوست سے تو آپ اس وقت ہم کلام ہیں۔" فوزیہ نے بڑے اعتماد سے کہا "دوسرے دوست کا نام خاور ندیم ہے۔ تنظیم ایڈسٹرز والے۔"

"بہت بہت شکریہ بیگم قریشی۔ آپ نے مجھ سے مثالی تعاون کیا ہے۔" نجمی نے بے حد خلوص سے کہا "اب میں چلتا ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اس سلسلے میں کچھ بھی معلوم ہوگا تو میں پہلے آپ سے رابطہ کروں گا۔" وہ اٹھنے لگا۔

"ایک منٹ۔ آپ نے میری مدد کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب ایک بات میں بھی کہوں۔ برا نہ منائیے گا اور اسے گھٹیا پن نہ سمجھئے گا۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔ اس کام کے سلسلے میں آپ کو جتنی بھی ضرورت پڑے' آپ مجھ سے طلب کرلیں۔"

"میں یہ کام بلامعاوضہ کررہا ہوں۔" نجمی نے خشک لہجے میں کہا۔

فوزیہ نے ایک گہری سانس لی "حیرت ہے۔ آپ صحافی ہو کر انسانوں کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ میں نے معاوضے کی بات نہیں کی تھی۔ بہرحال اسے ذہن میں رکھیے گا۔"

"شکریہ' ہاں ایک بات اور۔ آپ کا کوئی ذاتی اکاؤنٹ ہے؟"

فوزیہ نے حیرت سے اسے دیکھا "جی ہاں۔"

"تو ذرا اسے چیک کیجئے گا۔ کوئی خاص بات ہو تو مجھے مطلع کیجئے گا۔ یہ رہا میرا کارڈ۔"



خاور ندیم سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ وہ امریکا گیا ہوا تھا۔ اُس کی واپسی دو ہفتے بعد متوقع تھی۔ نجمی نے اس دوران اُس کے بارے میں اچھی خاصی معلومات جمع کرلیں۔ اس کے علاوہ اس نے عاصم کی سیکریٹری رعنا سے بھی ملاقات کی تھی لیکن کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ عاصم صرف ایک بار اپنے دفتر آیا تھا۔ اس روز' جس روز بظاہر وہ امریکا روانہ ہوچکا تھا۔ رعنا کی ملازمت برقرار تھی۔ عاصم نے نئی انتظامیہ سے سفارش کی تھی کہ وہ کام کی کارکن ہے اور دفتری معاملات کو خوب سمجھتی ہے۔

نجمی نے انٹرکان کو بھی چیک کیا تھا۔ ہوٹل سے معلوم ہوا کہ قیام کے دوران عاصم اپنے کمرے تک ہی محدود رہا تھا۔ کھانا اور ناشتا وہ روم سروس کے ذریعے منگواتا رہا تھا۔ ایک ہفتے کے قیام کے دوران وہ صرف دو بار کہیں باہر گیا تھا۔ دوسری بار چیک آؤٹ ہونے سے صرف ایک دن پہلے۔ اور اس موقعے پر وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو بھاری سوٹ کیس بھی تھے۔ اگلے روز وہ رخصت ہوگیا تھا۔ وہ پیلی ٹیکسی میں گیا تھا۔ نجمی نے ہوٹل کے باہر ریگولر کھڑی ہونے والی پیلی ٹیکسیوں کے ڈرائیوروں سے پوچھ گچھ کی لیکن بات بنی نہیں۔ تاہم اس نے چند ڈرائیوروں سے استدعا کی کہ وہ اس سلسلے میں دوسرے ڈرائیوروں کو ٹٹولتے رہیں۔ کام کی معلومات حاصل ہونے پر انہیں معقول انعام ملے گا۔

یہ وہ مقام تھا' جہاں سے عاصم قریشی کے نقوش پا ہوا میں تحلیل ہوگئے تھے۔

اب نجمی نے اُس کے متعلق چھان بین شروع کی۔ صنعتی اور تجارتی حلقوں کے لوگوں سے ملا۔ اس کلب کے ممبروں سے بات چیت کی' جس کا عاصم قریشی ممبر تھا۔ وہاں سے فوزیہ کی باتوں کی تصدیق و تائید کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا۔ تمام جاننے والوں کے نزدیک عاصم قریشی ایک فرشتہ تھا۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ایسی دولت کا کیا فائدہ جس سے آدمی لطف اٹھانے کی کوشش بھی نہ کرے۔ عاصم اپنی سوسائٹی کی نجی قسم کی محفلوں میں کبھی شریک نہیں ہوتا تھا بلکہ اب تو لوگوں نے اسے مدعو کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اسے پینے پلانے کا شوق بھی نہیں تھا۔ اپنے طبقے کے لوگوں میں وہ نرا بور مشہور تھا۔ عورتیں اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتی تھیں۔ ظاہر ہے وہ ان کی توقعات پر پورا جو نہیں اترتا تھا۔

کلب کے ممبروں کے کہنے کے مطابق ٹینس وہ صرف ایکسرسائز اور فٹنس کی نیت سے کھیلتا تھا۔ اُس کا گیم واجبی سا تھا۔ شطرنج کا البتہ وہ بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ کسی زمانے میں وہ ہر سال کلب کا چیس ٹورنامنٹ جیتتا تھا۔ شادی کے بعد اس کا کلب آنا اور شطرنج میں دلچسپی کم ہوگئی تھی۔ البتہ جمعرات کے دن وہ اب بھی کلب ضرور آتا تھا۔

اور اب نجمی ان معلومات کو مربوط کرکے ایک خاکہ بنانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ عاصم قریشی کی شخصیت ہر قدم پر اسے حیران کررہی تھی۔ وہ بے داغ کردار کا مالک ثابت ہورہا تھا۔ اس کے مخالفین بھی اسے زاہد خشک اور پارسا کے مترادفات استعمال کرکے گالی دیتے تھے۔ وہ ریزرو رہنے والا آدمی تھا۔ اُس کا خاص دوست صرف ایک ہی تھا۔۔۔ نہیں' ایک نہیں دو تھے۔ ایک فوزیہ

ں اور دوسرا خاور ندیم۔ وہ زیادہ دوست بنانے کا قائل نہیں
اُس کی طبیعت میں دردمندی تھی۔ غریبوں اور ضرورت
ں کی مدد وہ فرض سمجھتا تھا۔ اُس کے در سے کوئی سوالی خالی
نہیں جاتا تھا۔ اس شہر میں جہاں کسی کا عیب چھپائے نہیں
اُس کی عیاشی اور آوارگی کی ایک افواہ بھی نہیں ملی تھی۔
کے ایک مریض کے لیے یہ ایک بہت پھیکا' بے رنگ اور
ں کن پس منظر تھا۔

اچانک نجمی کے ذہن میں ایک لفظ گونجا' سیکریٹری! یہ ایک
امر تھا کہ کسی شخص کے بارے میں اس کی سیکریٹری سب سے
ہ معلومات فراہم کرسکتی ہے۔ وہ رعنا سے ملا ضرور تھا مگر اس
عاصم کی ذات کے بارے میں نہیں' صرف اس کی گمشدگی کے
ے میں بات کی تھی۔

نجمی نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بجے تھے۔ اس
رعنا کے دفتر فون ملایا "اتحاد انڈسٹریز" دوسری طرف سے آواز
ئی۔

"آپ رعنا ہی بول رہی ہیں نا؟"

"جی ہاں اور آپ شاید وحید نجمی ہیں' روزنامہ سویرا کے
رٹر۔"

نجمی کو حیرت ہوئی۔ صرف ایک ملاقات کے بعد اس طرح
ز پہچان لینا! "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کس حیثیت سے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

نجمی کو شاک لگا۔ وہ گڑبڑا گیا "میں آپ کا مطلب نہیں
ا۔"

"اتحاد انڈسٹریز کی ملازم تو اب میں رہی نہیں۔ میں نے
مت چھوڑ دی ہے۔ اب گھر جانے کے لیے اٹھنے ہی والی
۔"

یہ اطلاع بھی شاک تھی۔ تاہم نجمی نے خود کو سنبھالتے ہوئے
"میں جس حیثیت کی وجہ سے آپ سے ملنا چاہ رہا ہوں' وہ بھی
نہیں ہوگی۔ وہ حیثیت یہ ہے کہ آپ کبھی عاصم قریشی صاحب
سیکریٹری رہی ہیں۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر رعنا کی آواز ابھری
یک کہتے ہیں آپ۔ اس حیثیت کو میں کبھی بھولوں گی بھی نہیں۔
ں نے مجھے اعتماد دیا' سربلندی سے جینا سکھایا۔ نہ میں اپنی اس
یت کو بھولوں گی نہ عاصم صاحب کو۔"

لڑکی جذباتی ہو رہی تھی "تو پھر میں آپ کے دفتر آجاؤں؟"

"نہیں' یہاں تو میں ایک منٹ بھی نہیں رکنا چاہتی۔"

"تو پھر اپنا پتا بتادیجیے' میں آپ کے گھر آجاتا ہوں۔"

"یہ بھی مناسب نہیں۔" وہ ہچکچائی۔

"بس پھر ایسا کرتے ہیں کہ میں آپ کو دفتر سے لے لیتا ہوں۔
ہیں چل کر چائے پئیں گے اور آن اے کپ آف ٹی....."

وہ اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ تاہم چند لمحے کے بعد اس نے کہا "ٹھیک ہے لیکن آپ کو پہنچنے میں جتنی دیر لگے گی اور میں یہاں رکنا نہیں چاہتی۔"

"میں صرف پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے' میں باہر ملوں گی آپ کو۔" رابطہ منقطع ہوگیا۔

ریسیور رکھ کر نجمی جھپٹ کر اٹھا۔ ایسی ہنگامی صورت میں گھر سے نکلنا اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔



ریسٹورنٹ تقریباً خالی تھا۔ نجمی نے کونے کی ایک میز منتخب کی تھی۔ رعنا چائے بنارہی تھی اور نجمی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ خود کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ بڑے صحافی بنے پھرتے ہو۔ ایک ایسی سیکریٹری کو نظرانداز کیسے کردیا تم نے؟ رعنا صرف خوب صورت اور شاداب لڑکی نہیں تھی۔ اس میں ایک طرح کی اپیل بھی بے پناہ تھی۔ وہی سب سے موثر اور فیصلہ کن شہادت دے سکتی تھی۔ اس کا حُسن بلاشبہ زہد شکن تھا۔ نجمی کو حیرت تھی کہ اُس نے پچھلی بار ہی یہ پوچھ گچھ کیوں نہیں کی۔

رعنا نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھائی "اب پوچھیں' کیا پوچھنا ہے آپ کو۔" وہ بولی۔

"وہ تو میں بعد میں پوچھوں گا۔ پہلے یہ بتائیے کہ ملازمت کیوں چھوڑ دی آپ نے؟"

رعنا نظریں چرانے لگی۔ پھر اُس نے چائے کی پیالی پر جھکتے ہوئے کہا "اس لیے کہ اب وہاں عزت سے کام کرنا ممکن نہیں رہا۔"

"کیا مطلب؟"

"اس سے زیادہ وضاحت میں نہیں کرسکتی۔"

نجمی نے پھر دل میں خود کو کوسا۔ واقعی وہ ڈفر ثابت ہو رہا تھا۔ اس بیان میں وضاحت کی ضرورت ہی کہاں تھی "مگر آپ تو....." اس نے کہا اور کہتے کہتے رک گیا "کتنے عرصے سے یہ جاب کررہی تھیں آپ؟"

"تقریباً آٹھ سال ہوگئے۔"

"اور عاصم صاحب....."

"اللہ انہیں اپنی امان میں رکھے۔ عاصم صاحب بہت عظیم انسان ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ جب میں پہلی بار جاب کے لیے گھر سے نکلی تو کتنی مجبور تھی۔ ایک حادثے میں میرے والد کی دونوں ٹانگیں کٹ گئی تھیں۔ ہمارے گھر میں فاقے ہو رہے تھے۔ میرے چھ چھوٹے بہن بھائی تھے اور کمانے والا کوئی نہیں تھا۔ میں بی اے کی طالبہ تھی۔ تلاش رزق میں گھر سے نکلی تو مجبوری نے میرے ذہن کو شل کردیا تھا۔ اس وقت میں آج کی طرح سر اٹھا کر اپنی عزت نفس کے لیے لڑنے کے قابل نہیں تھی۔ بھائی بہنوں اور ماں باپ کی بھوک نے مجھے کمزور کردیا تھا اور میرے ساتھ احساس

کمتری بھی تھا۔ میں صرف انٹر پاس تھی۔ مجھے ٹائپنگ تک نہیں آتی تھی۔ عملی زندگی کیسی ہوتی ہے' اس کا تصور تک نہیں تھا میرے پاس۔ اللہ نے کرم کیا کہ مجھے عاصم صاحب تک پہنچادیا۔ انہوں نے میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے اہلیت نہ ہونے کے باوجود مجھے ملازمت دی۔ مجھے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کے لیے مہلت اور حوصلہ دیا۔ پرائیویٹ تعلیم کے لیے حوصلہ افزائی کی۔ دفتری امور سکھائے۔ باہر کی دنیا سے مجھے متعارف کرایا۔ مجھے عزت دی اور عزت سے جینا سکھایا۔ انہوں نے اس بات کی پروا نہیں کی کہ اہل اور تجربہ کار امیدواروں کو نظرانداز کر کے وہ ایک کم عمر' خوب صورت لیکن ملازمت کے لیے نااہل لڑکی کو جاب دے رہے ہیں تو اُن کا اسٹاف ان کے بارے میں کتنی غلط رائے قائم کرے گا۔" وہ کہتے کہتے رُکی اور اس نے سر اٹھا کر مجوب نظروں سے نجمی کو دیکھا "آپ کو عجیب لگے گا نجمی صاحب لیکن میں جانتی ہوں کہ میں غیر معمولی طور پر حسین ہوں۔ جس وقت عاصم صاحب نے مجھے ملازمت دی تو میں نے ایک فطری بدگمانی کی۔ میں نے سوچا' یہ بارٹر سسٹم کی عنایت ہے۔ عنایت کے بدلے عنایت۔ اور میں ضرورت مند تھی اور اس کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی۔ لیکن عاصم صاحب نے مجھ پر جو احسان کیا' وہ جاریہ احسان ہے۔ وہ اب بھی جاری ہے۔ میں ڈرتی رہی کہ کسی بھی وقت مجھ سے عنایت کے صلے کا تقاضا کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ایک سپردگی بھی طاری رہی تھی مجھ پر۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور ایک سال ہوگیا تو میرا ڈر آہستہ آہستہ نکلنے لگا۔ صرف سپردگی رہ گئی اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔" وہ چند لمحے خاموش رہی پھر ایک گہری سانس لے کر بولی "اب تک جو کچھ میں نے کہا' آپ چاہیں تو اسے شائع کرسکتے ہیں۔ مگر اب جو کچھ میں کہوں گی' وہ آف دی ریکارڈ ہے۔ بولیں کیا کہتے ہیں آپ؟"

سحرزدہ نجمی نے بے جان سے انداز میں سر کو تفہیمی جنبش دی "آپ مجھ پر اعتماد کرسکتی ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

رعنا نے ایک گہری سانس لی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی "لفظ تو دور کی بات ہے' عاصم صاحب کی آنکھ کے ایک اشارے پر میں اپنا وجود ان پر قربان کرسکتی تھی اور قربان کرسکتی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کون سا جذبہ ہے یا کسی جذبے کا کون سا درجہ ہے مگر یہ ہے بڑا سچا جذبہ۔"

بیرا بل لے آیا تھا۔ نجمی نے پلیٹ میں دو نوٹ رکھ دیے "باقی تم رکھ لینا۔" اس نے بیرے سے کہا۔ بیرا چلا گیا تو وہ رعنا کی طرف متوجہ ہوا "اور اب یہ اچھی بھلی ملازمت آپ نے چھوڑ دی ہے۔ کیوں؟"

"میرے نئے باس کا خیال ہے کہ سیکریٹری کی حیثیت سے جو فرائض میں ادا کرتی ہوں' اس کے علاوہ بھی میرے کچھ فرائض ہیں۔ اپنے اندر کی کمزوری کے عرصے میں' میں یہ بات تسلیم کرسکتی تھی مگر اب جبکہ میرے پاس ہر طرح کی اہلیت ہے' خود اعتمادی ہے اور میں سر اٹھا کر جینا سیکھ چکی ہوں تو یہ کیسے تسلیم کرسکتی ہوں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔" نجمی کے لہجے میں احترام تھا۔

"خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔"

نجمی چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ سمجھنا چاہتا تھا اُس سے زیادہ سمجھ چکا ہوں۔"

رعنا نے اپنی رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی "تو پھر چلیں؟"

"آیئے۔"

دونوں ریسٹورنٹ سے نکل آئے "چلیے میں آپ کو رکشا میں بٹھادوں۔" نجمی نے کہا۔

"نہیں آپ اطمینان سے چلے جائیں۔ میں بس سے جاؤں گی۔"

نجمی چند لمحے ہچکچاتا رہا پھر اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر رعنا کی طرف بڑھایا "یہ کارڈ رکھ لیجیے۔ دو تین دن میں مجھے فون کرلیجیے گا۔ ممکن ہے اس وقت تک میں آپ کے لیے کسی جاب کا بندوبست کرچکا ہوں۔"

رعنا نے ممنونیت سے اسے دیکھا "شکریہ نجمی صاحب۔ اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"



وحید نجمی کی نفسیات دانی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ رعنا سے دوسری ملاقات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ عاصم قریشی اس دنیا کا آدمی نہیں لگتا تھا۔ تاہم دنیا ابھی اچھے انسانوں سے خالی نہیں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے عاصم قریشی کا وجود کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ ایڈز کا مریض تھا۔

سوال یہ تھا کہ وہ ایڈز میں مبتلا کیسے ہوا؟

ایڈز کے بارے میں اول تو بات کی ہی نہیں جاتی تھی مگر کچھ عرصے سے 'نیشنل ایڈز پروگرام' اچانک ہی فعال ہوگیا تھا۔ اب ٹی وی پر کمرشل بھی آرہے تھے اور اخبار میں اشتہارات بھی۔ لوگوں کو بتایا جارہا تھا کہ ایڈز کیسے پھیلتا ہے۔ احتیاطی تدابیر پر زور دیا جارہا تھا۔ یہ تاثر دیا جارہا تھا کہ بلاواسطہ اور بالواسطہ ایڈز میں مبتلا ہونے کے امکانات برابر ہیں۔ شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ ایڈز کے شکار سے نفرت نہ کریں۔ اسے اچھوت نہ بناڈالیں۔ اور شاید اس لیے بھی کہ مریض بھی اس خود فریبی میں مبتلا رہے کہ اُس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس کے گناہوں کا شاخسانہ نہیں بلکہ بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ نجمی کے خیال میں جنسی بے راہ روی کا شکار لوگوں اور سرنج کے ذریعے منشیات استعمال کرنے والوں کے علاوہ کسی کے لیے ایڈز کا شکار ہونے کا

ان ہزار میں ایک تھا۔ لیکن لوگ جنہیں ایڈز کے بارے میں
مات حاصل نہیں تھیں' وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔

ویسے احتیاط بہت ضروری تھی۔ ایڈز کے حوالے سے ہی
، عام انسانی صحت کے لیے بھی۔ حجاموں کی دکانوں پر ایک
زے کا استعمال ویسے بھی اچھا نہیں تھا۔ لوگوں کو ایک دوسرے
، جلدی بیماریاں لگ سکتی تھیں اور کئی مریضوں پر ایک ہی سرنج
ستعمال تو بے حد مخدوش تھا۔

نجمی کے خیال میں نیشنل ایڈز پروگرام کے اشتہاروں میں دیا
نے والا تاثر ہر زاویے سے منفی پہلو رکھتا تھا۔ ایک طرف تو یہ
ز ایڈز کے مریض کو خود ترسی میں مبتلا کرتا تھا۔ اسے احساس
تا تھا کہ اُس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یوں اس کے اندر انتقام
جذبہ دیوانگی کی حد تک ابھر سکتا تھا۔ اور وہ بے حد خطرناک
بت ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف اس انداز کی مسلسل پبلسٹی نے
ل زندگی گزارنے والے عام لوگوں کو خوف زدہ کرنا شروع کردیا
۔ سیدھے راستے پر چلنے والے لوگ ایڈز کے اندیشے کے بوجھ
لے دبتے جارہے تھے۔ یہ زیادتی تھی۔ نارمل لوگوں کو ابنارملٹی کی
رف دھکیلا جارہا تھا۔ نجمی کتنے ہی ایسے لوگوں سے واقف تھا جو
م کے پاس جانے سے گھبرانے لگے تھے۔ شیو تو خیر گھر پر کیا جاسکتا
ہے لیکن بال ترشوانے کی تو مجبوری ہے۔ دوسری طرف ایسے
ریض بھی تھے جنہیں ڈاکٹر خون ٹیسٹ کرانے کا مشورہ دیتا تو یا وہ
اف انکار کردیتے یا پرچا لے کر کسی لیبارٹری کا رخ کرنے کی
جائے گھر آتے اور دوبارہ اس ڈاکٹر کے پاس نہ جاتے۔ جن
ریضوں کو خون کی ضرورت ہوتی وہ خود بھی اور اُن کے لواحقین
ی خون لینے سے ڈرتے۔ یعنی ایڈز کے خوف کے مارے دوسرے
ریقوں سے اپنی صحت کو اتنا ہی نقصان پہنچا رہے تھے۔ تیسری
رف وہ لوگ جنہیں صحیح معنوں میں ایڈز کا خطرہ لاحق تھا' احتیاطی
ابیر پر عمل کرکے مطمئن تھے۔ انہوں نے اپنی روش نہیں بدلی
ی۔

یعنی محدود اور نامکمل آگہی سب کے لیے مہلک ثابت ہو رہی
ی۔ سبھی کے لیے عذاب بن گئی تھی!

نجمی کا خیال تھا کہ ایڈز کے ہزار مریضوں میں صرف ایک ایسا
و سکتا ہے' جو بے قصور ایڈز کا شکار ہوا ہو اور لگتا تھا کہ اسے
عاصم قریشی کو ہزار میں سے ایک تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ ایک
یر معمولی بات تھی۔ مگر اب بھی وہ اس سوچ سے دست بردار
ہونے کو تیار نہیں تھا کہ عاصم کو بھی یہ مرض کسی سے لگا ہوگا۔ وجہ
یہ تھی کہ جتنے مضبوط اس بات کے شواہد تھے کہ عاصم کردار کے
اعتبار سے ایک بڑا آدمی ہے' اتنی ہی جان دار اس بات کی دلیلیں
تھیں کہ وہ بالواسطہ ایڈز کا کیس ہے۔

عاصم قریشی کروڑپتی آدمی تھا۔ ایسا شخص جسے معاشرے میں
وی آئی پی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ وہ باقاعدگی سے خون ٹیسٹ کراتا تھا
لیکن پاک لیب میں جو ملک بھر میں مانی ہوئی اور قابلِ اعتبار لیب
تھی۔ وہاں ہر شخص کے لیے پیکنگ کھول کر نئی سرنج استعمال کی
جاتی تھی اور استعمال کے بعد ضائع کردی جاتی تھی۔ اس میں شک و
شبے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ یقیناً کسی بہت اچھی باربر شاپ میں
جاتا ہوگا۔ وہاں پرانے زمانے والے استرے کے استعمال کا کوئی
سوال نہیں تھا۔ اب تو عام نائی بھی وہ استرے استعمال کرتے تھے
جن میں پھل نہیں ہوتا بلکہ سیفٹی بلیڈ کو نصف کرکے استعمال کیا
جاتا ہے۔

تو پھر عاصم قریشی ایڈز کا شکار کیسے ہوا؟ اگر وہ اتنا ہی صاحب
کردار اور پارسا ہے جتنا کہ ہر شخص کہتا ہے تو ایک ہی صورت رہ
جاتی ہے۔ اس کی بیوی فوزیہ! یہ خیال آتے ہی نجمی چونک کر اٹھ
بیٹھا۔ اس کے تصور میں باوقار فوزیہ کا سراپا لہرایا۔ کیا یہ ممکن ہے؟
اس نے خود سے سوال کیا۔ دل نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن صحافی کے
تربیت یافتہ دماغ نے دل کو ڈپٹ دیا۔ "تم چپ رہو جذباتیت کے
مارے۔ خوامخواہ ٹانگ نہ اڑایا کرو ہر معاملے میں۔ بس خون پمپ
کرتے رہو" وہ دل جسے کبھی لفٹ نہیں ملی تھی' گھبرا کر جلدی جلدی
خون پمپ کرنے لگا اور دماغ نے نجمی کے کان میں سرگوشی کی۔
کیوں نہیں۔ انسان سے کسی بھی خطا کی امید رکھی جاسکتی ہے۔
شیطان نے سب سے پہلے کسے بہکایا تھا اماں حوا کو!

دل نہیں مانتا تھا کہ وہ ایسی ہو سکتی ہے لیکن نجمی صحافی تھا۔
بہت اچھا تفتیشی صحافی۔ وہ ہر شخص پر اس وقت تک شک کرنے کا
قائل تھا جب تک اس کی برأت ثابت نہ ہو جائے۔

تو اب اسے فوزیہ کو ٹٹولنا تھا مگر کیسے؟ وہ اس بارے میں غور کر
ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "نجمی
اسپیکنگ۔"

دوسری طرف خاموشی رہی۔

"ہیلو' کون ہے بھئی؟" اس بار اس کی آواز نسبتاً بلند تھی۔

پھر بھی چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ایک نسوانی آواز ابھری
"نجمی صاحب' میں فوزیہ بول رہی ہوں۔ فوزیہ قریشی۔"

نجمی کو شاک لگا۔ کچھ یوں کہ اس وقت وہ اسی کے بارے میں
سوچ رہا تھا اور کچھ اچھا نہیں سوچ رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ خاصے
توقف کے بعد اُس سے مخاطب ہوئی تھی اور اُس کی آواز بھی بھرائی
ہوئی تھی جیسے دیر تک روتی رہی ہو۔

"ہیلو' یہ وحید نجمی صاحب کا ہی نمبر ہے نا؟" اس بار فوزیہ کا
لہجہ ہذیانی تھا۔

"جی ہاں مسز قریشی' میں نجمی بول رہا ہوں۔ فرمائیے۔"

"آپ مصروف تو نہیں ہیں؟"

"جی نہیں۔ آپ کام بتائیے۔"

"میرے گھر آسکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں" نجمی نے گھڑی میں وقت دیکھا "میں دس منٹ

میں پہنچ جاؤں گا۔"
"شکریہ' خدا حافظ۔" ریسیور رکھ دیا گیا۔
مجی کے بدن میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں۔ ضرور کوئی اہم بات ہے۔ فوزیہ قریشی بہت اپ سیٹ لگ رہی تھی۔ کہیں..... کہیں.....

○☆○

یہ اُس کی سالگرہ کا دن تھا۔ یہ دن اس کی زندگی کا خاص دن تھا جب تک امّی زندہ تھیں' اس روز خاص اہتمام کرتی تھیں۔ اس کی پسند کے کھانے پکواتیں۔ اسے تحفے ملتے۔ پھر امّی کے بعد ابّو نے بھی اس دن کا ہمیشہ خاص خیال رکھا۔ اس روز صبح سویرے ناشتے کی میز پر وہ اسے ہیپی برتھ ڈے کہتے اور ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے۔ وہ بے تابی سے پیکٹ کھولتا۔ پیکٹ میں سے ہمیشہ کوئی ایسی چیز ملتی' جس کی اس نے کبھی خواہش کی ہوتی۔ پھر ابو کہتے..... شام کو بازار چلیں گے۔ وہاں سے تم اپنی پسند کی کوئی چیز لے سکو گے۔ یہ ایک ریت بن گئی تھی۔ شام کو وہ ابو کے ساتھ بازار جاتا۔ رات کو گھر میں محدود سی پارٹی ہوتی جس میں ابو کے چند دوست اپنی فیملی کے ساتھ شریک ہوتے۔ شادی کے بعد فوزیہ نے بھی ہمیشہ اُس دن کا خاص خیال رکھا۔ تب مہمان زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ صرف خاور اپنی بیوی کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ اور اب پچھلے دو سال سے تو بچے بھی اسے تحفے دے رہے تھے۔

یہ اس کی پہلی سالگرہ تھی کہ وہ سو کر اٹھا تو کسی نے اسے وش نہیں کیا۔ پچھلی سالگرہ کا دن اسے خوب یاد تھا۔ چومے جانے کے احساس سے اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ فوزیہ کے ہونٹ اس کی پیشانی پر تھے۔ ایک رخسار پر سلیم کے اور دوسرے رخسار پر ملیحہ کے ہونٹ ثبت تھے اور جیسے ہی اُس کی آنکھیں کھلیں' کورس شروع ہو گیا ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ڈیڈی اور فوزیہ کی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو عاصم بالکل الگ تھی۔

وہ چونکا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ اس نے بڑی بے رحمی سے اپنی آنکھیں ہتھیلیوں سے مسل ڈالیں۔ "میرے خدا میری ہر خطا معاف کر دے۔ میرے آقا مجھے بخش دے۔ آج کے دن کی تنہائی تو میرے لیے بہت بڑی سزا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

اسے بابر کا خیال آیا۔ یہ بھی ضروری تھا۔ بابر اسے ہمیشہ یاد رہتا تھا۔ لیکن سالگرہ کے دن وہ اسے خاص طور پر یاد آتا تھا۔ اس سے رشتہ ہی کچھ ایسا تھا۔ وہ اُس کی ۱۸ ویں سالگرہ کا تحفہ تھا۔
اسے بچپن سے ہی بھائی کی بڑی آرزو تھی۔ کہیں دو بھائیوں کو لڑتے کھیلتے دیکھتا تو اداس ہو کر گھر آتا اور امی کی گود میں سر رکھ کر کہتا "امی..... میرا کوئی بھائی کیوں نہیں ہے؟"
امی سرد آہ بھر کر کہتیں "خدا کی مرضی میں کس کا دخل ہے بیٹے۔"
"تو اللہ میاں کیا مجھے ایک بھائی نہیں دے سکتے؟" وہ معصومیت سے کہتا۔
"ایسی باتیں نہ کرو بیٹے۔ اللہ میاں سب کچھ کر سکتے ہیں۔ دعا کیا کرو۔"

وہ بڑا ہوتا گیا۔ بھائی سے محروم ہی رہا لیکن اس نے کبھی اس محرومی سے سمجھوتا نہیں کیا۔ اُس کی آرزو بھی اُس کی عمر کے ساتھ بڑھتی رہی۔ البتہ اس نے اب امی یا کسی اور کے سامنے اس خواہش کا تذکرہ کرنا چھوڑ دیا۔ امی اور ابو یہی سمجھے کہ اُس نے اس محرومی کو قبول کر لیا ہے۔

اسے امّی کی موت خوب یاد تھی۔ وہ اس وقت بارہ سال کا تھا۔ وہ ان دنوں بہت خوش تھا۔ ناسمجھی اور سمجھ داری کے درمیان معلق لڑکا اتنا جانتا تھا کہ اس کی دعا قبول ہونے والی ہے۔ اس کے گھر ایک چھوٹا بھائی آنے والا ہے۔ وہ ہر روز آنے والے اس بھائی کے لیے نت نئے منصوبے بناتا۔ اسے امی سے شرم آنے لگی تھی لیکن وہ امی سے بہت خوش بھی تھا۔
لیکن پھر اس کی خوشیاں چھن گئیں۔ سب خواب بکھر گئے۔ امی اس کے لیے بھائی کو جنم دینے کے دوران ہی اللہ میاں کے پاس چلی گئیں اور پھر ننھا بھائی بھی چند گھنٹے بعد امی کے پاس چلا گیا۔
وہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ لیکن اس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا۔ شاید اس لیے کہ وہ سمجھدار تھا۔ اور اس سانحے نے اسے اور سمجھدار بنا دیا تھا۔ اس نے غم بہت کیا لیکن ظاہر بہت کم کیا۔ البتہ ماں اور اس بھائی کی موت جس کے لیے اس نے پل پل دعائیں کی تھیں' کی حقیقت کو قبول کرنے والے بارہ سالہ لڑکے نے بھائی کی آرزو سے دست بردار ہونا قبول نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی انسان کے پاس اللہ کی امانت ہوتی ہے۔ وہ جب چاہے واپس لے لے۔ موت پر صرف اللہ کا اختیار ہے۔ اس میں شکایت کی کوئی بات نہیں۔ لیکن اتنی کم عمری میں بھی اُس کا ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ دعائیں ضرور قبول فرماتے ہیں۔ اس کی طبیعت میں شکر اتنا تھا کہ وہ سوچتا... اللہ نے میری بھائی والی دعا بھی قبول فرمائی۔ مجھے بھائی دیا۔ چند گھنٹے کے لیے سہی مگر میری دعا بھی تو نامکمل تھی۔ میں نے بھائی تو مانگا تھا' اس کے لیے بڑی عمر تو نہیں مانگی تھی۔ سو وہ بھائی کی آرزو دل میں لیے لڑکپن سے گزر کر جوانی کی سرحد میں داخل ہو گیا۔

وہ اس کی ۱۸ ویں سالگرہ تھی۔ صبح ابو نے معمول کے مطابق اسے وش کیا اور ایک چھوٹا سا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا "یہ تمہارا تحفہ ہے بیٹے اور ہاں... آج شیڈول کچھ مختلف ہو گا۔ شام پانچ بجے دارالاطفال میں ایک تقریب ہے۔ مجھے اس میں شرکت کرنی ہے اس کے بعد بازار چلیں گے۔ پارٹی نو بجے ہو گی۔"
عاصم جانتا تھا کہ ابو ایسے کئی اداروں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ کتنے ہی یتیم لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کے اخراجات بھی انہوں نے

ذتے لے رکھے تھے "ابو' میں بھی تقریب میں چلوں گا آپ
ساتھ۔" اس نے بے دھیانی سے کہا۔ اس کی انگلیاں پیکٹ
کاغذ سے الجھی ہوئی تھیں۔ اس نے اوپر کا کاغذ کھولا اندر
ن پیپر تھا۔ اس نے بے تابی سے براؤن پیپر کو پھاڑ ڈالا۔ وہ
ن رہ گیا' چھوٹا سا بے حد خوب صورت ایک مخملیں جیول باکس
کے ہاتھ میں تھا۔ اسے مایوسی ہوئی۔ انگوٹھی' کف لنکس' ٹائی
کیا ہو سکتا ہے۔

ابو اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ مسکرائے "کھول کر دیکھو"

اس نے دھڑکتے دل سے باکس کھولا۔ ایک لمحے کو اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ خوب صورت مخملیں سیج پر ایک چابی رکھی۔ چابی کے سر پر حروف چمک رہے تھے۔ TOYOTA

"باہر کھڑی ہے' چل کر دیکھ لو۔" ابو نے کہا۔

اُس نے سر اٹھا کر ابو کو دیکھا لیکن ان کی محبت سے چھلکتی ہوں میں دیکھا نہیں گیا۔ اُس نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستہ کہا "لیکن ابو میں اس کا اہل بھی....."

"تم آج ۱۸ سال کے ہو گئے ہو عاصم۔ اب تم بالغ ہو' اب میں سے امید کرتا ہوں کہ تم بڑے فیصلے بھی پورے اعتماد سے کرو۔"

"شکریہ ابو۔ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا اور میں ہمیشہ آپ کے اعتماد را اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"ہاں' تم کہہ رہے تھے کہ میرے ساتھ تقریب میں شرکت کرو؟"

"جی ابو۔"

"تو چار بجے دفتر پہنچ جانا تیار ہو کر۔ وہیں سے چلے چلیں گے۔ ب کے بعد بازار چلیں گے۔ جہاں سے تم اپنی مرضی کی کوئی بھی خرید سکو گے۔"

"ابو' کار کے بعد کم از کم آج مجھے کسی چیز کی ضرورت ۔"

"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ موقع ملے تو اس سے ضرور رہ اٹھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرنا کبھی نہ بھولو۔ او کے؟"

"او کے ابو۔"

"ہاں' دفتر اپنی کار میں آنا۔ اچھا چلو کار تو دیکھ لو اپنی۔"

دونوں باہر آئے جہاں نئی چم چماتی سلور گرے ٹویوٹا کرولا ڑی تھی۔

ابو دفتر چلے گئے۔ وہ ناشتا کر کے اپنی گاڑی میں نکل کھڑا ہوا۔ اتنا خوش تھا کہ اسے کھانے کا بھی ہوش نہیں رہا۔ بھوک ہی ں لگی۔ اسے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں کہاں گاڑی دوڑاتا رہا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ سوا چار بجے ابو کے پاس پہنچ گیا۔

دارالاطفال کی تقریب بے حد سادہ تھی۔ بچوں کو صاف ستھرے کپڑے پہنائے گئے تھے۔ تقریب کچھ بچوں کے ختم قرآن مجید کی اور کچھ بچوں کی بسم اللہ کی تھی۔ وسیم قریشی صاحب مہمان خصوصی تھے۔ تقریب کے بعد وہ فرداً فرداً بچوں سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ عاصم ان کے ساتھ تھا۔ وہ بھی بچوں سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ اچانک ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی نظر اس بچے سے ملی۔ وہ بڑی معصومیت سے سر اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔ ان نگاہوں میں نجانے کیا تھا کہ عاصم بُت بن کر رہ گیا۔ وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ ابو آگے نکل گئے۔

اُس بچے میں نہ جانے کیسی کشش تھی۔ وہ بے حد جانا پہچانا' بے حد اپنا اپنا محسوس ہو رہا تھا "تمہارا نام کیا ہے بیٹے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا نام بابر ہے انکل۔"

"انکل نہیں' مجھے بھائی جان کہو۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان۔"

اسی لمحے ابو نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ تمام بچوں سے ہاتھ ملا چکے تھے "کیا بات ہے عاصم؟" انہوں نے اسے پکارا۔

"آیا ابو" عاصم نے کہا پھر وہ بچے کی طرف مڑا "تم یہیں کھڑے رہنا بیٹے۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ابو کی طرف چلا گیا۔ ابو یتیم خانے کے منتظم سے بات کر رہے تھے۔

"ابو... ایکسکیوزمی۔" اس نے کہا۔

"جی بیٹا؟" ابو اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"آپ کو مجھے ایک من پسند تحفہ دینا ہے نا آج؟"

"جی بیٹے' یہ تو طے شدہ بات ہے۔"

"تو میں وہ بچہ لینا چاہتا ہوں۔" عاصم نے بچے کی طرف اشارہ کیا "بابر ہے اس کا نام۔"

حیرت سے ابو کا منہ کھل گیا "بچہ؟ بابر؟"

"جی ہاں ابو' میرے لیے چھوٹا بھائی۔"

ابو کی آنکھوں میں پل بھر کو نمی سی چمکی لیکن پھر انہوں نے خود پر قابو پا لیا "رضوان صاحب' کیا یہ ممکن ہے؟" انہوں نے منتظم سے پوچھا۔

"کیوں نہیں جناب۔ یہ تو خوشی کی بات ہوگی ہمارے لیے اور بچے کی تو قسمت سنور جائے گی۔ کل آپ وکیل کو لے آیئے گا' قانونی کارروائی مکمل ہو جائے تو اسے لے جایئے گا۔"

"ٹھیک ہے رضوان صاحب۔"

"ابو..." عاصم نے اچانک مداخلت کی "۳۰ دسمبر تو آج ہے نا' کل تو ۳۱ ہو جائے گی۔"

ابو اُس کی بات سمجھ گئے "رضوان صاحب' ہم اس بچے کو ابھی نہیں لے جا سکتے؟" انہوں نے پوچھا۔

رضوان صاحب مسکرائے "کوئی بات نہیں سر۔ قانونی کارروائی کل ہو جائے گی۔ آپ بچے کو آج لے جائیں۔ ویسے

عاصم میاں نے بہت پیارے بچے کا انتخاب کیا ہے۔ بہت نیک طبیعت اور محبت والا بچہ ہے یہ بابر۔ نہایت سلیم الطبع۔ آئیے میرے ساتھ۔"

ابو رضوان صاحب کے ساتھ بابر کی طرف بڑھ گئے۔ عاصم چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ لگتا تھا کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ پھر وہ بھی بابر کی طرف چل دیا۔ وہاں ابو رضوان صاحب سے کہہ رہے تھے "بچے سے تو پوچھ لیں رضوان صاحب۔"

"اس کی تو یہ خوش قسمتی......"

"پھر بھی" ابو کے لہجے میں تیزی تھی۔

"بابر.... قریشی صاحب تمہیں اپنا بیٹا بنا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ جاؤ گے بیٹے؟" رضوان صاحب نے بابر سے پوچھا۔

بابر نے انکار میں سر ہلا دیا "نہیں" اس کے لہجے میں عجیب سی معذرت تھی۔

قریب پہنچتے ہوئے عاصم نے دیکھا کہ ابو کا چہرہ ستا گیا ہے

"کیوں بیٹے؟" انہوں نے بے حد شفقت سے پوچھا "ہم تمہیں اچھے نہیں لگے؟"

"آپ بہت اچھے ہیں" بابر نے کہا پھر اُس نے سر گھما کر اپنی طرف آتے ہوئے عاصم کو دیکھا اور بولا "میں ان کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ بھائی جان کے ساتھ۔"

ابو کے چہرے سے کشیدگی ڈھل گئی اور وہ کھلکھلا کر ہنس دیئے "ٹھیک ہے بابر تم ان کے ساتھ چلے جاؤ۔"

رضوان صاحب بھی مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے ابو سے کہا "آپ میرے ساتھ دفتر میں تشریف لے چلیں۔ اس کا برتھ سرٹیفکیٹ لے لیجئے گا۔ میں اس کے بارے میں بتا بھی دوں گا آپ کو۔" ابو رضوان صاحب کے ساتھ آفس کی طرف چل دیئے۔

"بابر.... تم اپنے ساتھیوں کو خدا حافظ کہہ دو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ پھر گھر چلیں گے۔" عاصم نے بابر سے کہا اور خود بھی آفس کی طرف چل دیا۔

آفس میں رضوان صاحب ایک فائل کھولے بیٹھے تھے "یہ بچہ چھ سال کا ہونے والا ہے۔" وہ کہہ رہے تھے کہ عاصم بھی وہاں پہنچ گیا "اس کی ماں اس کی ولادت سے چھ ماہ پہلے بیوہ ہوئی تھی۔ یہ جناح اسپتال میں پیدا ہوا۔ ماں زچگی کے دوران مر گئی۔ یہ یہاں ایک دن کا آیا تھا۔ یہ ہے اس کا برتھ سرٹیفکیٹ۔" انہوں نے سرٹیفکیٹ عاصم کی طرف بڑھایا۔ عاصم نے سرٹیفکیٹ کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی ابھری۔ پھر اس نے سرٹیفکیٹ ابو کی طرف بڑھاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ابو... اللہ میاں نے سچ مچ مجھے میرا بھائی دے دیا ہے۔"

ابو نے حیرت سے اسے دیکھا پھر سرٹیفکیٹ کو پڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "۲۴ اپریل ۶۷ء"

انہوں نے دھیمی آواز میں کہا "بے شک بیٹے، یہ اللہ کی طرف سے تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔"

وہ تاریخ عاصم کیسے بھول سکتا تھا۔ اس دن اللہ نے امی کے ساتھ اس کے نومولود بھائی کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔

دفتر کے باہر ننھا بابر اس کا منتظر تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا شاپنگ بیگ تھا۔ عاصم کو دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرایا۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے بابر؟" عاصم نے پوچھا۔

"میرے کپڑے اور کتابیں ہیں بھائی جان۔"

"یہاں کی سب چیزیں اور تمام یادیں یہیں چھوڑ دو بابر۔ ابھی ہم تمہارے لیے نئے کپڑے اور کتابیں لیتے ہوئے گھر چلیں گے۔" عاصم نے کہا۔

یادیں وہیں چھوڑنا تو بابر کی سمجھ میں نہیں آیا ہو گا تاہم شاپنگ بیگ اس نے وہیں زمین پر رکھ دیا اور اس کی انگلی تھام کر بولا "چلیں بھائی جان۔"

انگلی پر ننھے منے ہاتھوں کی وہ گرفت ایک ایسی محبت کا احساس دلا رہی تھی جو عاصم کے لیے بالکل نئی تھی، جس کے لیے وہ ترستا رہا تھا۔ وہ بابر کو اپنی نئی گاڑی کی طرف لے گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر بابر سے کہا "بیٹھو بابر، یہ تمہاری اور میری کار ہے۔"

گلی میں کوئی گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ انجن نے بیک فائر کیا تو عاصم بری طرح چونکا۔ پھر نگاہوں کی دھندلاہٹ نے اسے پریشان کر دیا۔ یہ سمجھنے میں اسے کچھ دیر لگی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس بار اُس نے دریا پر بند نہیں باندھا "میرے معبود، تو نے مجھ پر ہمیشہ کرم فرمایا۔ مجھے خوشیاں عطا فرمائیں۔ آج میں اکیلا ہوں۔ بچوں سے، بیوی سے دور تو ضرور مجھ سے کوئی بہت بڑی خطا ہوئی ہو گی۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "عاصم قریشی اسپیکنگ" اس نے بے ساختہ کہا۔ اس وقت اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اب وہ مرشد حسین ہے۔

"ہیلو بھائی جان" دوسری طرف سے چہکتی ہوئی آواز سنائی دی "میں آگیا ہوں بھائی جان۔"

عاصم گنگ ہو کر رہ گیا۔ بڑی مشکل سے وہ بولا "بابر.... بابر!" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی "کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

"ائیرپورٹ سے لیکن زیادہ باتیں نہیں ہوں گی۔ آپ مجھے یہ بتائیں، میں کہاں پہنچوں؟"

"ٹیکسی کرو اور سیدھے لبرٹی طارق روڈ پہنچ جاؤ۔ میں تمہیں منتظر ملوں گا۔"

"او کے بھائی جان۔ باقی باتیں ملاقات پر۔" رابطہ منقطع ہو گیا۔

رکے ہوئے آنسو پھر بہنے لگے۔ اس بار وہ شکر کے آنسو تھے۔

معبود نے پھر اس پر کرم فرمایا تھا۔ جنم دن پر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کی سالگرہ کا تحفہ امریکا سے آیا تھا۔

○☆○

اس بار فوزیہ ایک ٹوٹی پھوٹی ہستی لگ رہی تھی۔ متورم آنکھوں نے نجمی کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ وہ یقیناً روتی رہی تھی۔ نجمی کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک پل کے لیے پھیکی پھیکی سی خیر مقدمی مسکراہٹ ابھری "آیئے نجمی صاحب" فوزیہ نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا "میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے لیے وقت نکالا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں فرصت سے بیٹھا تھا۔" نجمی نے کہا۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو ثمینہ کافی کی ٹرے رکھنے کے بعد واپس جا رہی تھی۔ شاید فوزیہ نے ریسیور رکھتے ہی اسے کافی کے لیے کہہ دیا تھا۔ فوزیہ نے کافی بنائی اور پیالی اس کے سامنے کھسکا دی "آج میں بینک گئی تھی۔" اس نے کہا۔

"اپنا اکاؤنٹ چیک کرنے؟" نجمی نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

فوزیہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور کافی کی پیالی پر جھک گئی۔

"کوئی خاص بات؟"

فوزیہ نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نجمی حیران رہ گیا۔ پچھلی ملاقات میں وہ بہت مضبوط اعصاب کی ثابت ہوئی تھی۔ یقیناً کوئی بڑی بات ہو گی جس نے اسے اس طرح توڑ کر رکھ دیا ہو گا۔ لیکن کیا بات ہو سکتی ہے وہ فوزیہ کو بغور دیکھتا رہا جو پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔ "کچھ بتایئے تو۔" نجمی نے کہا۔

"انہوں نے میرے اکاؤنٹ میں دس کروڑ روپے جمع کرائے ہیں۔"

نجمی کو جھٹکا سا لگا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا "کب کی بات ہے؟"

"گھر سے جانے کے ٹھیک آٹھویں دن۔"

"نقد یا چیک کے ذریعے؟"

"ٹیکرا نویسٹرز انکارپوریٹڈ کا چیک تھا۔"

"تو آپ اتنی دل گرفتہ کیوں ہیں۔ یہ تو ایک مثبت علامت ہے یعنی وہ زندہ ہیں۔"

فوزیہ نے سر اٹھا کر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا "میرے نزدیک یہ سراسر منفی علامت ہے۔ اتنی بڑی رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل کرنے کا مطلب ہے کہ خدانخواستہ......" وہ کہتے کہتے رک گئی "کاش ایسا نہ ہو لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے طور پر ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے اور بچوں کو اتنی دولت کا کیا کرنا۔ اس سے زیادہ تو ہمیں اُن کی ضرورت ہے اور رہے گی۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

نجمی کو پشیمانی ہونے لگی۔ پیشہ ورانہ تقاضوں کے تحت وہ اس عورت پر شک کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ دنیا میں کتنی عورتیں ایسی ہوں گی جنہیں اُن کا شوہر دس کروڑ روپے دے کر غائب ہو جائے اور وہ خوش ہونے کی بجائے شوہر کا غم کریں۔ یقیناً ایسی عورتیں کم ہی ہوں گی۔ اور جو ہوں گی وہ شوہر پرست ہوں گی۔ ان پر اس طرح کا شک کرنا بھی بد ترین گناہ ہو گا۔

"اب یہ تو طے ہے بیگم قریشی کہ آپ کے شوہر اپنی مرضی سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت روپوش ہوئے ہیں۔" اس نے کہا "آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔"

"میں نے اس سلسلے میں بہت سوچا ہے لیکن مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔" فوزیہ کے لہجے میں بے بسی تھی "سچ کہہ رہی ہوں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

نجمی نے سوچا' ظاہر ہے یہ کیسے سمجھ سکتی ہے۔ اس نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور پیالی ختم کر کے رکھ دی "ایک بات بتائیں۔" اُس نے کہا "آپ صرف اس بات پر تو اپ سیٹ نہیں ہیں۔ کوئی اور بات بھی ہے۔ وہ کیا ہے؟"

فوزیہ اُس سے نظریں چرانے لگی "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"پلیز مجھ سے نہ چھپایئے' میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

فوزیہ اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ آخر کار اس نے بتایا "دراصل آج عاصم کا برتھ ڈے ہے۔ مجھے یہ سوچنا بہت عجیب لگ رہا ہے کہ آج وہ اکیلے ہوں گے۔ کاش ایسا نہ ہو۔"

نجمی سمجھ گیا۔ اسے فوزیہ کو اداسی کے خول سے نکالنا تھا۔ اُس نے دیکھا تھا کہ ایسی کیفیت میں اشتعال بے حد موثر ثابت ہوتا ہے "تو آپ یہ کیوں سمجھ رہی ہیں کہ وہ اکیلے رہنے کے لیے آپ کو اور بچوں کو چھوڑ کر روپوش ہوئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ بہت سادہ لوح ہیں مسز قریشی۔ اگر کوئی شخص اپنے تمام اثاثے ۹۰ کروڑ میں فروخت کر کے ۱۰ کروڑ بیوی کو لگا دے تو یہ کوئی احسان تو نہیں۔ اور ۸۰ کروڑ روپے لے کر روپوش ہونے والا کسی کٹیا میں بیٹھ کر خود کو عبادت و ریاضت میں مصروف کرنے کے لیے تو روپوش نہیں ہوا ہو گا۔"

خلاف توقع فوزیہ مسکرا دی "آپ عاصم کو نہیں جانتے اس لیے ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ ورنہ میں عاصم کے متعلق اس قسم کی گفتگو برداشت نہیں کرتی۔"

"تو آپ کے خیال میں اس پورے قضیئے کی بنیاد میں کوئی عورت نہیں ہو گی؟"

"اگر مجھے اس مفروضے پر یقین آ سکتا ہوتا تو میں اس وقت پریشان نہ ہوتی نجمی صاحب۔ پھر تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میں جانتی ہوں کہ کوئی بہت ہی خطرناک بات ہو گی کہ وہ اس طرح چلے گئے اور میں اس کے بارے میں کوئی اندازہ تک نہیں قائم کر سکتی۔

یہی وجہ ہے میری پریشانی کی۔"
اب نجمی خود کو اُس کی جگہ رکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ کتنی پریشان ہوگی۔ اُس کے جی میں آئی کہ اسے سب کچھ سچ سچ بتا کر کم از کم اندیشوں کی قید سے تو آزادی دلا دے۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ اس کے لیے کوئی مناسب موقع نہیں۔ یہ اس کے شوہر کا جنم دن ہے۔ "ایک ذاتی سوال پوچھوں آپ سے؟"
"ضرور پوچھیں۔ آخر میں ایک بے حد ذاتی معاملے میں آپ سے مدد لے رہی ہوں۔"
"بچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟"
فوزیہ نے ایک سرد آہ بھری اور جیسے کچھ دیر خلاؤں میں گھورتی رہی۔ پھر بولی "میں انہیں یہ نہیں بتا سکتی کہ ان کے پاپا انہیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اتنے چھوٹے معصوم بچے... کیا گزرے گی ان پر۔ انہیں یہی معلوم ہے کہ عاصم امریکا گئے ہوئے ہیں۔"
"لیکن یہ اس مسئلے کا مستقل حل تو نہیں۔"
"جانتی ہوں۔ کل میں انہیں لے کر مری جا رہی ہوں۔ وہاں اسکول میں داخل کرا دوں گی۔ ثمینہ وہیں مری میں رہے گی۔ وہاں ہمارا ایک کاٹیج ہے۔"
"آپ کی واپسی کب ہوگی؟"
"جلد سے جلد آنے کی کوشش کروں گی۔ پھر بھی ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔" فوزیہ نے جواب دیا "آپ عاصم کو تلاش کر رہے ہیں نا... کرتے رہیں گے نا؟"
نجمی نے سرد آہ بھر کے کہا "میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ سچ یہ ہے کہ انٹرکان سے چیک آؤٹ کے بعد انہوں نے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔ ایک ایسے آدمی کو تلاش کرنا جس نے خود کو چھپانے کے لیے اپنی ہر شناخت مٹا دی ہو، تقریباً ناممکن کام ہے۔ میں اس سلسلے میں کوشش کرتا رہوں گا لیکن میں زیادہ پر امید نہیں ہوں۔"
فوزیہ کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ تاہم اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا "میں سمجھتی ہوں اور آپ کی شکر گزار بھی ہوں۔ مجھ سے آپ کسی بھی قسم کی مدد طلب کر سکتے ہیں۔ مری میں آپ مجھ سے اس نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔" اس نے کاغذ پر ایک نمبر لکھ کر نجمی کی طرف بڑھا دیا۔
اپنے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے نجمی سوچ رہا تھا کہ اب چند روز کی فرصت ہے۔ خاور ندیم ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ فوزیہ مری جا رہی تھی اور عاصم کا کوئی سراغ فی الحال سامنے نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس عرصے میں ایڈز پر دو تین آرٹیکل ضرور لکھے گا۔ وقت آگیا تھا کہ لوگوں کو ایڈز کے بارے میں بتایا جائے۔ حکومت کو اور محکمہ صحت کو احساس دلایا جائے کہ وہ اس معاملے میں صحیح خطوط پر کام نہیں کر رہے ہیں اور درست سمت میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ عام لوگوں کو یہ بھی بتانا تھا کہ انہیں ایڈز کے مریضوں سے نفرت کا کوئی حق نہیں۔ جو کیس عدالت میں ہوتا ہے اس پر اخبارات میں بھی رائے زنی نہیں کی جاتی کہ یہ توہین عدالت ہے تو پھر انسانوں کو کائنات کی سب سے بڑی عدالت میں زیر سماعت کسی کیس پر فیصلہ صادر کرنے کا کیا حق ہے!

○☆○

ٹیکسی کیفے لبرٹی کے سامنے رکی۔ بابر نے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ڈرائیور نے ڈِکی کھول دی تھی۔ اس نے دو سوٹ کیس نکال کر رکھ دیئے "یہ لیجئے سر آپ کا سامان۔" بابر نے پرس کھول کر اسے دو سو روپے دیئے اور پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اچانک فٹ پاتھ پر کھڑا ایک شخص اس کی طرف بڑھا "واپسی مبارک ہو بابر۔"
بابر نے اسے صورت سے نہیں آواز سے پہچانا۔ اس شخص کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی، بال بھورے تھے۔ تاہم غور سے دیکھنے پر اسے اس میں بھائی جان کی شباہت نظر آنے لگی "السلام علیکم۔ ارے بھائی جان، یہ کیا حلیہ بنا لیا ہے آپ نے۔"
عاصم نے سلام کا جواب دے کر اسے گرم جوشی سے لپٹا لیا۔ بابر بے تابانہ بھائی جان، بھائی جان کہتے ہوئے اس کے رخساروں اور گردن کو چومے جا رہا تھا۔ دونوں کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ ایک مصروف فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں۔
پھر پہلے عاصم کو ہی ہوش آیا "چلو، اب گھر چلیں۔"
بابر کی مزاحمت کے باوجود ایک سوٹ کیس عاصم نے اٹھا لیا اس کی پناہ گاہ ویسے بھی زیادہ دور نہیں تھی۔ تین منٹ بعد وہ فلیٹ میں تھے۔
"اب تم نہا دھو کر کپڑے بدل لو پہلے۔" عاصم نے کہا "اپنے سوٹ کیس سے تولیہ بھی نکال لینا۔"
"تولیہ تو یہ کرسی پر بھی پڑا ہے۔" بابر نے اشارہ کیا۔
"یار بہت میلا اور بدبودار ہو رہا ہے۔"
"ٹھیک ہے بھائی جان۔" بابر نے کہا اور اپنے سوٹ کیس پر جھک گیا۔ کپڑے اور تولیہ لینے کے بعد وہ باتھ روم میں جا گھسا۔ نہا دھو کر نکلا تو وہ فریش ہو چکا تھا "بھائی جان، میں شیو بنوا کر ابھی آیا۔ پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"
"شیو؟ یہ کیا حماقت ہے۔ شیو ہمیشہ گھر میں بنایا کرو، سمجھے؟" عاصم نے سخت لہجے میں کہا۔
"ٹھیک ہے بھائی جان۔ آئندہ ایسا ہی ہوگا لیکن آج معاف کر دیں۔ میرے پاس شیونگ کٹ نہیں ہے۔"
"میں جو کہہ رہا ہوں تم شیو باہر نہیں بنواؤ گے۔"
"تو پھر؟ آپ تو شیو سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔" بابر کے لہجے میں شگفتگی تھی "اب کیا کروں؟"
"شیو بنوانے جا رہے تھے، اب شیو کرنے کا سامان لے آؤ۔" عاصم نے نرم لہجے میں کہا۔ پھر اس نے جیب سے ہزار کے چند نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھائے "دو ایک شلوار سوٹ بھی خرید

لیٹا اپنے لیے۔"

"رقم تو میرے پاس بھی ہے بھائی جان۔ لیکن آپ کے ہاتھ سے پیسے لیے اتنے دن ہو گئے ہیں اس لیے انکار نہیں کروں گا۔"

بابر کے جانے کے بعد عاصم بیڈ پر دراز ہو گیا۔ بابر کے آنے سے وہ بڑی تقویت محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ بالکل اکیلا نہیں تھا۔

بابر کوئی دو گھنٹے بعد واپس آیا تو لدا پھندا تھا۔ اس نے شاپنگ بیگ بیڈ پر ڈھیر کر دیے اور دو شاپنگ بیگ لے کر کچن کی طرف چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ ایک کیک، چھری اور ایک لفافہ ٹرے پر رکھ کر لایا اور ٹرے چھوٹی ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دی۔

عاصم چونک کر اٹھ بیٹھا "یہ کیا؟"

"بننے مت۔ آج آپ کی سالگرہ ہے۔"

عاصم اپنی آنکھوں کو نم ہونے سے روکنے کے لیے پلکیں جھپکانے لگا "تمہیں یاد تھی؟"

"کب یاد نہیں ہوتی یہ تاریخ۔ بھائی جان، یہ آپ ہی کا نہیں میرا بھی تو جنم دن ہے۔" بابر نے کہا "آج یہاں پہنچنے کی خاطر تو میں نے وہ پہاڑ جیسے دن امریکا میں گزارے ہیں۔"

عاصم اِس جملے کی معنویت کو سمجھ گیا لیکن خاموش رہا۔ بابر نے لفافے سے دو عدد موم بتیاں نکال کر کیک پر لگائیں پھر وہ اُس سوٹ کیس کی طرف بڑھا جو اُس نے ابھی کھولا بھی نہیں تھا۔ وہ سوٹ کیس کھول کر بابر نے چھوٹا سا ایک پیکٹ نکالا۔ پیکٹ بہت خوب صورت کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک مبارکبادی کارڈ بھی منسلک تھا۔ بابر نے پیکٹ لے جا کر میز پر رکھ دیا "اب اٹھ بھی جایئے قبلہ۔"

عاصم اٹھا اور میز کی طرف چلا آیا۔ بابر نے موم بتیاں روشن کیں اور چھری عاصم کی طرف بڑھائی "بسم اللہ کیجیے بھائی جان۔"

عاصم کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ بابر کی محبت کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے جھک کر پھونک ماری اور موم بتیاں بجھا دیں۔ اس نے کیک کاٹا۔ بابر کی تنہا آواز اسے وش کر رہی تھی۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو بھائی جان۔ پھر اس نے عاصم سے چھری لے کر کیک کا ایک پیس کاٹا اور اسے انگلیوں میں تھام کر عاصم کی طرف مڑا "منہ کھولیے بھائی جان۔"

"ایسے نہیں چھری مجھے دو۔"

عاصم نے بابر سے چھری لے کر ایک اور پیس کاٹا "اب تم بھی منہ کھولو۔"

دونوں نے ایک دوسرے کے منہ میں کیک کا ٹکڑا ٹھونس دیا اور دونوں ہی ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ پھر بابر دوبارہ کچن کی طرف چلا گیا۔ اس بار وہ پلیٹیں لے کر آیا تھا "اب کیا ارادہ ہے بھائی؟" عاصم نے پوچھا۔

"سخت بھوک لگ رہی ہے بھائی جان۔ اب کھانا کھائیں گے۔" بابر نے کہا۔ پھر اُس کی نظر تحفے کے پیکٹ پر پڑی "میں بھی بہت بدتمیز آدمی ہوں۔ بھوک لگے تو جانور بن جاتا ہوں۔ تحفہ دینا بھول ہی گیا آپ کو۔" اس نے پیکٹ اٹھا کر عاصم کی طرف بڑھایا "سالگرہ مبارک بھائی جان۔ اللہ آپ کو خوشیاں دے اور طویل عمر۔"

عاصم کے ہونٹوں پر بجھی بجھی مسکراہٹ ابھری "شکریہ بھائی" اس نے کہا اور بے تابی سے کاغذ کو ہٹانے لگا۔ بابر پھر کچن میں چلا گیا تھا۔

کاغذ ہٹا تو گتے کا ایک پیکٹ نکلا۔ اس پیکٹ کو کھولا تو ایک چھوٹا سا جیول باکس نکلا۔ مخملیں جیول باکس۔ عاصم کا دل دھڑکنے لگا۔ اسے اپنی اٹھارویں سالگرہ یاد آ گئی۔ وہی سالگرہ جس پر اللہ نے اسے بابر کا تحفہ دیا تھا۔ اس سالگرہ پر ابو نے اسے ایسا ہی ایک جیول باکس دیا تھا جس میں اس کی زندگی کی پہلی کار کی چابی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ یہ دن ہی یادوں اور آنسوؤں کا ہوتا ہے شاید۔

اُس نے بچوں کے سے دھڑکتے دل کے ساتھ باکس کھولا۔ اندر ایک بے حد خوب صورت سنہری رسٹ واچ تھی۔

"کیسی لگی بھائی جان؟"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ بابر کھانا لگا چکا تھا۔ بروسٹ چکن، رائتہ، سلاد اور کلچے.... اور اب وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

عاصم گھڑی کو ہاتھ میں لیے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا "بہت خوب صورت ہے۔" اس نے کہا۔

"خوب صورت تو ہے لیکن اس کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک چابی میرے دل کی بھی ہے۔ جب بھی کبھی بے یقینی میں گرفتار ہوں اس چابی کو کھینچیں اور میرے دل کی آواز سن لیں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

بابر نے قریب آ کر گھڑی کی سائیڈ میں لگی ایک چابی کی طرف اشارہ کیا "ذرا اسے باہر کی طرف کھینچیں۔"

عاصم نے چابی باہر کھینچی تو بابر کی آواز ابھری "آئی لو یو بھائی جان، آئی ول آلویز لو یو۔ آئی لو...." عاصم نے چابی دبا دی اور عجیب سی نظروں سے بابر کو دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن میں ایک سوال تھا۔ کیا یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی مجھ سے محبت کرتا رہے گا؟

"آیئے اب کھانا کھا لیں۔"

کھانے کے بعد عاصم نے چائے بنائی۔ چائے کی پیالیاں سامنے رکھ کر وہ دونوں پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے "اب سناؤ تعلیم مکمل ہو گئی؟" عاصم نے پوچھا۔

"جی ہاں" بابر نے چائے کا ایک گھونٹ لیا "فارغ التحصیل ہو کر آیا ہوں۔ بہت سخت آٹھ سال گزارے ہیں آپ کے بغیر۔"

"کوئی محبت وحبت بھی کی کسی سے؟"

"اکیس سال پہلے کسی سے پہلی نظر کی محبت ہوئی تھی۔ تب سے اب تک کسی اور محبت کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

عاصم نے غور سے اسے دیکھا۔ نہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی نہ آنکھوں میں۔ وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"اب آپ سنائیں" بابر نے گہری سانس لے کر کہا اور چائے کی پیالی خالی کر دی۔

"سگریٹ" عاصم نے سگریٹ کا پیکٹ اُس کی طرف بڑھایا۔

بابر ہچکچایا "یہ گستاخی تو نہیں ہو گی بھائی جان۔"

"پاگل۔ میں نے ہمیشہ تم سے یہی کہا تھا کہ ہم بھائی سے زیادہ اچھے دوست ہیں۔"

"یاد ہے بھائی جان۔" بابر نے سگریٹ لے لی۔ عاصم نے دیا سلائی جلا کر بڑھائی پھر اپنی سگریٹ بھی سلگالی۔

"ہاں بھائی جان' آپ کے فون نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کو میری ضرورت ہے۔ پھر آپ نے یہ فون نمبر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ گھر کا فون نمبر نہیں ہے اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ آپ کسی بہت بڑی پریشانی میں گرفتار ہیں۔ آپ بھابی اور بچوں سے دور اس فلیٹ میں رہ رہے ہیں کیوں؟ اور آپ کی صحت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔"

"ہاں' میں اتنی بڑی مصیبت میں ہوں کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔" عاصم نے آہستہ سے کہا "تمہیں مدد کے لیے بلایا مگر اب سوچتا ہوں کہ اپنے ساتھ تمہیں بھی مصیبت میں کیوں پھنساؤں۔"

"کیا بات کر رہے ہیں بھائی جان۔ میں تو بس آپ ہی کا دوسرا روپ ہوں' آپ کا سایہ۔"

"مگر اب میں بہت بڑا مجرم ہوں۔ ایک ایسا شخص جس سے کوئی بھی تعلق رکھنا پسند نہیں کرے گا۔"

"میں تو جو کچھ ہوں اور رہوں گا' میرا حوالہ آپ ہی ہوں گے اور میں اس پر فخر کروں گا ہمیشہ۔" بابر نے کہا۔

"مجھے تم سے جو مدد درکار ہے وہ مجرمانہ بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں آپ کے ایک اشارے پر جہنم بھی جا سکتا ہوں۔"

"صورت حال کی سنگینی کا اندازہ اِس سے لگالو کہ اب میں عاصم قریشی نہیں ہوں۔ میرا نام' میری شخصیت بدل چکی ہے۔ سوائے تمہارے کسی کو نہیں معلوم کہ میں یہاں ہوں۔"

بابر مسکرایا "یہ تو میرے لیے فخر کی بات ہے۔ آپ دنیا میں سب سے زیادہ اعتماد مجھ پر کرتے ہیں۔"

"ہاں بھائی' یہ تو ہے۔" عاصم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بس پھر سب کچھ بتا دیجیے مجھے۔"

"اِس وقت نہیں' فی الوقت تو سکون سے سو جاؤ۔ تازہ دم ہو کر اٹھو گے تو بات کریں گے۔ اس وقت تو مجھے بھی نیند کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

بابر نے بحث نہیں کی۔ اس نے کہا "ٹھیک ہے بھائی جان۔ یہ مناسب ہے۔ جلدی کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس وقت کی کمی نہیں۔"

اُس رات عاصم کو نیند کے لیے دوا لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

○☆○

نجمی کو خاور ندیم سے ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ پہنچا۔ اس نے اُس کی سیکریٹری کو اپنا نام بتایا۔ سیکریٹری نے انٹرکام پر خاور سے بات کی اور پھر بولی "آپ تشریف لے جائیے جناب۔ صاحب آپ کے منتظر ہیں۔"

اس ملاقات کا بندوبست فوزیہ نے کیا تھا۔ اس نے نجمی کو یقین دلایا تھا کہ خاور اس کے ساتھ پورا تعاون کرے گا۔

خاور نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ "تشریف رکھیے مسٹر نجمی۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

نجمی صوفے پر بیٹھ گیا۔ خاور اٹھا اور خود بھی سامنے والے صوفے پر آ بیٹھا "آپ مصروف تو نہیں ہیں۔" نجمی نے اُس سے پوچھا "میری گفتگو طویل بھی ہو سکتی ہے۔"

خاور ندیم مسکرایا "اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں نے اسی لیے آپ کو چھٹی کے بعد کا وقت دیا ہے۔"

"شکریہ" نجمی بھی مسکرایا۔ خاور خوش اخلاق آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ ابھی وہ گفتگو شروع نہیں کر پائے تھے کہ سیکریٹری چائے لے آئی۔ چائے بنا کر اس نے پیالیاں ان دونوں کے سامنے رکھیں اور واپس جانے لگی۔ خاور نے اسے پکارا "مس ناہید' آپ اب چھٹی کر سکتی ہیں۔ بنارس موجود رہے گا۔"

"بہتر سر۔"

اس کے جانے کے بعد خاور نجمی کی طرف متوجہ ہوا "اب فرمایئے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میں قریشی صاحب کی گمشدگی کے کیس پر کام کر رہا ہوں؟"

خاور نے سر کو تفہیمی جنبش دی "فوزیہ نے مجھے بتا دیا تھا۔"

"میں قریشی صاحب کی شخصیت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ آپ اُن کے سب سے اچھے دوست ہیں؟"

"واحد دوست کہیئے۔ میرے دوست بے شمار ہیں لیکن میں عاصم کا واحد دوست ہوں۔"

"آپ انہیں کب سے جانتے ہیں؟"

"ہمارا ساتھ تو بچپن سے ہے۔ ہم قریب رہے' ساتھ پڑھے اور پھر ایک ہی فیلڈ میں گئے..... یعنی آبائی بزنس۔" خاور نے جواب دیا۔

"آپ قریشی صاحب کے واحد دوست ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ آدم بیزار....."

"نہیں" خاور نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "عاصم کے بھی ملنے والے بہت ہیں لیکن وہ خوش اخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ طبع بھی ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ

ملانے والا۔ بس کئی اعتبار سے وہ مختلف آدمی ہے۔"

"اُن کی گمشدگی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ پولیس بھی ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی ہے۔"

"لیکن پولیس قریشی صاحب کے متعلق اتنا نہیں جانتی، جتنا آپ جانتے ہیں۔" نجمی نے کہا "میں اس سلسلے میں آپ کا نظریہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"سچ پوچھیں تو میں اس سلسلے میں کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکا ہوں۔ اس کی وجہ وہ ہے، جسے آپ پولیس پر میری فوقیت قرار دے رہے ہیں۔ یہ کہ میں عاصم کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اسے۔ وہ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو اب تک اُس کی گمشدگی کے سلسلے میں میرے پاس کئی نظریے ہوتے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ وضاحت کریں گے آپ؟"

"عام آدمی کے بارے میں ہم کہہ سکتے تھے کہ کوئی لڑکی کا..... عشق کا چکر ہوگا یا یہ کہ اس سے کوئی جرم سرزد ہوگیا ہوگا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسی کوئی بات عاصم کے ساتھ نہیں ہوسکتی اور یہ خیال آتے ہی میں خود کو اندھیرے میں محسوس کرتا ہوں۔ مجھے سجھائی نہیں دیتا کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔"

"میں نے ایسے بہت لوگ دیکھے ہیں، جو پارسا مشہور تھے، عورتوں کی قربت سے گھبراتے تھے۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ ایسے ہی لوگ عورتوں کے معاملے میں کچھ بھی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وہ جنونی بھی ہوتے ہیں۔ ان سے کسی بھی اقدام کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ چھپے رستم کہا جاتا ہے ایسے لوگوں کو۔"

"عاصم ایسا نہیں ہے۔ میں اسے واقعی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تو اپنے گردوپیش کو بھی درست دیکھنا چاہتا ہے۔ میری محفلوں میں شرکت تو دور کی بات ہے، وہ تو جب بھی ملتا ہے مجھے لیکچر پلاتا رہتا ہے۔ اُس کے اختیار میں ہو تو وہ پورے معاشرے کو سدھار کر رکھ دے۔"

"گہرے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔" نجمی نے رائے زنی کی۔

خاور مسکرایا "تم یقیناً اچھے صحافی ہو۔ مجھے اکسا رہے ہو؟ لیکن میں تمہیں وہی کچھ بتاؤں گا، جو میں جانتا ہوں، جس پر یقین ہے مجھے۔ اور یقین کرو میں خود آسانی سے کسی کی اچھائی پر یقین کرنے والا آدمی نہیں۔ میں تو بہت عیب جو ہوں۔ انسانوں میں صرف خامیاں ہی تلاش کرتا ہوں۔"

نجمی بھی مسکرایا۔ اسے یقین تھا کہ خاور ایسا ہی ہے "پھر بھی خاور صاحب، میں عاصم صاحب کی تلاش میں نکلا ہوں اور سب سے مضبوط امکان یہی ہے۔"

خاور نے ایک سرد آہ بھر کے پوچھا "تم اس کے گھر گئے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"ثمینہ کو دیکھا ہے؟"

"دیکھا ہے۔"

"تب بھی نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر میری چار بیویاں ہوتیں اور مجھے ثمینہ جیسی کوئی لڑکی نظر آجاتی تو میں اس سے ہر قیمت پر شادی کرتا اور اگر میں فوزیہ کی جگہ ہوتا تو اتنی حسین لڑکی کو گورنس رکھنا تو کجا گھر سے ایک میل تک پھٹکنے نہ دیتا۔"

نجمی کو ہنسی آگئی "میرا خیال ہے، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ویسے میں اُن کی سیکریٹری رعنا سے بھی مل چکا ہوں۔"

"پھر بھی اپنے نظریے پر ڈٹے ہوئے ہو۔"

"میرے پاس فی الحال کوئی نظریہ نہیں۔ میں تو کوئی نظریہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"بہرحال، یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی عورت کے چکر میں گیا ہو۔"

"انہوں نے تمام اثاثے فروخت کر دیئے۔"

"یہ ارادہ تو اُس کا تقریباً ایک سال سے تھا۔ یہ تو جو کچھ بھی ہوا ہے اچانک ہی ہوا ہے کیونکہ وہ تو اپنے پروگرام پر عمل بھی نہیں کر سکا۔"

"کیسا پروگرام؟"

"فوزیہ نے نہیں بتایا تمہیں؟" خاور نے حیرت سے اسے دیکھا "وہ بیوی بچوں کے ساتھ امریکا میں مقیم ہونا چاہتا تھا۔"

"جہاں تک مجھے علم ہے، وہ پاکستان سے عشق کرنے والوں میں سے ہیں۔ ایسا آدمی ہمیشہ کے لیے ملک چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہے۔" نجمی نے اعتراض اٹھایا۔

"عاصم آئیڈیلسٹ آدمی ہے۔ یہاں کے حالات نے اسے مایوس کردیا ہے۔ اس کی اپنی منطق ہے کہ پاکستان میں اب سب کچھ امریکا کے حکم سے ہوتا ہے تو وہ وہاں کیوں نہ جارہے، جہاں سے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ آزادی تو اب وہاں ہے۔ یہاں تو آزادی کے نام پر بدترین غلامی ہے۔"

"تب تو انہیں فائٹ کرنی چاہیے۔ آزادی کے لیے، جمہوریت کے لیے۔"

خاور سنبھل کر بیٹھ گیا "آپ مان لیں کہ جمہوریت کا الاپ بھی امریکا ہی کا ہے۔ اب جو کچھ میں کہوں گا، وہ عاصم کے نظریات ہیں۔ میں ان میں سے بیشتر سے متفق ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ریفرنڈم کرایا جائے تو پتا چلے گا کہ ہماری اکثریت اُن سے متفق ہوگی۔ دیکھیں، اسلامی جمہوریت کی مثالیں کم سہی لیکن ایسی ہیں کہ قیامت تک روشن رہیں گی۔ وہاں خلیفۂ وقت سے کوئی عام آدمی بھی جواب طلب کر سکتا تھا کہ اس کے پاس یہ چادر کہاں سے آئی جو وہ اوڑھے ہوئے ہے۔ اور خلیفۂ وقت عاجزی سے سب لوگوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا تھا۔ اور یہ جو مغربی جمہوریت ہے، اس میں تو ہر انسان کی رائے برابر ہے۔ حالانکہ عقل و فہم اور شعور میں کوئی دو انسان برابر نہیں ہوتے۔"

"اس بات سے تو میں بھی متفق ہوں۔" نجمی بولا "لیکن اب تو مغربی جمہوریت ہی چلے گی۔ بہرحال جمہوریت آمریت سے تو بہتر

"یہ تو ایک فیشن والا نعرہ ہے۔ ذرا حقیقت پسند بن کر تو سوچیں کہ کس دور نے کیا دیا۔ ایوب خان کے دس برسوں نے پاکستان کو معاشی ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اس عرصے میں ملک کو پہلی بار زراعت کے مرکز سے ہٹا کر صنعت کے راستے پر باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت چلایا گیا۔ ملکی معیشت کو ایسی مضبوط بنیاد فراہم کی گئی جس کی وجہ سے ہم آج اس سے برے حال میں نہیں۔ پھر منتخب جمہوری حکومتیں آئیں۔ ذرا حساب تو لگائیں کہ انہوں نے ملک و قوم کو کیا دیا۔ انہوں نے تو مضبوط صنعتی بنیاد میں اپنے مفادات کی خاطر نقب لگائی۔ اور سیاسی کلچر جو بنا وہ بھی سامنے ہے۔ اور اب ۸۸ء سے اب تک کی جمہوریت کا حساب بھی لگالو۔ کرپشن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اقتدار سے محبت بھی کس حد تک کی جاسکتی ہے اس کے حصول کے لیے اگر کوئی تمام جمہوری اصولوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دے تو کیا اسے کوئی سیاسی پارٹی چلانے کا حق ملنا چاہیے۔"

"بات یہ ہے کہ فوجی آمریت کی وجہ سے جمہوریت کی نشوونما ہمارے ہاں تعطل کا شکار ہوتی رہی۔ سیاستدانوں کی تربیت نہ ہو سکی۔"

"یہ بات سن سن کر بھی کان پک گئے ہیں اب تو۔ مجھے یہ بتائیں کہ کیا سیاست کوئی ٹیکنیکل شعبہ ہے۔ ارے ایک سیاست داں کے لیے صرف ایک اچھا مسلمان اور ملک و قوم سے محبت کرنے والا ہونا ہی کافی ہے اور اس کے لیے کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر میں تمہیں غلیظ گالیاں دینا شروع کردوں تو تم کیا کہو گے۔ یہ کہ میری تربیت جمہوری ماحول میں نہیں ہوئی۔ یہ کوئی عذر ہے۔ سیاسی تربیت نہیں ہوئی تو کیا اچھا مسلمان بننے کی تربیت بھی نہیں ملی انہیں؟ اور اگر نہیں ملی تو قصور کس کا ہے؟ کسے کرنی چاہیے تھی یہ تربیت؟ میرے خیال میں تو آمریت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے آداب جمہوریت زیادہ بہتر طور پر سیکھے جاسکتے ہیں۔ ہمارے سیاست داں اسمبلی میں گالم گلوچ کرتے ہیں۔ بگڑے ہوئے بچوں کا سا بدتمیزی والا رویہ رکھتے ہیں۔ اس پر تم کچھ لکھ دو تو بچے صحافی میدان میں اتر آئیں گے۔ جیسے بدتمیز بچوں کے والدین ان کی صفائی پیش کرنے کھڑے ہوتے ہیں کہ فلاں کا بچہ تو ان سے زیادہ بدتمیز ہے۔ لکھیں گے کہ یورپ اور امریکا کے جمہوری ممالک میں اسمبلیوں میں اس سے زیادہ بدتمیزی ہوتی ہے۔ ایسی ایسی گالیاں دی جاتی ہیں کہ حد اور بس۔ اب ان سے پوچھا جائے کہ ان میں اور ہم میں کتنا فرق ہے۔ ہم مسلمان ہیں جنہیں خوش خلقی کی تاکید کی گئی ہے۔ ہم مغرب کی تقلید کیوں کریں اگر کرتے ہی ہو تو جمہوری رویوں کے معاملے میں بھی تو ایسا ہی کرو۔ وہاں ریل کا کوئی حادثہ ہو تو متعلقہ وزیر فوراً استعفیٰ دے دیتا ہے۔ ذرا سے اسکینڈل پر پورا کیریئر ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں کرپشن ثابت کیے جاؤ تو بھی لوگ اپنے عہدوں سے چپکے رہتے ہیں۔ اسمبلی میں 'ٹی وی پر' اخبار نویسوں کے سامنے قسمیں کھا کر کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ بات ثابت ہوگئی تو استعفیٰ دے دیں گے۔ بات ثابت ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ ایک وزیر اپنا عہد پورا کرنے سے بچنے کے لیے دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے اقتدار میں ہونے کے باوجود الیکشن میں دھاندلی ہوئی۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس صورت میں ان کی نااہلی ثابت ہوگئی اور استعفیٰ لازم ٹھہرا۔ یہ سب کیا ہے کم سن نوجوانوں کا رویہ بھی اس سے زیادہ ذمہ دارانہ ہوتا ہے۔ تو پھر کیا ایسا ہے کہ ہم نے چھ سال کی عمر تک کے بچوں کو اپنا رہنما بنا لیا ہے۔ ملک کی باگ ڈور سونپ دی ہے۔ سات سال میں نے اس لیے نہیں کہا کہ سات سال کے بچے کو تو نماز پڑھوانا فرض ہو جاتا ہے۔"

نجمی اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے صحافی ہو کر بھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا "تو یہ عاصم قریشی کے خیالات ہیں؟"

"ہاں" خاور نے گہری سانس لے کر کہا "اور غلط نہیں ہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ یہاں اقتدار کا مثلث بن گیا ہے۔ سب سے کمزور طاقت وہ ہے جس کے پیچھے عوامی قوت ہے، جسے سب سے زیادہ طاقت ور ہونا چاہیے۔ یہ جمہوریت ہے؟ ہاں، یہ وہ جمہوریت ہے جو امریکا کو ہمارے لیے پسند ہے۔ ہماری پچھلی حکومت دو تہائی اکثریت کے باوجود ختم ہوگئی۔ دنیائے جمہوریت سے کوئی ایک ایسی مثال لا دو۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کسی لانگ مارچ کا نتیجہ نہیں تھا۔ احکامات اوپر سے آئے تھے۔ اب جو یہ حکومت مانگے کی سادہ اکثریت کے زور پر چل رہی ہے تو کیسے چل رہی ہے؟ میں بھی جانتا ہوں، تم بھی جانتے ہو اور پوری قوم جانتی ہے۔ ایسے میں آدمی بے بسی نہیں محسوس کرے گا، مایوس نہیں ہوگا کہ جمہوریت میں بھی اس کی مرضی نہیں چل رہی ہے۔ رائے اس کی لی جاتی ہے اور اس کے فیصلے کو توڑ مروڑ کر اس کے ہی خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ ان دیکھی طاقتیں کیا کیا کچھ کر دیتی ہیں اور ووٹ دینے والوں کو مطلع بھی نہیں کرتیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ سچ پوچھو تو اس نام نہاد جمہوریت سے تو آمریت ہی بہتر تھی۔ اس میں انسانوں کو استعمال کی چیزوں کی طرح برتا جاتا ہے۔ ان کا کام بس یہی ہے کہ جب حکم ہوا، ووٹ ڈال آئے۔"

نجمی نے سرد آہ بھر کے کہا "بات تو سچ ہے۔" وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "ممکن ہے قریشی صاحب امریکا چلے گئے ہوں۔"

"بیوی بچوں کو چھوڑ کر؟ ناممکن۔ تم نہیں جانتے وہ اپنے بچوں سے کتنا پیار کرتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"میرے ذہن میں ہمیشہ اس سلسلے میں ایک ہی خیال آتا ہے۔ مگر کیونکہ عاصم مجھے بہت عزیز ہے اس لیے میں اسے رد کر دیتا ہوں۔" خاور نے کہا اور کچھ دیر سوچتا رہا "یہی ایک امکان رہ جاتا ہے کہ کسی گروہ کو بھنک مل گئی ہو کہ وہ اپنے تمام اثاثے فروخت

کررہا ہے اور انہوں نے اسے یرغمال بنالیا ہو اور ممکن ہے۔ خدانخواستہ اب وہ اس دنیا میں نہ ہو۔"

"اِس کے علاوہ کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی؟"

"میں نے کہا نا کہ میں عاصم کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ اس لیے مجھے کوئی اور صورت نظر نہیں آتی۔"

"لیکن مجھے اب تک جتنی معلومات ملی ہیں وہ بتاتی ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے روپوش ہوئے ہیں۔"

"تو پھر اُس کا دماغ چل گیا ہوگا۔ ورنہ روپوش ہونے کا کیا سوال ہے۔ وہ کوئی مجرم تو ہے نہیں۔"

"اور اُن کے پاس ۸۰ کروڑ روپے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" خاور سوچ میں پڑ گیا "۸۰ کروڑ کوئی معمولی رقم نہیں۔ اور یہ ممکن نہیں کہ وہ کوئی غیر قانونی کام کرے... ۸۰ کروڑ کے ۸۰ ارب بنانے کے ارادے سے روپوش ہوگیا ہو اس لیے کہ دولت کی اسے کبھی کمی نہیں رہی لیکن اس نے دولت کو کبھی بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اگر اسے یرغمال نہیں بنایا گیا اور وہ اپنی مرضی سے روپوش ہوا ہے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے کسی خاص مقصد کے لیے ایسا کیا ہوگا۔"

"کیسا مقصد؟" نجمی سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"اس کے اپنے خیال میں وہ ملک و قوم کی خدمت ہوگی۔ خواہ میری تمہاری اور دوسروں کی نظر میں وہ جرم ہو۔ ممکن ہے وہ قوم کو متبادل قیادت فراہم کرنے کے چکر میں ہو اور اس سلسلے میں کسی احمقانہ اسکیم پر وقت اور پیسہ برباد کررہا ہو کیونکہ یہاں کچھ بدل نہیں سکتا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ملک کے تمام لیڈروں اور سیاست دانوں سے متنفر ہوچکا ہے۔ اگر وہ متشددانہ ذہنیت کا مالک ہوتا تو شاید ان لوگوں کو قتل کرنے کے منصوبے بناتا اور ان پر عمل کرتا۔"

نجمی اٹھ کھڑا ہوا "شکریہ خاور صاحب' میں چلتا ہوں' ضرورت پڑی تو آپ کو پھر زحمت دوں گا۔"

"جب بھی ضرورت محسوس کرو مجھے فون کرلینا۔"

نجمی باہر نکل آیا۔ خاور ندیم کا آخری جملہ اس کے ذہن پر نقش ہوگیا تھا۔



"میں بس اتنا بتادینا کافی سمجھتا ہوں کہ جرم مجھ پر ثابت ہوچکا ہے۔" عاصم بابر سے کہہ رہا تھا "لیکن میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ لہٰذا میرے پاس روپوشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔"

"لیکن جرم کی نوعیت کے بارے میں تو بتائیے۔" بابر نے کہا۔

"سوری بھائی' اگر میں مجرم ہوں ہی نہیں تو پھر نوعیت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس لیے میں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

بابر نے کندھے جھٹک دیئے "ٹھیک ہے بھائی جان۔ میرے لیے تو صرف آپ کی بات' آپ کا حکم کافی ہے۔ میرے لیے کچھ بھی جاننا ضروری نہیں۔ یہ بتائیں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"کاروبار اور خدمت خلق۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میں نے بتایا نا کہ میں اپنا کاروبار فروخت کرچکا ہوں۔ میرے پاس جو کچھ ہے' اس میں تمہارا حصہ بھی ہے۔ لہٰذا میں تمہاری شراکت میں ایک خاص کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں جدید طرز کی ایک لیب قائم کرنا چاہتا ہوں اور ممکن ہو تو ایک بلڈ بینک بھی۔ یہ تمہاری فیلڈ ہے۔ سرمایہ تم جتنا کہو گے مل جائے گا۔"

بابر چند لمحے سوچتا رہا "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ اس لیب میں ایچ آئی وی اسکریننگ کا بندوبست بھی ہو اور ایڈز کے مریضوں کا مکمل ریکارڈ رکھا جائے۔"

"یہ تو ضروری ہے۔ میں نے سنا ہے کہ پاکستان میں ایڈز سے نمٹنے اور اُس کی روک تھام کے لیے اب تک سنجیدہ اقدامات نہیں کیے گئے ہیں۔"

"اسی پر کیا منحصر ہے۔ ہمارے ہاں پیسہ کمانے کے علاوہ کسی بھی سلسلے میں سنجیدہ اقدامات نہیں کیے گئے۔" عاصم نے سادگی سے کہا۔

"تو بھائی جان' یہ کام تو ہوجائے گا۔" بابر نے کہا۔ وہ ہچکچا رہا تھا "لیکن آپ نے کہا تھا کہ آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔"

"ہاں تم دنیا میں واحد آدمی ہوگے جس سے میرا رابطہ ہوگا۔ یہ میری مدد ہی تو ہے۔ ورنہ تو میرا دنیا سے' ہر اپنے سے اور اپنے ماضی سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے اور یہ تنہائی کیسی تنہائی ہے اس کا اندازہ تم کرسکتے ہو۔ پردیس میں آٹھ سال رہے ہو۔"

"یہ تو کوئی مدد نہ ہوئی۔" بابر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"تو کیا تم سمجھ رہے تھے کہ میں تمہیں کسی غیر قانونی کام میں ملوث کروں گا۔"

"خیر' آپ کی مرضی۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے ایک اشارے پر سب کچھ کرسکتا ہوں۔" بابر نے کہا "اب پروگرام بتائیے۔"

پروگرام کا خاکہ عاصم پہلے ہی مکمل کرچکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے "جب بھی تم تیار ہو تو بتادینا۔ میں اس کام کا آغاز لاہور سے کرنا چاہتا ہوں۔ ہم لاہور چل کر جگہ منتخب کریں گے پھر تمہیں آلات اور دیگر سازوسامان کی خریداری کے لیے بیرون ملک جانا ہوگا۔ وہاں سے آگے کا سب کام تمہارا۔"

"میں تو اس وقت بھی تیار ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ کل ہم لاہور چل رہے ہیں۔"

○☆○

وحید نجمی بے حد پریشان تھا۔ خاور ندیم سے انٹرویو کے بعد اسے یقین ہوگیا تھا کہ عاصم قریشی کی روپوشی ایک نہایت سنگین مسئلہ ہے۔ وجہ یہ تھی کہ اب اسے عاصم قریشی کی شخصیت کے

بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگیا تھا۔ اُس نے عاصم کو خود پر طاری کر کے خود کو اس کی جگہ رکھ کر سوچنے کی کوشش کی تھی۔ ایک محبِ وطن، آئیڈیلسٹ شخص جس نے صاف ستھری زندگی گزاری ہو، جو اپنے وطن کے بددیانت، بدکردار اور غیر ملکی اشاروں پر ناچنے والے کٹھ پتلی لیڈروں سے متنفر ہو۔ جسے خدشہ ہو کہ اُس کا ملک خدانخواستہ کسی بدیسی طاقت کا غلام بننے والا ہے، جس کے لیے آزاد سرزمین پر زندہ رہنا اتنا اہم ہو کہ وہ اس کے لیے اپنے وطن سے ہجرت کے لیے تیار ہو۔ جو کروڑپتی بھی ہو اور ایسے شخص کو اچانک یہ پتا چلے کہ وہ ایڈز کا شکار ہوگیا ہے تو اس پر کیا گزرے گی؟ یہ طے ہے کہ وہ خود کو مظلوم سمجھے گا۔ اسے احساس ہوگا کہ معاشرے نے اُس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ایسے شخص کے ذہن کے مسخ ہوجانے کا امکان بے حد قوی تھا اور مسخ ذہن کے لیے سب سے زیادہ اہم کون سا جذبہ ہوگا؟ یقینی طور پر نفرت۔ اور نفرت تو بے حد تند شکل میں اس ذہن میں پہلے سے موجود تھی۔ اب اس کا کیا حال ہوگا۔

اور ایڈز یقینی موت ہے۔ یقینی موت سے دوچار کوئی شخص اگر کوئی مقصد، کوئی نصب العین بھی رکھتا ہو تو وہ حد درجہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ ایسے ہی ایک جاپانی شہری نے جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ کے مایہ ناز بحری جہاز کو تباہ کیا تھا۔ وہ اپنے طیارے کو لے کر جہاز کی چمنی میں کود گیا تھا۔

یعنی اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ عاصم قریشی ملک و قوم کو اپنی دانست میں سیاست دانوں کے ناسوروں سے نجات دلانے کی کوشش کر سکتا ہے مگر کیسے؟ اُس کے پاس دولت ہے۔ وہ اجرتی قاتلوں کو استعمال کر سکتا ہے۔ کوئی بڑی تخریب کاری کرا سکتا ہے۔ کوئی نئی سیاسی جماعت بنا سکتا ہے جس کے ذریعے متوسط طبقے سے قیادت ابھر کر آسکے۔ اگرچہ یہ ایک طویل اور صبر آزما کام ہے۔ اچانک نجمی کو خیال آیا کہ عاصم کے پاس ایک طاقت اور بھی ہے۔ ایچ آئی وی، چلتی پھرتی موت۔ یہ خیال آتے ہی وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ سوال یہ تھا کہ عاصم اسے مخصوص لوگوں کے خلاف کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ ایسی کون سی صورت ہوسکتی ہے۔

وہ اس پر غور کرتے کرتے تھک گیا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اُس نے تھک کر فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں غور کرتا رہے گا لیکن اس سے زیادہ اہم مسئلہ عاصم کو تلاش کرنے کا ہے۔ اور یہ اب بہت ضروری ہوگیا تھا۔ عاصم کی روپوشی کسی وقت بھی دھماکا خیز ثابت ہوسکتی تھی۔ لہٰذا اسے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ بے خبر فوزیہ قریشی کو حقیقت بتادے۔ وہی اپنے شوہر کو اس کی کمیں گاہ سے باہر لا سکتی ہے۔

○☆○

فوزیہ نے اب خود کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ صدمہ بہت بڑا تھا لیکن اُس کے سامنے ایک اِس سے بڑی پریشانی بھی تھی۔ دونوں بچے۔ ابھی اس نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن بچوں کے لیے باپ کی محبت بہت بڑی تھی۔ عاصم نے انہیں وقت بھی بہت دیا تھا۔ چنانچہ وہ دونوں عاصم سے بہت زیادہ قریب تھے۔ فوزیہ نے اِس کا عارضی حل تو بہت اچھا تلاش کرلیا تھا۔ وہ انہیں مری کے کانونٹ اسکول میں داخل کرا آئی تھی۔ یوں اسے ایک سال کے لگ بھگ مہلت مل گئی تھی۔ اب وہ پُرامید تھی کہ اس عرصے میں اِس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔ ایک دبی دبی آس بھی تھی کہ شاید اِس دوران عاصم واپس ہی آجائے۔

اب وہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر صرف عاصم کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔ اُس کا دل کہتا تھا کہ عاصم زندہ اور بخیریت ہے۔ پولیس نے گمشدگی کی رپورٹ درج ہونے کے بعد معمول کے مطابق ہر طرح کی کارروائی کی تھی۔ انہوں نے اسپتال چیک کیے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ عاصم کا اس کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا اِس بات کی دلیل تھا کہ وہ خیریت سے ہے۔ یہ بات جہاں طمانیت بخش تھی وہیں قلبی اذیت کا باعث بھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ عاصم اسے اور بچوں کو چھوڑ گیا ہے۔ ایسے کہ اُسے اعتماد میں لینے کی زحمت بھی نہیں کی۔ اسے کچھ بتایا تک نہیں کیوں؟ بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ ان کے درمیان تو کبھی سخت کلامی تک نہیں ہوئی تھی۔ ازدواجی زندگی ہر اعتبار سے پُرسکون اور خوش گوار تھی۔ پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

اور وجہ کے بارے میں سوچتے سوچتے فوزیہ آخرکار عورت بن گئی اور عورت بننا اور زیادہ اذیت ناک تھا۔ جہاں مرد کے یوں چھوڑ جانے کی کوئی ظاہری وجہ نہ ہو، وہاں پھر ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے۔ دوسری عورت! عاصم ایسا نہیں تھا، کبھی نہیں رہا تھا لیکن پھر بھی مرد تو مرد ہی رہتا ہے نا۔ اس خیال نے اس کا سکون تباہ کردیا۔ نیند اڑ گئی۔ وہ بے حد معقولیت کے ساتھ اس خیال کو رد کرتی، اسے ذہن سے جھٹکتی۔ لیکن پھر کسی وقت اچانک وہ پھانس کی طرح ذہن میں چبھنے، کھٹکنے لگتا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ اُس نے اپنے لیے ایک جہنم دہکا لیا ہے لیکن اِس میں قصور عاصم کا بھی تھا۔ آخر ایسی کون سی بات ہوگئی تھی کہ وہ بغیر کچھ بتائے، بغیر کچھ کہے یوں چپکے سے اس کی زندگی سے نکل گیا۔ مگر اس کیفیت میں بھی اس نے ایک بڑا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کے لیے اسے مدد اور رہنمائی کی ضرورت تھی جو اسے وحید نجمی سے مل سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے نجمی کا نمبر ڈائل کیا دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن ریسیور نہیں اٹھایا گیا۔ اس نے چند منٹ کے وقفے سے دوبارہ رنگ کیا مگر بے سود... وہ گھر میں ہی نہیں تھا۔

وہ تیسری بار کوشش کررہی تھی کہ انٹرکام کا بزر چیخا۔ اُس نے فون رکھ کر انٹرکام اٹینڈ کیا "وحید نجمی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" سیکیورٹی گیٹ سے بتایا گیا۔

"انہیں اوپر بھیج دو۔"

نجمی اوپر پہنچا تو وہ دروازہ کھولے کھڑی تھی "میں خاصی دیر سے آپ کا نمبر ملا رہی تھی۔" اس نے کہا۔

"میں گھر سے یہاں کے لیے نکل چکا ہوں گا۔" نجمی بولا۔

دونوں ڈرائنگ روم میں آبیٹھے "خاور بھائی سے مل لئے آپ؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"جی ہاں اور اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کو اندھیرے میں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔"

فوزیہ سنبھل کر بیٹھ گئی "کیا آپ مجھ سے کچھ چھپاتے رہے ہیں؟"

"میں آپ کو اذیت نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔"

فوزیہ کا چہرہ سپید پڑگیا تھا "کچھ بھی معلوم نہ ہونے کی اذیت زیادہ بڑی ہوتی ہے۔" اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کا فیصلہ تو اب آپ ہی کر لیجئے گا۔ میں اِس وقت یہاں اس لیے آیا ہوں کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے' آپ کو بتادوں۔"

فوزیہ اسے متوقع نظروں سے دیکھتی رہی۔ ذرا سے توقف کے بعد نجمی نے جو کچھ کہا' وہ اس حقیقت کے باوجود کہ فوزیہ نے خود کو بدترین خبر کے لیے ذہنی طور پر تیار کرلیا تھا' فوزیہ کے لیے ایک بہت بڑا دھماکا تھا "قریشی صاحب اس لیے روپوش ہوئے ہیں کہ ان کا ایچ آئی وی پازیٹیو تھا۔ وہ ایڈز کے مریض ہیں۔"

فوزیہ تھوڑی دیر یوں بیٹھی رہی جیسے اُس کے جسم میں جان نہ رہی ہو۔ پھر اُس نے سرگوشی میں کہا "یہ ناممکن ہے۔"

"انہوں نے بھی معلوم ہونے پر یہی کہا تھا اور سچ یہ ہے کہ مجھے بھی یہ ناممکن لگتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔"

فوزیہ پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ اُس کے ہونٹ جیسے سل گئے تھے۔

"مجھے یقین ہے کہ اب آپ کو اُن بہت سے سوالوں کے جواب مل جائیں گے جنہوں نے آپ کو اب تک پریشان کررکھا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے آپ کو یہ سچ بتا کر اچھا کیا ہے یا بُرا۔ مگر اب اس سے فرق بھی کوئی نہیں پڑتا۔ بہرحال اب آپ کے سامنے ایک یقینی صورت حال ہے' کتنی ہی خوف ناک سہی۔"

فوزیہ بدستور خاموش تھی۔

نجمی اٹھ کھڑا ہوا "میں سمجھتا ہوں' آپ کو اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تنہائی کی ہے۔ آپ مجھے فون کررہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو مجھ سے کوئی بات کرنا تھی لیکن وہ بات بعد میں بھی ہوسکتی ہے۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ ضرورت کے ہر لمحے میں مجھے یاد رکھیے گا' خدا حافظ۔"

فوزیہ کے ہونٹ ہلے۔ شاید وہ اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی لیکن آواز نجمی تک نہیں پہنچ سکی تھی۔



وہ کسی گہرے کنوئیں میں قید تھی' جہاں وقت کا کوئی گزر نہیں تھا۔ سوچوں کے بھنور بنتے بگڑتے اور وہ ان میں ڈوبتی ابھرتی رہتی۔ ابتدا میں تو غیرجذباتی انداز میں سوچنا ہی ناممکن تھا۔ بس ایک ہی خیال تھا اس کے ذہن میں۔ یہ ناممکن ہے۔ اس خیال میں بھی اس کے لیے ایک تسلی۔۔۔۔ ایک طمانیت تھی۔ وہ شک کے جہنم سے بری ہوگئی تھی اور نجمی کی بات کو غلط قرار دینا ممکن نہیں تھا کیونکہ یہ سچ تھا کہ اس سچ نے اس کے سب سے مشکل سوال کا جواب دے دیا تھا۔ اب وہ جان گئی تھی کہ عاصم اتنی خاموشی سے اُس کی اور بچوں کی زندگی سے کیوں نکل گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی اور چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اسے اور بچوں کو شرم سار نہیں کرانا چاہتا تھا۔ انہیں تماشا نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں گناہ گار پر اتنے پتھر نہیں برسائے جاتے جتنے اُس بے گناہ پر برسائے جاتے ہیں جو دھوکے میں گناہ گار کی حیثیت سے پکڑا گیا ہو۔ ان جملوں کا تو مزہ ہی اور ہے۔۔۔۔ 'دیکھا سالے کو بڑا پارسا بنا پھرتا تھا۔ میاں ایسے لوگ زیادہ خراب ہوتے ہیں۔' عاصم خود کو بھی ان تیروں سے چھلنی نہیں کرانا چاہتا تھا اور اسے اور بچوں کو بھی ان سے بچانا چاہتا تھا۔ ایسے میں وہ اور کیا کرتا۔

وہ ہر بار یہاں تک سوچتی اور پھر اس کا ذہن۔۔۔۔ لیکن یہ ناممکن ہے کی تکرار کرنے لگتا۔ پھر نجانے کب ایسے ہی ایک موقعے پر وہ ایک ہی جست میں اس کنوئیں سے باہر آگئی۔ اس نے چیخ کر کہا تھا "ناممکن کیسے ہے؟" اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی لگی تھی اور اس کنوئیں سے نکلتے ہی اس کے اندر ایک ملامت ابھری۔ کیا اس امر کو ناممکن کہتے ہوئے اس نے اس امر کے ممکن ہونے کو عاصم کی بے وفائی سے مشروط کردیا تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ بات کیا تھی لیکن اب بہرحال وہ ہوش مندی اور حقیقت پسندی سے سوچ سکتی تھی۔ عاصم بہت اچھا شوہر' بہت اچھا باپ تھا اس کے کردار پر شک کرنے کی گنجائش۔۔۔۔۔

اچانک وہ بُری طرح چونکی۔ ارے' یہ کیا۔۔۔۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ کیوں؟ یہ سمجھنے میں اسے کچھ دیر لگی کہ رات ہوچکی ہے اور فلیٹ میں اندھیرا ہے۔ وہ اٹھی اور ٹٹول ٹٹول کر سوئچ بورڈ کی طرف گئی۔ روشنی ہوئی تو اس نے سکون کی سانس لی۔

وہ پھر صوفے پر آبیٹھی۔ یہ حقیقت تھی کہ عاصم کے کردار پر شک کرنے کی گنجائش نہیں تھی لیکن وہ خود بھی یہ حماقت کربیٹھی تھی تو پھر دوسرے کیا کریں گے۔ سچ ہے کہ انہیں موقع مل جائے تو وہ تو اُسے چھلنی کردیں۔ اس لحاظ سے عاصم نے درست فیصلہ کیا' لیکن اُس سے ایک غلطی ہوگئی۔ اُسے اُس کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔ یہاں پھر دل میں ٹیس اٹھی۔ اسے شاید مجھ پر اعتماد نہیں۔ پھر وہ پشیمان ہوگئی۔ اس کا پہلا ردعمل عاصم کے فیصلے کو درست ہی ثابت کررہا تھا۔

اب اسے پہلی بار موقع ملا کہ وہ عاصم کے کرب کو محسوس کرسکے۔ اور وہ لرز کر رہ گئی۔ وہ بے چارہ تو اپنے کندھوں پر اپنی صلیب اٹھائے پھر رہا تھا۔ کس قدر اکیلا ہوگا وہ؟ کہاں ہوگا۔۔۔۔ اور کیا کررہا ہوگا؟ دیر تک وہ یہ سوچ سوچ کر کڑھتی اور آنسو بہاتی رہی۔ یہ جذباتی ریلا گزرا تو اسے اپنا فیصلہ یاد آیا۔ اسے یاد آیا کہ اس سلسلے میں اسے نجمی سے مدد لینا تھی۔ اب وہ فیصلہ اور زیادہ اہم

ہوگیا تھا۔ اسے کسی نہ کسی طور عاصم تک اپنی بات پہنچانا تھی اور اس کی سب سے اچھی اور یقینی صورت یہی تھی۔
اُس نے سوچا نجمی سے اگلے روز بات کرے گی۔

○☆○

لیب کا مسئلہ توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا۔ عاصم کا ارادہ تھا کہ زمین خرید کر خود تعمیر کرائے گا۔ لیکن بابر کو اپنے مطلب کی ایک عمارت نظر آگئی۔ عاصم کو بھی وہ پسند آگئی۔ چنانچہ اسے خرید لیا گیا۔ اتنا کیش عاصم کے پاس موجود تھا۔ لاہور پہنچتے ہی اس نے مرشد حسین کے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھول لیا تھا۔ اب اسے باقی رقم سوئزرلینڈ سے منتقل کرانا تھی۔ اکاؤنٹ بابر کا بھی کھل گیا تھا۔

لیب کے لیے مشینری کی درآمد کے سلسلے میں ڈیوٹی سے استثنا لینا تھا۔ بابر کو دو ہفتے اسلام آباد میں دھکے کھانا پڑے۔ اس دوران عاصم نے اپنے لیے لاہور میں مکان کا بندوبست کرلیا۔ وہ علامہ اقبال ٹاؤن میں چھوٹا سا تین کمروں کا مکان تھا جو اس کے لیے بہت کافی تھا۔ مشینری کی درآمد کی اجازت ملتے ہی بابر نے سفر کی تیاری شروع کردی۔ اسے سوئزرلینڈ اور پھر جرمنی جانا تھا۔ اندازاً ایک ہفتہ اس میں بھی لگ جاتا۔ بابر نے اس پر بہت شور مچایا کہ عاصم نے اپنی رہائش کا بندوبست الگ کرلیا ہے۔

"یہی بہتر ہے۔" عاصم نے کہا "میں کہہ چکا ہوں کہ میں تمہیں اپنے معاملات میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے بھی لیب کی بلڈنگ میں تمہاری رہائش مجھے پسند نہیں آئی۔ اب تو تمہیں گھر بسانے کا سوچنا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد اپنے لیے کوئی اچھا سا بنگلا ڈھونڈو۔"

"جب میرا گھر بسایئے گا تو خود ہی ڈھونڈ لیجیے گا۔" بابر نے کہا "ویسے آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ میں بھابی اور بچوں سے ملنے کو تڑپ رہا ہوں۔"

"مل لینا، پہلے کام مکمل کرلو۔"

تین دن بعد بابر یورپ روانہ ہوگیا۔

اب عاصم کو اپنے اصل منصوبے پر کام کرنا تھا۔ پیسے کی تو ہر جگہ اہمیت ہے لیکن فلمی دنیا میں تو اس کی حیثیت ایک دیوتا کی سی ہے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اسے ملک اسٹوڈیوز میں دفتر مل گیا۔ پہلے ہی دن سے امداد پروڈکشنز کے دفتر میں بھیڑ لگ گئی۔ مزید ایک ہفتے میں پورے اسٹوڈیو کو معلوم ہوگیا کہ مرشد حسین بہت تگڑی اسامی ہے۔ دفتر میں ان ہدایت کاروں کی قطار لگ گئی جن کا کام یہی تھا کہ تگڑی پارٹی پھانسیں اور فلم بنانے کے نام پر سال دو سال کا خرچا نکال لیں۔ ان کے کریڈٹ پر آج تک کوئی فلم نہیں تھی۔

عاصم اس دنیا کو اسٹڈی کر رہا تھا۔ اسے کسی مناسب آدمی کی تلاش تھی۔ اس دوران وہ اس ماحول کو بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ وہ زندگی سے قریب ہوگیا تھا۔ فلم میکنگ اس کا پرانا شوق تھا۔ اب قدرت نے اسے اس شوق کی تکمیل کا موقع دے دیا تھا۔

○☆○

نجمی کو یقین تھا کہ فوزیہ کو سنبھلنے میں وقت لگے گا۔ شاک بہت بڑا تھا۔ لیکن کوئی شاک بھی آدمی سے بڑا نہیں ہوتا۔ آخرکار آدمی سنبھل جاتا ہے۔ فوزیہ بھی سنبھل جائے گی۔ البتہ یہ ضروری نہیں تھا کہ اب وہ اس سے رابطہ کرے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اب کبھی اس کا سامنا ہی نہ کرے۔

فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "وحید نجمی اسپیکنگ۔"

"میں فوزیہ بول رہی ہوں۔" دوسری طرف سے جانی پہچانی آواز آئی اور نجمی سناٹے میں رہ گیا "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے نجمی صاحب۔"

"جی، میں حاضر ہوں۔ فرمایئے۔" نجمی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے فلیٹ پر آسکتے ہیں؟"

"جی، حاضر ہوجاؤں گا۔"

"تو پھر آجایئے۔ بات تفصیل طلب ہے۔"

"میں آرہا ہوں۔"

اس بار گیٹ پر موجود گارڈ نے نہ اس کا شناختی کارڈ چیک کیا، نہ ہی انٹرکام پر فوزیہ سے رابطہ کیا "ہیلو مسٹر نجمی فرام ڈیلی سویرا" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے لیے گیٹ کھول دیا۔ نجمی کو حیرت تو ہوئی مگر اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ گارڈ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ اپنی موٹر سائیکل اندر لے گیا۔

اوپر، فوزیہ نے دروازہ کھولا اور بولی "آیئے، آپ ذرا ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔ بنا چکی ہوں۔"

"تو ثمینہ.....؟"

"وہ اب مری میں ہے۔"

فوزیہ اندر چلی گئی اور ذرا دیر بعد چائے کی ٹرے لے آئی۔ چائے کی ایک پیالی اس نے نجمی کی طرف بڑھائی۔ دوسری پیالی اپنے سامنے رکھ لی۔

"بیگم صاحبہ، آپ آہنی اعصاب کی مالک ہیں۔" نجمی نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"اعصاب کسی کے آہنی نہیں ہوتے۔" فوزیہ نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "کچی مٹی کے جسم پر کبھی اسٹیل کی پتری چڑھ جاتی ہے۔ اندر کی مٹی تو چٹختی بھی ہے اور جھڑتی بھی ہے۔ لیکن نظر کسی کو کچھ نہیں آتا۔"

"پھر بھی آپ بہت مضبوط ثابت ہوئی ہیں۔"

"پہلے مضبوطی بچوں کی وجہ سے تھی۔ اب اس دکھ کی وجہ سے ہے کہ اس وقت انہیں میری شدید ضرورت ہے۔ کیا گزر رہی ہوگی اُن پر۔ ان کے دکھ کے سامنے میرے دکھ کی کیا حیثیت ہے۔ اور اب تو میرے پاس اس یقین کی مضبوطی بھی ہے کہ وہ جہاں بھی

ہیں خیریت سے ہیں۔ اور میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت اسی بات کی ہے۔"

"قریشی صاحب بہت خوش نصیب ہیں۔"

فوزیہ نے تیزی سے بات کا رخ بدلا "نجمی صاحب' میں اپنے شوہر تک یہ پیغام پہنچانا چاہتی ہوں کہ وہ یا تو گھر آجائیں یا مجھے اپنے پاس بلالیں۔ کیونکہ اس وقت صرف میں ہی ان کے کام آسکتی ہوں۔ مجھے اُن سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

نجمی ہکا بکا رہ گیا "بیگم صاحبہ' اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کہاں ہیں تو میں یہ بات سب سے پہلے آپ کو بتاتا۔ آپ غلط سمجھ....."

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" فوزیہ نے اس کی بات کاٹ دی "لیکن میرا ان سے رابطہ ضروری ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ ہمیں جب علم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں تو......"

"میری سمجھ میں ایک طریقہ آگیا ہے۔ اس سے یہ کام یقینی طور پر ہو سکتا ہے۔"

ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود نجمی کی سمجھ میں کوئی ایسا طریقہ نہ آسکا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا "معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ' میں بالکل نہیں سمجھ سکا ہوں۔"

"اس پر عمل کرنے کے لیے مجھے آپ کا ٹیکنیکل تعاون درکار ہوگا۔"

"میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ لیکن پہلے مجھے سمجھائیں تو۔"

"اس مقصد کے لیے مجھے ایک اخبار کی اشاعت کا اہتمام کرنا ہوگا۔"

"اخبار؟" نجمی حیران رہ گیا "اس سے آپ کا مقصد کیسے حاصل ہوگا؟"

"ہم اخبار کی پبلسٹی کرتے ہوئے فوزیہ قریشی کی زیرِ ادارت پر خاص طور پر زور دیں گے۔ یوں عاصم ہمارا اخبار لینے پر مجبور ہو جائیں گے اور اخبار میں میرا کوئی مضمون ہوگا تو وہ اسے پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے اور اس مضمون کے ذریعے میں اُن سے ہر بات کر سکتی ہوں۔ ایسے کہ اس کے اصل مفہوم کو ان کے سوا کوئی سمجھ بھی نہیں سکے گا۔"

نجمی نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ اس عورت نے ہر قدم پر اسے حیران کیا تھا۔ اس میں ضبط اور حوصلہ بھی تھا' ذہانت بھی تھی اور قوتِ عمل بھی "آپ کا آئیڈیا بہت شاندار ہے لیکن اخبار نکالنا بے حد اعصاب شکن کام ہے۔"

"اعصاب شکن مراحل سے میں گزر چکی ہوں۔ بلکہ ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اعصاب شکن کام میرے بکھرے ہوئے اعصاب کو سمیٹنے میں مدد دے گا۔" فوزیہ نے کہا۔ "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں اس فیلڈ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اس کے لیے مجھے آپ کی مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔"

"تو نوعیت کی وضاحت بھی کر دیجیے۔" نجمی بولا "ویسے میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔"

"آپ مجھے اخبار کے لیے اہل اور محنتی کارکن فراہم کر سکتے ہیں۔ اشاعت کے مراحل سے مجھے روشناس کرا سکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کو میرے اخبار کی ادارت کرنا ہوگی۔"

"اور میں آپ کو مشورے بھی دے سکتا ہوں؟"

"ظاہر ہے مجھے سب سے زیادہ ضرورت انہی کی ہوگی۔"

"تو میرا پہلا مشورہ یہ ہے کہ مجھے ایڈیٹر نہ بنائیں۔ میں اس کا اہل نہیں۔ ایڈیٹر جم کر بیٹھنے والا آدمی ہوتا ہے۔ جبکہ میں وہ لڑکا ہوں جو شہر بھر کے کوڑا گھروں کو چھانتا پھرتا ہے' ان چیزوں کی تلاش میں جو کارآمد ہوتی ہیں لیکن لوگ انہیں بے کار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ اور ایڈیٹر ایسے تمام لڑکوں کی چن کر لائی ہوئی چیزوں کا معائنہ کرکے ان کی وقعت کا تعین کرتا ہے۔ فیصلہ کرتا ہے کہ کس چیز کو کب' کہاں' کیسے اور کس مقام پر استعمال کرنا ہے۔"

فوزیہ مایوس نظر آنے لگی "تو پھر؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے لیے اسٹاف کا بندوبست میں کردوں گا۔ لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ آپ کا پہلا مسئلہ تو ڈکلیریشن کا حصول ہے۔"

"نام تجویز ہو جائے تو میں کل ہی درخواست دے دوں۔"

"بیگم صاحبہ' ڈکلیریشن آسانی سے نہیں ملے گا۔" نجمی نے کہا۔

"اس جمہوری دور میں بھی!"

"جی ہاں۔ جمہوری حکومت عوامی مینڈیٹ سے قائم ہوتی ہے لہٰذا عوام کی طرف سے بے پروا ہوتی ہے۔ کیونکہ عوام تو احساسِ جرم کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اف بھی نہیں کرسکتے۔ حکومت کو خطرہ بس عدلیہ اور صحافت سے ہوتا ہے۔ عدلیہ کو تو کسی طرح قابو کرلیا جاتا ہے کیونکہ تقرریوں کا اختیار حکومت کو ہوتا ہے۔ لیکن صحافت میں تمام لوگوں کو نہیں باندھ کر رکھا جاسکتا۔ صحافی دردِ سر بنے رہتے ہیں۔ اس لیے حکومت نئے آنے والوں کو بڑی سختی سے چیک کرتی ہے۔ بلکہ وہ چاہتی ہی نہیں کہ مزید لوگ آئیں اور اس کے دردِ سر میں اضافہ کا سبب بنیں۔"

"بہرکیف میرا خیال ہے کہ یہ کام ہو جائے گا۔ کچھ ایسے لوگوں سے میرے تعلقات ہیں جو یہ کام کرا سکتے ہیں۔"

"بس تو بسم اللہ کیجیے۔ لیکن ایک مشورہ اور بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ روزنامے کی بجائے ہفت روزے کا ارادہ کیجیے۔ اس میں دردِ سر اور پھیلاؤ کم ہوگا۔ ڈکلیریشن بھی نسبتاً آسانی سے مل جائے گا۔"

فوزیہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ لگتا تھا فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے۔

"دیکھیں نا آپ کا مقصد ہفت روزے سے بھی پورا ہو سکتا

ہے۔" مجی نے کہا "بلکہ میرے خیال میں آپ کے مقصد کے حصول کے لیے ہفت روزہ زیادہ موثر رہے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"ہر اعتبار سے۔ کالم آپ کے لیے زیادہ موثر پیرایہ اظہار نہیں۔ افسانہ زیادہ مناسب رہے گا۔ اب آپ ہر روز ایک نئے انداز میں اپنے پیغام پر مبنی کالم تو لکھنے سے رہیں پھر عام قارئین بھی اس کالم میں اور طرح کی دلچسپی لیں گے۔ وہ انہیں مضحکہ خیز اور پھر معنویت سے پُر لگے گا۔ افسانے میں یہ قباحت نہیں ہوتی۔ دوسرے اخبار کی زندگی بمشکل ایک دن ہوتی ہے' دوسرے دن وہ باسی ہوجاتا ہے۔ اسٹال پر اس کی گنجائش نہیں رہتی۔ جبکہ ہفت روزہ ہفتوں اسٹال پر موجود رہتا ہے۔"

فوزیہ سر کو تفہیمی جنبش دیتی رہی تھی "میں آپ کی بات سمجھ گئی۔" اس نے کہا "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"اس کا تجربہ ہوجانے کے بعد آپ چاہیں تو روزنامے کا اجرا بھی کرسکتی ہیں۔"

"بس تو یہ طے ہوگیا' ڈکلیریشن کی درخواست میں دے رہی ہوں۔ باقی سب کچھ آپ کو کرنا ہے۔ آپ سویرا سے استعفیٰ دے دیں۔"

"بہت بہتر۔"



عوامی لیب اینڈ بلڈ بینک کا افتتاح بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ صوبائی وزیر صحت تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ عاصم نے تقریب میں شرکت نہیں کی۔ وہ خود کو نمایاں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اُس کی تجویز پر لیبارٹری کی پبلسٹی کے دوران یہ اعلان کیا گیا تھا کہ افتتاح کے روز کوئی بھی شخص مفت خون ٹیسٹ کراسکتا ہے چنانچہ خون ٹیسٹ کرانے والوں کا ہجوم تھا۔ افتتاح کے بعد بابر نے یہ اعلان بھی کیا کہ اس کا بلڈ بینک خون بطور عطیہ یا قیمتاً اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک خون دینے والے کے خون کی مکمل اسکریننگ نہ ہوجائے۔ اس نے اپنی تقریر میں اس بات کی اہمیت کو بھی واضح کیا تھا اور لوگوں کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کی تلقین کی تھی۔

اُس رات بابر' عاصم سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔ عاصم نے اس سے تقریب کا احوال سنا اور خوش ہوا "اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے لیکن تمہیں یہیں نہیں ٹھہرنا ہے۔" وہ بولا "میری خواہش ہے کہ ملک کے کم از کم ہر بڑے شہر میں لیبارٹری قائم کی جائے اور اسے اسی انداز میں چلایا جائے۔ یہ میری خواہش ہے۔"

"انشاء اللہ آپ کی خواہش پوری ہوکر رہے گی۔" بابر نے بے حد خلوص سے کہا "لیکن یہ آپ نے فلم کا کیا چکر چلایا ہے؟"

"تم جانتے ہو کہ یہ شوق مجھے لڑکپن سے تھا۔ مجھے خبط تھا کہ خوب صورت فلمیں بناؤں۔ اب فرصت ملی ہے تو سوچا کہ یہ شوق بھی پورا کرلیا جائے۔"

بابر اس بات سے واقف تھا۔ لیکن اس نے وطن واپس آکر عاصم کو غیر معمولی صورت حال میں پایا تھا۔ پھر بے حد اہم آٹھ برسوں کے دوران وہ عاصم سے دور رہا تھا۔ اسے عاصم کی فلم میکنگ سے دلچسپی یاد تھی۔ مگر یوں فلمی دنیا میں داخل ہونا' نہ جانے کیوں اسے یہ سب بے حد غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ عاصم کا اسے فون کرنا... واپسی پر اپنے گھر کی بجائے طارق روڈ کے ایک فلیٹ میں تنہا زندگی گزارتے ملنا... بیوی بچوں سے دوری' اور یہ کہانی کہ وہ مجرم نہیں ہوتے ہوئے بھی مجرم ثابت ہوچکا ہے' یہ سب اسے افسانہ سا لگ رہا تھا۔ بابر بھی بچہ نہیں تھا۔ اس نے زندگی کا ایک حصہ پردیس میں اور تنہا گزارا تھا۔ اس میں سوجھ بوجھ بھی تھی اور ذہانت بھی۔ اس نے اب تک جو مشاہدہ کیا تھا وہ عاصم کی باتوں کی نفی کرتا تھا۔ پولیس سے چھپنے والے مجرم تو راہ میں کسی پولیس والے کو دیکھ لیں تو ان کا چہرہ فق پڑجاتا ہے۔ عاصم کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ایسا شخص ہرگز نہیں لگتا تھا جس پر کوئی جرم' خواہ غلط ہی سہی' ثابت ہوگیا ہو اور وہ قانون سے چھپتا پھر رہا ہو۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس صورت میں اسے ملک سے نکلنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ وہ بہ آسانی کہیں بھی جاسکتا تھا۔ دولت اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔

تو پھر؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ عاصم سے کوئی اخلاقی جرم سرزد ہوا ہے۔ ایسا شخص بھی مجرم تو ہوتا ہی ہے۔ بابر کو اس خیال میں وزن محسوس ہوا۔ لگتا یہی تھا کہ عاصم خود اپنے آپ سے' اپنی بیوی اور بچوں سے بھاگ رہا ہے اور پھر فلمی دنیا میں جانا۔ بابر جانتا تھا کہ مصنوعی روشنیوں کی اس دنیا میں کون سے سکے چلتے ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ کہ اگر عاصم کی بیان کی ہوئی نامکمل کہانی درست تھی تو بھی عاصم کا بیوی کو کچھ نہ بتانا غیر فطری تھا۔ بابر' فوزیہ سے کبھی نہیں ملا تھا لیکن فون پر اس سے بات ہوتی رہی تھی۔ فوزیہ اور بچوں کی تصویریں اسے باقاعدگی سے بھیجی جاتی رہی تھیں۔ فوزیہ اسے بہت اچھی لگی تھی اور عاصم تو تھا ہی بہت اچھا۔ اس گھرانے میں محبت ہی محبت' ہم آہنگی ہی ہم آہنگی تھی۔ ہاں یہ ایک جواز بنتا ہے کہ عاصم نے فوزیہ کو اس لیے اپنے متعلق بے خبر رکھا کہ پولیس اس کے ذریعے اس کے متعلق معلوم نہ کرلے۔ ایسا ہوتا تو ہے لیکن بے حد ہاٹ کیسز میں۔ یہاں یہ بات بھی نہیں تھی۔ بابر کو وطن واپس آئے کافی دن ہوگئے تھے۔ وہ باقاعدگی سے اخبارات کا مطالعہ کرتا رہا تھا۔ مگر عاصم قریشی کے کسی کیس کی خبر کہیں نہیں چھپی تھی۔ نہ ہی یہ خبر چھپی تھی کہ پولیس فوزیہ قریشی سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کررہی ہے۔

مگر بابر یہ سب کچھ عاصم سے نہیں کہہ سکتا تھا نہ کچھ پوچھ سکتا تھا اور نہ ہی اُس کے حکم کے خلاف کچھ کرسکتا تھا۔ وہ تو اس کا بندہ بے دام تھا۔ اس لیے کہ اسے سب کچھ یاد تھا۔ اُس پل سے آج تک کا ہر لمحہ اسے یاد تھا۔ جب اس نے عاصم کو اور عاصم نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اُس پہلی شام اسے گھر لے

جاتے ہوئے بڑے ابّا اور بھائی جان پہلے بازار گئے تھے۔ اس کے لیے کپڑے خریدے گئے تھے اور کتابیں بھی۔ بھائی جان نے اصرار کر کے ادائیگی اپنی جیب سے کی تھی۔ اور اس سلسلے میں ہونے والی گفتگو بابر کو آج بھی یاد تھی۔

بھائی جان نے بڑے ابّا سے کہا تھا "ابّو' میں بابر کو اپنی ذمے داری کے طور پر قبول کر چکا ہوں۔ اس کے تمام اخراجات میں پورے کروں گا۔"

"لیکن بیٹے' ابو تو اس کا میں ہی ہوں۔" بڑے ابّا نے کہا تھا۔

"ابو' یقین کریں وہ چھوٹا بھائی جی گیا ہوتا تب بھی میں یہی کرتا۔"

"مگر عاصم' میرے پاس جو کچھ بھی ہے تمہارا ہی تو ہے۔"

"نہیں ابو' جب میں تعلیم مکمل کر کے کاروبار سنبھالوں گا' تب یہ سب کچھ میرا ہوگا۔ ابھی نہیں ہے۔ ہاں ابھی میں آپ کی ذمے داری ہوں۔ بابر میری ذمے داری ہے۔"

"تو تعلیم کے دوران تم یہ ذمے داری کیسے اٹھاؤ گے؟" بڑے ابا یک لخت سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"پارٹ ٹائم جاب کروں گا اس کے لیے۔ آپ مجھے کام دیں گے نا؟"

"ٹھیک ہے بیٹے۔ لیکن...."

"بس ابو' یہ طے ہو گیا۔ اس میں کئی فائدے ہیں میرے۔ میں ذمے دار بھی ہو جاؤں گا اور دو سال بعد مجھے ایم بی اے کرنا ہے۔ اس کے لیے تربیت بھی ہو جائے گی۔ کاروبار کے رموز بھی سمجھ لوں گا میں۔"

بابر کو یاد تھا.... خوب یاد تھا۔ اس کے اخراجات بھائی جان نے ہمیشہ اپنی تنخواہ سے پورے کیے تھے۔ بڑے ابّا صرف اسے تحفے دے سکتے تھے۔ کاغذات پر وہ بڑے ابّا کا بیٹا تھا لیکن اس کے اصل سرپرست بھائی جان تھے۔ ایسی محبت اور اس بچے کے لیے' جس نے آنکھیں کھول کر ماں باپ کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ جس نے زندگی کے چھ سال یتیم خانے میں گزارے تھے۔ جس کا روئے زمین پر کوئی اپنا نہیں تھا۔ بھائی جان نے تو اسے ہمیشہ کے لیے خرید لیا تھا۔ آج وہ جو کچھ بھی تھا' اللہ کے بعد بھائی جان کی بدولت تھا۔ وہ اگر بدترین مجرم بھی تھے' تب بھی اُس کے لیے صرف بھائی جان تھے۔

"کہاں کھو گئے بھائی۔" عاصم نے اسے چونکا دیا۔

"کہیں نہیں بھائی جان۔ کبھی کبھی پرانی حسین یادیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔"

"اب تم عملی زندگی میں قدم رکھ چکے ہو بھائی۔ یادوں سے کھیلنا چھوڑ دو۔"

"کچھ یادیں تو سرمایہ حیات ہوتی ہیں بھائی جان۔" بابر نے گہری سانس لے کر کہا "خیر چھوڑیں" اچانک اس کے لہجے میں التجا در آئی "بھائی جان.... بھابی اور بچوں سے ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔"

"فی الحال یہ مناسب نہیں ہے بابر۔"

"بھائی جان' بھابی کتنی تنہا اور پریشان ہوں گی۔ بچوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔"

"تم کیا سمجھتے ہو' اس کا احساس تمہیں مجھ سے زیادہ ہو سکتا ہے۔" عاصم نے چڑچڑے پن سے کہا۔ مگر فوراً ہی اسے اپنے لہجے کی درشتی کا احساس ہو گیا "معاف کرنا بابر' میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں بھائی جان۔ میں آپ کی کیفیت سمجھ رہا ہوں۔ اب ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو بھائی۔ تم میرا سراغ بن سکتے ہو۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں پتا ہے کہ میں اور تمہاری بھابی تمہارے لیے ایک بہت پیاری لڑکی تلاش کر چکے ہیں۔" عاصم کا لہجہ خوش گوار ہو گیا "یہ الگ بات کہ تم پہلے ہی کسی کو پسند نہ کر چکے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں بھائی جان۔ آپ کے انتخاب سے اچھا کوئی ہو سکتا ہے بھلا۔"

"کاش! میں تمہاری شادی میں شریک ہو سکوں۔" عاصم کے لہجے میں حسرت تھی۔



امداد پروڈکشنز کے آفس میں اب گِدھوں کی بھیڑ نہیں رہتی تھی۔ فنانس کی تلاش میں آنے والے تمام گِدھ اڑ چکے تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ مرشد حسین نہ تو بے وقوف ہے اور نہ ہی عیاشی کے ارادے سے اس میدان میں اترا ہے۔ اس کے کچھ سنجیدہ قسم کے عزائم تھے جنہیں وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکے۔ ساتھ ہی انہیں یہ احساس بھی تھا کہ مرشد حسین کی نظریں انہیں آرپار دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور فلمی گِدھ یہ بات کبھی پسند نہیں کرتے۔ مرشد حسین شاہ خرچ آدمی ضرور تھا مگر سمجھ دار اور منہ پھٹ بھی تھا۔ وہ ان میں سے ہر ایک کو واضح طور پر بتا چکا تھا کہ اس کی رائے میں وہ لوگ فلم میکنگ کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ لہٰذا اس کے کسی کام کے نہیں۔

یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی کہ مرشد حسین ملک کے ایک نامور ادیب سے ایک فلم کا اسکرپٹ لکھوا رہا ہے۔

اس دوران اسٹوڈیو کے مالک سعید ملک سے مرشد حسین کی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ وہ زیادہ وقت ملک صاحب کے عالی شان دفتر میں گزارتا' جہاں تاش کی محفلیں جمتی تھیں۔ کبھی وہ نہ جاتا تو ملک صاحب خود اس کے دفتر میں چلے آتے۔ حالانکہ وہ کبھی کسی پروڈیوسر کے آفس میں جانے کے روادار نہیں تھے۔ مرشد حسین کی وضع داری' انکسار اور خود اعتمادی نے ان کا دل جیت لیا تھا۔ ملک صاحب فلمی دنیا کی روایت کے مطابق نہایت شوقین

مزاج آدمی تھے۔ فلم بنانے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسٹوڈیو سے جو کچھ کماتا ہوں، فلم میں کیوں گنواؤں۔ لیکن ہر اونٹ ایک دن پہاڑ کے نیچے ضرور آتا ہے۔ پچھلے دنوں وہ ایک حسین لڑکی کے پھیر میں ایسے آئے کہ فلم بنانے پر آمادہ ہو گئے۔ لڑکی کو مرشد حسین نے بھی دیکھا تھا۔ وہ بلاشبہ بہت حسین اور طرح دار لڑکی تھی لیکن مرشد حسین کا خیال تھا کہ اداکاری اس کے بس کی بات نہیں۔ ادھر لڑکی نے ملک صاحب کو ایسا شیشے میں اتارا تھا کہ وہ ایک معروف فلمی رائٹر سے خاص طور پر اس کے لیے فلم لکھوا رہے تھے۔

وہ لڑکی ہی مرشد حسین کے عظمت مرزا سے تعارف کا سبب بنی! اس روز وہ ملک صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر شخص آندھی طوفان کی طرح دفتر میں آیا "ملک صاحب، آپ اس نیلوفر کے بارے میں سنجیدہ ہیں؟" اس نے پوچھا۔

ملک صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں "میں نے کبھی آپ سے مذاق نہیں کیا۔ پھر آپ کو یہ سوال کرنے کا حق کیسے مل گیا۔"

"ملک صاحب، اس لڑکی کو اسکرین ٹیسٹ کی ہرگز ضرورت نہیں۔ وہ ویسے بہت خوب صورت ہے لیکن فلم کے لیے نہیں۔ اداکاری تو خیر اسے آتی ہی نہیں۔ اسکرین پر اس کا حُسن بھی جاتا رہے گا۔ وہ بس ایسے ہی ٹھیک ہے ملک صاحب۔" وہ شخص ایک آنکھ بند کر کے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

مرشد نے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ اُن کا چہرہ تمتما رہا تھا "میں نے آپ سے تبصرہ کرنے کو کب کہا مرزا صاحب۔"

"تبصرہ تو میں نے اب تک کیا ہی نہیں ہے ملک صاحب۔ وہ اب سن لیں۔ اس کا کوئی ٹیسٹ کرانا ہی ہے تو پورنو ٹیسٹ کرا لیں اور اسکرین ٹیسٹ کی کمی بیشی کے سلسلے میں مشورہ بھی سن لیں۔ وہ پلاسٹک سرجری کا کیس ہے سر جی۔ سرجری کے بعد اے ون ہو جائے گی۔ آج تک کی تمام اداکاراؤں کو مات دے دے گی۔"

مرشد کے کان مرزا کی آواز پر لگے تھے اور نظریں ملک صاحب کے چہرے پر جمی تھیں۔ اب ملک صاحب بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔ لیکن مرزا کے اگلے جملے پر ان کا چہرہ پھر تپ اٹھا۔

"اداکاری آپ اسے پھر بھی نہیں سکھا سکیں گے۔ خیر جی، اب آپ مشورہ بھی سن لیں۔ نتھنوں کو پانچ ملی میٹر اوپر لے جاتے ہوئے مرکزی ناک کی تین ملی میٹر کی چھلائی کر دیں۔ بالائی ہونٹ کو خم دیتے ہوئے دو ملی میٹر چھیل دیں۔"

"بس مرزا صاحب" ملک صاحب نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "آپ اب ایک لمحہ بھی نہ رکیے۔ فوراً تشریف لے جائیے یہاں سے اور ہاں.... ریاض کو بھیج دیجیے۔"

"بہتر ملک صاحب۔" وہ چلا گیا۔

مرشد حیران تھا۔ اس نے کبھی کسی کو ملک صاحب سے اس طرح بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ بڑے بڑے پروڈیوسر ڈائریکٹر ان کے سامنے گھگیاتے تھے۔ جبکہ یہ مرزا تو کوئی ایسی اچھی حیثیت والا بھی نہیں تھا۔ بلکہ یقینی طور پر وہ کوئی فوٹوگرافر تھا۔ لیکن ملک صاحب اس سے آپ جناب کر کے بات کر رہے تھے۔

"یہ کون ذات شریف تھے؟" اُس نے ملک صاحب سے پوچھا تھا۔

"ارے عظمت مرزا کو نہیں جانتے؟" ملک صاحب نے حیرت سے کہا۔

مرشد کو شاک لگا۔ یہ.... عظمت مرزا! اسے یاد تھا کہ عظمت مرزا بہت وجیہہ اور خوش پوش آدمی تھا۔ وہ ایک بے مثال کیمرا مین تھا۔ فری لانسر تھا۔ ہر اچھی فلم کے لیے اسے سائن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ پھر وہ امریکا گیا اور وہاں ہدایت کاری کی باقاعدہ تربیت حاصل کی، ڈپلوما لیا۔ وطن واپس آکر اس نے ذاتی فلم پروڈیوس اور ڈائریکٹ کی اور اپنا سب کچھ اس میں جھونک دیا۔ وہ بہت خوب صورت فلم تھی۔ ناقدین نے اسے بے حد سراہا۔ اسے بے شمار ملکی اور غیر ملکی ایوارڈ ملے۔ لیکن اس فلم نے عظمت مرزا کا بھٹہ بٹھا دیا۔ انتقام کہیے یا سنبھلنے کی کوشش، طوفان کے بعد مرزا نے تین چار پنجابی فلمیں ڈائریکٹ کیں، دوسروں کے لیے۔ لیکن وہاں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر اس کا نام بھی سننے میں نہ آیا۔

"یہ... یہ عظمت مرزا؟" مرشد نے کہا "کیمرا مین ڈائریکٹر عظمت مرزا؟"

"ہاں۔ یہ وہی ہے۔ فلم لائن میں آدمی ایسے ہی تباہ ہوتا ہے۔ آخری فلم کی ناکامی کے بعد ہدایت کار کی حیثیت سے تو اس کا کیریئر ختم ہو گیا تھا۔ ہے یہ بہت باصلاحیت اور یہ بات جانتا بھی ہے۔ اُس وقت بھی کیمرا مین کی حیثیت سے یہ ٹاپ پر تھا۔ لیکن اس نے ہر پیشکش ٹھکرا دی۔ کہنے لگا، اب مجھ سے ردی فلمیں نہیں ہوں گی۔ فلمیں ڈائریکٹ کرنے کے دوران اس نے ہر طرح کی لت بھی لگالی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے صحت بھی تباہ ہو گئی۔ کام بھی نہیں تھا اور اسٹوڈیو کے علاوہ اس کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے اسٹوڈیو کے چیف کیمرا مین کی حیثیت سے کام کرنے کی پیشکش کی۔ اور جانتے ہو اس نے کس شرط پر قبول کی۔ یہ صرف میری فلم کے لیے عملی کام کرے گا۔ اور اب میرے ساتھ اس کا رویہ دیکھ لو۔"

اتنے میں کیمرا مین ریاض دفتر میں آگیا "آپ نے مجھے بلوایا صاحب جی۔"

"نیلوفر کہاں ہے؟" ملک صاحب نے پوچھا۔

"وہ جی کیمرا ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ مرزا صاحب سے باتیں کر رہی ہے۔"

ملک صاحب پریشان نظر آنے لگے "نیلوفر کا موڈ کیسا ہے؟ باتیں کیا ہو رہی ہیں؟"

"نیلو جی کا موڈ بہت اچھا ہے صاحب جی۔ مرزا صاحب انہیں بتا رہے ہیں کہ ان کے اسکرین ٹیسٹ کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کی نظروں سے اچھا ٹیسٹ کیمرا نہیں کر سکتا۔ صاحب جی، میں کیا

بتاؤں۔ انہوں نے نیلوفر کے حسن کی ایسی ایسی تعریف کی کہ میں نے کبھی نہیں سنی۔ نیلو جی نے بھی نہیں سنی ہوگی۔ اور اب وہ انہیں بتا رہے تھے کہ ملی میٹر اور انچ کا کیا تعلق ہے۔"

ملک صاحب مسکرائے "بس تم دوڑ جاؤ' اب وہ کسی بھی لمحے اسٹار بن جائے گا۔ تم نیلوفر کا اسکرین ٹیسٹ کرو گے۔"

"ٹھیک ہے صاحب جی۔"

"ملک صاحب' ایک بات کہوں۔" ریاض کے جانے کے بعد مرشد نے کہا۔

"وس کہو۔"

"عظمت مرزا کو آپ مجھے دے دیں۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔ دیکھ رہے ہو' میں تو اب اس سے تنگ آگیا ہوں۔"

"وہ میرے پاس آنا قبول کرلے گا؟"

"کیسے نہیں کرے گا۔ میری ملازمت میں ہے وہ۔" ملک صاحب نے اکڑ کر کہا "مگر شرط کے مطابق وہ میرے علاوہ کسی اور کی فلم شوٹ نہیں کرے گا۔"

"ٹھیک ہے' بس آپ اسے کہہ دیں کہ وہ میرے دفتر میں بیٹھا کرے۔"

اُن کے درمیان پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دو گھنٹے بعد ریاض نیلوفر کے اسکرین ٹیسٹ کے تازہ پرنٹس لے آیا۔ ملک صاحب نے تصویروں پر ایک نظر ڈالی اور ان کا منہ اتر گیا۔ تمام تصویریں دیکھنے کے بعد انہوں نے مرشد کی طرف بڑھادیں "دیکھو انہیں اور اس کی نظر کے قائل ہو جاؤ۔" انہوں نے کہا۔

وہ نیلوفر کے ہر زاویے سے لی گئی تصویریں تھیں۔ پہلی تصویر پر نظر ڈالتے ہی مرشد حیران رہ گیا۔ پھر ہر تصویر کے ساتھ اس کی حیرت بڑھتی گئی۔ بات ہی حیرت کی تھی۔ نیلوفر ہر اعتبار سے خوب صورت لڑکی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے کہیں عدم تناسب کا احساس نہیں ہوتا تھا مگر کیمرے کی آنکھ نے اس کے چہرے میں عدم تناسب ڈھونڈ لیا تھا۔

مرشد کو مرزا کی کہی ہوئی ہر بات یاد تھی۔ اس نے تصویروں میں اس کی تجویز کردہ ترامیم پر عمل کرکے دیکھا اور اُس کی نظر کا قائل ہوگیا۔ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ مرزا کی تجویز کردہ پیمائشیں تک درست ہوں گی۔

"ہیرا آدمی ہے آپ کے پاس۔" وہ تصویریں ملک صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑبڑایا۔

"لیکن جاننے کے لیے۔" ملک صاحب نے زہریلے لہجے میں کہا "اور اب تمہارے پاس پہنچنے والا ہے۔"

○☆○

فوزیہ پہلے ہی مرحلے میں نجمی کی قائل ہوگئی۔ اُس کی کہی ہوئی بات حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی تھی۔ اُس کے پاس اثر و رسوخ بھی تھا اور پیسہ بھی۔ پھر بھی ڈکلیریشن کا حصول ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ فوزیہ کو یہ احساس بھی ہوگیا کہ اگر اس نے روزنامے کے لیے درخواست دی ہوتی تو نجانے کیا ہوتا۔ اسے تو ہفت روزے کے حصول میں پاپڑ بیلنے پڑ رہے تھے۔ جسے سرکاری زبان میں نیم بے ضرر سمجھا جاتا ہے۔

ڈکلیریشن کے علاوہ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ دفتر کا بندوبست کیا جاچکا تھا۔ اسٹاف رکھا جاچکا تھا۔ تین شماروں کا عام میٹر مکمل تھا۔ فوزیہ نے نجمی کی مدد سے وہ افسانہ مکمل کرلیا تھا جو درحقیقت عاصم کے نام کھلا خط تھا۔ وہ اُس سے مطمئن بھی تھی۔ اُس نے دل کی ہر بات اُس میں کہہ دی تھی۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ چاہتی تھی کہ ابھی سے پبلسٹی شروع کردی جائے لیکن نجمی نے اس موقع پر بھی اس سے اختلاف کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ضروری نہیں کہ اسی نام سے ڈکلیریشن ملے' جو ہم چاہتے ہیں۔ فارم میں متبادل نام اسی لیے طلب کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا پبلسٹی سے پہلے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ ڈکلیریشن کس نام کا ملا ہے۔

اس عرصے میں یہ ضروری تھا کہ کام جاری رکھا جائے۔ فوزیہ کو یہ کام بہت اچھا لگا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مسائل سے اس کا ذہن بڑی حد تک ہٹ گیا تھا۔ اگر ان مسائل میں وہ نہ گھری ہوتی تو یقیناً اس وقت کو بہت زیادہ انجوائے کرتی۔ اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ آسائش کے دنوں میں کچھ کرنے کا خیال لوگوں کو کم ہی سوجھتا ہے۔ کیونکہ مصروفیت کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی۔ خدا کا دیا سبھی کچھ موجود جو ہوتا ہے۔

نجمی فوزیہ کی ذہانت کا پہلے ہی قائل ہوگیا تھا۔ اب اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ فوزیہ معاملات کو کتنی تیزی سے سمجھتی ہے۔ اتنے سے عرصے میں پرچے کے بیشتر معاملات اور مراحل وہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ اسے لوگوں کو ہینڈل کرنا' ان سے کام لینا بھی آتا تھا۔ اب صرف اشاعتی مراحل اس کی دسترس سے دور رہ گئے تھے۔ اور وہ بھی اس لیے کہ ابھی پرچا اشاعت کے مراحل سے نہیں گزرا تھا۔

ڈکلیریشن کے حصول کے سلسلے میں خاور کے ایک دوست صنعت کار فوزیہ کی مدد کررہے تھے۔ ان کے حکومتی حلقوں میں اچھے تعلقات تھے۔ مگر اب تک ان کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ نئی حکومت نے اپنے پہلے سال میں ابھی تک کسی روزنامے یا ہفت روزے کے لیے ڈکلیریشن نہیں دیا تھا۔ کچھ یوں بھی تھا کہ ڈکلیریشن کے لیے درخواستیں بھی نہیں دی گئی تھیں۔ جس ترقی پذیر ملک میں کاغذ کی قیمت ہر سال چڑھتی ہو وہاں لفظوں کو فروغ کب ہوتا ہے۔ وہاں کتاب' اخبار یا رسالہ چھاپنے کی حماقت کون کرے اور کب تک کرے۔ یہاں تو اب کاغذ کی ہوش ربا گرانی کی وجہ سے چلتے ہوئے اخبار اور رسائل بند ہونے کے مرحلے میں داخل ہو رہے تھے۔ اسی لیے تو ہر حکومت آئے اور کاغذ کی قیمت میں خوف ناک اضافہ

کرتی ہے۔ آٹے کی قیمت میں اس لیے کہ غریب آدمی آٹے کی فکر میں لگ جائے اور کوئی اور فکر نہ کرے۔ کاغذ کی قیمت میں اس لیے کہ کتاب کی اشاعت مشکل ہو جائے اور تعلیم اور اُس کے نتیجے میں شعور عام نہ ہو جائے۔ اخبار اور رسائل کی قیمت اتنی بڑھ جائے کہ لوگوں کی قوت خرید سے باہر ہو جائے۔ اس کے بعد لکھنے والے حق لکھتے رہیں، بے شک حقِ قلم ادا کرتے رہیں۔ قصیدہ خوانوں کے آنسو تو اشتہارات کا ریٹ بڑھا کر بھی پونچھے جاسکتے ہیں۔

فون کی گھنٹی بجی۔ فوزیہ نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف طاہر بیگ تھے۔ خاور ندیم کے صنعت کار دوست "سیکریٹری اطلاعات سے آپ کے لیے وقت لے لیا گیا ہے۔" انہوں نے فوزیہ کو خوش خبری سنائی "پرسوں سہ پہر تین بجے آپ اسلام آباد روانگی کا بندوبست کرلیں۔ پلیز' انہیں اپنے سیاسی خیالات کے بارے میں اچھی طرح مطمئن کر دیجیے گا۔ انشاء اللہ آپ کا کام ہو جائے گا۔"

"میں شکر گزار ہوں آپ کی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں۔"

ریسیور رکھ کر فوزیہ نجمی کی طرف مڑی "مجھے اسلام آباد جانا ہے۔ سیکریٹری اطلاعات سے وقت لے لیا گیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیسٹ آف لک" نجمی نے دفتر میں بیٹھے لوگوں کی طرف ہاتھ گھما کر اشارہ کیا "فور آل آف اُس۔"

○☆○

ساڑھے گیارہ بجے عظمت مرزا امداد پروڈکشنز کے دفتر میں داخل ہوا اور بے تکلفی سے مرشد حسین کے سامنے بیٹھ گیا "آپ شاید مرشد حسین ہیں؟"

"جی ہاں" مرشد نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"حکم ہوا ہے کہ اب میں آپ کے دفتر میں حاضری لگایا کروں۔"

"فرمائش میری ہی تھی۔"

"وجہ پوچھ سکتا ہوں اس عنایت کی۔" عظمت مرزا کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

"بس آپ مجھے اچھے لگے تھے۔ جی چاہا کہ آپ کے ساتھ وقت گزارا جائے۔" مرشد نے کہا۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں۔ لوگ مجھے محض مجبوراً برداشت کرتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ یہ بڑی ناقدری کا زمانہ ہے۔"

"مجھے کرنا کیا ہوگا؟"

"وہی جو کیمرا ڈیپارٹمنٹ میں کرتے تھے۔"

"وہاں تو میں لوگوں کا جینا عذاب کرتا تھا۔" مرزا نے سادگی سے کہا۔

"یہاں میں حاضر ہوں۔ ناکافی لگوں تو بتا دیجیے گا' کچھ اور لوگوں کو ملازم بھی رکھ لوں گا۔"

عظمت مرزا کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ورنہ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ تک نہیں آئی ہوگی۔ اس لمحے وہ بہت پیارا لگا "آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ مگر فوراً ہی کھسیا بھی گیا "حالانکہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ مگر میں نے یہ بات کبھی ملک صاحب سے ان کی ملازمت کے دوران بھی نہیں کہی۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم کھرے آدمی ہو بہرحال پسندیدگی کا شکریہ۔ یہ بتاؤ کیا پیو گے؟"

"کیا پی سکتا ہوں۔" مرزا نے بے بسی سے کہا "سنا ہے کہ آپ بدذوق آدمی ہیں۔"

مرشد کو ہنسی آگئی "بدذوق تو ہوں لیکن متواضع بھی ہوں۔" اس نے شگفتگی سے کہا "ویسے آپ کی خوش ذوقی کی حد کہاں تک ہے؟"

"اب تو کوئی حد نہیں۔" مرزا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایک زمانے میں ایک ہی شوق تھا۔ خوب صورت فلم بنانے کا' جسے فن پارہ قرار دیا جائے۔ خیط تھا اچھے سے اچھا شاٹ ٹیک کرنے کا۔ خود کو خوش ذوق سمجھتا تھا۔ لیکن جب لوگوں نے ثابت کیا کہ میں جسے فن پارہ سمجھ رہا تھا' وہ ڈبہ فلم تھی تو میں نے لوگوں کے معیار کے مطابق خوش ذوق بننے کا فیصلہ کیا۔ کمزور آدمی تھا نا۔ ایک ہی بار میں قلاش ہو گیا تھا۔ بس اس دن سے ہر طرح کی خوش ذوقی میں مبتلا ہوں۔ جسم' بوتل' سگریٹ' سرنج' سب سے گزر چکا ہوں۔ اب بوٹی سے کام چلا رہا ہوں۔ سستی ہے نا۔" اس کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔

"میں تو آپ کی پرانی خوش ذوقی کا قائل ہوں۔ مرزا صاحب۔ طوفان کے حوالے سے آپ کا فین ہوں میں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے اُس سے بہتر اور مکمل کوئی پاکستانی فلم آج تک نہیں دیکھی۔"

"طوفان کا خالق تو بہت پہلے مر گیا تھا مرشد صاحب۔ یہ...." مرزا نے اپنے جسم کی طرف اشارہ کیا "یہ تو ملبہ ہے اس کا۔"

"خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ آیئے اندر والے کمرے میں چلیں۔" مرشد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ عظمت مرزا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اندرونی کمرا بے حد آرام دہ اور آراستہ تھا "یہاں آرام سے بیٹھیں۔" مرشد نے کہا اور دیواری کیبنٹ کھول کر ایک بوتل نکال لی۔

○☆○

سیکریٹری اطلاعات سے ملاقات کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے ایک دن پہلے ہی سرکاری اعلان جاری کر دیا گیا' جس کے تحت چھ ماہ تک کسی بھی قسم کے ڈکلیریشن پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ سیکریٹری صاحب سے فون پر بات ہوئی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ پابندی اٹھتے ہی ہفت روزہ 'گلدان' کے لیے سرکاری اجازت نامہ

جاری کردیا جائے گا۔ یہ صورت حال بے حد مایوس کن تھی۔ لیکن کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ فوزیہ کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اسٹاف کو خوا مخواہ تنخواہ دینا پڑے گی۔ افسوس یہ تھا کہ اس کے سامنے موجود واحد در امکان بھی وقتی طور پر ہی سہی' بند ہو گیا تھا۔ اسے مزید چھ ماہ تک انتظار کرنا تھا۔

یہ خبر ملتے ہی اس نے اپنے فلیٹ کا رخ کیا اور بند ہو کر بیٹھ گئی۔ ڈپریشن کا یہ دورہ بہت شدید تھا جو تین دن تک جاری رہا۔

○☆○

دس بارہ دن میں مرشد نے دیکھ لیا کہ عظمت مرزا کتنا خوددار آدمی ہے۔ اس کے لہجے میں کبھی عاجزی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ نشے کے عادی لوگ نشے کے حصول کے لیے کسی کے بھی سامنے زمین پر ناک بھی گھسنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مے نوشی کے معاملے میں بھی وہ اعتدال کا حیرت انگیز مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی خود شراب کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

اس روز عظمت مرزا دفتر آیا تو مرشد بیٹھا ایک اسکرپٹ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ اسکرپٹ گزشتہ روز ہی مکمل ہوا تھا اور مرشد نے اس کی کئی کاپیاں بنوالی تھیں۔

"کیا ہو رہا ہے مرشد صاحب؟" مرزا نے پوچھا۔

"بہت دن عیش کر لیے۔" مرشد نے مسکراتے ہوئے کہا "اب کام کے دن شروع ہو گئے ہیں۔ ایک کام کریں گے میرا؟"

"جی فرمائیے۔"

مرشد نے دراز کھول کر اسکرپٹ کی ایک اور کاپی نکالی اور اس کی طرف بڑھائی "ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔ میں اس کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔"

عظمت مرزا نے ہچکچاتے ہوئے اسکرپٹ لے لیا۔ مرشد سر جھکا کر دوبارہ اسکرپٹ کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن وقفے وقفے سے سر اٹھا کر وہ عظمت مرزا کے چہرے پر نظر ضرور ڈال لیتا تھا اور وہاں ہر بار اسے حوصلہ افزا تاثر نظر آتا۔ مرزا کا انہماک دیدنی تھا۔ کبھی اس کا چہرہ تمتمانے لگتا اور کبھی اس پر دبا دبا جوش نظر آتا۔ لیکن یہ طے تھا کہ اسے اس وقت یہ بھی احساس نہیں ہے کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ دیکھے جانے کا احساس تو دور کی بات تھی۔

ڈیڑھ بجے مرشد نے اسے پکارا "اب اسے چھوڑ دیں مرزا صاحب۔ پہلے کھانا کھالیں۔ پھر پڑھ لیجیے گا۔"

عظمت مرزا نے چونک کر دیکھا "مجھے تو خواہش نہیں ہے۔ آپ کھا لیجیے۔"

"یہ نہیں چلے گی مرزا صاحب۔ اسکرپٹ کوئی بھاگا تو نہیں جا رہا ہے۔"

"یہ بات نہیں۔" مرزا نے کھسیا کر کہا "مجھے واقعی بھوک نہیں ہے۔"

"پھر بھی دو چار لقمے تو لے لیں۔ چلیے۔"

مرشد کے اصرار نے مرزا کو مجبور کر دیا۔ دونوں اٹھ کر اندر والے کمرے میں چلے گئے۔ چپراسی کھانا لگا چکا تھا۔ خلاف توقع مرزا نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد مرزا نے کہا "مرشد صاحب' آج آپ نے چائے بھی نہیں پلوائی۔"

"چائے آپ پیتے ہی کب ہیں۔"

مرزا کھسیا گیا "کام کے دوران تو یہ ہوتا ہے کہ چائے پینے کے پانچ منٹ بعد یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ چائے پی تھی یا نہیں۔"

"فکر نہ کریں۔ اب آپ کی پیالی خالی نہیں رہنے دیں گے۔" مرشد نے کہا۔ پھر اس نے چپراسی کو آواز دی "نذیر' ادھر آؤ۔ بھئی چائے کا بندوبست کرو فرسٹ کلاس۔"

مرزا نے جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر نذیر کی طرف بڑھایا "میرے لیے سگریٹ بھی لے آنا... دو پیکٹ۔"

"آجائے گی سگریٹ بھی۔ نذیر کے پاس پیسے ہیں۔" مرشد نے کہا۔

"نہیں میاں صاحب۔ سگریٹ کے معاملے میں یہ نہ کریں۔ میں ویسے ہی کم زیر بار نہیں ہوں آپ کا۔"

مرشد نے بحث نہیں کی۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ پھر اسکرپٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شام سات بجے مرشد نے اسکرپٹ تہ کر کے ایک طرف رکھا "مرزا صاحب' پڑھ لیا آپ نے؟"

مرزا نے چونک کر دیکھا "جی نہیں' ابھی تو آدھے کے قریب باقی ہے۔"

تب مرشد نے دیکھا کہ مرزا کے کانوں کے اوپر پنسل رکھی ہے۔ وہ دیر تک اسے پڑھتے دیکھتا رہا۔ مرزا پھر منہمک ہو گیا تھا کبھی وہ پڑھتے پڑھتے کئی ورق الٹ کر پیچھے دیکھتا۔ کبھی حاشیے میں پنسل سے کچھ لکھتا۔ آٹھ بجے مرشد نے کہا "مرزا صاحب' میں تو اب گھر جا رہا ہوں۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

مرزا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا "میاں صاحب' میں رات دفتر میں گزار سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔"

"دراصل میں اسکرپٹ پوری طرح پڑھے بغیر نہیں اٹھنا چاہتا۔" مرزا کے لہجے میں شرمندگی تھی "گھر جانے میں تو خاصا وقت لگے گا۔"

"میں نذیر سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ آپ کا خیال رکھے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا۔"

"شکریہ میاں صاحب۔"

"ہاں' اسکرپٹ آپ کو کیسا لگا؟"

"پورا اسکرپٹ پڑھے بغیر میں تبصرہ نہیں کروں گا۔"

"چلیے یہی سہی۔ میں اب چلتا ہوں۔ کل ملاقات ہوگی۔" مرشد نے کہا اور باہر نکل آیا۔ وہ جمعرات کی رات تھی اور جمعرات کو بابر اس کے پاس آتا تھا۔ دونوں جمعرات کی رات اور جمعے کا دن

ساتھ گزارتے۔ ہفتے کو بابر پھر لیب چلا جاتا۔

○☆○

"بہت جان دار، مربوط اور مکمل اسکرپٹ ہے۔" عظمت مرزا نے گہری سانس لے کر کہا "اس اسکرپٹ کو کوئی ہدایت کار محض فلما بھی لے تو بڑا ہدایت کار کہلائے گا۔ کون یہ بات سمجھے گا کہ یہ صرف اسکرپٹ کا کمال ہے۔"

"اور اگر یہ اسکرپٹ کسی باکمال ہدایت کار کو مل جائے تو؟" مرشد نے پوچھا۔

"تو بلاشبہ یہ ایک عظیم فلم ہوگی۔ یہ خدیجہ مستور کا ناول 'آنگن' ہے نا؟"

"جی ہاں۔ میں نے اس میں کچھ تبدیلیاں کرائی ہیں۔"

"کاش! طوفان کا اسکرپٹ ایسا ہی ہوتا۔ یہ اسکرپٹ پڑھنے کے بعد پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ طوفان کا اسکرپٹ کمزور تھا۔"

"آپ نے فلم کے ہیرو اور ہیروئن کو کتنا معاوضہ دیا تھا؟" مرشد نے پوچھا۔

"ساڑھے تین لاکھ روپے۔"

"اور رائٹر کو کیا دیا تھا؟"

"سات ہزار۔"

"میں نے یہ اسکرپٹ ڈیڑھ ماہ میں مکمل کرایا ہے اور معاوضہ ایک لاکھ دیا ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کو شاید میں دس ہزار سے زیادہ نہیں دوں گا۔"

مرزا نے اسے حیرت سے دیکھا "ایک لاکھ؟"

"جی ہاں میں زیادہ اہم چیزوں پر زیادہ پیسہ خرچ کرنے کا قائل ہوں۔ اسکرپٹ فلم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ ہیرو ہیروئن تو میں کسی کو بھی بنادوں۔"

عظمت مرزا اب اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا "آپ بہت ذہین پروڈیوسر لگتے ہیں۔ حالانکہ فلم کا تجربہ نہیں ہے آپ کو۔"

"میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔ فلم کے آرٹ کو بھی سمجھتا ہوں لیکن آرٹ فلم اور کمرشل فلم کی اصطلاحات میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔ فلم میرے نزدیک کمرشل آرٹ ہے۔"

"لیکن اچھی سے اچھی فلم تجارتی اعتبار سے بُری طرح ناکام ہوسکتی ہے۔"

"یہ حقیقت ہے۔ سو میں ایک اچھے بزنس مین کی طرح خسارے کے اس امکان کو اور طرح سے کور کروں گا۔"

"کیسے؟" مرزا کے لہجے میں تجسس تھا۔

"یہ بزنس سیکرٹ ہے۔" مرشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ عظمت مرزا کبھی اسکرپٹ کو اٹھاتا، چند ورق الٹتا، نظر ڈالتا اور پھر رکھ دیتا۔ وہ ہچکچا رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" مرشد نے اس سے پوچھا۔

"میں... میں... کچھ نہیں" مرزا کہتے کہتے رک گیا۔ وہ اب بھی گومگو کے عالم میں تھا "میری ایک التجا ہے آپ سے۔"

"جی فرمائیے۔"

مرزا کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس کا حال اس بچے کا سا تھا جس کا چاند کھلونا نیچے اتر آیا ہو۔ مگر پھر بھی اس کی پہنچ سے دور ہو اور وہ کسی بڑے سے امید کررہا ہو کہ وہ چاند کو پکڑ کر اسے دے دے گا۔ آخر کار وہ یوں پھٹ پڑا جیسے یقین ہو کہ عام انداز میں اپنا مدعا کبھی بیان نہ کرسکے گا "میں اپنی اہلیت تو ثابت نہیں کرسکتا مرشد صاحب لیکن میری آرزو ہے کہ آپ یہ فلم بنانے کا موقع مجھے دیں۔"

"آپ کی اہلیت ثابت کرنے کے لیے تو طوفان ہی کافی ہے۔" مرشد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن میں کبھی کوئی بڑا فیصلہ عجلت میں نہیں کرتا۔"

"پلیز مرشد صاحب۔" عظمت مرزا اب گھگیا رہا تھا اور یہ وہ شخص تھا، جس نے مفلسی میں بھی خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ یہ رویہ ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ ایک سچا فنکار ہے اور اب وہ ایک اچھا اسکرپٹ دیکھ کر بچے کی طرح مچل رہا تھا۔ خوشامدیں کررہا تھا۔ وہ تڑپ اٹھا تھا، کچھ کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ مرشد نے سوچا، ابھی لوہے کو اور گرم کرنا ہوگا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں مرزا صاحب کہ آپ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچوں گا۔" مرشد نے کہا "آپ فنکار تو ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ بزنس مین بھی بن جائیں۔ بزنس کے اسرار و رموز مجھ سے سیکھ لیں۔"

"آپ جیسا کہیں گے، میں ویسا ہی کروں گا۔"

"میرا کہنا یہ ہے کہ فلم بناتے ہوئے باکس آفس کو اپنی کمزوری کبھی نہ بنائیں۔ فن کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہ کریں۔ ہاں، اس میں ہونے والے ممکنہ نقصان کو کہیں اور سے پورا کرنے کی سبیل ضرور کریں۔" مرشد نے کچھ توقف کیا "میں دیکھوں گا کہ میرا طریق کار آپ کو پسند آتا ہے یا نہیں۔"

"جیسی فلم آپ بنا رہے ہیں۔" مرزا نے میز پر رکھے اسکرپٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ایسی فلمیں بنانے کے مواقع حاصل کرنے کے لیے تو میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"دیکھیں گے۔ فی الحال تو میں "نئے چہروں کی ضرورت ہے" کا یہ اشتہار ملک کے تمام بڑے اخباروں میں دے رہا ہوں۔ اس کا رسپانس زبردست آئے گا۔ ہم انٹرویو کریں گے، آپ میرے ساتھ موجود ہوں گے۔ اس موقع کے لیے میں آپ کو پہلا کاروباری گر بتا رہا ہوں۔ یہ ہر موقع پر کام آئے گا۔"

عظمت مرزا ہمہ تن سماعت تھا۔

"اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھیں۔ سامنے والے پر اپنی دلچسپی کبھی ظاہر نہ ہونے دیں۔ اسکرپٹ کے معاملے میں بھی آپ سے

غلطی ہوئی تھی۔ اور......"

عظمت مرزا سر کو تفہیمی جنبش دیتا رہا۔

○☆○

صوفیہ نے چوکیدار کو امداد پروڈکشنز کا انٹرویو لیٹر دکھایا۔ چوکیدار نے بغلی دروازہ کھول کر اسے اشارے سے بتایا "اس طرف ہے...."

"شکریہ۔ دفتر ڈھونڈنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔" صوفیہ نے اس کی بات کاٹ دی اور اسٹوڈیو میں داخل ہو گئی۔

دفتر ڈھونڈنے میں اسے واقعی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ بیرونی کمرے میں دروازے پر رکھے اسٹول پر چپراسی بیٹھا تھا۔ ایک میز کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ صوفیہ نے انٹرویو لیٹر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے ایک نظر لیٹر پر ڈالی اور کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تشریف رکھیے' آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا ہوگا۔"

صوفیہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

صوفیہ ایک باغی لڑکی تھی۔ لیکن اب سے دو سال پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے مزاج میں بغاوت ہے۔ تب وہ سیکنڈ ایئر کی معصوم سی طالبہ تھی جس نے کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی تھی۔ ماں باپ کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو چکا تھا۔ لیکن بڑے بھائی نے سوتیلا ہونے کے باوجود بڑی محبت سے اسے پالا تھا۔ وہ محبت اس کا سرمایہ حیات تھی۔ لیکن ایک روز وہ تہی دامن رہ گئی۔

ان کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ زمینیں تھیں' بہت بڑی جاگیر تھی۔ بہت احترام کیا جاتا تھا بھائی جان کا۔ ان کے گھر بڑی بڑی پارٹیاں ہوتی تھیں۔ بڑے بڑے سیاستدان آتے تھے۔ سیاسی جوڑ توڑ کی باتیں ہوتی تھیں۔ بھائی جان پیسہ پانی کی طرح بہانے کے قائل تھے۔ اکثر بھابی سے کہتے 'ہمارے مطلب کی حکومت آجائے تو وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔"

"کیوں' آپ کو کیا مل جائے گا؟" بھابی پوچھتیں۔

"تم نہیں سمجھو گی ان باتوں کو۔ شوگر ملز کے لیے قرضہ مل جائے گا۔"

"تو قرضہ ادا بھی تو کرنا ہو گا' سود سمیت۔"

بھائی جان ہنسنے لگتے "قرضہ چھوٹا موٹا ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہاؤس بلڈنگ کا یا عام کسانوں کو ملنے والا قرضہ۔ بڑا قرضہ کون ادا کرتا ہے۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں تو آتی نہیں۔"

"تمہارے سمجھنے کی ہیں بھی نہیں۔"

صوفیہ کو ان باتوں سے ویسے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آبائی زمین بکتے بکتے سمٹتی جارہی ہے اور جو رہ گئی ہے وہ قابل کاشت کم ہی ہے۔ اسے تو اپنے حصے سے بھی غرض نہیں تھی۔ یہ تو اسے بعد میں پتا چلا کہ بھائی جان اب اس قرضے ہی پر انحصار کر رہے تھے۔

اس روز گھر میں دعوت تھی۔ دعوت میں ایک وزیر صاحب بھی شریک تھے۔ محدود سی پارٹی تھی لیکن اہتمام بہت زیادہ کیا گیا تھا۔ صوفیہ معمول کے مطابق کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسے صبح انگریزی کے ٹیسٹ کے لیے تیاری کرنا تھی۔ پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ اس کی آنکھ اس احساس سے کھلی کہ کمرے میں کوئی موجود ہے۔ اسے یاد تھا کہ اس نے سونے سے پہلے کمرے کا دروازہ لاک کیا تھا اور نائٹ بلب بھی آن کیا تھا مگر اب کمرے میں اندھیرا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی "کون ہے؟" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ڈرو نہیں بے بی۔" ایک اجنبی آواز ابھری۔

اس نے ٹٹول کر بیڈ سائیڈ لیمپ روشن کردیا۔ یہ دیکھ کر اسے دھچکا لگا کہ وزیر صاحب اس کے کمرے میں موجود ہیں....

وزیر صاحب کے جانے کے بعد اس نے خود کو سمیٹا۔ وہ اٹھ رہی تھی کہ اسے قالین پر پڑی چابی نظر آئی۔ وہ یقیناً اس کے کمرے کی ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی اور پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ وزیر صاحب بھائی جان کو وہی فائل دے رہے تھے جو انہوں نے کمرے میں اسے دکھائی تھی۔ پھر اس نے واضح طور پر وزیر صاحب کو کہتے سنا۔ آواز بلند نہیں تھی مگر رات کے سکوت میں تو سرگوشی بھی بلند آہنگ ہو جاتی ہے "آپ بے فکر ہو جائیں افضل صاحب' سمجھ لیں کہ آپ کا کام ہو گیا۔ آپ یہ فائل کل منیجر کے پاس لے جائیے گا' میں گیارہ بجے فون کردوں گا منیجر کو۔"

وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ اسے یاد آیا کہ منسٹر صاحب نے وہ فائل اسے دکھاتے ہوئے کہا تھا "بے بی' یہ تمہارے بھائی جان کے شوگر ملز کے قرضے کی فائل ہے۔ مجھے اس پر دستخط کرنے ہیں۔ اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔"

"لیکن یہاں آنا کیوں ضروری تھا؟"

"ایسے کام سکون سے کہیں بیٹھ کر ہی کیے جاتے ہیں۔ ویسے تمہارے بھائی جان نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں کوئی مجھے ڈسٹرب نہیں کرے گا۔" انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا تھا۔ اس وقت صوفیہ کو یقین نہیں آیا تھا۔ مگر اب اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

وہ خاموشی سے لٹ گئی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ مزاحمت یا شور مچانا بے سود ثابت ہو گا۔ لیکن اس لمحے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے اندر ایک بہت باغی روح موجود ہے۔ اور اب وہ باغی روح مرتے دم تک چین سے نہیں بیٹھے گی۔ اس نے اپنی مرضی سے خود کو سیکڑوں بار استعمال کرکے دیکھ لیا۔ مگر وہ ایک بار مرضی کے خلاف استعمال ہونے کا داغ نہ دھل سکا۔ اس نے گھر کے نوکروں تک کو نہیں بخشا۔ بھائی جان کو ذلیل کیا' جنھوں نے اس پر آنکھیں نکالنے کی حماقت کی تھی۔ پھر وہ ماڈلنگ کی طرف چلی گئی۔

اب ماڈلنگ میں مسابقت بہت زیادہ تھی۔ جہاں ایک ماڈل کی ضرورت ہوتی وہاں بلا مبالغہ پچاس ماڈل موجود ہوتیں اس لیے کہ اچھے گھروں کی لڑکیاں اب بلا جھجک اس میدان میں اتر رہی تھی طلب کم تھی اور رسد زیادہ۔ لہٰذا وقعت کم ہو گئی تھی مگر صوفیہ کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تو گھر سے بے وقعت ہو کر نکلی تھی۔

پھر اس نے گھر ہی چھوڑ دیا اور پوری طرح آزاد ہو گئی اور اب وہ فلمی دنیا میں اترنے کے لیے پر تول رہی تھی۔

چپراسی کی آواز نے اسے چونکا دیا "مس صاب... صاب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔"



عظمت مرزا بے حد مایوس نظر آ رہا تھا۔ مرشد حسین نے ایک ہزار سے زائد درخواستوں میں سے اس کی مدد سے صرف سات لڑکیوں کا انتخاب کیا تھا اب تک وہ چھ لڑکیوں کا انٹرویو کر چکے تھے۔ دو خود ہی دست بردار ہو گئی تھیں اور چار کو مرشد نے مسترد کر دیا تھا۔ وہ سوال ہی اس نوعیت کے کر رہا تھا کہ کسی لڑکی کا منتخب ہونا ناممکن لگتا تھا۔

مرشد نے مرزا کی مایوسی بھانپ لی "فکر نہ کرو مرزا صاحب" اس نے اسے دلاسا دیا "یہ نہ بھولیں کہ ہمارے پاس ابھی ایک ہزار سے زائد امیدوار موجود ہیں۔"

"لیکن ان میں دو بہت اہل لڑکیاں نکل گئیں۔"

"آپ کے ذہن میں اہلیت کا مکمل تصور نہیں ہے۔ وہ پوری طرح اہل نہیں تھیں اور میں بعد میں کوئی پریشانی نہیں اٹھانا چاہتا۔"

"کیسی پریشانی؟"

"آپ ابھی نہیں سمجھ سکتے مرزا صاحب۔ آپ کو یاد ہے، میں نے اصل فلم پر لگنے والے سرمائے کے رسک کو کور کرنے کی بات کی تھی۔ تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔"

"جی بہت بہتر۔"

اسی لمحے صوفیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ مرشد اگلے ہی لمحے مرزا کو دیکھنے لگا۔ مرزا کی آنکھوں کی چمک نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ لڑکی نے اپنی جو تصویر بھیجی تھی، وہ اس کے حسن کا احاطہ نہیں کر سکی تھی۔ بلاشبہ وہ غیر معمولی طور پر حسین لڑکی تھی۔ تصویر کے لحاظ سے ترجیحی فہرست میں اسے ساتواں نمبر ملا تھا لیکن درحقیقت وہ ایک نمبر تھی۔ اس کا چہرہ بھی ایسا تھا کہ لگتا تھا، تاثرات اس پر سے پھسلتے ہوں گے۔ یہ علامت تھی اس بات کی کہ وہ بہت بڑی اداکارہ بن سکتی ہے۔

"تشریف رکھیے۔" مرشد نے لڑکی سے کہا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں مرزا کو پہلا کاروباری درس یاد دلایا۔ مرزا نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

"شکریہ" لڑکی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بے حد مترنم اور لہجہ بہت شیریں تھا۔ یعنی وہ سراپا موزوں تھی۔ اب صرف اس کا ذہن چیک کرنا تھا۔

مرشد کو احساس ہوا کہ لڑکی بھی اسے تولنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ نام، پتا پوچھنے اور چند رسمی سوالات کرنے کے بعد مرشد نے اچانک پوچھا "آپ فلم میں کیوں آنا چاہتی ہیں؟"

"اس کے گلیمر کی وجہ سے۔" لڑکی نے بے جھجک کہا۔

"آپ کو معلوم ہے، اس گلیمر کی کیا قیمت ادا کرنا ہوتی ہے؟"

"جی ہاں، جانتی ہوں۔" لڑکی نے بے ساختہ کہا "وہ قیمت میں پہلے ہی کہیں اور ادا کر چکی ہوں۔"

اس جواب سے مرشد بھی سناٹے میں آ گیا۔ پھر اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا "آپ کو معلوم ہے، یہاں آنے کے لیے ضروری ہے کہ عزت کا تصور گھر میں چھوڑ کر نکلا جائے۔"

"عزت کا تصور تو گھر کی چار دیواری میں ہی چکنا چور ہوا تھا۔" صوفیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب تو میں بس مردوں کے دلوں کو تاراج کرنا چاہتی ہوں۔"

"آپ اسٹار بن گئیں، جس کا خاصا قوی امکان ہے تو آپ لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن جائیں گی۔ لوگ آپ کے ایک اشارے پر، آپ کے قدموں میں بیٹھ جائیں گے۔ لیکن خود آپ ڈائریکٹر کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی ہوں گی۔ عزتِ نفس تک قربان کرنا پڑے گی آپ کو۔"

"چٹخے ہوئے شیشے میں عزت نفس کہاں ہوتی ہے۔"

"عزت نفس کبھی ختم نہیں ہوتی۔" مرشد نے مربیانہ لہجے میں کہا "تم ایک حقیقت پسند لڑکی ہونے کے باوجود یہ بات نہیں سمجھ رہی ہو۔ بہرحال تم حیرت انگیز لڑکی ثابت ہوئی ہو۔ لگتا ہے گھر سے تیار ہو کر نکلی ہو۔"

"مجھے آپ حیرت انگیز آدمی لگے ہیں۔" صوفیہ نے ترکی بہ ترکی کہا "آپ تو مجھے بھگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے اس دنیا کے متعلق سنا ہے کہ یہاں ابتدا میں اچھی اچھی باتیں کی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ جو آپ ابتدا میں زبانی سنا رہے ہیں، یہ تو بعد کا مرحلہ ہوتا ہے۔"

"ہاں میں بھی تمہاری طرح حیرت انگیز ہی ہوں۔"

"مجھے آپ لوگوں کے ساتھ کام کر کے خوشی ہو گی۔"

"اچھا صوفیہ، نام کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"جو جی چاہے نام دے دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اعتراض کرنے کے حق سے میں پہلے ہی دست بردار ہو چکی ہوں۔"

"ٹھیک ہے صوفیہ۔ آپ کا فون نمبر میرے پاس ہے۔ میں دو تین دن میں آپ سے رابطہ کروں گا۔" مرشد نے اسکرپٹ کی ایک کاپی اس کی طرف بڑھائی "اس دوران آپ اسکرپٹ کا مطالعہ کر لیں۔ ابھی کچھ حتمی نہیں ہے۔ اگلی ملاقات میں ممکن ہے، معاہدے پر دستخط ہو جائیں۔"

ایک لمحے کو صوفیہ مایوس نظر آئی مگر پھر وہ مسکراتے ہوئے کرسی سے اٹھی "بہت بہتر' میں آپ کی کال کا انتظار کروں گی۔"

اُس کے جانے کے بعد مرشد نے سوالیہ نظروں سے عظمت مرزا کو دیکھا "کیا خیال ہے مرزا صاحب؟"

"میرے خیال میں تو ہیرا مل گیا ہے ہمیں۔"

"میرے ذہن میں ایسی ہی لڑکی کا خیال تھا۔" مرشد نے کہا "اب آپ اپنی بات کریں۔ آپ اس فلم کو ڈائریکٹ کرنا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں اور آپ کی ہر شرط مجھے منظور ہوگی۔ بس مجھے آزادانہ کام کرنے دیجئے گا۔"

"اور معاوضہ؟"

"معاوضہ آپ نہ بھی دیں تو مجھے منظور ہے۔"

"میرے ذہن میں آپ کے لیے معاوضہ کا تصور ہے بھی نہیں۔ بہرحال یہ کل آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ فی الوقت مجھے آپ سے ایک اور اہم معاملے پر بات کرنی ہے۔ یہ سرمائے کے رسک کو کور کرنے کا معاملہ ہے۔"

"مجھے اس سلسلے میں بڑا تجسس ہے میاں صاحب۔"

"ارے عام سی بات ہے' ہم اپنی اچھی فلم کو پورنو سے کور کر سکتے ہیں۔"

عظمت مرزا کا منہ بن گیا۔ اندر کا فنکار اپنی خودداری سمیت پھر جاگ گیا "آپ مجھ سے اس گھٹیا پن کی امید رکھتے ہیں۔"

"دیکھیے مرزا صاحب' آپ نے طوفان بنائی۔ وہ نہایت اعلیٰ فلم تھی مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ کیا اس کے بعد کی پنجابی فلمیں گھٹیا نہیں تھیں۔ اور اس کے بعد کیا ہوا۔ آپ عضو معطل بن کر رہ گئے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ ایک شاہ کار فلم بنائیں اور پھر اس حال کو پہنچ جائیں۔ ویسے آپ کی مرضی۔ آپ جیسا نہ سہی' بہرحال کوئی اچھا ڈائریکٹر مل ہی جائے گا مجھے۔"

مرزا یوں سمٹا جیسے اس کے جسم پر کوئی نادیدہ کوڑا پڑا ہو۔

"ویسے جو آپ سمجھ رہے ہیں' میرا خیال اس سے مختلف ہے۔" مرشد نے زخم پر مرہم لگانے کی کوشش کی "میں سولو پورنو بنانا چاہتا ہوں۔ گھٹیا قسم کی فحاشی نہیں۔ آپ جیسا ہدایت کار اسے آرٹ فلم کے درجے پر پہنچا سکتا ہے۔ میرے ذہن میں اس کے منظر نامے کا ہلکا سا خاکہ بھی ہے۔"

"لیکن میاں صاحب' مخرب اخلاق تو وہ پھر بھی رہے گی۔ ہم چند ہزار کے لیے قوم کو اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ پن کی طرف کیوں دھکیلیں۔"

"آپ کچھ بھی نہیں سمجھ رہے ہیں مرزا صاحب۔" مرشد نے سرد لہجے میں کہا "میری نظر میں ایسے لوگ ہیں جنہیں ان فلموں میں دلچسپی ہے' جنہیں میں قوم میں شامل بھی نہیں سمجھتا۔ شوقین مزاج جاگیردار ہیں کچھ' جن کی اوپر' بہت اوپر تک رسائی ہے۔ ایسے ہی ایک صاحب یہاں اسٹوڈیو بھی آتے رہتے ہیں۔ ملک صاحب کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی تھی میری۔ ان سے میں کس طرح ڈیل کروں گا یہ آپ خود دیکھ لیجئے گا۔"

"لیکن انہیں اس کیسٹ کو تجارتی پیمانے پر ریلیز کرنے سے کون روکے گا۔"

"میں روکوں گا۔ اول تو وہ اس طرح کے آدمی نہیں ہیں اور پھر میں ان سے یہ شرط منواؤں گا۔"

"اور بعد میں وہ مکر گئے تو؟"

"تو وہ بہت پچھتائیں گے۔ آپ خود دیکھ لیجئے گا۔ بولیے کیا کہتے ہیں آپ؟"

مرزا سوچ میں پڑ گیا۔ 'ٹوٹے ستارے' کا اسکرپٹ اسے اتنا بھا گیا تھا کہ وہ اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ دوسری طرف مرشد حسین کی بات کسی حد تک اس کے دل کو لگتی تھی۔ ایسی فلم عیاش طبع بڑے لوگوں تک محدود رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بس معاشرے کی عام اور معصوم اکثریت کو اس سے محفوظ رہنا چاہیے تھا۔ اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' آپ مجھے خاکہ سنائیے۔"

"اس فلم کا نام ہے 'صبح بخیر' شب بخیر' اس میں صرف ایک کردار ہے ایک لڑکی' جو گھر میں اکیلی ہے۔ پہلے شاٹ میں ہم صبح سات بجے اسے نیند میں کسمساتا دکھائیں گے۔ پھر وہ اٹھتی ہے....."

مرشد کہتا گیا اور عظمت مرزا سر ہلاتا گیا۔ اس کی نگاہوں میں مرشد کے لیے ستائش تھی۔ مرشد کے خاموش ہونے کے بعد وہ بولا "آپ کا کہنا درست ہے میاں صاحب۔ یہ تو اچھی خاصی فلم بن جائے گی۔ میاں صاحب' آپ کا ذہن' آپ کی نظر تو ڈائریکٹر والی ہے۔ کمال کر دیا آپ نے۔"

"اس کا اسکرپٹ لکھ کر مجھے دے دیں۔" مرشد نے اپنی تعریف کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "کتنا وقت لگ جائے گا اس میں۔"

"یوں تو چند گھنٹے کا کام ہے لیکن میں اس پر خاص توجہ دوں گا۔ دو دن تو ضرور دے دیجئے مجھے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ کام شروع کر دیں۔" مرشد نے جیب سے ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر مرزا کی طرف بڑھائے "یہ وقتی ضروریات کے لیے ہیں۔ کل انشاء اللہ پکا بندوبست کر دوں گا میں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو نذیر سے منگوا لیجئے گا۔"

○☆○

عوامی لیب نے بہت کم عرصے میں بہت اچھی ساکھ بنالی تھی۔ اسپتالوں کے ڈاکٹر خون تجویز کرتے ہوئے سفارش کرتے تھے کہ مطلوبہ خون عوامی لیب سے لینے کی کوشش کی جائے۔ لیب کا بزنس بھی بہت اچھا جا رہا تھا۔ بابر اب کراچی میں لیب قائم کرنے کی سوچ رہا تھا۔ اُس رات اس نے عاصم سے اس سلسلے میں بات کی۔

"پہلے یہاں کا کام پوری طرح جم جائے پھر آگے کی سوچنا۔"

عاصم نے مشورہ دیا۔

"یہاں مجھے نہایت قابل اعتماد اسٹاف مل گیا ہے۔ کام بھی بہت اچھا جارہا ہے۔ اب میں اپنا دھیان دوسری طرف دے سکتا ہوں۔" بابر نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ پہلے راولپنڈی اور پشاور کی طرف توجہ کی جائے۔ کراچی میں بعض بہت اچھی لیبارٹریز موجود ہیں۔"

بابر اس گریز کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ عاصم نہیں چاہتا تھا کہ وہ کراچی جائے۔ کراچی جائے گا تو بھابی اور بچوں سے بھی ملے گا۔ اس میں یہ خطرہ بہرحال تھا کہ وہ بھابی کا برا حال دیکھے تو اپنا عہد بھول جائے اور اسے عاصم کے بارے میں بتا بیٹھے۔ بابر کی سمجھ میں یہ معما اب بھی نہیں آیا تھا۔ عاصم کا رویہ اسے غیر فطری لگتا تھا

"آپ کی فلم کی کیا پروگریس ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کاغذی تیاریاں مکمل ہیں۔ کاسٹ فائنل ہوجائے تو شروع کردیں گے۔ میں اسکرپٹ سے بہت مطمئن ہوں۔" عاصم نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "میں فلم سے متعلق لوگوں کو میڈیکل چیک اپ کے لیے بھجواؤں گا۔ بل امداد پروڈکشنز سے چارج کرنا اور رپورٹ براہ راست مجھے بھجوانا۔"

"ٹھیک ہے بھائی جان۔ ویسے یہ آپ نے بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔"

عاصم نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا "بابر، مجھے ایڈز کے بارے میں بتاؤ۔"

"مجھے حیرت ہے کہ یہاں لوگ ایڈز کے بارے میں نہیں جانتے۔" بابر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایڈز کا وائرس انسان کے جسم کے مدافعتی نظام کو تباہ کردیتا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ معمولی سی کوئی بیماری حملہ آور ہوجائے تو پیچھا نہیں چھوڑتی.... مثلاً نزلہ زکام۔ مریض کو مستقل بخار رہتا ہے۔ دستوں کا سلسلہ نہیں رکتا۔ بھوک ختم ہوجاتی ہے۔ وزن بہت تیزی سے گرنے لگتا ہے۔ اسی کیفیت میں مریض موت سے ہم کنار ہوجاتا ہے۔"

"اور اس کے اسباب؟"

"اسباب کے بارے میں حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ ریسرچ کا سلسلہ جاری ہے۔ ہاں یہ طے ہے کہ اس کا وائرس خون کے ذریعے خون میں شامل ہوتا ہے' بالواسطہ یا بلاواسطہ۔ اب تک جو سب سے بڑا سبب سامنے آیا ہے وہ جنسی تعلق ہے۔ لیکن اور اسباب بھی یقیناً ہوں گے۔ اس پر کام کیا جارہا ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ وائرس خون میں شامل ہونے کے بعد بیماری کا حملہ کتنے عرصے کے بعد ہوتا ہے؟"

"اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ جوانوں میں وائرس زیادہ عرصے بعد فعال ہوتا ہے جبکہ بوڑھوں پر اس کا حملہ جلدی اور بعض اوقات بہت جلدی ہوجاتا ہے۔ میں اس بات کو یوں بیان کروں گا کہ اس کا تعلق اس

بات سے ہے کہ مریض کے جسم کا مدافعتی نظام کتنا طاقت ور ہے۔ اس کی عمومی صحت کیسی ہے۔ جو بچے پیدائشی ایڈز کے مریض ہوں وہ بہت زیادہ خطرے میں ہوتے ہیں۔ کسی شخص کے خون میں اگر بیس سال کی عمر میں ایڈز کا وائرس شامل ہو جائے اور اس شخص کی صحت بہت اچھی ہو اور وہ اپنا خیال رکھنے والا بھی ہو تو امکان ہے کہ بیماری کا حملہ اس پر بیس یا پچیس سال سے پہلے نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بہرحال کوئی حتمی بات نہیں ہے۔ ایڈز کسی بھی وقت کسی بھی تجربے، کسی بھی کلیئے کو غلط ثابت کرسکتا ہے۔"

"مرض کا حملہ ہونے سے پہلے بھی مریض وائرس کسی دوسرے شخص کو منتقل کرسکتا ہے؟"

"جی ہاں، یہ خطرہ تو ایچ آئی وی کے ہر پازیٹو کیس میں موجود ہوتا ہے۔"

"اس کے سلسلے میں احتیاطی تدابیر...."

"دیکھیے، یہ فرد سے زیادہ اسٹیٹ کا کام ہے۔ فرد کے لیے تو صرف ایک احتیاطی تدبیر کافی ہے کہ وہ زندگی اللہ کے احکامات کے مطابق گزارے۔ اس کے علاوہ کوئی احتیاط بچاؤ کی ضمانت نہیں ہوسکتی۔ فیملی پلاننگ کے نام پر جو گناہ کے لیے آسانی پیدا کردی گئی ہے، وہ بہت بھیانک ہے۔ مغرب میں تو یہ تحقیق بھی کی جارہی ہے کہ مانع حمل ادویات بھی کہیں ایڈز کا سبب تو نہیں بنتیں۔ یہاں میں حیران ہوں کہ کچھ بھی نہیں کیا گیا بلکہ شاید ابتدا میں تو ایڈز کا ذکر بھی حرام قرار دے دیا گیا۔ حیرت ہے کہ ٹی وی جیسے میڈیا پر فیملی پلاننگ کی تشہیر کرتے وقت یہ نہیں سوچا گیا کہ نابالغ لوگوں کو قبل از وقت آگہی دی جارہی ہے اور لازمی طور پر اس کے مضر اثرات مرتب ہوں گے۔ لیکن ایڈز جیسے مہلک مرض کا نام لینا بھی فحاشی کے زمرے میں آگیا۔ یہ تو شتر مرغ والا رویہ ہے۔ پھر یہاں ائرپورٹس پر باہر سے آنے والوں کے خون کی اسکریننگ کا ابھی تک بندوبست نہیں کیا گیا حالانکہ یہ بہت ضروری ہے۔ یہ کام تو ایڈز کی دریافت کے ساتھ ہی ہوجانا چاہیے تھا۔ دوسرے لیبارٹریز اور بلڈ بینکوں پر سختی کرنی چاہیے تھی۔ سرنج کے معاملے میں غیرذمے داری اور خون کی اندھا دھند خرید وفروخت کو بڑا جرم قرار دینا چاہیے تھا۔ لیکن اس سلسلے میں اب تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ تو مجرمانہ غفلت اور بے پروائی ہے۔ یہاں تو میں دیکھ رہا ہوں کہ ایڈز کے لیے ہم نے اپنی تمام سرحدیں، تمام دروازے کھول دیے ہیں اور لوگوں کو بتایا ہی نہیں گیا کہ ایڈز کیا ہے۔ باہر تو یہ تسلیم کیا جارہا ہے کہ اسلام واقعی انسان کی فلاح کے لیے آیا ہے۔ اسلام نے ہر اس کام سے انسان کو روکا ہے بلکہ سختی سے روکا ہے، جو انسان کے لیے پرکشش ہونے کے باوجود ضرر رساں ہے۔ باہر تو اب اسلام کے حرام اور حلال کے تصور پر غور کیا جارہا ہے۔ اسلام کی حرام قرار دی ہوئی چیزوں پر اس یقین کے ساتھ ریسرچ کی جارہی ہے کہ وہ بے حد ضرر رساں ہوں گی۔ اور ہم مسلمان ہیں کہ حرام خوری میں لگے ہیں۔ حکمراں کسی بھی معاملے میں اپنی ذمے داری نہیں بھاگے۔"

"خوفِ خدا سے محروم ہیں۔" عاصم نے کہا "دو ایک کو ایڈز لاحق ہوجائے تو سب سدھر جائیں گے۔"

اس کا لہجہ اتنا خوف ناک تھا کہ بابر جھرجھری لے کر رہ گیا۔

"بابر سنو، اب تک تمہاری لیب میں کتنے ایچ آئی وی کیس آئے ہیں؟" عاصم نے اچانک پوچھا۔

"گیارہ۔"

"تم نے ان کے سلسلے میں کیا کیا؟"

"نیشنل ایڈز پروگرام کو مطلع کردیا۔"

"دیکھو.... میری فلم کمپنی سے متعلق لوگوں میں اگر کوئی ایچ آئی وی کیس ہو تو اسے آگے نہ بڑھانا۔ بلکہ اپنے ریکارڈ میں بھی نہ رکھنا اور رپورٹ صرف مجھے بھیجنا۔"

"لیکن بھائی جان...."

"یہ میرا حکم ہے بابر۔ انہیں میں خود ڈیل کرلوں گا۔" عاصم کے لہجے میں قطعیت تھی۔ بابر سہلا کر رہ گیا۔

○☆○

عظمت مرزا حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ مرشد حسین کس قسم کا آدمی ہے۔ اسے کیا سمجھا جائے۔ لڑکیوں سے انٹرویو کے اگلے روز اس نے بینک کے کچھ فارموں پر اس سے دستخط کرائے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ قانونی دستاویزات بھی تھیں جن پر مرزا نے دستخط کیے۔ وہ دستاویزات پڑھنا چاہ رہا تھا مگر مرشد نے ہنستے ہوئے کہا تھا "میں آپ کو بتادیتا ہوں مرزا صاحب۔ آپ کیوں وقت ضائع کرتے ہیں۔ اب یہ ایک ادارہ ہے.... امداد فلمز لمیٹڈ، جس کے آپ سینئر پارٹنر ہیں۔ میں جونیئر پارٹنر ہوں۔ آپ ہی اس کے کرتا دھرتا ہوں گے۔ میں تو سیلانی آدمی ہوں۔ کبھی اچانک مہینوں کے لیے غائب ہوجاتا ہوں۔ بینک اکاؤنٹ اس طرح کا ہے کہ رقم نکلوانے کے لیے بیک وقت ہم دونوں کے دستخط ضروری نہیں، ہم میں سے کوئی ایک بھی رقم نکلوا سکتا ہے۔"

"لیکن میاں صاحب...."

"آپ معاوضے کے متعلق کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ تو مجھے ٹھیک طرح سے جانتے بھی نہیں۔ پھر مجھ پر اتنی بڑی ذمے داری کیوں ڈال رہے ہیں۔"

"مجھے بڑا مان ہے کہ میں آدمی کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ آپ مخلص اور سچے فن کار ہیں۔ ایسا شخص جھوٹا، بے ایمان اور دھوکے باز نہیں ہوتا۔"

اُس وقت تو مرزا کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس پر کتنی بھاری ذمے داری عائد کی گئی ہے۔ کتنا اعتبار کیا گیا ہے۔ مرشد حسین نے بینک کی پاس بکس اور چیک بکس اسے لاکر دیں تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ امداد فلمز لمیٹڈ کا اکاؤنٹ ۶۵ لاکھ روپے سے کھولا گیا تھا۔ ۶۵ لاکھ.... اور وہ جب چاہے، جتنی بھی رقم نکلوا سکتا

تھا۔

"نہیں میاں صاحب، میں خود کو اتنی بڑی ذمے داری کا اہل نہیں سمجھتا۔" عظمت مرزا تقریباً رو دیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، میں تو سمجھتا ہوں۔ اور میں واضح طور پر کہہ رہا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں کبھی بھی مجھے جواب دہ نہیں ہوں گے۔"

اس بار مرزا پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ مرشد اسے تھپکتا رہا۔

اگلے روز مرزا نے "صبح بخیر شب بخیر" کا منظرنامہ مرشد کے سامنے رکھ دیا۔ مرشد نے اسے پڑھا اور چند ترامیم تجویز کیں۔ مرزا نے بخوشی انہیں قبول کرلیا۔ وہ مرشد حسین پر واقعی حیران تھا۔ اس کی فلمی سوجھ بوجھ حیران کن تھی۔

"بس آپ پہلے یہ فلم تیار کرلیں۔ اس کے بعد 'ٹوٹے ستارے' پر دھیان دیجیے گا۔" مرشد نے کہا۔

"جی بہتر۔ آپ صوفیہ کو فائنل کردیں۔ ہاں، شوٹ کہاں کریں گے؟"

"ایک بنگلا ہے میری تحویل میں۔ بہت خوب صورت اور مناسب ہے۔"

"اور اس فلم کے لیے اسٹاف؟"

"اسٹاف کی ضرورت نہیں۔ سب کام آپ کو ہی کرنے ہیں پروسیسنگ کے سوا۔ فوٹوگرافی اور ایڈیٹنگ آپ کرسکتے ہیں نا؟"

"جی ہاں، کیمرا تو میری پہلی محبت ہے اور ایڈیٹنگ کے بغیر کوئی ڈائریکٹر نہیں بن سکتا۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ ہر اعتبار سے یہ سولو جاب ہے۔ اب میں صوفیہ کو بلا رہا ہوں۔"

○☆○

صوفیہ نے اسکرپٹ کی چند سطریں پڑھیں۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا "یہ..... یہ تو میرے اندازے سے مشکل ہے۔" اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔"

"میں نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔" صوفیہ نے اب بھی نظریں نہیں اٹھائیں۔

"اور میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ سب کچھ سوچ لیں۔ خیر اب بھی کیا بگڑا ہے، واپسی کا راستہ تو کھلا ہے۔"

صوفیہ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور مرشد کی آنکھوں میں دیکھتی رہی "آپ مجھے کیا آفر کررہے ہیں۔"

"ٹوٹے ستارے میں ہیروئن کا رول۔"

"بس؟"

"اور کیا چاہتی ہیں آپ۔ ٹوٹے ستارے ایسی فلم ہے جو آپ کو ایک ہی جست میں شہرت کی بلندیوں پر لے جاسکتی ہے۔"

"لیکن اتنے لوگوں کے سامنے....."

"وہاں مرزا صاحب کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا۔" مرشد نے یقین دہانی کرائی "اور یہ فلم عام ریلیز کے لیے بھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

مرشد نے وضاحت کی۔ صوفیہ کی آنکھیں چمکنے لگیں "مجھے منظور ہے۔"

مرشد نے معاہدے کے کاغذات اس کی طرف بڑھادیے "تو پھر اس پر دستخط کردیجیے۔ میں منہ میٹھا کراتا ہوں۔" پھر اس نے نذیر کو آواز دی "مٹھائی لاؤ نذیر۔"

صوفیہ معاہدے کی تفصیلات پڑھ رہی تھی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "اس کے مطابق تو آپ مجھے پچاس ہزار روپے معاوضہ دے رہے ہیں۔"

"جی ہاں، دس ہزار ایڈوانس۔ بیس ہزار فلم آدھی مکمل ہونے کے بعد اور بیس ہزار فلم کی ریلیز سے پہلے۔"

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے....."

"وہ صبح بخیر شب بخیر کی بات تھی۔ اس کا کوئی معاوضہ نہیں ہوگا۔ اس کا معاوضہ لے کر آپ حقیر ہوجائیں گی اور معاوضہ دے کر میں حقیر ہوجاؤں گا۔"

صوفیہ نے اسے شکرگزاری سے دیکھا اور کانٹریکٹ پر دستخط کردیے۔ میڈیکل چیک اپ کی شق پڑھ کر اسے حیرت ضرور ہوئی تھی۔

○☆○

"چوہدری صاحب، آپ کو فلم کیسی لگی؟" مرشد نے چوہدری جمیل سے پوچھا۔ اس نے فلم کا چھوٹا سا ٹریلر بنوا کر چوہدری کو دے دیا تھا۔

"ایسی حسین فلم میں نے آج تک نہیں دیکھی۔" چوہدری نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"فلم تو ابھی آپ نے دیکھی ہی نہیں ہے۔ یہ تو بس جھلکیاں ہیں۔ ایک گھنٹے کی فلم ہے۔"

"تو مجھے دے دیں نا مرشد صاحب، نذرانہ منہ مانگا دوں گا۔" چوہدری نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"نذرانہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ صرف پانچ ہزار روپے۔"

چوہدری کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ دوسری طرف عظمت مرزا بھی حیران رہ گیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ لاکھوں کی بات ہوگی۔ پھر چوہدری نے خود کو سنبھالا اور شک آمیز لہجے میں کہا "تو کیا اسے باقاعدہ ریلیز کریں گے آپ؟ یہ تو زیادتی ہوگی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں چوہدری صاحب۔ خاص چیز تو خاص لوگوں کے لیے ہی ہوتی ہے۔" مرشد نے وضاحت کی "میں نے صرف پچاس پرنٹ بنوائے ہیں۔ صرف خاص خاص لوگوں کو دوں گا اور وہ بھی اس شرط پر کہ کیسٹ عام نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کوئی کمرشل کام نہیں ہے۔ صرف تعلقات کی وجہ سے میں نے یہ فلم بنائی ہے۔"

"تو کسی اور کو دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں جو موجود

ہوں۔" چوہدری نے جلدی سے کہا۔
"لیکن چوہدری صاحب آپ پچاس پرنٹ لے کر کیا کریں گے؟ میں نے عرض کیا نا، یہ فلم عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔"
"تو، تو کیا میں یہ فلم چلواؤں گا۔ ویڈیو شاپس کو دوں گا۔" چوہدری نے برا مانتے ہوئے کہا۔
"میرا یہ مطلب نہیں تھا چوہدری صاحب۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ پچاس پرنٹ....."
"تو جی، اپنے یاروں میں شوقین لوگ کوئی کم ہیں۔" چوہدری نے فخریہ لہجے میں کہا "پھر لوگوں سے کام بھی پڑتا رہتا ہے۔"
"لیکن آپ کسی کو دیں اور وہ اس کی کاپیاں بنا کر تجارت شروع کردے۔"
"اس طرف سے آپ بے فکر ہوجائیں مرشد صاحب، ہم لالچی لوگ نہیں۔ نہ ایسے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جو ایسا دھندا کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔"
"دیکھ لیں چوہدری صاحب، آپ بڑی گارنٹی دے رہے ہیں۔"
"میں جانتا ہوں نا۔ بس آپ پرنٹ میری گاڑی میں رکھوادیں۔" چوہدری نے جیب سے چیک بک نکالی اور ڈھائی لاکھ روپے کا چیک مرشد کی طرف بڑھایا۔
"یہ آپ مرزا صاحب کو دیں۔" مرشد نے مرزا کی طرف اشارہ کیا پھر مرزا سے بولا "مرزا صاحب، یہ چوہدری صاحب اپنے خاص آدمی ہے۔ معاملات کے کھرے ہیں۔ جو کہہ دیں اسے پتھر پر لکیر سمجھئے۔ ان کا ہمیشہ خاص خیال رکھئے گا۔"
مرزا نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے چیک لیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ چوہدری نے جاتے جاتے کہا "میاں صاحب، ایک بات بتادوں آپ کو۔ یہ آپ کی ہیروئن بڑے لوگوں میں سپرہٹ ہو کر رہے گی۔"
چوہدری کے جانے کے بعد مرشد نے مرزا سے کہا "یہ ہے آپ کے ٹوٹے ستارے پر لگنے والے سرمائے کا کور۔ اب آپ ناکامی سے بے نیاز ہو کر فلم بنائیں۔"
"میں بہت کچھ سمجھ گیا ہوں لیکن کچھ باتیں اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"
"وہ آپ مجھ سے پوچھ لیں۔"
"ایک تو یہ کہ چوہدری صاحب نے پورے ۵۰ کیسٹ کیوں خرید لئے جبکہ کام ایک سے بھی چل سکتا تھا۔ ڈھائی لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی۔"
"جواب یہ ہے کہ چوہدری صاحب مجبور تھے۔ اگر ہم ۱۰۰ کیسٹ کہتے تو وہ ۱۰۰ کیسٹ خریدتے۔ چوہدری صاحب کے حلقہ احباب میں بڑے اور صاحب اختیار بیوروکریٹس ہیں، بینکار ہیں اور وزرا ہیں۔ یہ تعلق غرض کا ہے جس کے لیے دوستوں کو خوش کرنا ضروری ہے۔ اب یہی کیسٹ اگر کسی وی آئی پی کو چوہدری صاحب کے علاوہ کوئی ایکس وائی زیڈ بھی پیش کردے تو اُس کی کیا وقعت رہے گی۔ اِس لیے تمام کیسٹ خریدنا چوہدری صاحب کے لیے ضروری تھا۔ اب یہ ایک قیمتی تحفہ ہے دوستوں کو خوش کرنے کے لیے۔ دوسری بات یہ کہ چوہدری صاحب کے لیے یہ ڈھائی لاکھ کوئی بڑی چیز نہیں۔ ایک طرح کی سرمایہ کاری ہے، جس سے وہ کروڑوں کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تیسرے یہ بھی ممکن ہے کہ چوہدری صاحب یہ فلم غیر ملکی شائقین کو فروخت کردیں۔"
عظمت مرزا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "اور اِس بات کی کیا ضمانت ہے کہ چوہدری صاحب اِس فلم کی تجارت نہیں کریں گے؟"
"اس کی ایک وجہ تو میں نے تمہیں بتادی۔ چوہدری صاحب کے لیے یہ فلم ایک نایاب تحفہ ہے، جسے صرف وہ کسی کو پیش کرسکتے ہیں۔ وہ فلم کا اچھوتا پن مجروح نہیں کرسکتے۔ اس کے باوجود بھی میں نے احتیاطی تدبیر کی ہے۔" مرشد نے دراز کھول کر چھوٹا ٹیپ ریکارڈر مرزا کو دکھایا "ان کی گفتگو میں نے ٹیپ کرلی ہے۔"
عظمت مرزا بے ساختہ مسکرادیا۔



فلم ٹوٹے ستارے کا مہورت بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ فلم کی کاسٹ میں زیادہ تر نئے لوگ تھے۔ فلم کی شوٹنگ جس رفتار سے ہورہی تھی اس سے لگتا تھا کہ تین چار مہینے میں فلم ایڈیٹنگ ٹیبل پر ہوگی۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اداکاروں کی ڈیٹس کا وہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔
شام شوٹنگ جلدی پیک اپ کردی گئی۔ عظمت مرزا کو اپنی فیملی کے ساتھ ایک تقریب میں شرکت کرنا تھی۔ مرشد نے اس سے وعدہ لے لیا کہ تقریب سے نمٹنے کے بعد وہ اُس کے گھر آجائے گا "مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔"
دفتر میں مرشد نے صوفیہ سے، جس کا فلمی نام الماس رکھا گیا تھا، پوچھا "بے بی آج کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے تمہیں؟"
صوفیہ نے نظریں اٹھا کر اسے حیرت سے دیکھا "جی نہیں، کوئی کام ہے تو بتائیں۔"
"آج میرے ساتھ میرے گھر چلو۔"
صوفیہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ مرشد اکیلا ہی رہتا ہے "نہ مجھے کوئی مصروفیت ہے اور نہ ہی مجھے اس میں کوئی اعتراض ہوسکتا ہے۔"
مرشد کو اُس کی نظریں اچھی نہیں لگیں۔ تاہم اس نے مسکراتے ہوئے کہا "تو پھر چلو میرے ساتھ۔ تم سے ایک بہت اہم بات کرنی ہے۔"
صوفیہ کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ اِس اہم بات سے بخوبی واقف ہے "چلئے....." اس نے آہستہ سے کہا۔
وہ باہر نکلے۔ صوفیہ مرشد کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی اسٹوڈیو

سے نکل آئی۔ راستے میں مرشد نے صوفیہ سے پوچھا "کھانا پکانا آتا ہے تمہیں؟"

صوفیہ پھر حیران ہوئی "جی ہاں لیکن اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتی کہ میرا پکایا ہوا کھانا آپ کو پسند بھی آئے گا۔"

"تو پھر یہ زحمت کر سکو گی؟"

"کیوں نہیں۔"

"ویسے میں کھانے کے معاملے میں نخرے باز ہوں بھی نہیں۔"

راستے میں انہوں نے رک کر گوشت اور کچھ دوسری چیزیں لے لیں۔ صوفیہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

مرشد کا چھوٹا سا صاف ستھرا گھر صوفیہ کو بہت اچھا لگا۔ مرشد نے بتایا کہ ایک ملازمہ روز صبح آتی ہے اور صفائی کر جاتی ہے۔ صوفیہ نے جا کر کچن کا جائزہ لیا۔ وہاں مسالے اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی "آپ خود بھی پکاتے رہتے ہیں کیا؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"کبھی کبھی موڈ بن جائے تو پکا لیتا ہوں۔"

"میرا ہاتھ بٹائیں گے؟"

"ضرور۔"

"اچھا یہ بتایئے کیا کھانا پسند کریں گے؟"

"کچھ بھی پکا لو۔"

"بھوک جلدی لگنے کا امکان تو نہیں؟"

مرشد نے گھڑی دیکھی۔ سات بجے تھے "دو گھنٹے کی مہلت ہے تمہارے پاس۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ بریانی اور کباب بناؤں گی میں۔"

مرشد نے بڑی حد تک صوفیہ کا ہاتھ بٹایا۔ یوں کام جلدی نمٹ گیا۔ نو بجے وہ کھانے سے نمٹ چکے تھے۔ صوفیہ چائے بنا کر لے آئی۔ دونوں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے اور چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے "میں منتظر ہوں مرشد صاحب" اچانک صوفیہ نے کہا۔

"کس کی؟"

"اُس خاص بات کی، جو آپ کو مجھ سے کرنی ہے۔"

"اس کے لیے تمہیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔"

صوفیہ نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالی میز پر رکھی اور اٹھ کر صوفے پر مرشد کے برابر آ بیٹھی "جھجکنے کی ضرورت نہیں مرشد صاحب۔" اُس نے لرزیدہ آواز میں کہا "میں ذہنی طور پر تیار ہو کر آئی ہوں۔ ویسے بھی آپ کو میں نے ناپسند کبھی نہیں کیا۔"

مرشد نے سر گھما کر ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھا "تم غلط سمجھ رہی ہو بے بی۔ میں ہرگز نہیں جھجک رہا ہوں۔ جھجکتا تو آدمی وہاں ہے جہاں کوئی خوف یا خدشہ ہو۔ لیکن تم میرے لیے بہت محترم ہو۔"

"حیرت ہے۔ میری وہ فلم دیکھنے کے باوجود۔"

"تم یقین نہیں کرو گی لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے وہ فلم نہیں دیکھی۔ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ تم سے ایک عجیب طرح کا دلی ناتا جڑ گیا ہے۔" مرشد نے گہری سانس لے کر کہا "ویسے بھی اِن چیزوں میں، میں نے کبھی دلچسپی نہیں لی۔"

دیکھتے ہی دیکھتے صوفیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ ہلکی سی چیخ مار کر اُس سے لپٹ گئی "مجھے معاف کر دیجئے اپنی بدگمانی پر۔" وہ سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی "آپ مجھے ایسے ماحول میں ملے تھے پھر جس طرح آپ نے میرا انٹرویو لیا، مجھے وہ دوسرا اسکرپٹ دیا، میرا تاثر آپ کے بارے میں کچھ اور ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوا۔ میں خود حیران ہوئی تھی کہ آپ کا امیج اچھا ہی کیوں بنتا ہے۔ آج جب آپ نے گھر چلنے کو کہا تو ایک شیشہ سا چٹخا۔ لیکن یقین کریں مجھے خوشی ہوئی۔ اب میں آپ سے وہ بات کہوں گی جو مجھے کہنے کا حق نہیں۔ اِس لیے کہ مَیں اِس قابل ہی نہیں رہی۔ مگر میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اتنی کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

مرشد کے لیے وہ بے حد کمزور اور آزمائش لمحے تھے۔ وہ بے حد حسین تھی، بے حد قریب تھی، اُس سے اظہار محبت بھی کر رہی تھی اور وہ خود انسان تھا۔ خطا کا پتلا پھر وہ ایسا انسان تھا جو اپنی دانست میں ایک ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا تھا۔ بہت قریب تھا کہ وہ بہک جاتا لیکن اس خیال نے کہ آخری لمحوں میں کیوں اپنا دامن آلودہ کرے، عین وقت پر اسے بچا لیا۔

اُس نے بے حد نرمی سے صوفیہ کو ہٹایا "تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں۔"

صوفیہ بے حد شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا اب ان کے درمیان گفتگو کے لیے کوئی موضوع نہیں رہا ہے۔ مرشد نے اس کی کھسیاہٹ محسوس کر کے اس سے چائے کی فرمائش کر دی تاکہ شرمندگی اور تعطل کی فضا ختم ہو جائے "چائے زیادہ بنا لینا، تھرماس میں بھر لینا۔ تھوڑی دیر میں مرزا صاحب بھی آنے والے ہیں۔"

"مرزا صاحب؟"

"ہاں، میں نے انہیں بھی بلایا ہے۔"

صوفیہ کچن میں چلی گئی اور مرشد اُن رپورٹس کا جائزہ لینے لگا جو گزشتہ شب بابر نے اسے دی تھیں۔ اُن رپورٹس کو دیکھتے ہوئے اس کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ اداسی کی دھند نے آہستہ آہستہ اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

صوفیہ چائے بنا لائی تھی۔ دونوں چائے پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ صوفیہ کے انداز میں بے فکری تھی جیسے تھوڑی دیر پہلے ان کے درمیان کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مرشد بار بار اسے عجیب سی اداس سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ساڑھے دس بجے عظمت مرزا بھی آ گیا۔ صوفیہ کو موجود پا کر وہ حیران ہوا۔ صوفیہ کے پوچھنے پر اُس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ کھانا وہ تقریب سے کھا کر چلا تھا۔

"چائے پئیں گے؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"یا آپ کے ذوق کے مطابق کچھ پیش کروں۔" مرشد نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"شرمندہ نہ کریں میاں صاحب۔ جب سے مجھے میرا ماحول ملا ہے' میں نے آوارگی ترک کردی ہے۔ میں اپنے موجودہ مقام پر بہت مطمئن اور خوش ہوں۔" مرزا نے جواب دیا۔ پھر وہ صوفیہ کی طرف مڑا "چائے پلاؤ بے بی۔"

"نجانے کیوں مجھے یقین تھا کہ آپ ایسے ہی ہیں۔" مرشد بولا۔

، صوفیہ نے تھرموس سے چائے انڈیل کر مرزا کے سامنے رکھ دی۔ مرشد نے سگریٹ سلگائی اور ان دونوں کو غور سے دیکھا "اب میں آپ دونوں کی توجہ کا خواستگار ہوں۔" اس نے کہا "میں نے کہا تھا کہ مجھے بہت اہم بات کرنی ہے۔"

وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن بولے کچھ نہیں۔

"سب سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میں ایک کروڑ پتی صنعت کار ہوں۔ نہیں.... تھا کہئے۔ میری بیوی ہے' دو بچے ہیں۔ میں ان کو بہت چاہتا ہوں.... بہت زیادہ لیکن میں خود سے بھاگ رہا ہوں۔ اس لیے کہ میں ایڈز کا مریض ہوں۔"

وہ بہت بڑا دھماکا تھا۔ صوفیہ اور مرزا کے چہروں پر زلزلے کا سا تاثر تھا۔ مرزا تو گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی منٹ سناٹا سا طاری رہا۔ پھر صوفیہ نے کوشش کرکے خود کو سناٹے کے اِس طلسم سے نکالا "نہیں... میں یقین نہیں کرسکتی۔"

"میں بھی نہیں کرسکا تھا۔ لیکن میری خون کی رپورٹ بتاتی ہے کہ میرا ایچ آئی وی ٹیسٹ پازیٹیو ہے۔"

"میں اب بھی یقین نہیں کرسکتی۔" صوفیہ تنویم زدگی کی سی کیفیت میں بڑبڑائی۔

"میرے بھائی کو چھوڑ کر صرف آپ دونوں دنیا میں ایسے ہیں جنہیں میں نے اس راز میں شریک کیا ہے۔ اس لیے کہ اب آپ ہی وہ لوگ ہیں جنہیں میں اپنی فیملی سمجھتا ہوں۔"

"آپ کی بیوی کو بھی نہیں معلوم؟" صوفیہ نے پوچھا۔ مرزا اب تک یوں بیٹھا تھا جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔

مرشد یا عاصم نے انہیں اپنی بیوی اور بچوں کے بارے میں بتایا۔ وہ دونوں بڑی محویت سے سن رہے تھے "میں اپنے بچوں کو عمر بھر کی بدنامی کا داغ نہیں دینا چاہتا تھا۔" مرشد کہہ رہا تھا "سو میں اُن کی زندگی سے نکل آیا۔ پہلے میں منفی انداز میں سوچتا رہا۔ میں قصوروار نہیں تھا۔ مجھے یہ مرض لگا تو یہ پورے معاشرے کا قصور تھا۔ پھر میں نے سوچا' ممکن ہے مجھ سے کوئی بہت بڑی خطا سرزد ہوئی ہو جو خداوند کریم کو بہت ناپسند ہوئی ہو۔ اس کی مجھے یہ سزا ملی ہو۔ پھر میں نے اس حقیقت کو قبول کرلیا۔ مگر ایک بات میں نے پھر بھی سوچی۔ میں جانتا ہوں کہ اس معاشرے میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے' جنہیں فرصت و مہلت گناہ نہیں۔ جن کی عمر دو وقت کی روٹی کی فکر میں تمام ہوجاتی ہے۔ پھر بھی وہ ایڈز سے محفوظ نہیں۔ انہیں احتیاط کی تلقین کی جاتی ہے اس لیے کہ معاشرے کی گمراہ اور دولت مند اقلیت صرف احتیاط پر انحصار کرتی ہے' جو کہ ناکافی ہے۔ وہ اقلیت معاشرے کی معصوم اقلیت کے لیے ایک مہلک خطرہ ہے۔ یہ وہ اقلیت ہے جس کی سوچ گناہ سے شروع ہو کر گناہ پر ہی ختم ہوجاتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اِن گناہ گاروں کی فنا کے قدرتی عمل کو تیز کردوں تاکہ معصوم اکثریت کا تحفظ یقینی ہوجائے۔ فلم سے میری دلچسپی کافی پرانی ہے مگر میں یہ مشن لے کر اس طرف آیا۔ میں نے خود کو آلہ قہر سمجھ لیا۔ لیکن میں خود کو اس حیثیت میں استعمال نہیں کرسکا اور تن بہ تقدیر ہوگیا۔"

"مجھے بہت افسوس ہے مرشد صاحب۔" صوفیہ نے کہا "مگر اب میری الجھن دور ہوگئی ہے۔ آپ مجھے اس ماحول کے آدمی نہیں لگتے تھے۔"

"میں بھی بہت کچھ سمجھ گیا ہوں۔" عظمت مرزا نے پہلی بار لب کشائی کی "میں بھی الجھ رہا تھا۔ آپ مجھے پیسے سے بے نیاز آدمی معلوم ہوتے تھے مگر آپ اچھی فلم پر لگنے والے سرمائے کے کور کی بات کرتے تھے۔ یہ بات آپ کے منہ سے غیر فطری لگتی تھی۔ پھر آپ نے یہ پورنو فلم بنوائی تو اس دوران بھی آپ کا رویہ عیاش رئیسوں کا سا نہیں تھا۔ پھر اس بات پر زور کہ یہ فلم عام لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ حالانکہ آپ اُس سے خود لاکھوں کما سکتے تھے۔ آپ اسے بیرون ملک کے شوقین لوگوں کو منہ مانگے داموں بھی فروخت کرسکتے تھے لیکن اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ آپ ایک مشن کے تحت کام کررہے تھے۔"

"کررہا تھا نہیں کررہا ہوں۔" مرشد نے کہا "میں یقین رکھتا ہوں کہ رزق حرام کا ایک لقمہ بھی خون میں شامل ہوجائے تو اس کے اثرات بے حد خوف ناک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد آدمی گناہ کی دلدل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ یہاں ایسے لوگ' ایسے سیاست داں' ایسے حکمراں ہیں جنہوں نے کرپشن کی انتہا کردی ہے۔ جن کی رگوں میں خون نہیں' صرف رزق حرام دوڑ رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی گناہ سے بھی بچ سکتے ہیں۔ مجھے نفرت ہے ان لوگوں سے۔ میں انہیں ہٹ کرنا چاہتا ہوں۔ میری سوچ یہ ہے اگر غلط ہو تو اللہ معاف کرے کہ اُن لوگوں کو گناہ کے ذریعے خدا کے قہر کی طرف لے جانا گناہ نہیں ایک قومی خدمت ہے۔ یہ لوگ بے حس ہوچکے ہیں۔ انہیں عوام کی کوئی پروا نہیں۔ یہ اُس وقت سے بھی نہیں ڈرتے جب ملک کے عوام یہ دعا کرنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ اے اللہ' ان لوگوں کو ایڈز میں مبتلا کردے۔"

عظمت مرزا جھرجھری لے کر رہ گیا۔ صوفیہ نے کہا "مجھے لگتا ہے' ابھی آپ نے ہمیں اہم بات نہیں بتائی ہے۔"

مرشد نے گہری سانس لی "ہاں۔ بات یہ ہے کہ آپ دونوں کے لیے ایک بُری خبر ہے۔ آپ کی بلڈ رپورٹ بھی ایچ آئی وی پازیٹیو ظاہر کررہی ہے اور میری ہدایت پر اسے ٹرپل چیک کیا گیا ہے۔ مجھے بہت دکھ ہے۔"

"لیکن مجھے نہ دکھ ہے نہ حیرت۔" صوفیہ بولی "یہ تو ہونا ہی تھا۔ میں تھی ہی اس قابل۔"

"میں نہیں مانتا۔ تمہیں کسی نے اس طرف دھکیلا ہوگا۔ تم ایسی نہیں ہو۔ بہرحال میں ڈاکٹر سے بات کرچکا ہوں۔ جوان لوگوں پر بیماری کا حملہ عام طور پر بیس پچیس سال بعد ہوتا ہے۔ یہ مہلت کافی ہے۔ اس دوران ہوسکتا ہے علاج بھی دریافت ہوجائے اس کا......"

"سچ تو یہ ہے کہ مجھے جینے کی کوئی آرزو نہیں۔ جتنی مہلت مل جائے بڑی نعمت ہے۔ میں بھی آپ کی طرح ایک مشن لے کر نکلی تھی۔ اس مشن کو آپ نے وسعت دے دی ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے نہ کوئی دکھ ہے نہ ملال۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔" عظمت مرزا نے کہا "مسئلہ میرا بھی آپ والا ہے۔ بیوی بچے۔" اس نے ایک سرد آہ بھری "میں ان سے بھاگ بھی نہیں سکتا۔ میرا تو سب کچھ یہ کیریر ہے اور اب تو یہ اور اہم ہوگیا ہے۔ زندگی نے مجھے جتنی بھی مہلت دی، میں اسے آپ کے مشن کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔" اچانک اس کی آنکھوں میں امید چمکی "میاں صاحب' کیا یہ ممکن ہے کہ میرا راز راز ہی رہے؟"

"اس طرف سے آپ بے فکر ہوجائیں مرزا صاحب۔ یہ بات کبھی کسی کو معلوم نہیں ہوگی۔"

"بس تو پھر میں خوش ہوں کہ مجھے اپنے گناہوں کی سزا دنیا میں بھی مل رہی ہے۔"

وہ تینوں دیر تک بیٹھے مستقبل کی باتیں کرتے رہے۔ اب وہ ایک فیملی تھی۔

اچانک مرشد نے صوفیہ سے کہا "میری ایک بات یاد رکھنا بی بی۔ خود کو سہل الحصول نہ بنانا۔ یوں تمہاری کشش بھی بڑھے گی اور تم زیادہ موثر بھی ثابت ہوگی۔"

صوفیہ نے بے دھیانی سے اثبات میں سرہلایا۔ اس کے تصور میں اس وزیر کی صورت تھی جو اس کے بھائی کے ساتھ مل کر اس کی تباہی کا سبب بنا تھا۔

مرزا ہذیانی انداز میں ہنسنے لگا "تو یہ ہے آپ کی امداد فلمز لمیٹڈ امداد عام لوگوں کے لیے اور ایڈز فلموں کے ذریعے گناہ گاروں تک محدود......"

○☆○

ڈکلیریشن کے اجراء سے سرکاری پابندی اٹھنے میں ابھی ایک مہینہ باقی تھا۔ وحید نجمی کے لیے یہ عرصہ اکتا دینے والا تھا۔ اس نے اس عرصے میں ایڈز کے حوالے سے لیبارٹریز اور بلڈ بینکوں پر کافی گراؤنڈ ورک مکمل کرلیا تھا۔ کراچی کی حد تک وہ کام مکمل کرچکا تھا۔ اب اس کا ارادہ لاہور اور پھر راولپنڈی کی لیبارٹریز پر کام کرنے کا تھا۔

لاہور میں عوامی لیب کا بہت چرچا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس لیب نے بڑی اچھی ساکھ بنالی تھی۔ نجمی نے اس کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر بابر نسیم سے ملاقات کا وقت لیا۔ ڈاکٹر کی شخصیت نے اسے بہت متاثر کیا۔ ڈاکٹر امریکا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے آیا تھا۔ خون کے امراض کا وہ اسپیشلسٹ تھا۔

"آپ کی لیب کو قائم ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟" نجمی نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"سات ماہ ہونے والے ہیں۔"

"آپ کو لیب قائم کرنے کا خیال کیوں آیا؟"

"دیکھیں، پہلی بات تو یہ کہ یہ میری فیلڈ ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں نے محسوس کیا کہ پاکستان میں اِس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ایڈز پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہوچکا ہے۔ اب بلڈ بینکوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی کو مطلوبہ خون دینے بلکہ لینے سے پہلے خون کی مکمل اسکریننگ کریں۔ ہر لیبارٹری میں ایڈز کے وائرس کی چیکنگ کا بندوبست ہونا چاہیے۔ یہ بڑا ذمے داری کا کام ہے۔ یہ صحت عامہ کا مسئلہ ہے۔ جو شخص بھی یہ کام کرے گا وہ درحقیقت ایک اہم قومی خدمت انجام دے گا۔"

"تو آپ کی لیبارٹری میں یہ کام ہوتا ہے؟"

ڈاکٹر بابر چند لمحے اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر بولا "میں اِس کا جواب دوں گا۔ لیکن یہ آف دی ریکارڈ ہوگا۔" اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا "آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ایڈز کے بارے میں یہاں لوگوں کا رویہ کیا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔" نجمی نے سہلاتے ہوئے کہا "آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کی مرضی کے بغیر آپ کا کہا ہوا ایک لفظ بھی شائع نہیں ہوگا۔"

"شکریہ" ڈاکٹر بابر مسکرایا "ہم نہ صرف اپنے معزز کرم فرماؤں کے خون کی ایچ آئی وی اسکریننگ کررہے ہیں بلکہ مکمل ریکارڈ بھی رکھ رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم اِس بات کا اعلان بھی کردیں تو لوگ ہمارے پاس آنا چھوڑدیں گے۔ یہاں تو ایڈز مرض کی بجائے ایک گالی کی صورت اختیار کرگیا ہے۔"

"درست کہا آپ نے۔ اور اس میں لوگوں کے رویے کا بڑا دخل ہے۔"

"لوگوں کو صحیح طرح سے بتایا بھی تو نہیں گیا ہے ایڈز کے بارے میں.... اور اچھوت بننے سے تو ہر شخص ڈرتا ہے۔"

"جی ہاں یہی بات ہے۔ کئی ایسے افراد ہیں جنہیں اپنے ایڈز میں مبتلا ہونے کا علم ہوا تو وہ روپوش ہوگئے۔" نجمی نے کہا "ایک شخص تو ایسا تھا کہ جو ڈاکٹر سے یہ کہتا تھا کہ اُس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ لہٰذا اب وہ اس مرض کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرے گا۔"

"کمال ہے۔ اُس شخص کو تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی؟ یہ تو بے حد خطرناک بات ہے۔"

"اخبار میں خبر چھپی لیکن اُس شخص کو بہر حال سنجیدگی سے تلاش نہیں کیا گیا۔ ایڈز کی بدنامی کا یہ حال ہے کہ دولت مند لوگ جو ہمارے معاشرے میں بے حد طاقت ور ہوتے ہیں' وہ بھی خود کو معاشرے میں ایڈز کے مریض کی حیثیت سے نہیں پیش کرپاتے۔ وہ روپوش ہونے والا شخص تو بہت غریب آدمی تھا۔ خون بھی بیچتا تھا اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے۔ کوئی دس ماہ پہلے ملک کے ایک معروف کروڑپتی صنعت کار نے بھی روپوشی اختیار کرلی۔ اُس کا آج تک سراغ نہیں ملا۔"

ڈاکٹر بابر کچھ چونکا "کروڑپتی صنعت کار؟ کیا نام تھا اُس کا؟"

"یہ بات پلیز اپنی ہی حد تک رکھیے گا۔" نجمی نے کہا "اس صنعت کار کا نام عاصم قریشی تھا۔" ڈاکٹر بابر کی آنکھوں میں اسے حیرت نظر آئی "آپ جانتے ہیں انہیں؟"

"نہیں' میں نے بتایا نا کہ میں آٹھ سال امریکا میں رہ کر واپس آیا ہوں۔" ڈاکٹر بابر نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ حالانکہ اندر ہی اندر وہ اپنے پورے وجود کو لرزتا محسوس کر رہا تھا "البتہ نام مجھے سنا ہوا لگا ہے۔"

"میں نے قریشی صاحب کے بارے میں بہت چھان بین کی۔ لیکن وہ ہر اعتبار سے بہت صاف ستھرے آدمی ثابت ہوئے۔ انہوں نے خود بھی ڈاکٹر سے کہا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں ایڈز کیسے لگا ہوگا۔"

"دیکھیں' اِن ڈائریکٹ طریقے بھی تو ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایڈز کا ہر مریض گناہ گار ہو۔"

"آپ کے خیال میں ایڈز کی روک تھام کے لیے حکومت نے موثر اقدامات کیے ہیں؟"

"موثر اقدامات؟" ڈاکٹر تلخی سے ہنسا "مجھے تو ابھی تک اقدامات بھی نظر نہیں آئے ہیں۔ حکومت تو بس ایک ادارہ قائم کرکے مطمئن ہوگئی ہے۔ انداز شترمرغ والا ہے جو ریت میں منہ چھپا کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اُس کا پہاڑ جیسا وجود بھی چھپ گیا ہے۔ اب اس ادارے کے نام کو ہی لیجیے۔ نیشنل ایڈز پروگرام۔ پہلی بار میں نے یہ نام سنا تو سمجھا کہ یہ غریبوں کی مدد کرنے والا کوئی فلاحی ادارہ ہے۔ پھر بتایا گیا کہ یہ ایڈز کا چکر ہے۔ اب بھی نام سے مجھے یہ ادارہ ایڈز کی روک تھام والا نہیں بلکہ فروغ والا لگتا ہے۔ نیشنل ایڈز پروگرام۔" اُس نے تمسخر سے دہرایا "یہ ہے ہمارا حال۔ نیشنل ایڈز کنٹرول ہی رکھ دیتے نام۔ اور اس ادارے کی ناقص کارکردگی کی گواہی ٹی وی اور اخبارات دیتے ہیں۔"

"اچھا.... آپ کا بلڈ بینک؟"

"مجھے فخر ہے کہ ہم یہ بڑا کام کر رہے ہیں۔ ہم دعوے سے صاف ستھرا خون فراہم کرتے ہیں ضرورت مندوں کو۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات ہم ضرورت پوری نہیں کرپاتے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ کوئی خون فروخت کرنے آئے تو ہم پوری طرح ٹیسٹ کیے بغیر خون قبول نہیں۔ لہٰذا ہمارے وسائل کم ہیں۔ عطیہ دینے والے کم ہی آتے ہیں۔ بہرکیف ہم کسی کو ضرررساں خون نہیں دیتے۔"

"اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔" نجمی نے کہا "ایڈز کے سلسلے میں عام لوگوں کے لیے کوئی پیغام ہے آپ کا؟"

ڈاکٹر بابر چند لمحے سوچتا رہا "جی ہاں' میں اُن سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایڈز کے کسی بھی مریض کو بدکار اور گناہ گار نہ سمجھیں۔ اسے ملامت' نفرت اور گریز کی نہیں' ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اُس کا نظروں کے سامنے رہنا اچھا ہے۔ دوسری صورت میں وہ انسانی بم بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی ہم میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ محض شک کی بنا پر کسی کو مجرم قرار دے دیں۔ حقیقت صرف خدا کو معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں تو بیمار سے بس ہمدردی کرنی چاہیے۔"

"ایڈز کی روک تھام کے لیے حکومت کو کوئی مشورہ دیں گے آپ؟"

"ائرپورٹس پر خون ٹیسٹ کرنے کا انتظام ضروری ہے۔ غیرملکیوں کو بغیر چیکنگ کے ملک میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ دوسری بات' باہر سے آنے والے پاکستانیوں کو بھی ائرپورٹ پر ہی چیک کیا جائے خواہ ان میں دو چار ہفتوں کے کاروباری' تفریحی دوروں پر جانے والے ہوں خصوصاً جو عام طور پر مشرق بعید کے ممالک یا ہندوستان کا رخ کرتے ہیں۔ آپ تصور نہیں کرسکتے کہ بھارت اور مشرق بعید کے ممالک میں ایڈز کے مریض کتنی بڑی تعداد میں ہیں۔ پاکستان میں یہ مرض باہر سے ہی آیا ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی "یہ کام ابتدا میں ہی ہو جانا چاہیے تھا۔ اب تک تو صورت حال نجانے کتنی خراب ہو چکی ہوگی۔ پھر بھی کم از کم اب تو یہ کام کرلیا جائے۔ دوسرے ایڈز کے مریضوں پر نظر رکھی جائے۔"

"شکریہ ڈاکٹر" نجمی اٹھ کھڑا ہوا۔



بابر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔

گمشدہ کڑی مل گئی تھی۔ زنجیر مکمل ہوگئی تھی۔ بات پوری طرح اُس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ عاصم کا رویہ جو ناقابل فہم لگتا تھا' اب ناقابل فہم نہیں رہا تھا۔ معمّا حل ہوگیا تھا لیکن کیا ایسا تھا؟ اس معمّے کا تو کوئی حل نہیں تھا۔ ایڈز موت تھی.... یقینی موت!

بابر یہ سوچ کر کانپ اٹھتا تھا کہ عاصم اتنے عرصے سے اکیلا اپنی سولی اپنے کاندھے پر اٹھائے پھر رہا ہے۔ ایک معزز' قابل فخر شخص اپنی شناخت سے' اپنی محبوب بیوی سے' اپنے جیتے بچوں سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوگیا تھا اور وہ کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کرب کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔

بابر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کا جی چاہا کہ اسی وقت جا کر بھائی جان سے لپٹ جائے۔ روئے اور انہیں بھی رلائے کہ اب تک نہ جانے کتنے آنسو وہ پی چکے ہوں گے۔ انہیں دلاسا دے۔ انہیں بتائے کہ اُن سے محبت کرنے والا کوئی بھی شخص اُن

کی محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ وہ اب بھی سب کو محبوب ہیں۔ اور آخری لمحے تک وہ انشاءاللہ اکیلے نہیں ہوں گے۔

آخری لمحے کا خیال آتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ دیر تک روتا رہا۔ پھر اچانک اس کا دل جیسے جگمگا اٹھا۔ گھپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن بھی بہت ہوتی ہے۔ اس نے اس کرن کو جیسے دل کی مٹھی میں بند کرلیا۔

یہ خیال اسے بعد میں آیا کہ یہ فیصلہ کچھ دشوار تو نہیں ہے بلکہ ہونا ہی یہ چاہیے تھا۔

○☆○

صوفیہ دل ہی دل میں خوش تھی لیکن بظاہر پریشان اور برہم نظر آنے کی کوشش کررہی تھی "میں کہہ چکی ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔" اُس نے چوہدری جمیل سے کہا۔ چوہدری جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں امداد فلمز لمیٹڈ کے دفتر کے اندرونی کمرے میں بیٹھے تھے۔

"کیوں ناممکن ہے؟" چوہدری نے کہا۔

"اس لیے ناممکن ہے کہ نہ مجھے رقص آتا ہے نہ ہی میں گانے والی ہوں۔"

"تو تم ایک معزز مہمان کی حیثیت سے شریک ہوسکتی ہو؟"

"دیکھیں چوہدری صاحب، میں نادان بچی نہیں، سب سمجھتی ہوں۔ میں اس طرح کی نجی محفلوں میں شریک نہیں ہوسکتی۔" صوفیہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیوں آخر؟ یہ تو تمہاری عزت افزائی ہے۔ اس محفل میں تین منسٹر شریک ہوں گے۔"

"یہ منسٹر آخر مجھ پر ہی کیوں مہربان ہو رہے ہیں۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔"

چوہدری مکاری سے ہنسنے لگا "تبھی فلم نگری میں چلی آئی ہو۔"

"فلم نگری میں ابھی تک قدم بھی نہیں رکھا میں نے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے مرشد صاحب اور مرزا صاحب جیسے لوگ ملے۔ میں ایک عزت دار لڑکی ہوں۔ اسی لیے میں نے کسی اور ادارے کی کوئی فلم قبول نہیں کی۔ اب تک کسی نے یہاں میلی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھا مجھے۔"

"تم بھول رہی ہو۔ ادارہ تمہاری ایک دھانسو فلم خاص لوگوں میں ریلیز کرچکا ہے۔" چوہدری نے زہریلے لہجے میں کہا "اس فلم سے تم عزت دار لڑکی تو ثابت نہیں ہوتیں۔ اُس فلم نے بڑے لوگوں کو دیوانہ بنادیا ہے تو اس میں کس کا قصور ہے؟ تمہارا ہے عزت دار لڑکی۔"

صوفیہ نے چوہدری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "وہ فلم بھی مجھے عزت دار ہی ثابت کرتی ہے۔ ورنہ میں اکیلی نہ ہوتی اس فلم میں۔"

"اسی بات نے تو ویلیو بڑھا دی ہے تمہاری۔" چوہدری نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "دیکھو بے بی الماس' بے کار ضد نہ کرو۔ تم خوش قسمت ہو کہ ابتدا میں ہی اتنا اونچا جانے کا موقع مل رہا ہے۔ میں تمہیں جن لوگوں سے متعارف کرا رہا ہوں' وہ بڑے اختیار والے لوگ ہیں۔ اُن سے کیا کچھ نہیں مل سکتا تمہیں۔ ضد کرو گی تو نقصان میں رہو گی۔ جو لوگ تمہیں عزت سے بلوا رہے ہیں وہ تمہیں اٹھوا بھی سکتے ہیں۔"

"خیر... ملک میں اب اتنی لاقانونیت بھی نہیں۔" صوفیہ نے کمزور لہجے میں کہا۔

"میں لاقانونیت کی نہیں' قانون کی بات کررہا ہوں۔ وہ فلم جو تمہیں اتنا اوپر لے جارہی ہے' تمہیں تباہ بھی کرسکتی ہے۔ تمہارے خلاف ناقابل تردید ثبوت بھی بن سکتی ہے۔"

صوفیہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ خوف زدہ نظر آنے لگی "اچھا میں سوچوں گی چوہدری صاحب۔"

"سوچنا کیا ہے۔ پروگرام مری میں ہوگا۔ تمہیں مسلسل شوٹنگ نے تھکا دیا ہے۔ میں میاں صاحب سے بات کرلوں گا۔ تمہیں پندرہ دن کی چھٹی مل جائے گی۔"

"پندرہ دن....؟"

"میرا وہاں شاندار بنگلا ہے۔ وہیں قیام کرنا۔ میں تو دو دن سے زیادہ نہیں رک سکوں گا۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ آپ میاں صاحب سے بات کرلیں۔" صوفیہ نے مُردہ لہجے میں کہا۔ دل ہی دل میں وہ ہنس رہی تھی کہ موذی اپنی موت کو خود آواز دے رہے ہیں۔

○☆○

فلم آدھی سے زیادہ مکمل ہوچکی تھی۔ الماس اگرچہ موجود نہیں تھی مگر دوسرے اداکاروں کی شوٹنگ جاری تھی۔ مرشد جمعرات کی رات معمول کے مطابق اسٹوڈیو سے جلدی نکل آیا۔ وہ گھر پہنچا تو بابر پہلے ہی وہاں موجود تھا۔

بابر اپنے ساتھ کھانا لے کر آیا تھا۔ دونوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا پھر بابر نے چائے بنائی۔ چائے پینے کے بعد عاصم کو جماہیاں آنے لگیں۔

"لگتا ہے آج آپ بہت تھک گئے ہیں۔" بابر نے کہا۔

"تھکن تو نہیں ہے لیکن نیند بہت آرہی ہے۔"

"تو سو جائیں۔"

میّت میں پڑوسی عورتیں تعزیت کررہی تھیں۔ ایک بولی "اسّی کا ہوگا۔"

دوسری بولی "نہیں ستّر سے زیادہ کا نہیں ہے۔"

میّت کے قریب بیٹھے ہوئے چھ سالہ پوتے نے کہا۔ "چلو ستّر ہی دے دو اور لے جاؤ۔"

"نہیں، اب ایسا بھی نہیں۔ ٹی وی پر آج بہت اچھی فلم آرہی ہے۔"

لیکن عاصم فلم نہ دیکھ سکا۔ نیند پر قابو پانا اُس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ بستر پر جالیٹا اور چند لمحوں میں ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔ بابر نے ایک گھنٹے انتظار کیا۔ پھر اس نے اپنے بیگ سے سرنج نکالی اور بڑی مہارت سے عاصم کی کلائی سے خون لیا۔ عاصم کسمسایا بھی نہیں۔ بابر اُس وقت بے حد ایکسائیٹڈ تھا۔ اپنے لیب اسسٹنٹ کو وہ پہلے ہی رکنے کی ہدایت کر آیا تھا۔

اس نے عاصم کو کمبل اُڑھایا اور دروازہ لاک کرکے باہر نکل آیا۔ بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اِس وقت اُس کا رواں رواں دعا کررہا تھا۔

○☆○

عاصم کی آنکھ کھلی تو کمرے میں ہلکی دھوپ اتر چکی تھی۔ اُس کی نظر سرہانے کرسی ڈال کر بیٹھے ہوئے بابر پر پڑی تو اسے حیرت ہوئی۔ بابر محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے جاگتے دیکھا تو مسکرایا۔

"کیا بات ہے، تم سوئے نہیں؟" عاصم نے پوچھا۔

"نہیں بھائی جان۔ کل جاگنے کی رات تھی۔" بابر نے مسکراتے ہوئے کہا "اور اب بھی نہیں سوؤں گا۔ یہ جشن منانے کا دن ہے۔"

عاصم اٹھ بیٹھا "کیا بات ہے۔ معموں میں بات کررہے ہو۔ رات تو ایسی کوئی بات نہیں کی تم نے۔"

"خوش خبری آپ کے سونے کے بعد ملی تھی۔"

اچانک عاصم کو کہنی سے نیچے اس جگہ تکلیف کا احساس ہوا، جہاں سے بابر نے خون لیا تھا "ارے یہ کیا، رات کسی کیڑے نے کاٹ لیا شاید۔" وہ بڑبڑایا۔

"اس کیڑے کا نام بابر نسیم ہے بھائی جان۔"

"کیا... کیا مطلب؟"

"رات میرا جی چاہا کہ آپ کا خون چیک کردیکھوں۔" بابر نے کہا۔ عاصم کا چہرہ فق ہوگیا "ڈریے نہیں، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ آپ ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"یہ صبح صبح کیا بکواس...."

"بھائی جان، جس نے آپ کا خون چیک کرکے ایچ آئی وی پازیٹیو ڈکلیر کیا تھا، وہ غلطی پر تھا۔"

عاصم کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"اس کا بھی زیادہ قصور نہیں۔ میں نے اس وائرس کو اسٹڈی نہ کیا ہوتا امریکا میں تو میں بھی دھوکا کھا جاتا۔" بابر نے اپنی بات جاری رکھی "رات میں نے ٹیسٹ کرنے کے لیے آپ کا خون لیا تھا۔ جاکر اسکریننگ کرائی اپنے سامنے۔ پونے چھ بجے خوش خبری لے کر واپس آیا اور آپ کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا۔"

"میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آرہی ہے۔"

"آپ باتھ روم ہو آئیں۔ میں اتنے میں ناشتے کا بندوبست کرتا ہوں۔ پھر بیٹھ کر سکون سے بات کریں گے۔"

عاصم باتھ روم میں چلا گیا۔ وہاں اسے غور کرنے کا موقع مل گیا۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی۔ اس کے بعد تو اس کے لیے سکون سے نہانا بھی ممکن نہیں رہا۔ جلدی جلدی کپڑے بدل کر وہ باہر نکل آیا۔ بابر ناشتا لے آیا تھا۔ لیکن عاصم نے صرف چائے پر اکتفا کیا۔

"تم مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کررہے ہو کہ مجھے ایڈز کا کوئی خطرہ لاحق نہیں؟" اس نے بابر سے پوچھا۔

"سمجھا نہیں رہا ہوں، حتمی طور پر بتارہا ہوں۔" بابر نے کہا "پوری طرح چھان بین کے بعد یہ بات کہہ رہا ہوں۔"

عاصم کچھ سوچنے لگا پھر بولا "پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ بات معلوم کیسے ہوئی؟"

بابر نے اسے نجمی کے متعلق تفصیل سے بتادیا۔

"اور تم نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے یہ ڈراما کیا تاکہ میں گھر جاؤں اور بیوی بچوں کے ساتھ ایک نارمل زندگی گزارنے لگوں اور آخرکار ایڈز سے مرجاؤں۔"

"میں جانتا تھا کہ آپ اسی انداز میں سوچیں گے۔" بابر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "حالانکہ میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور اتنا بڑا جھوٹ بولنے کا.... دھوکا دینے کا تو میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں بھائی جان۔ بہرحال آپ کی اس بے یقینی کا بھی حل ہے میرے پاس۔ میں آپ کو امریکا لے کر چلوں گا۔ وہاں سے آپ مطمئن ہوکر وطن واپس آئیں گے۔ پھر ہم کہیں اور نہیں جائیں گے۔ بس گھر چلیں گے۔ ٹھیک ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا ہے بابر۔" عاصم کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

"بھائی جان، آپ جانتے ہیں کہ آپ مجھے کتنے عزیز ہیں۔" بابر نے جذباتی لہجے میں کہا "میں آپ کی قسم کھاکر کہہ رہا ہوں کہ میری بات سچ ہے۔"

عاصم نے بابر کو لپٹالیا "مجھے یقین آگیا میرے بھائی لیکن امریکا ہم پھر بھی چلیں گے۔"

"بالکل چلیں گے لیکن اب آپ عاصم قریشی کی حیثیت سے جائیں گے۔ اپنا پاسپورٹ دے دیں مجھے۔"

عاصم کا جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر فوزیہ اور بچوں کے پاس پہنچ جائے۔ لیکن احتیاط کے نام پر چند دن اور سہی۔ کاش.... کاش وہ فوزیہ کو فون ہی کرسکتا۔

○☆○

وہ اُن لوگوں کی الوداعی ملاقات تھی۔ عاصم اگلے روز بابر کے ساتھ امریکا جارہا تھا۔ صوفیہ اور عظمت مرزا کی حالت عجیب تھی۔ وہ سانس روکے بیٹھے عاصم سے تفصیل سن رہے تھے۔ کبھی ان میں سے کسی کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا "اللہ کا شکر ہے۔"

"مجھے دلی خوشی ہوئی ہے میاں صاحب۔" عظمت مرزا نے کہا "اگرچہ دکھ بھی ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو جائیں گے لیکن آپ ہماری دنیا کے آدمی ہی نہیں تھے۔" مرزا کے لہجے میں اداسی اتر آئی "آپ کو تو اللہ نے ہم لوگوں کو نئی زندگی دینے کے لیے بھیجا تھا' گمنامی میں مرجانا جن کا مقدر تھا۔"

صوفیہ بیک وقت اپنے آنسوؤں کو پینے اور چھپانے کی کوشش کررہی تھی "مبارک ہو مرشد صاحب' مجھے یقین تھا کہ آپ کے معاملے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ آپ کو مبارک ہو۔"

عاصم اُس سے نظریں چرا رہا تھا۔ اسے وہ رات یاد آگئی' جب وہ صوفیہ کو اپنے ساتھ گھر لایا تھا۔ جب اُس نے اپنا راز ان پر منکشف کیا تھا۔ وہ وقت شاید اُس کی آخری آزمائش کا تھا۔ تنہائی' صوفیہ کا حُسن اور اس کی سپردگی۔ اور پھر یہ ترغیب کہ پارسائی کے صلے میں بدکاری کی سزا تو مل ہی چکی ہے۔ عاصم کو یاد تھا کہ شیطان نے اُن لمحوں میں اس کے کانوں میں فسوں پھونکا تھا۔ لیکن اللہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ اس آزمائش سے سرخرو نکلا تھا۔ اگر اُس رات اس سے لغزش ہوگئی ہوتی تو اب وہ یقینی طور پر ایچ آئی وی پازیٹیو کیس ہوتا۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گیا "صوفیہ بی بی اگر مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو مجھے معاف کردینا۔"

صوفیہ نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے "ایسی باتیں نہ کریں پلیز۔ آپ نے تو ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ اب آپ ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں تو میرے پاس آپ کی صرف اچھی یادیں ہیں۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھلا سکوں گی۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"اب آپ عاصم قریشی کی حیثیت سے اصل زندگی گزاریں گے۔" مرزا نے کہا "یہ خوشی کی بات ہے۔ ہمیں بھی کبھی کبھی یاد کرتے رہیے گا کوئی خبر پڑھ لیں تو دعائے مغفرت کردیجیے گا۔" اس بار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "میں نے اپنے بدترین دنوں میں تنہائی کے باوجود بھی کبھی خود کو تنہا محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن اب میں بھری دنیا میں' اپنے گرد لوگوں کا جمگھٹا ہونے کے باوجود تنہائی محسوس کروں گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں رابطہ رکھوں گا آپ سے۔"

"میرا مشورہ مانیں تو ایسا نہ کیجیے گا۔" مرزا نے کہا "مرشد صاحب کو یہیں چھوڑ جائیں آپ۔ اور عاصم قریشی کا ہم سے کوئی تعلق رکھنا مناسب نہیں ہوگا۔"

عاصم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر عاصم نے کہا "میں آپ لوگوں کو بتا نہیں سکتا کہ کتنا شکر گزار ہوں آپ کا۔ جب میں دنیا میں اکیلا تھا' اپنی شناخت تک سے محروم تو آپ میری فیملی بنے۔"

ماحول بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ صوفیہ نے گفتگو کا رخ بدلا "امریکا سے واپسی پر کیا کریں گے آپ؟ میرا مطلب ہے کوئی کاروبار۔"

"کاروبار میں تو عمر گزر گئی۔" عاصم نے اداسی سے کہا "اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اخبار نکالوں گا' کاروبار کے لیے نہیں' صحافت کی آبرو کے لیے' سچ لکھنے کے لیے عام لوگوں کی رہنمائی کے لیے۔"

"ہم آپ کی کامیابی کے لیے دعا کرتے رہیں گے۔"

"آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟"

"ہم اپنا کام کرتے رہیں گے۔" عظمت مرزا نے کہا "مشن جاری رہے گا۔ نتائج خدا کے اختیار میں ہیں۔"

صوفیہ تائید میں سرہلا رہی تھی۔

"امداد فلر لینڈ کو یا آپ لوگوں کو کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو عاصم قریشی کو فون کر دیجئے گا۔"

○☆○

فوزیہ اب قدرے پرسکون تھی۔ ڈیکلیریشن مل گیا تھا۔ ہفت روزہ آنگن کی اشاعت شروع ہوگئی تھی۔ پہلے شمارے کی سیل اگرچہ کم تھی لیکن اب پرچہ بتدریج جگہ بنا رہا تھا۔ پہلا شمارہ کسی بھی اسٹال سے بچنے نہیں دیا گیا تھا اور اب فوزیہ متوقع نتائج کی بے صبری سے منتظر تھی۔ گھر میں جب بھی فون کی گھنٹی بجتی، وہ اس توقع پر ریسیور اٹھاتی کہ عاصم کی آواز سنائی دے گی لیکن ابھی تک مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ بس اب انتظار کی وہ کیفیت تھی اور وہ۔ دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ پرچے کی مصروفیات نہ ہوتیں تو شاید یہ انتظار اسے پاگل ہی کر دیتا۔

اُس شام وہ تھکی ہاری گھر پہنچی۔ بیٹھی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور اٹھایا "ہیلو؟"

"بھابی السلام علیکم" دوسری طرف سے چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ارے بابر" وہ خوش ہوگئی "بے مروت لڑکے، کتنے عرصے بعد فون کیا ہے تم نے۔" ساتھ ہی اس کا دل دھڑکا کہ اب وہ بھائی جان کو پوچھے گا۔

"بھابی، آپ کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔"

"واپس آرہے ہو نا؟"

"جی ہاں لیکن خوش خبری اور ہے۔ اپنے ساتھ آپ کے لیے ایسا تحفہ لا رہا ہوں کہ آپ خوش ہو جائیں گی۔"

"بتاؤ نا۔"

"آپ کی ہی ایک گمشدہ چیز ہے۔"

فوزیہ کا دل بے طرح دھڑکا۔ اس کی تو ایک ہی چیز گم ہوئی تھی۔ عزیز ترین ہستی.... اس کا شوہر۔ "پہیلیاں نہ بجھواؤ بابر۔"

بابر کا لہجہ ہیجانی ہوگیا "آپ بھائی جان کی یادگار سالگرہ کی تیاری مکمل کرلیں۔ میرے ساتھ بھائی جان بھی ہوں گے۔ اب آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ بھائی جان بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ہم لوگ انشاء اللہ سالگرہ والے دن پہنچیں گے۔"

فوزیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دل تھا کہ قابو میں نہیں آرہا تھا۔ بابر بھابی، بھابی پکار رہا تھا لیکن بولنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا "بابر.... بابر کیا یہ سچ ہے؟" اُس نے سسکیوں کے درمیان پوچھا۔

"بھابی اتنے بڑے معاملے میں، میں مذاق کروں گا کیا۔ پلیز بھابی آپ روئیں نہیں۔"

"میں کتنی خوش ہوں، بتا نہیں سکتی۔ اِس سے بڑی خوش خبری کوئی مجھے سنا نہیں سکتا۔"

"بس تو منہ مانگا انعام پکا۔"

"بالکل پکا۔"

"تو انعام میں وہیں آکر لوں گا۔ اچھا بھابی خدا حافظ۔"

فوزیہ ریسیور رکھ کر سناٹے کے عالم میں بیٹھی رہی۔ بابر نے کہا تھا بھائی جان بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ جس حال میں بھی ہوں میرے لیے تو دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں لیکن ابھی اُس کے آنے میں آٹھ دن ہیں۔ کیسے کٹیں گے یہ دن۔ وہ روتے روتے ہنس دی۔ ایک سال سے زیادہ کی جدائی سہنے والی اب صرف ایک ہفتے کی جدائی سے گھبرا رہی تھی۔

اچانک اسے بچوں کا خیال آیا۔ بچوں کو بھی بلوالینا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اُس نے ریسیور اٹھایا۔

"باجی، میں ثمینہ بول رہی ہوں۔"

"اوہ ثمینہ۔"

"باجی کل اسکول کا آخری دن ہے پھر چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔ انہیں لے آؤں یا..."

"ارے پگلی، ابھی میں اسی لیے تمہیں فون کرنے والی تھی کہ تمہارا فون آگیا۔ بچوں کو لے آؤ۔"

"کیا بات ہے باجی، بہت خوش لگ رہی ہیں؟"

"خوش خبری تم بھی سنو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ ۳۰ دسمبر کو تمہارے بھائی جان گھر آرہے ہیں۔"

"مبارک ہو باجی۔" ثمینہ کی آواز سے خوشی چھلک رہی تھی۔

"بس تم کل کی فلائٹ سے آجاؤ بچوں کو لے کر۔ بہت سی تیاریاں کرنی ہیں۔"

"ٹھیک ہے باجی۔"

○☆○

عاصم کی کیفیت ایسی تھی جیسے وہ عالم خواب میں ہو۔ ذہن پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ بابر کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ ایڈز کا مریض نہیں تھا۔ امریکی ڈاکٹروں نے کچھ دوائیں تجویز کردی تھیں۔ دس دن وہ اسپتال میں داخل رہا تھا اور اب وہ وطن واپس جا رہا تھا۔

سفر کے دوران وہ صرف یہ سوچتا رہا کہ فوزیہ کا سامنا کیسے کرے گا۔ اِس ذہنی کیفیت میں یہ فیصلہ کرنا اُس کے لیے دشوار تھا کہ اس نے گھر چھوڑ کر غلطی کی تھی یا نہیں۔ صوفیہ کو اعتماد میں نہ لینا زیادتی تھی یا نہیں۔ اب اُس کا رویہ کیسا ہونا چاہیے اور فوزیہ کا رویہ کیسا ہوگا۔ ان سوچوں نے اسے اور الجھا دیا۔

اسے علم نہیں تھا کہ بابر گھر فون کرکے آمد کی اطلاع دے چکا ہے۔ وہ تو یہ سوچ رہا تھا کہ ائرپورٹ سے ہی منہ چھپا کر کہیں نکل لے گا۔ لیکن ائرپورٹ پر فوزیہ اور بچے اُن کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ فوزیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے جبکہ بچوں کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

پھر بپھرے ہوئے دریا نے بند کو توڑ دیا۔ عاصم کو کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ اسے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ کب وہ گاڑی میں بیٹھے اور کب گھر پہنچے۔ گھر جسے وہ بھول چکا تھا، جس سے وہ دست بردار ہو چکا تھا، جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہاں اب وہ قدم بھی نہیں رکھ سکے گا۔ وہ ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ثمینہ بھی اس سے لپٹ گئی۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ بچے البتہ حیران تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ وہ ان کے ہاسٹل میں قیام کے دوران گھر میں نہیں تھا۔

عاصم اپنے بیڈ روم میں چلا آیا۔ فوزیہ اور بچے اس کے ساتھ تھے۔ ثمینہ بابر کو اس کا کمرا دکھانے لے گئی جو پہلے ہی اس مقصد کے لیے تیار کیا جا چکا تھا۔

"فوزیہ، میں....."

فوزیہ نے اُس کی بات کاٹ دی "کیا پھر بھاگ جانے کا ارادہ ہے؟" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"نہیں تو، کیا مطلب؟" وہ گڑبڑا گیا۔

"مطلب یہ کہ باتوں کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ ابھی آپ باتھ روم جائیں، نہا دھو کر تازہ دم ہوں اور فوراً سو جائیں۔ دو گھنٹے بعد آپ کو جگا دیا جائے گا۔"

عاصم نے گھڑی میں وقت دیکھا، صبح کے نو بجے تھے "لیکن میں...."

فوزیہ نے پھر اُس کی بات کاٹ دی "بس آپ کو اس ہدایت پر عمل کرنا ہے۔ آپ باتھ روم میں جائیں۔ میں بچوں کو لے کر جا رہی ہوں۔ آپ کے کپڑے نکال جاؤں گی۔"

"مگر کپڑے تو میرے سوٹ کیس میں ہیں۔"

فوزیہ نے ملامت آمیز نظروں سے اسے دیکھا "آپ کو یاد نہیں کہ آپ اس وقت اپنے گھر میں ہیں اور گھر میں آپ کا وارڈ روب موجود ہے۔"

عاصم کھسیا کر باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر نکلا تو کپڑے بیڈ پر پھیلے نظر آئے۔ اس نے کپڑے بدلے تو عجیب طمانیت کا احساس ہوا۔ پہلی بار اسے یقین آیا کہ وہ گھر واپس آگیا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر چھت کو دیکھا۔ اس کا وجود شکر گزاری کے احساس سے چھلکنے لگا۔ رب کریم نے اس کا سب کچھ اسے لوٹا دیا تھا۔ وہ شکر کے دو نفل پڑھنے کھڑا ہو گیا۔

وہ دو رکعتیں بہت طویل تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ یونہی نماز پڑھتا رہے۔ آنکھوں سے شکر کے آنسو بہتے رہیں اور سجدے کی لذت... سر اٹھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

اُس وقت وہ فوزیہ سے کہنا چاہتا تھا کہ اسے نیند نہیں آرہی ہے اور نیند اسے اب بھی نہیں آرہی تھی۔ بس وہ فوزیہ کی بات رکھنے کے لیے بستر پر جا لیٹا۔ بستر جیسے جانی پہچانی کسی آغوش کی طرح اس کے لیے وا ہو گیا۔ اسے بے خبر سونے میں چند لمحے بھی نہیں لگے اور وہ ایسی نیند تھی جو گھر سے باہر اسے ایک بار بھی میسر نہیں آئی تھی۔ آٹھ گھنٹے سو کر بھی نہیں۔ پھر وہ خواب دیکھ رہا تھا وجود میں طمانیت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر اس کے دونوں رخساروں پر چپکے ہوئے ہونٹ محبت کا امرت اس کی روح میں اتار رہے تھے۔ پھر کورس میں آواز ابھری ہیپی برتھ ڈے ٹو یو... اس مقام سے آوازیں جدا ہو گئیں۔ بچے ڈیڈی کہہ رہے تھے، فوزیہ عاصم کہہ رہی تھی اور ایک بھائی جان کا ڈوئٹ بھی تھا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ خواب نہیں تھا۔ وہ سب اس کے کمرے میں موجود تھے۔ سلیم اور ملیحہ اس کے رخسار چوم رہے تھے۔ فوزیہ سرہانے کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ثمینہ کھڑی تالیاں بجا رہی تھی اور سامنے بابر کیمرا لیے یہ سب کچھ ریکارڈ کر رہا تھا۔

عاصم بوکھلا گیا "یہ.... یہ کیا؟"

"ڈیڈی، آپ کو یاد نہیں، آج آپ کا برتھ ڈے ہے۔" ملیحہ کے لہجے میں شکایت تھی۔

"کیا واقعی؟" اس نے تائید کے لیے پہلے فوزیہ اور پھر بابر کو دیکھا۔

"بیٹے، تمہارے ڈیڈی بھلکڑ پروفیسر ہو گئے ہیں۔" فوزیہ نے ملیحہ سے کہا "اچھا اب اٹھ جائیے، کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

عاصم نے گھڑی میں وقت دیکھا، بارہ بج چکے تھے۔ وہ اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ منہ دھو کر کمرے سے نکلا تو سب ڈائننگ روم میں موجود تھے۔ وہاں ایک اجنبی چہرہ بھی تھا "بھائی جان، آپ کو ایک اہم شخص سے ملواؤں۔" بابر نے کہا "آپ آج کے دن کے ہیرو ہیں تو یہ اس کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور مصنف ہیں۔"

"پھر تو یہ وی آئی پی ہوئے۔" عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن میں سمجھا نہیں۔"

"یہ وہ پریس رپورٹر ہیں وحید نجمی، جنہوں نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ نہ بتاتے تو شاید ہم یہاں اکٹھے نہ ہوتے۔"

"آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں ڈاکٹر۔" نجمی کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"نہیں نجمی صاحب، بابر نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں بلکہ ہم سب آپ کے شکر گزار ہیں۔" اس نے گرم جوشی سے نجمی سے ہاتھ ملایا "کس اخبار کے لیے لکھتے ہیں آپ؟"

نجمی مسکرانے لگا "آج کل تو بیگم صاحبہ کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

عاصم کو حیرت ہوئی لیکن اس دوران ثمینہ اس کی طرف آنگن کی پہلی کاپی بڑھا چکی تھی۔ "چھوڑو جی، جس کے لیے ہم نے یہ سب کیا اسے تو پتا بھی نہیں۔" فوزیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا اب کھانے کو انتظار نہ کرائیں آپ لوگ۔" ثمینہ نے احتجاج کیا۔

کھانے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں۔ عاصم نے فوزیہ سے کہا "تم خواہ مخواہ آگے نکل گئیں۔ جانتی ہو، میں یہ ارادہ کرکے آیا ہوں کہ اب اخبار نکالوں گا۔"

"تو اب آپ کے لیے ایک سیٹ اپ پہلے سے موجود ہے۔"

مجی نے کہا "ویسے آپ جیسے آدمی کو اس فیلڈ میں ضرور آنا چاہیے۔"

"آپ مجھے جانتے بھی نہیں پھر ایسی بات اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"آپ کے قریبی لوگوں کو چھوڑ کر دنیا میں سب سے زیادہ آپ کو میں جانتا ہوں۔"

"یہ بڑے خطرناک آدمی ہیں۔" فوزیہ نے ہنستے ہوئے کہا "تحقیق ان کا خاص میدان ہے۔"

"تب تو یہ ہماری ٹیم میں شامل ہوں گے انشاء اللہ۔" عاصم نے کہا "ارے فوزیہ اپنے اسٹاف سے تو ملواؤنا۔"

"شام کو مل لیجئے گا۔ میں نے آپ کی برتھ ڈے پر سب کو مدعو کیا ہے۔"



اس بات کو تین ماہ ہو چکے تھے۔ پاکستان میں اس عرصے میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سوائے اس کے کہ وفاقی کابینہ سے کچھ وزیر رخصت ہو گئے تھے اور کچھ نئے لوگ کابینہ میں شامل کر لیے گئے تھے۔ اس سے قطع نظر وہی فضا تھی' وہی کمر توڑ مہنگائی تھی اور وہی وعظ کہ عوام دو تین سال اسی طرح قربانی دیتے رہے تو پاکستان کو دائمی خوش حالی نصیب ہو جائے گی۔ لیکن ارباب اقتدار کے اللے تللے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی ان کے طور طریقے اور انداز دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ ملک میں جمہوریت نہیں ملوکیت قائم ہے۔

عاصم قریشی کو روزنامہ "صبح بخیر" کا ڈکلیریشن مل چکا تھا۔ اخبار کے اجرا کے لیے تین ماہ کی مہلت دی گئی تھی مگر عاصم کو امید تھی کہ وہ ایک ماہ کے اندر ہی اخبار کو اسٹال پر لانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تمام انتظامات پہلے ہی سے مکمل تھے۔ عاصم کا ارادہ تھا کہ جس دن کوئی دھماکا خیز خبر آ گئی اسی دن سے اخبار کی اشاعت شروع ہو جائے گی۔

فوزیہ کا ہفت روزہ آنگن خاصا مقبول ہو رہا تھا۔ اُس کی اشاعت مسلسل بڑھ رہی تھی۔ ادارے کے لوگ روزنامے کی اضافی ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے بے تاب تھے۔ ان کے حوصلے بلند تھے کیونکہ ان کے پبلشرز دیانت دار بھی تھے اور حوصلہ مند بھی۔

ہاں' ملک میں ایک اور مثبت کام بھی ہوا تھا۔ عوامی لیب اینڈ بلڈ بینک نے کراچی میں بھی کام شروع کر دیا تھا۔ بابر کا خیال تھا کہ آئندہ سال پشاور یا راولپنڈی میں بھی لیب کی شاخ قائم ہو جائے گی۔

اُس صبح عاصم تازہ اخبار کا فلمی صفحہ پڑھ رہا تھا۔ فلمی صفحہ وہ باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ اس روز عظمت مرزا کی فلم ٹوٹے ستارے کے متعلق خبر چھپی تھی کہ فلم آئندہ جمعے سے عام نمائش کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔ خبر دینے والے نے لکھا تھا فلم کی اسٹوڈیو رپورٹ اور سنسر رپورٹ بے حد شان دار ہے۔ پریمیر شو دیکھنے والے ناقدین کا کہنا ہے کہ ٹوٹے ستارے فلم انڈسٹری کے مُردہ تن میں نئی روح پھونک دے گی۔ ممکن ہے یہ ایسی آرٹ فلم ثابت ہو جو باکس آفس پر کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کرے۔ فلمی نجومیوں نے اس فلم کی زبردست کامیابی کی پیش گوئی کی ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ فلم کی ہیروئن الماس اپنی معصومیت' حسن اور اعلیٰ کردار نگاری کے زور پر اس فلم کی ریلیز کے ساتھ ہی سپر اسٹار بن جائے گی۔ واضح رہے کہ الماس فلم کی ریلیز سے پہلے ہی خواص میں سپر اسٹار کا مرتبہ پا چکی ہے۔ غیر فلمی سرگرمیوں کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت اونچا اڑ رہی ہے بلکہ اوپر ہی اوپر جا رہی ہے۔

عاصم نے اخبار تہ کر کے ایک طرف رکھا اور بابر کی طرف متوجہ ہوا جو فوزیہ سے سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا "کیا سازش ہو رہی ہے؟"

"آپ بھی سُن لیں" بابر نے کہا "بھابی نے مجھ سے منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا تھا' اب مکر رہی ہیں۔"

"دیکھو نا' تم نے مانگا بھی کیا ہے۔" فوزیہ بولی۔

"کیا مانگ لیا بھئی؟" عاصم نے متجسس لہجے میں بابر سے پوچھا۔

"میں کہہ رہا ہوں ثمینہ سے میری شادی کرا دیجئے۔"

فوزیہ مسکرا رہی تھی۔ عاصم نے پوچھا "پھر تمہاری بھابی کیا کہتی ہیں؟"

"کہتی ہیں' وہ تو بہت پہلے سے بُک ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہیں۔" عاصم نے کہا۔ پھر وہ فوزیہ کی طرف مڑا "ثمینہ سے بکنگ کنفرم بھی کرا لی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"بس تو پھر بتا دیں۔"

بابر کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بابر' منہ مانگا انعام تمہارا ہوا۔" فوزیہ نے کہا۔

بابر کا منہ پہلے حیرت سے کھلا پھر وہ اچانک ہنسنے لگا "میں سمجھ گیا۔ میں نے منہ مانگے انعام کا موقع گنوا دیا۔ یہ تو آپ لوگ پہلے سے طے کیے بیٹھے تھے۔ اب مجھے یاد آیا' لاہور میں ایک دن بھائی جان نے مجھ سے کہا تھا "میں اور تمہاری بھابی تمہارے لیے ایک بہت پیاری لڑکی تلاش کر چکے ہیں۔ یہ الگ بات کہ تم پہلے ہی کسی کو پسند نہ کر چکے ہو۔" بابر نے عاصم کی سی آواز بنا کر دہرایا "پھر بڑی سوگواری سے یہ بھی فرمایا تھا' کاش..... میں تمہاری شادی میں شریک ہو سکوں۔"

عاصم جھینپ گیا۔ فوزیہ قہقہے لگانے لگی۔ اسی وقت ثمینہ کافی لے آئی "کس بات پر ہنس رہی ہیں؟" اس نے فوزیہ سے پوچھا۔

"مت پوچھو۔ ادھر بھائی جان کو دیکھو اور عبرت پکڑو۔ بات تمہیں بتا دی تو تمہارا حشر ان سے بھی بُرا ہو گا۔ دیکھ رہی ہو ان کا جھینپنا۔" بابر نے کہا۔

ثمینہ بغیر بات سنے اور سمجھے ہی جھینپ گئی۔ اس بار عاصم بھی قہقہوں میں شامل ہو گیا۔

✱✧✱

لہو کے دو رنگ
پگلی
جوان ہوا
رشتہ آدم
مس ہرکولیس
خندہ تقدیر
اماوس کا دیا
پہیلی
امید کا دیا
اچھوت